دائرۃ المعارف

یعنی

معارف اعظم گڑھ

کی

۱۳۸ ویں جلد

ماہ جولائی سنہ ۱۹۸۶ء تا ماہ دسمبر سنہ ۱۹۸۶ء

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

معارف پریس اعظم گڑھ

فہرست

مضمون نگارانِ معارف

جلد ۱۳۸

ماہ جولائی ۱۹۸۶ء تا ماہ دسمبر ۱۹۸۶ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست مضامین معارف

جلد ۱۳۸

ماہ جولائی ۱۹۸۶ء تا ماہ دسمبر ۱۹۸۶ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	مضمون	صفحہ
	شذرات	۲، ۸۲، ۱۶۲، ۲۴۲، ۳۲۲، ۴۰۲
	مقالات	
۱	اردو میں حمدیہ شاعری	۱۳۰
۲	اسلام اور مستشرقین جلد اول پر کچھ اظہار خیالات	۶۴
۳	تاریخ غزنی	۵۴
۴	حنائے علی گڑھ	۱۳۹
۵	سیرت عائشہؓ اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم	۴۶۶
۶	سیرۃ النبیؐ جلد سوم پر کچھ اعتراضات اور ان کے جوابات	۱۰۵، ۱۸۱، ۲۶۸
۷	شاخت اور حدیث نبویؐ	۳۲۵، ۴۰۵
۸	قاضی عبدالرشید ابراہیم	۲۰۵، ۲۹۶

رجسٹرڈ نمبر اے ۔زیڈیم۔ این پی ۳۴ جولائی سنہ ۱۹۸۵ء

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

قیمت تین ۳ روپئے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

برید فرنگ

۱۹۲۰ء میں علامہ سید سلیمان ندوی نے مولانا محمد علی وغیرہ کے ساتھ وفد خلافت کے ایک رکن اور جمعیۃ علماء خصوصاً مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے نمایندہ کی حیثیت سے مسئلۂ خلافت پر اس دور کے برطانوی وزیر اعظم مسٹر لائڈ جارج سے گفتگو کرنے اور ترکوں کے حق میں فیصلہ کے لئے لندن کا سفر کیا تھا، اور اسی ضمن میں وہ فرانس، اٹلی وغیرہ بھی آتے جاتے رہے، ان تمام مقامات سے ہندوستان کے جن بزرگوں، دوستوں، اور عزیزوں کے نام انہوں نے جو خطوط لکھے تھے، وہ اس میں جمع کر دیئے گئے ہیں، اس کا پہلا اڈیشن خود سید صاحب کی زندگی میں ان کے پیش لفظ کے ساتھ ان کے اشاعتی ادارہ مکتبۃ الشرق کراچی سے شائع ہوا تھا، ایک عرصہ کے بعد بیس سے اس کا دوسرا اڈیشن مولانا فضل ربی ندوی نے شائع کیا، اسی دوسرے اڈیشن کا عکسی اڈیشن دارالمصنفین نے اپنے مطبع معارف میں چھپوا کر شائع کیا ہے،

اس میں اس دور کی پوری دنیائے اسلام کے سیاسی و اجتماعی حالات، مسلمانوں کے سیاسی مسائل اور بیرون اسلامی ملک کے مسلمان اکابر و مشاہیر کی دلچسپ ملاقاتوں کی تفصیل بھی آگئی ہے، اس دور کی اسلامی سیاست کو سمجھنے کے لئے اس کا مطالعہ بہت ضروری ہے،

قیمت:۔ ۔۔ ۱۴ روپیے

جلد ۱۳۸ ماہ ذی القعدہ ۱۴۰۶ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۸۶ء عدد ۱

مضامین

مقالات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

جب سے بابری مسجد کا قضیہ اٹھ کھڑا ہوا ہے، اس وقت سے راقم کو اس کا تجسس ہے کہ بابر پر رام جنم بھومی کے مسمار کرنے کا جو الزام عائد کیا گیا ہے، اس کا قدیم ترین ثبوت کہاں مل سکے گا، مغلوں کے دور کی کسی تاریخ میں تو اس کا ذکر کہیں نہیں ملا۔

البتہ برطانوی عہد میں ۱۸۸۱ء میں جو امپیریل گزیٹر مرتب ہوا، اس میں ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر نے اجودھیا کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے اس میں ہے کہ اجودھیا سے دلچسپی اس کی قدیم تاریخ کی وجہ سے ہے، اس کا پرانا شہر بالکل غائب ہو چکا تھا، یہ کھنڈروں کا ڈھیر تھا یا جنگلوں میں گم تھا، لیکن قدیم زمانہ میں یہ ہندوستان کے عظیم ترین اور شاندار ترین شہروں میں تھا، کہا جاتا ہے کہ اس کا رقبہ چھیانوے [۹۶] میل تک پھیلا ہوا تھا، کوشل کی حکومت کا یہ دارالسلطنت تھا، اس میں موجودہ دور کا اودھ بھی شامل تھا، یہاں سورج بنسی خاندان کے راجہ دسرتھ کا دربار تھا، رامائن کے ابتدائی ابواب کے مطالعہ سے اس شہر کی شوکت، یہاں کے فرماں روا کی شان اور یہاں کے لوگوں کی نیکی، دولت، اور اطاعت گذاری کا اندازہ ہوتا ہے، رام چندر دسرتھ کے بیٹے تھے، وہ رامائن کے ہیرو ہیں، سورج بنسی خاندان کے آخری فرماں روا کے مرنے کے بعد یہاں بودھوں کا تسلط قائم ہو گیا تو اجودھیا پر زوال آ گیا، لیکن جب برہمنیت کا از سر نو عروج ہوا تو بیان کیا جاتا ہے کہ راجہ بکرماجیت نے ۵۷ قبل مسیح میں اس شہر کی کھوج لگائی، اس کے مختلف مندروں، اور ان جگہوں کی نشاندہی کی جو رام سے منسوب تھیں، ان میں سب سے اہم مقام رام کوٹ تھا، جو راجہ کا قلعہ اور محل تھا، پھر ناگیشور مندر کا بھی پتہ چلایا گیا جو مہادیو کے نام پر تھا، مانی پربت کی پہاڑی کی بھی تلاش کی گئی، اسی طرح اور مندروں کا پتہ لگایا گیا۔

ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر آگے چل کر رقمطراز ہے کہ کوشل اس لیے بھی مشہور تھا کہ یہ بودھ مت اور جین مت کے پیروں کا ابتدائی مسکن تھا، اور ان کا دعویٰ تھا کہ یہیں ان کے بانی کی پیدائش ہوئی، ساتویں صدی میں چینی سیاح یہاں آیا تو اس نے اجودھیا میں بودھوں کے بیس [۲۰] مندر اور تین [۳] ہزار بھکشو دیکھے، ان ہی میں برہمنوں کی بھی بڑی آبادی تھی، اب بھی یہاں جینیوں کے کئی مندر ہیں جو ڈیڑھ سو برس کے اندر بنے ہیں، خیال کیا جاتا ہے کہ ان کے پانچ [۵] مذہبی پیشواؤں کا یہ مولد بھی تھا۔

اسی کے بعد ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر کا بیان ہے کہ جب مسلمانوں نے اس کو فتح کیا تو ان کی یادگار میں تین [۳] مسجدوں کے

کھنڈر ہیں، جو شہنشاہ بابر اور اورنگ زیب نے ہندوؤں کے مندروں کو توڑ کر ان کے ملبے سے بنوائیں۔ یہ تین[۳] مشہور مندر یہ تھے: (۱) جنم استھان جہاں رام چندر پیدا ہوئے تھے (۲) سوارگ دوار امندر جہاں رام چندر جلائے گئے (۳) تیرتا کا ٹھاکر جو اس لیے مشہور تھا کہ یہاں رام چندر نے بھینٹ چڑھائی تھی...... اس شہر میں اس وقت تریسٹھ[۶۳] وشنو اور تینتیس[۳۳] شیو کے مندر ہیں، چھتیس[۳۶] مسلمانوں کی مسجدیں ہیں۔

یہ تو ابھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ بابر پر جو یہ الزام رکھا گیا ہے اس کے لیے یہی قدیم ترین تحریری ثبوت ہے، ممکن ہے کہ ایسی تحریر اس سے پہلے کی بھی ہو مگر وہ کسی نہ کسی انگریز ہی کی ہوگی۔ ۱۸۸۱ء کے بعد فیض آباد کے جتنے گزیٹیر تیار ہوئے ان میں یہی ساری باتیں دہرائی گئیں، ہنٹر نے اپنی سامراجیت پسندی میں مذکورۂ بالا تحریر میں جو زہر پھیلایا ہے اس کا اندازہ اس کو بہت ہی غور سے مطالعہ کرنے کے بعد ہی ہو سکے گا، اس نے اس میں ہندوؤں، بودھوں، جینیوں اور مسلمانوں سب پر ضرب لگائی ہے، کیا یہ صحیح ہے کہ کوشل میں گوتم بدھ اور مہابیر پیدا ہوئے؟ پھر ہندوؤں کے مذہبی تخیل کی تحقیر یہ لکھ کر کی گئی ہے کہ وہ اجودھیا کو ایک مقدس شہر سمجھتے ہیں، مگر یہ مقدس شہر جنگلوں میں گم ہو کر کھنڈر ہو چکا تھا، رام چندر کے کئی ہزار برس کے بعد اس کو پھر سے آباد کیا گیا، ان کی پیدائش، جلانے اور قربانی کی جگہوں کو خیالی طور سے متعین کیا گیا، ان ہی خیالی جگہوں کو ہندو مقدس سمجھتے ہیں، اس تحریر میں یہ بھی ہے کہ یہاں پہلے بودھوں کی بیس[۲۰] عبادت گاہیں تھیں جن میں تین[۳] ہزار بھکشو رہتے تھے، اس تحریر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب ۱۸۸۱ء میں یہ لکھی گئی تو وہاں نہ بودھوں کی عبادت گاہیں رہ گئی تھیں اور نہ بھکشو دکھائی دیتے تھے، اس طرح یہ الزام ہندوؤں پر عائد ہو جاتا ہے کہ انھوں نے اجودھیا سے ان کو ختم کیا۔

پھر ہندوؤں کو مسلمانوں سے یہ لکھ کر برگشتہ کیا گیا ہے کہ بابر اور اورنگ زیب دونوں نے ان کے مندروں کو مسمار کر کے ان کے ملبے سے مسجدیں بنوائیں، ایسے اہم بیان کے لیے کسی مستند ماخذ کا حوالہ دینا ضروری تھا، مگر جب شر انگیزی مقصود ہو تو مستند حوالہ کے بجائے قیاس آرائی زیادہ کارگر ہوتی ہے، پھر اس کی تحریر میں بابری مسجد کو کھنڈر ہی بتایا گیا ہے، یہ کوئی کیسے یقین کر سکتا ہے، جب یہ مسجد اپنی پرانی شان کے ساتھ کھڑی ہے اور اسی

کے لیے سارا قضیہ جاری ہے، پھر اس میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ یہ مسجد مندر کی جگہ یا اس کے قریب بنائی گئی جب یہ یقین نہ تھا کہ مسجد مندر کی اصل جگہ پر بنائی گئی تو یہ لکھنے کی کیا ضرورت تھی کہ اس کی جگہ کے قریب بنائی گئی، اس طرح کی تحریروں ہی سے فتنہ پیدا ہوتا ہے۔

خیریت یہ ہے کہ اب تک ہندوؤں کی طرف سے یہ دعویٰ نہیں کیا جا رہا ہے کہ اجودھیا میں جنم بھومی مندر کے علاوہ سوارگ دوار مندر اور تیرتا کا ٹھاکر کی جگہیں بھی ان کو دلائی جائیں، جہاں ہنٹر کے بیان کے مطابق دو اور مسجدیں بنائی گئی تھیں ہندوؤں نے ان دونوں جگہوں کی واپسی کا مطالبہ اب تک نہیں کیا ہے تو اس کے کیا معنی ہیں کہ انگریزوں نے سنی سنائی روایتوں یا اپنی طرف سے من گھڑت باتیں لکھ کر ہندوؤں کے جذبات کو مشتعل کرنے کی کوشش کی، اور اس میں کامیابی حاصل کی۔

۲۱ - ۱۵ / جون کے السٹریٹڈ ویکلی میں ایک مضمون نگار چیدانند داس گپتا نے لکھا ہے کہ بنیاد پرست ہندو یہ کہتے ہیں کہ ہم رام اور سیتا کو آیڈیل نمونے تسلیم کرنے پر اکتفا نہیں کرتے، ہمارے ہنتوں نے ان کی جو پیدائش کی تاریخ اور ان کی پیدائش کی جو جگہ بتائی ہے ان ہی کو تاریخی حیثیت سے ہم کو تسلیم کرنا ہے اور اسی کے سہارے دوسرے فرقہ سے جنگ کر کے ان سے بازی جیت سکتے ہیں، یہ تسلیم کہ رام کی پیدائش کی جگہ کا ثبوت سائنٹفک طریقہ سے نہیں ملتا ہے، لیکن ہم کو اس کی پرواہ نہیں، بابری مسجد اور جنم بھومی کے جھگڑے سے جو جذبات ابھرے ہیں ان کا تقاضا یہ ہے کہ تاریخ کی ساری کتابیں جلا دی جائیں، برہمن اس کی تاریخ پھر سے لکھیں گے، اپنی اس رزمیہ کو پھر سے سنائیں گے، پھر سے اس کی تعبیر کریں گے، اور اس میں طرح طرح کے اضافے بھی کریں گے، وہ اپنے پرانوں کو بھی پھر سے قلمبند کریں گے، اور اس کی پرواہ نہ کریں گے کہ تاریخی حیثیت سے ان کا کیا مقام ہے۔

اس ہٹ کے بعد پھر سارے معاملات کا تاریخی تجزیہ کرنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔

مقالات

قرآن کریم اور مستشرقین

ڈاکٹر التہامی نقرہ صدر شعبۂ قرآن و حدیث کلیۃ الزیتون تونس یونیورسٹی تونس

ترجمہ

عبید اللہ کوٹی رفیق دار المصنفین

"مکتب التربیۃ لدول الخلیج" کی طرف سے "مناہج المستشرقین" کے نام سے دو جلدوں میں کتاب شائع ہوئی ہے، مستشرقین اور اسلام کے سلسلہ کو جاری رکھنے کے لئے اس کتاب کے مضامین کے ترجمے بھی ناشر اور مضمون نگاروں کے شکریہ کے ساتھ معارف میں شائع کئے جارہے ہیں، ترجمہ میں مستشرقین کے جو نام آئے ہیں ان کو حتی الوسع صحیح لکھنے کی کوشش کی گئی ہے، اگر ان کے املا میں کوئی غلطی ہو گئی ہو تو ناظرین توجہ دلائیں، یہ دونوں جلدیں جناب محمد اجمل ایوب، استاذ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے ذریعہ سے ملیں جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

(معارف)

تحریک استشراق نے اٹھارہویں صدی عیسوی میں شہرت حاصل کی اس عرصہ میں مستشرقین نے اسلام کے دو بنیادی ماخذ (قرآن و حدیث)، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کتب و رسائل اور انسائیکلوپیڈیاز میں جو کچھ لکھا وہ فکر اسلامی کے ماہروں کے لیے بھی توجہ

کا سبب بنا۔

مسلمانوں میں تعلیم یافتہ طبقہ اپنی تربیت و تعلیم اور فکری رجحانات کے لحاظ سے یکساں نہ تھا، اسی لئے ان کی مستشرقین کی طرف توجہ کے اسباب بھی مختلف تھے، ان کی اس توجہ میں تحسین و قدردانی اور ناپسندیدگی اور بے اطمینانی، دونوں کے اثرات نمایاں تھے۔

تاہم اہم اسباب درج ذیل ہیں۔

مستشرقین کی طرف توجہ کے اسباب مسلمانوں کے ایک طبقہ میں اسلام، قرآن مجید اور پیغمبر اسلام کے بارے میں غیر مسلم مفکرین کے خیالات سے واقفیت کی خواہش پیدا ہوئی، مستشرقین نے اپنی مخصوص تعلیم و تحقیق اور پیشہ ورانہ کارکردگی کی روشنی میں مختلف پہلوؤں سے اسلام پر نظر ڈالی ہے، کچھ لوگوں نے تو فروعی مسائل ہی کو اپنی ساری جدوجہد کا محور بنایا یہاں تک کہ ان مسائل میں ان کو رہنمائی و قیادت کا منصب حاصل ہو گیا، ان کے ایسے شاگرد اور عقیدت مند بھی پیدا ہو گئے، جو ان کی رایوں سے ہی استدلال کرتے اور ان ہی کے طرز تحقیق کو اپناتے ہیں۔

۱۔ ہر ایک قوم کا یہ حق ہے کہ اس کے فرزندوں کو ان خیالات کا علم ہو جو دوسرے لوگ ان کے عقیدہ و اخلاق اور تہذیب و ثقافت کے بارے میں ظاہر کیا کرتے ہیں۔ ان خیالات پر ان کو نقد و تجزیہ کا حق بھی حاصل ہے، ورنہ ان کی طرف سے خاموشی ان خیالات سے اتفاق کے ہم معنی ہو گی، پھر اگر ان خیالات کا اظہار، مغرب کے ترقی یافتہ مرکز سے ہو رہا ہو اور بحث و گفتگو کا محور وحی آسمانی ہو جو کتاب اللہ و سنت نبویؐ کی صورت میں موجود ہے۔ تو نقد و تجزیہ کے استحقاق اور اس کی ضرورت سے کسی صورت میں بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

۱۔ مستشرقین کے نتائج فکر و تحقیق سے مسلمانوں کی دلچسپی کی وجہ یہ ہے کہ ان کے شاگردوں نے مستشرقین کے معروضی انداز بحث و تحقیق کا بہت زیادہ پروپیگنڈہ کیا ہے، اس زمانہ میں عالم اسلام پس ماندہ اور ترقی کی جانب پیش قدمی کے لیے بے قرار تھا، مغربی یونیورسٹیوں کو علمی تحقیقات میں شہرت ملی انکے یہاں متون کی دریافت اور ان پر نقد و استقرار اور ان کے اسلوب تحریر میں جو وقار و سنجیدگی نظر آتی ہے، اس کی وجہ سے عالم اسلام میں بھی اس طرح کی یونیورسٹیوں کے قیام و تاسیس کی خواہش پیدا ہوئی، چنانچہ یورپ کی یونیورسٹیوں میں عالم اسلام کی طرف سے وفود بھیجے گئے، اور عرب ممالک کی یونیورسٹیوں میں تدریس کے لیے ان مستشرقین سے تعاون لیا گیا، استفادہ کی غرض سے ان کی تحقیقات کو عربی میں منتقل کیا گیا، اور مصر، بغداد اور دمشق کی علمی و لسانی اکاڈمیوں میں ان کا تقرر کیا گیا۔

۲۔ عالم اسلام نے تحریک استشراق کی طرف اس کی تردید و دفاع کی غرض سے بھی توجہ کی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، اسلام اور قرآن پر متعصب مستشرقین کے اعتراضات اور الزامات واضح تھے، لیکن ان کے پس پردہ سامراجی مقاصد اور صلیبی جنگ کے رجحانات بھی کارفرما تھے، جن پر انھوں نے علمی تحقیق اور دین و دیانت کا پردہ ڈال رکھا تھا، مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو زندگی اور علم کے مختلف میدانوں میں مغرب سے بہت زیادہ پیچھے رہ جانے کا صدمہ تھا، اس لیے مستشرقین کی یہ کوشش ہوئی کہ اسلامی تعلیمات کے وقار کو مجروح کردیں اور اسلام کے بارے میں شک و شبہہ کی ایسی فضا پیدا کردیں جس کی وجہ سے مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ احساس کمتری میں مبتلا ہو جائے۔

ایک مستشرق نے قرآن مجید کی آیت "والی اللہ المصیر" (سورۂ نور) کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"اسلام کا اللہ بظاہر اعلیٰ لیکن سخت گیر ہے، جب کہ مسیحیت کا اللہ مہربان اور متواضع ہے، وہ انسانی صورت میں ظاہر ہوا، وہ معبود فرزند ہے..... تثلیث کے مسیحی عقیدہ نے انسان کو اللہ سے قریب کر دیا ہے، اور توحید کے اسلامی عقیدہ نے دونوں کے درمیان فاصلہ پیدا کر کے، انسان کو خوف و اندیشہ میں مبتلا کر دیا ہے۔"[۱]

ایک فرانسیسی مستشرق کارادے فاؤ (Carra de Vaux) کہتا ہے کہ

محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک طویل مدت تک مغرب میں بدنام تھے، چنانچہ جو بھی بے سرو پا حکایت یا برائی ملتی وہ ان کی طرف بے تکلفی کے ساتھ منسوب کر دی جاتی۔"[۲]

اسلام اور پیغمبر اسلامؐ پر یہودی اور مسیحی مستشرقین کی طرف سے یہ بامقصد حملے مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے کے علاوہ بہت سے اہل مغرب کے ذہنوں پر بھی اثر انداز ہوتے رہے ہیں، چنانچہ ایک مستشرق کولی یہ بیان کرتا ہے کہ "اسلام کی بنیاد ہی تعصب اور طاقت پر ہے، وہ اپنے پیروؤں کو لوٹ مار اور رہزنی کی اجازت دیتا ہے، اور جو لوگ جنگ میں مرجاتے ہیں انھیں جنت کی خوش خبری دیتا ہے"، یہی مستشرق صلیبی جنگوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

"اور اس طرح ہلال کی قوت صلیبی علم کے سامنے پسپا ہو گئی، اور قرآن اور اس کے بیان کردہ اخلاق کے مقابلہ میں انجیل کو فتح حاصل ہوئی۔"[۳]

---

[۱] مجلۃ العالم الاسلامی The Muslim World اکتوبر ۱۹۵۵ء [۲] کتاب محمدیہ" ص ۲۰ طبع پیرس ۱۹۰۸ء [۳] دیکھئے اس کی کتاب البحث عن الدین الحق (عربی ترجمہ) طبع ۱۹۲۶ء۔ مولف کو ۱۸۵۵ء میں نپولین سوم سے خوشنودی کا پروانہ ملا اور مشرق و مغرب کی درسگاہوں میں اس کا نام آج تک زندہ ہے۔

مذکورۂ بالا قسم کی تحریریں دوسرے سنجیدہ مستشرقین کے حق میں بھی نقصان دہ ثابت ہوئی ہیں، چنانچہ اب اسلام کے بارے میں مستشرقین کی تحریروں کو احتیاط اور اندیشہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، اور ان میں نقائص کو معلوم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

درمنگم (F. Dermanghame) لکھتا ہے کہ

"اسلام اور مسیحیت کے درمیان صدیوں کی جنگ نے دونوں کے درمیان نفرت پیدا کی اور دونوں نے ایک دوسرے کو سمجھنے میں غلطی کی، البتہ ہمیں یہ بات تسلیم کرنی چاہئے کہ مغرب کی طرف سے غلط فہمیاں پیدا کرنے کی زیادہ کوشش ہوئی ہے، ان سخت فکری مقابلہ آرائیوں میں مغرب نے واقعی تحقیق سے کام نہیں لیا، مستشرقین نے باز نطینی طریق بحث و مناظرہ کے ذریعہ اسلام کو اپنی ملامت کا نشانہ بنایا، پھر اس کے بعد مغرب کے وظیفہ یاب شاعروں اور مقالہ نگاروں نے عربوں پر مسلسل حملے کئے، ان کے یہ حملے بے بنیاد بلکہ متضاد الزامات کی صورت میں تھے۔"[1]

۳۔ مستشرقین کی طرف مسلمانوں کی توجہ کا ایک مقصد ان علمی تاریخی اور لسانی غلطیوں کی نشاندہی بھی جو ان سے ناواقفیت، غلط فہمی، تنگ نظری یا بے بنیاد مفروضوں کے قائم کر لینے کی وجہ سے سرزد ہوئیں۔ مثلاً ان کا یہ دعویٰ کہ "حروف مقطعات کے مسئلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہود سے متاثر ہوئے ہیں" اور "یہ الزام کہ قرآن مجید آپ ہی کی تصنیف ہے"، مستشرقین اس حقیقت سے چشم پوشی کر گئے کہ یہ سورتیں (جن کا آغاز حروف سے کیا گیا ہے) مکی ہیں، جہاں یہودی نہ تھے، مدنی سورتوں میں سے سورۂ البقرہ اور آل عمران کے سوا کسی بھی سورت کا آغاز حروف سے نہیں کیا گیا ہے، جب کہ مدینہ میں یہود موجود تھے، پھر ان حروف مقطعات پر یہودیوں کے

---

[1] حیاۃ محمد ص ۱۲۵-b پیرس ۱۹۲۹ء

اثر کی یہ منطق کیونکر صحیح ہوسکتی ہے۔

جرمن مستشرق نولدکی نے اپنی کتاب تاریخ القرآن میں حروف مقطعات کو قرآن مجید کا جزء تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے، وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ مصحف عثمانی کی ترتیب سے پہلے مسلمانوں کے پاس جو نسخے تھے، یہ حروف مقطعات علامت کے طور پر درج کئے گئے تھے مثلاً حضرت مغیرہؓ کے مجموعہ کے لئے حرف میم حضرت ابوہریرہؓ کے نسخہ کیلئے حرف ہ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے صحیفہ کے لیے حرف صاد صحیفۂ حضرت عثمانؓ کے لئے حرف نون، چنانچہ نولدکی کے نزدیک یہ حروف مختلف مجموعوں کی ملکیت کی علامت تھے، جو غلطی سے مصحف عثمانی کی بعض سورتوں کے آغاز میں باقی رہ گئے، اور طول مدت کے ساتھ وہ قرآن کا جزء بن گئے۔

نولدکی کو اگرچہ بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا لیکن .... دوسرے مستشرقین اس کی مذکورۂ بالا رائے ہی کو نقل کرتے رہے، حالانکہ ان سچے مسلمانوں کے ساتھ جنھوں نے قرآن مجید کے مختلف نسخوں کو نقل کیا ہے، بڑی ناانصافی اور زیادتی ہوگی اگر ہم ان پر غفلت یا قرآن مجید میں .... دوسروں کے کلام کے اضافہ کا الزام عائد کریں[1]

۴۔ مستشرقین کی طرف توجہ کا ایک سبب، ان کی تحقیقات سے استفادہ بھی تھا کلیسا کے طریق کار کے دباؤ سے آزاد ہونے کے بعد مستشرقین کی جو تحقیقات منظر عام پر آئی ہیں اُن میں کلیسا کے عائد کردہ احکام کی پیروی یا سامراجی مقاصد کی تکمیل پیش نظر نہ تھی، ان تحقیقات کا انداز خالص علمی ہے، مستشرقین کا یہ جدید نقطۂ نظر معروضیت، انصاف اور تحقیق و استقرار کے اصولوں کے مطابق ہے، اگرچہ استشراقی مطالعہ کا فکری غلطیوں اور صدیوں کے نسلی اثرات سے محفوظ رہنا یا معمولی جدوجہد سے ان اثرات کو مغلوب کر لینا آسان نہ تھا، لیکن تحقیق میں

---

[1] نظرات استشراقیہ فی الاسلام۔ ص ۲۴ ۔ قاہرہ۔

ان سے آزاد رہنے کی یہ کوشش، ان کے تحقیقی کاموں میں پختگی کا سبب بنی اور اس سے مستشرقین کے بارہ میں شک وشبہ کے ازالہ میں بھی مدد ملی۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کو مستشرقین نے کئی زبانوں میں شائع کیا ہے، اور اس میں اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر دی ہیں، تاہم چند در چند تحریفات اور غلط مباحث کے باوجود وہ مسلمانوں کے لیے بھی ایک اہم علمی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

بہرحال وجہ کچھ بھی ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ مستشرقین نے اپنی تحقیقات کے ذریعہ علوم اسلامیہ کی ترقی میں قابل قدر حصہ لیا ہے، اور ان میں اضافہ، نظر ثانی اور معترضانہ مباحث کے ذریعہ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے، ان میں سے چند دیانت دار مستشرقین نے عالم اسلام اور مغربی دنیا کے علمی ماحول پر گہرا اثر ڈالا ہے، مثلاً کلو دا تیاں سافاری Claude Etienne Savary) نے قرآن مجید کے اپنے ترجمہ کے مقدمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا احترام وتعظیم کے ساتھ ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک ایسے عالمی مذہب کی بنیاد ڈالی جو سادہ عقیدہ پر مشتمل ہے، ایک اللہ پر ایمان جس کو عقل تسلیم کرتی ہے، وہ نیکی پر جزا اور بدی پر سزا دیتا ہے، مغرب کا کوئی روشن خیال محمدؐ کی نبوت کو تسلیم نہ کرے تب بھی وہ ان کو تاریخ انسانی کے عظیم ترین افراد میں شمار کرنے پر مجبور ہے۔"[۱]

اسی طرح انگریز مستشرق تھامس کارلائل اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ

اس زمانہ میں ایک پڑھے لکھے آدمی کے لیے یہ بات شرمندگی اور عیب کا باعث ہوگی اگر وہ اس خیال کی طرف توجہ کرے کہ "دین اسلام غلط ہے اور محمدؐ ایک فریبی

---

[۱] Le Coran. 2, ed Paris 1783

اثر کی یہ منطق کیونکر صحیح ہو سکتی ہے۔

جرمن مستشرق نولدیکی نے اپنی کتاب تاریخ القرآن میں حروف مقطعات کو قرآن مجید کا جزء تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے، وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ مصحف عثمانی کی ترتیب سے پہلے مسلمانوں کے پاس جو نسخے تھے، یہ حروف مقطعات علامت کے طور پر درج کئے گئے تھے مثلاً حضرت مغیرہؓ کے مجموعہ کے لئے حرف میم حضرت ابوہریرہؓ کے نسخہ کیلئے حرف ہا، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے صحیفہ کے لیے حرف صاد صحیفہ حضرت عثمانؓ کے لئے حرف نون، چنانچہ نولدیکی کے نزدیک یہ حروف مختلف مجموعوں کی ملکیت کی علامت تھے، جو غلطی سے مصحف عثمانی کی بعض سورتوں کے آغاز میں باقی رہ گئے، اور طول مدت کے ساتھ وہ قرآن کا جزء بن گئے۔

نولدیکی کو اگرچہ بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا، لیکن .... دوسرے مستشرقین اس کی مذکورہ بالا رائے ہی کو نقل کرتے رہے، حالانکہ ان سچے مسلمانوں کے ساتھ جنھوں نے قرآن مجید کے مختلف نسخوں کو نقل کیا ہے، بڑی ناانصافی اور زیادتی ہوگی اگر ہم ان پر غفلت یا قرآن مجید میں .... دوسروں کے کلام کے اضافہ کا الزام عائد کریں [۱]

۴۔ مستشرقین کی طرف توجہ کا ایک سبب، ان کی تحقیقات سے استفادہ بھی تھا، کلیسا کے طریق کار کے دباؤ سے آزاد ہونے کے بعد مستشرقین کی جو تحقیقات منظر عام پر آئی ہیں ان میں کلیسا کے عائد کردہ احکام کی پیروی یا سامراجی مقاصد کی تکمیل پیش نظر نہ تھی، ان تحقیقات کا انداز خالص علمی ہے، مستشرقین کا یہ جدید نقطہ نظر معروضیت، انصاف اور تحقیق و استقرار کے اصولوں کے مطابق ہے، اگرچہ استشراقی مطالعہ کا فکری غلطیوں اور صدیوں کے نسلی اثرات سے محفوظ رہنا یا معمولی جدوجہد سے ان اثرات کو مغلوب کر لینا آسان نہ تھا، لیکن تحقیق میں

---

[۱] نظرات استشراقیہ فی الاسلام۔ ص ۴۴۔ ط قاہرہ۔

ان سے آزاد رہنے کی یہ کوشش، ان کے تحقیقی کاموں میں پختگی کا سبب بنی اور اس سے مستشرقین کے بارہ میں شک وشبہ کے ازالہ میں بھی مدد ملی۔

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کو مستشرقین نے کئی زبانوں میں شائع کیا ہے، اور اس میں اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر دی ہیں، تاہم چند در چند تحریفات اور غلط مباحث کے باوجود وہ مسلمانوں کے لیے بھی ایک اہم علمی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

بہر حال وجہ کچھ بھی ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ مستشرقین نے اپنی تحقیقات کے ذریعہ علوم اسلامیہ کی ترقی میں قابل قدر حصہ لیا ہے، اور ان میں اضافہ، نظر ثانی اور معترضانہ مباحث کے ذریعہ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے، ان میں سے چند دیانت دار مستشرقین نے عالم اسلام اور مغربی دنیا کے علمی ماحول پر گہرا اثر ڈالا ہے، مثلاً کلود اتیان سافاری Claude Etienne Savary) نے قرآن مجید کے اپنے ترجمہ کے مقدمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا احترام وتعظیم کے ساتھ ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک ایسے عالمی مذہب کی بنیاد ڈالی جو سادہ عقیدہ پر مشتمل ہے، ایک اللہ پر ایمان جس کو عقل تسلیم کرتی ہے، وہ نیکی پر جزا اور بدی پر سزا دیتا ہے، مغرب کا کوئی روشن خیال محمد کی نبوت کو تسلیم نہ کرے تب بھی وہ ان کو تاریخ انسانی کے عظیم ترین افراد میں شمار کرنے پر مجبور ہے۔"[1]

اسی طرح انگریز مستشرق تھامس کارلائل اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ

اس زمانہ میں ایک پڑھے لکھے آدمی کے لیے یہ بات شرمندگی اور عیب کا باعث ہوگی اگر وہ اس خیال کی طرف توجہ کرے کہ "دین اسلام غلط ہے اور محمد ایک فریب

---

[1] Le coran. 2, ed Paris 1783

شخص تھے، کیونکہ انھوں نے جو پیغام دیا وہ بارہ صدیوں سے ہمارے جیسے کروروں
لوگوں کے لئے روشن چراغ بنا ہوا ہے، ان لوگوں کو اسی اللہ نے پیدا کیا ہے جس نے
ہم کو پیدا کیا ہے، کیا یہ بدگمانی کی جا سکتی ہے کہ محمدؐ نے اپنی زندگی میں جو پیغام دیا۔
جس پر کروروں آدمی عمل کرتے رہے وہ محض ایک فریب تھا۔ جہاں تک میرا
تعلق ہے تو یہ خیال کبھی میرے ذہن میں پیدا نہیں ہو سکتا ہے۔
..... اگر اللہ کی مخلوق میں غلط بیانی اور فریب کو اس قدر شہرت حاصل ہونا
ممکن ہو اور انسانی عقل اس کو اس قدر آسانی سے قبول کر لیتی ہو تو اس کا مطلب تو
یہ ہوا کہ تمام انسان بے وقوف ہیں، زندگی کا یہ سارا کھیل عبث اور بے معنیٰ ہے۔
اس سے کہیں زیادہ بہتر تو یہ تھا کہ ایسی زندگی کا وجود ہی نہ ہوتا۔"[۱]

کارلائل نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا جائزہ لیکر آپ کے نبوغ و کمال کے مختلف
پہلوؤں پر وحی کے اثرات کی نشاندہی کی ہے، اور پھر اس نے اپنی بحث و گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ کیا
ہے، کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دوسرے عظیم اور مومن افراد کی طرح اپنی دعوت میں مخلص اور
اپنے عقیدہ میں سچے تھے۔

تحریک استشراق نے کلیسا کی نگرانی اور رہنمائی میں ترقی کی ہے، اس نے سامراج کے
سیاسی، تہذیبی اور فوجی مقاصد کی تکمیل میں اہم رول ادا کیا ہے، اس نے اپنی جدوجہد سے
محکوم قوموں میں اپنے مذہب اور تہذیب کی طرف سے بے اعتمادی پیدا کی ہے لیکن اس کے
باوجود تحریک استشراق کا ایجابی پہلو بھی قابل قدر ہے، مستشرقین نے یورپ کی پبلک لائبریریوں میں

---

[۱] Thomas Garlyle on Heroes Heroes-Wors-hip and The Heroic in History - London - 1949

عربی کتابوں کی تنظیم تو کی، ان کی فہرستوں کو مرتب کیا، تحقیق و اشاعت کے لیے اہم قلمی نسخوں کی دریافت کی، انھوں نے بعض جزئی مسائل پر تحقیق کے لیے بھی لائق علماء کو مقرر کیا، جنھوں نے طویل صبر آزما جد و جہد کے بعد خاص خاص موضوعات پر یکسو ہو کر اپنے تحقیقی نتائج کو شائع کیا، ان میں سے بعض مستشرقین نے تو ان ہی تحقیقات کی بنا پر شہرت پائی، چنانچہ ماسینیون (Massignon) کو حلاج پر اور لاؤوسٹ (Laoust) کو ابن تیمیہ پر اپنے تحقیقی کاموں کی وجہ سے شہرت حاصل ہوئی۔

نولدیکی (Noeldeke) بلاشیر (Blachere) جیفرے (Jeffray) اور گولڈ زیہر (Goldziher) کو قرآن اور علوم قرآن کے مطالعہ کی وجہ سے شہرت ملی، اس پر ان میں سے ہر ایک نے کئی کئی کتابیں لکھیں، ان علمی خدمات کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے، ان کے یہاں جو پہلو قابل قدر ہیں ان کا اعتراف ضروری ہے، اور جہاں ان سے غلطیاں سرزد ہوئی ہیں ان کی نشاندہی اور تردید ہونی چاہیے۔

قرآن مجید پر مستشرقین کے مطالعہ و تحقیق کا جائزہ ... وقت کی ایک اہم ضرورت ہے، اس طرح ہم ان اعتراضات سے بھی واقف ہونگے جو مستشرقین نے قرآن مجید پر کیے ہیں۔ اور خالص علمی طریقہ پر ان کی تردید اسلام اور قرآن مجید کی ایک بڑی خدمت تصور کی جائے گی۔

اب ہم قرآن مجید پر مستشرقین کی تحقیقات کا تنقیدی جائزہ لیں گے تاکہ ان کی واقعی قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکے، اس کے علاوہ مستشرقین نے قرآن مجید کے بارے میں جن الزامات یا شبہات کا ذکر کیا ہے، ہم ان پر بھی اپنے خیالات درج کریں گے، یہ قرآن اور اسلام کی خدمت ہوگی، اور اس سچائی کی بھی خدمت ہوگی جس کے نام پر مستشرقین نے اپنی علمی جد و جہد کا آغاز کیا ہے۔

قرآن کا سرچشمہ | مسلمانوں کے درمیان اس مسئلہ میں باہم کوئی اختلاف نہیں ہے کہ قرآن مجید

قلب رسولؐ پر وحی کے ذریعہ نازل ہوا ہے، اللہ تعالیٰ ہی اس کلام کے متکلم ہیں،
چنانچہ مختلف آیتوں میں ضمیر متکلم ذات الٰہی ہی کی طرف اشارہ کرتی ہے، مثلاً

نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ وَشَدَدْنَآ   ہم ہی نے انسانوں کو پیدا کیا ہے

اَسْرَهُمْ (دھر - ۲۸)   اور ہم ہی نے انکے جوڑ بند مضبوط کئے ہیں'

دوسری آسمانی کتابوں کے مقابلہ میں قرآن کا امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنے لفظ و معنی دونوں کے اعتبار سے ربانی ہے، بائبل (عہد عتیق اور عہد جدید) میں نبی کے پاس جو وحی آتی وہ اسے اپنے الفاظ میں لوگوں تک پہنچاتا جیسا کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی قوم کہکر اور حضرت عیسیٰؑ نے اپنا بھائی کہکر لوگوں سے خطاب کیا،

قرآن مجید میں اللہ کی موجودگی ضمیر متکلم کے ذریعہ پائی جاتی ہے، جب کہ تورات وانجیل میں اللہ مخاطب کی حیثیت سے موجود ہے، جس کی طرف دعا و مناجات میں توجہ کی گئی ہے' یا وہ ایسی غائب ہستی ہے جس کے بارے میں بیانیہ انداز یا تعارفی طریقہ اختیار کیا گیا ہے تاکہ لوگ اس سے متعارف ہوں اور لوگوں کو اس کی طرف دعوت دی جائے، دوسری آسمانی کتابوں میں یہ امتیاز صرف قرآن ہی کو حاصل ہے کہ وہ کلمۃ اللہ (اللہ کا بول) ہے۔
اس میں اللہ نے نئے اور انوکھے انداز سے پیرایہ بدل بدل کر بار بار فصاحت و بلاغت کے ماہرین کو یہ چیلنج کیا ہے کہ وہ اس کی طرح کوئی ایک سورت ہی پیش کریں، لیکن تقریباً تمام ہی مستشرقین اس بات پر متفق ہیں، کہ قرآن اللہ کی طرف سے منزل نہیں ہے، اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کا مواد یہودی عالموں اور عیسائی راہبوں کے ذریعہ حاصل کیا تھا جن سے وہ عہد عتیق اور عہد جدید کی دینی معلومات حاصل کیا کرتے تھے۔

دراصل قرآن مجید کے سرچشمہ کی جستجو کا مسئلہ بنیادی طور پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے

اقرار سے وابستہ ہے، اس لئے کہ آپ کی نبوت سے انکار کا ایک ہی نتیجہ ہوگا، اور وہ ہے قرآن کا انسانی کلام ہونا لہٰذا ہم کو اسی نکتہ پر اپنی توجہ مرکوز کرنی ہوگی،

اسلامی عقیدہ کے مطابق نبی وہ ہے جس کی طرف اللہ نے اپنی وحی بھیجی ہے، اس وحی کی تبلیغ کا حکم بھی دیا گیا ہو تو وہ شخص رسول ہے، جو اللہ کی طرف سے خبر پاتا اور اس خبر کو اللہ سے پاکر دوسروں تک پہنچاتا ہے، جو وحی اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاری وہ آپ کی بلند نفسیاتی استعداد سے ابل پڑنے والا الہام نہ تھا، نہ یہ کہا جاتا کہ آپ کے معلومات، خیالات اور آرزوؤں نے آپ کی باطنی عقل یا روحانی نفس سے ابل کر قوت خیالیہ میں ... آپ کے لیے الہامات پیدا کر دیئے ہیں، یا یہ کہ آپ کا یقین واعتقاد ہی نگاہوں کے سامنے منعکس ہو گیا ہے، چنانچہ آپ نے اپنے سامنے ایک فرشتہ کو کھڑا ہوا دیکھا، یا وہ اعتقاد گوش گزار ہوا، جس کی وجہ سے آپ نے فرشتہ کی باتوں کو یاد رکھا، کچھ مستشرقین نے اپنے قیاسات کی مدد سے ایسا ہی منظر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

ہمارے اور مستشرقین کے درمیان اختلاف کی بنیاد یہی ہے، کہ وحی نبی کے پاس باہر سے آتی ہے، وہ اس کی داخلی کیفیات سے پیدا نہیں ہوتی، اور پھر یہ بات کہ خارج میں بھی روحانی فرشتہ موجود ہے، جو حقیقت میں اللہ کی طرف سے آکر، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔[1] جیسا کہ اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے کہ

وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ	اور قرآن رب العالمین کا بھیجا ہوا
نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ	ہے، اس کو امانت دار فرشتہ
عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ	لیکر آیا ہے آپ کے قلب پر صاف

---

[1] محمد رشید رضا ۔ الوحی المحمدی :- ۳۹ - ط مصر ۱۹۳۵ء

بلسانٍ عربیٍ مبین۔ عربی زبان میں، تاکہ آپ (بھی)
(شعراء ۱۹۲ تا ۱۹۵) متنبہ کرنے والوں میں سے ہوں۔

نبی کی طرف وحی آتی ہے، وہ اس یقین سے سرشار اور مطمئن ہوتا ہے کہ یہ وحی خواہ بالواسطہ ہو یا براہ راست، سنی جانے والی آواز کے ذریعہ ہو، یا بغیر آواز کے، وہ یقیناً اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

باب نبوت کسی کے لیے کھلا ہوا نہیں ہے، کسی... کی اختراعی قوت خواہ کتنی ہی زبردست ہو یا اس کے نفس کو، ریاضتوں نے کتنی ہی بلندیوں تک پہنچا دیا ہو، مگر نبوت انسان کی ذاتی صلاحیتوں اور نفس کی ریاضتوں سے بلند تر ہے، وحی اپنے صحیح اور مذہبی مفہوم کے لحاظ سے ایک روحانی شی ہے، جس کے ذریعہ اللہ اپنے بندوں میں سے ان ہی کو ممتاز کرتا ہے جنھیں وہ نبوت کے لیے چن لیتا ہے، اور اس نبوت کے ذریعہ ان کا اللہ سے جو تعلق پیدا ہوتا ہے، وہ نہ حلول کا ہے اور نہ ہی اتحاد کا، اس کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ اس طرح وہ اس کی ہدایات کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے ذمہ دار ہو جائے۔

مسیحیت کے نزدیک غالباً وحی کے معنی، روح الہی کے اس فرد میں تحلیل ہو جانے کے ہیں، جس کی طرف وحی نازل کی گئی ہے، وہ مسیحؑ کو حلول کے اس عقیدہ ہی کی وجہ سے تو الہٰ قرار دیتے ہیں کیونکہ جس کی ذات میں روح الہی حلول کر جائے وہ الہٰ بن جائے گا۔ اسلام اس مفہوم کی قطعی طور پر نفی کرتا ہے، اس لئے کہ اللہ کی ذات نہ اپنے غیر میں حلول کرتی ہے، اور نہ ہی خدا کی ذات میں کوئی غیر حلول کر سکتا ہے۔

کچھ مستشرقین وحی اور نبوت کے بارے میں اس ڈھنگ سے باتیں کرتے ہیں جیسے کہ وہ درویشی یا درویشیوں کے بارے میں باتیں کرتے ہوں یا ماہرین نفسیات

عظیم افراد، تاریخی ہیروز اور انقلابی رہنماؤں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوں، یا جس طرح کہ بعض خاص خاص افراد، آنکھوں یا کانوں کی مخصوص داخلی خصوصیات کی وجہ سے ممتاز ہو جاتے ہیں، اور ایسی آوازیں سن لیتے یا ایسے مناظر دیکھ لیتے ہیں جن کو عام انسان اپنی سماعت یا بصارت کی گرفت میں نہ لے سکتے ہوں اس طرح کے حالات و واقعات ہی کی روشنی میں انسانوں نے مذہبی تجربات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے[۱]

وحی قرآنی کے بارے میں مستشرقین کے درج ذیل اقوال سے ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے ا۔

جرمن مستشرق ہوبرٹ گرمی (Hubert Grimme) اپنی کتاب[۲] "محمدؐ" میں لکھا ہے۔

محمدؐ ابتدا میں کسی نئے دین کے داعی نہ تھے، وہ ایک نوع کی اشتراکیت کی طرف دعوت دیتے رہے۔ اسلام کو اس کی اصل ابتدائی شکل میں سمجھنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم اس سے پہلے کے کسی دین پر نظر ڈالیں جو اسلامی تعلیمات کی وضاحت میں معاون ہو، کیونکہ اسلام کا براہ راست مطالعہ ہمیں اس نتیجہ تک پہنچاتا ہے کہ وہ ایک دینی عقیدہ کے بجائے ایسی اجتماعی اصلاحی جد و جہد کی صورت میں سامنے آیا، جس کے پیش نظر بگڑے ہوئے حالات میں تبدیلی، اور خصوصاً حریص دولت مندوں اور پریشان حال غریبوں کے درمیان واضح فرق کو مٹانا تھا، یہی وجہ ہے کہ ہم ان کو ضرورت مندوں کی مدد کے لئے، ایک متعین ٹیکس عائد کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ وہ اپنی دعوت کی تائید اور لوگوں پر نفسیاتی دباؤ ڈالنے کے لیے

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز ط ۱۹۵۰ء جلد ۱۳ ص ۲۳۰

[۲] Mohamed. 1892

اُخروی محاسبہ کے نظریہ کو استعمال کرتے رہے[1]

گرمی، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اشتراکیت کا داعی اور ایک اجتماعی مصلح ثابت کرنے کے لئے کس قدر سادہ دلی سے نبوت کی نفی کر رہا ہے دلیل و ثبوت کے بغیر نبوت کی واضح علامتوں سے صرف نظر کرنا کس قدر غیر علمی بات ہوگی، اس پر شاید اس نے زیادہ غور نہیں کیا۔

انگریز مستشرق گب (Gibb) جو امریکہ کی ہارڈ یونیورسٹی میں عربی زبان و ادب کے مطالعاتی شعبہ میں پروفیسر تھے۔ لکھتے ہیں[2] کہ

"محمدؐ نے ہر ایک انوکھی شخصیت کی طرح اگر ایک طرف اپنے گرد و پیش کے خارجی ماحول کا اثر قبول کیا تو دوسری طرف انھوں نے اپنے زمانہ کے عقائد و افکار سے اور ان خیالات کی مدد سے جن میں ان کی نشو و نما ہوئی تھی ایک نئی راہ نکال لی' مکہ کے اس زمانہ کے ماحول کا اثر، محمدؐ کی زندگی کے ہر دور میں نمایاں ہے، دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ محمدؐ کامیاب ہوئے، کیونکہ وہ مکہ ہی کے ایک فرد تھے۔"

گب نے یہ بھی لکھا ہے کہ "یہ بات بھی واضح ہے کہ اہل مکہ کی طرف سے محمدؐ کی مخالفت کی وجہ قدیم روایات سے ان کی وابستگی نہ تھی، اور نہ ہی یہ بات کہ محمدؐ پر ایمان لانے سے انھیں کوئی دلچسپی نہ رہی ہو، اس مخالفت کے پس پردہ زیادہ تر سیاسی و اقتصادی اسباب کار فرما تھے،

گب کی مذکورہ بالا رائے پڑھنے کے بعد ہمیں اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ جو شخص تاریخ دیر کے متفقہ بیانات سے اختلاف کرنے کی جرأت کرتا ہو، اور وہ اطمینان بخش دلیلیں نہ پیش کر سکے اس کے لیے اپنے نجی خیالات اور ذاتی رجحانات سے آزاد ہو کر بحث و تحقیق کرنا ممکن نہیں ہے۔

---

[1] محمد کامل عیاد - مجلہ مجمع اللغۃ العربیہ دمشق - ج ۴۴ - ۴۴ - اکتوبر ۱۹۶۹ء ص ۹۰۲،

[2] Mohomedanismism P. 27

درمنگھم نے اپنے تخیل کی مدد سے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں خوبصورت شاعرانہ اسلوب میں اپنے داخلی احساسات کو قلمبند کیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک نبی و رسول کے بجائے، کسی فطری آرٹسٹ یا کسی پیدائشی عبقری کی تصویر پیش کر رہا ہو، وہ لکھتا ہے کہ۔

"موسم گرما کی صحرائی راتوں میں یہ بے شمار تارے خوب دمک رہے ہیں، آدمی یہ سوچنے لگتا ہے کہ شاید وہ ان کی روشنی کی آہٹ سن رہا ہو یا شاید دہکتے ہوئے انگاروں نے کوئی ساز چھیڑ دیا ہو۔

سچ تو یہ ہے کہ آسمان میں داناؤں کے سمجھنے کے لیے کچھ راز پنہاں ہیں، اور عالم میں کچھ حقیقتیں پردہ کئے ہوئے ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ سارا عالم ہی ایک غیب ہے، کیا یہ ممکن نہیں کہ انسان اپنی آنکھیں کھول کر سب کچھ دیکھ لے، وہ اپنے کانوں کو متوجہ کرے اور پھر سن لے، حق کو دیکھے اور نہ فنا ہونے والی آوازوں کو سن لے، انسانوں کے پاس آنکھیں تو ہیں، مگر وہ دیکھ نہیں سکتیں، کان ہیں مگر وہ نہیں سنتے، لیکن ان کا (محمدؐ) خیال یہ ہے کہ وہ دیکھتے اور سنتے ہیں، آسمان کے پردہ میں جو آوازیں گونج رہی ہیں، کیا، ان کی طرف دھیان دینے کی تھیں بھی ضرورت ہے۔؟ اس کے لیے تو ایسا ہی دل چاہیئے جو مخلص ہو اور ایمان سے لبریز ہو۔"[۵]

مستشرقین کے ان اقوال سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں، کہ وہ وحی اور نبوت کی حقیقت سے ناواقف ہیں، ان دونوں کے درمیان باہمی رشتہ کو سمجھے بغیر جو شخص اپنے نظریات اور تجرباتی علوم کی مدد سے وحی اور نبوت کو جانچنے کی کوشش کرے گا۔ وہ وحی اور نبوت کی حقیقت سے بے گانہ ہی رہے گا۔ وحی آسمانی پر ایمان لانے والوں اور اس کو تسلیم نہ کرنے والوں کے درمیان اختلاف کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ دونوں کے نزدیک وحی کا مفہوم جداگانہ ہے۔

---

[۵] محمد رشید رضا۔ الوحی المحمدی۔ ص ۹۱۔

جدید و قدیم علمائے دین اور فلاسفہ نے اس مسئلہ پر بحث و تحقیق کے بعد وحی کے وجود کو تسلیم کیا ہے، انھوں نے شرعی مفہوم کے مطابق وحی کے امکان پر دلیلیں پیش کی ہیں اور وحی سے انکار کرنے کے لیے جو شبہات اور دعوے کئے گئے ہیں، انھوں نے ان میں سے ہر ایک کا جواب دیا ہے، اب وحی آسمانی کے بارے میں تحقیق نے یہ بات متعین کر دی ہے کہ وہ مقدس چیز ہے، اور ایسی سچائی ہے جس میں باطل کی آمیزش نہیں ہو سکتی۔

مستشرقین نے نفسیاتی تجزیہ کے ذریعہ وحی الہٰی کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، وحی کی آمد کے موقع پر نبی جسمانی بشریت سے جدا ہو کر اور روحانی پیکر میں جس مخصوص کیفیت سے دوچار ہوتا تھا، مستشرقین نے اس کو جنون کی ایک قسم قرار دیا ہے، یہ خیال حقیقت نبوت سے تمام تر ناواقفیت کی پیداوار ہے، کیا کسی ایک علم کے اصول و معیار دوسرے علوم کے لیے بھی استعمال کئے جا سکتے ہیں، علمی بحث و تحقیق کا کوئی بھی طریقہ اس قدر ترقی یافتہ نہیں ہے کہ اسے اپنے حدود سے باہر بھی معیار تسلیم کیا جا سکتا ہو، گستاف لیبان اسلام، نبی کی شخصیت اور قرآن پر اپنی متوازن تحریروں کے لیے ممتاز اور معروف ہے۔ لیکن کوئی بھی مذہبی عالم، اس فرانسیسی مستشرق کے درج ذیل خیال سے اتفاق نہیں کر سکتا کہ

> "ایک خیال یہ ہے کہ محمدؐ پر صرع کا اثر تھا، لیکن اس بات کا قطعی فیصلہ کرنے کے لیے مجھے، تاریخ عرب میں کوئی دلیل نہیں ملی، ان کے ہم عصر لوگوں سے جن میں ایک عائشہؓ بھی ہیں، صرف یہ معلوم ہو سکا ہے کہ محمدؐ پر جب وحی آتی تو پیشاب رک جاتا، سخت وباؤ محسوس کرتے، دہن سے لعاب ظاہر ہو جاتا۔ لیکن ہر دیوانہ کی طرح، اگر تم محمدؐ کی اس ذہنی کیفیت کو نظر انداز کر کے دیکھو تو تم ان کو عقل و فہم کے لحاظ سے پختہ اور فکری اعتبار سے سلامت رو پاؤ گے۔"

گستاف لیبان کا یہ بھی خیال ہے کہ

علمی نقطۂ نظر سے محمد صلعم کو ان کی وارفتگی مزاج کے باوجود سب سے بڑا بانی مذہب تسلیم کرنا ہوگا، ان کے مرض کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے، اس لئے کہ بانیانِ مذاہب میں تمام مفکرین صرف بارد مزاج والے ہی نہ تھے، پریشان دماغی سے دوچار ہونے والوں اور دیوانگی سے متاثر لوگوں نے بھی یہی کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے مذاہب کی بنیاد ڈالی، حکومتوں کا خاتمہ کیا، انسانی گروہوں میں جوش و ولولہ پیدا کیا، اور انسانوں کی قیادت کی ہے، اگر اس دیوانگی کے بجائے دنیا پر عقل کو سیادت ملتی تو تاریخ انسانی کسی دوسری صورت میں ظاہر ہوتی۔[1]

کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مجذوب اور وارفتہ مزاج قرار دینا، لیبان کا ایک بے سروپا دعویٰ نہیں ہے، نبوت سے پہلے یا اس کے بعد کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا، جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مجذوبیت کا اثر تھا، یا آپ عام انسانی خصائص سے الگ مزاج وطبیعت رکھتے تھے، یا کسی طرح کی نفسیاتی کجی سے دوچار تھے، اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو اس کا اثر اور ردعمل آپ کی زندگی کے مختلف حالات اور واقعات میں بھی ضرور نظر آتا۔

غارِ حرا میں پہلی وحی کے موقع پر، جب آپ نے کچھ خوف محسوس کیا تو اس وقت حضرت خدیجہؓ نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے کیا کہا تھا؟ وہ تو آپ کی پوری شخصیت سے واقف تھیں۔ انھوں نے یہ کہا کہ

"آپ ہرگز پریشان نہ ہوں، اللہ آپ کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا۔

---

[1] دیکھئے لیبان کی کتاب حضارۃ العرب (عربی ترجمہ - زعیتر) ص ۱۲۵-۱۲۱ - ط بیروت ۱۳۹۹ھ

آپ تو رشتہ کا حق ادا کرتے ہیں، دوسروں کا بوجھ اٹھاتے، مفلس کی اعانت کرتے، مہمان کی خاطر کرتے اور حق پر آئی ہوئی مصیبتوں میں ہر ایک کا سہارا بنتے ہیں، (بخاری)

حضرت خدیجہؓ کے بیان سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے انسانی کمال کی جو تصویر ابھرتی ہے۔ اس کو ایسے جنون سے کیا نسبت ہے، جو ...... عجیب وغریب کرتب دکھاتا ہو، اور ایسی حرکتوں کا باعث ہو جو ذوق سلیم پر گراں گذرتی ہوں۔[1]

لیبان کی رائے حقیقت دین سے بے خبری، اور تنقید علمی کے طریق استعمال سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے، انسان اپنے اختیار سے جو حرکتیں کرتا ہے، امام غزالی نے ان کی تین قسمیں[2] بیان کی ہیں، ان میں سے دو قسموں کا زیر بحث مسئلہ سے تعلق ہے، اور وہ یہ ہیں۔

فکری حرکت جو حق اور باطل سے تعلق رکھتی ہے۔

قولی حرکت جو صداقت اور دروغ سے تعلق رکھتی ہے۔

تینوں حرکتوں سے پیدا ہونے والی صفات حق، صداقت اور خیر جب کسی ایسے شخص میں پائی جائیں، جس کو اللہ نے آسمانی پیغام کے لیے چن لیا ہو، اور غور وفکر اور تحقیق واستقرا کے بعد، یہ بھی ثابت ہو جائے کہ ان کے برعکس باطل، دروغ اور شر کی صفات اس میں نہیں ہیں، ان تمام باتوں کی اس شخص کے سوانح اور تاریخی واقعات سے تواتر کے ساتھ تصدیق ہوتی ہو، تو ایسی صورت میں اس پر نزول وحی سے انکار کی کوئی وجہ نہیں، اس وحی کو باطنی الہام کہہ کر نظر انداز کرنا بھی درست نہ ہوگا۔

ایسے شخص کی نبوت کا انکار کرنے والے جب یہ کہتے ہیں کہ وہ حکما، مصلحین، قانون ساز

---

[1] التہامی نقرہ - سیکولوجیۃ القصۃ فی القرآن۔ ص ۵۵ - ط تونس ۱۹۷۱ء [2] امام غزالی نے نبوت اور وحی کے بارے میں معروضی انداز میں بڑی تفصیل سے بحث کی ہے دیکھیے المنقذ من الضلال۔

رر حکومتوں کے بانیوں، سیاسی رہنماؤں اور اجتماعی لیڈروں کی صف اول میں شمار ہونے کے لائق ہے، تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ شاید جلد ہی اسے الٰہ قرار دے دیں گے، کیونکہ انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو بھی بالآخر الٰہ بنا ڈالا یہ بلند صفات جن کا وہ تذکرہ کرتے ہیں کسی عبقری میں دیکھی نہیں ہوئیں،

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ - (انعام - ۵۰)	آپ کہدیجئے کہ نہ تو میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میرے پاس خدا تعالےٰ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کو جانتا ہوں اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں میں تو صرف جو وحی میرے پاس آتی ہے اس کا اتباع کرتا ہوں۔

اگر کسی کو ڈاکٹر یا انجینیر ہونے کا دعوی ہو تو حقیقی صورت حال سے اس کے دعوی کی تصدیق یا تردید ہو جائے گی۔ رسول اللہ صلعم پر چودہ صدیوں میں قائدانہ صلاحیتوں کے جو مفکرین ایمان لائے ہیں، اور انھوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کردہ دین کی پیروی کی، کیا وہ سب فریب خوردہ اور نادان تھے، کہ سچ اور جھوٹ اور حق و باطل میں تمیز نہ کر سکے؟ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ذریعہ سے جو بنیادی انقلاب آیا اس کی اطمینان بخش توجیہ کے لیے تنہا علم کافی نہیں ہے، اس کے لیے ایمان کی روشنی درکار ہے کیونکہ اس انقلاب کے پس پردہ وہ وحی آسمانی ہے جس کا سلسلہ ۲۰ برس سے زیادہ عرصہ تک جاری رہا، اس دوران میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو وعدے کئے، غیب کی جو خبریں دیں وہ حرف بحرف پوری ہوئیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آتی اور

وحی کی آمد پر آپ کو بوجھ اور تھکن کا جو احساس ہوتا تو دورِ جاہلیت کے مشرکین اسے جنون یا سحر کا نام دیتے، ان میں اور دورِ جدید کی اکاڈمیوں میں کام کرنے والے مستشرقین کے درمیان کیا فرق ہے، جب کہ یہ مستشرقین بھی نفسیاتی نقطۂ نظر یا عقلِ باطن کے حوالہ سے یا لیبان کے بقول دیوانگی کے لفظ سے وحی آسمانی کی ترجمانی کرتے ہیں، لیبان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازدواجی زندگی کو بھی نہیں سمجھ سکا، اس کو وہ خواہش نفسانی کا نتیجہ قرار دیتا ہے اور اس پر اس نے اپنے فاسد خیالات کی بنیاد رکھی ہے۔ وہ قرآن مجید کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبقریت کی دلیل مانتا، اور اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تصنیف قرار دیتا ہے، لیکن قرآن مجید کو ہندوں کی مذہبی کتابوں سے فروتر سمجھتا ہے۔ اور لکھتا ہے کہ

> "قرآن مجید کا عمومی انداز بیان اور اس کے طفلانہ لاہوتی بیانات آسمانی مذاہب کا خاصہ ہیں، مگر ان کو ہندوؤں کے فکر و فلسفہ پر قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا۔" [۱]

وہ قرآن مجید کی جامعیت و کمال کا بھی منکر ہے، اس کا خیال ہے کہ قرآن کی افادیت محدود اور وقتی تھی، بعد کی صدیوں میں وہ انسانی ضرورتوں کی تکمیل سے قاصر رہا، وہ قرآن مجید کو مسلمانوں کی پسماندگی کا سبب قرار دیتا ہے۔[۲]

(باقی)

---

[۱] حضارۃ العرب۔ ص ۷۰۔ [۲] ایضاً۔ ص ۷۰۔ ۷۳۔

سیرۃ النبیؐ جلد سوم پر ایک نظر

از ضیاء الدین اصلاحی

(۳)

شکوک و شبہات کا جواب | شکوک و اعتراضات کا جواب سیرۃ النبیؐ کا بنیادی مقصد ہے، چنانچہ اس کی تمام جلدوں میں بحث و جدال اور مناظرانہ انداز اختیار کئے بغیر غلط خیالات و نظریات کی تردید و تصحیح کی گئی ہے، سیرت کی اس جلد میں بھی اس کی بکثرت مثالیں موجود ہیں، اوپر اس کی بعض مثالیں گذر چکی ہیں، ابھی مسئلہ اسباب و علل کے بارہ میں بھی دو باطل اور افراط و تفریط پر مبنی نظریے کی مفصل تردید گذری ہے، ذیل میں چند اور بحثوں کی جانب بھی توجہ دلائی جاتی ہے۔

کفار کے اس بار بار کے اصرار سے کہ پیغمبرؐ ہم کو معجزہ کیوں نہیں دکھاتے۔ بعض نادان یہ سمجھتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ نے ان کو کوئی معجزہ نہیں دکھایا، اگر وہ معجزہ دیکھ چکے ہوتے تو بار بار اس کے لیے اصرار کیوں کرتے ؟ مولانا سید سلیمان ندویؒ اس استدلال کو سرتاپا غلط ثابت کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ کفار کو نفس معجزہ مانگنے پر نہیں بلکہ مادی اور ظاہری معجزات طلب کرنے پر تنبیہ کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ نشانیوں کے ظاہر ہونے کے بعد بھی یہ عناد سے طلب معجزہ پر مصر ہیں، چنانچہ ان تمام مقامات میں جہاں کفار کی اس طلب معجزہ کا ذکر ہے یہ تصریح موجود ہے، اور انھیں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ان

خوارق سے انھیں تسلی نہ ہوگی، ان کو چاہئے کہ نبوت کے اصلی آثار وعلامات کی جانب توجہ کریں کہ سعادت مند دلوں کی تسلی ان ہی سے ممکن ہے، اس سلسلہ میں وہ بعض قرآنی آیتوں کا حوالہ دیتے ہیں، جن میں کفار کے معجزہ طلب کرنے کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے نبوت کے اصلی آثار وعلامات کی جانب ان کی توجہ مبذول کرائی ہے، اور بتایا ہے کہ ہم نشانیاں کھول کر بتا چکے ہیں، لیکن ان نشانیوں سے وہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، جو اہل یقین ہیں، اور جو ہر امر میں شک کرتے ہیں، ان کا علاج صرف دوزخ ہے، (بقرہ - ۱۴) ایک اور جگہ معجزات کی طلب پر گذشتہ قوموں کے واقعات کا جو اگلی کتابوں میں مذکور ہیں، حوالہ دیا گیا ہے کہ دیکھ لو ان کا کیا حشر ہوا جنھوں نے معجزوں کو دیکھ کر بھی ایمان قبول نہیں کیا (طٰہٰ - ۸) (ص ۲۲۴ و ۲۲۵) وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ معجزات ایک وقتی چیز ہیں جو دنیا کے دوسرے حوادث کی طرح فنا ہو جاتے ہیں، اس بنا پر اگر ہر معاند کے سوال پر پیغمبر معجزہ ہی دکھاتا رہے تو یہ تسلسل شاید کبھی ختم نہ ہو اور پیغمبر کی زندگی صرف ایک تماشا گر کی حیثیت اختیار کرلے، اس لیے ظاہری معجزہ طلب کرنے والوں کو دائمی اور مسلسل معجزہ کی طرف ملتفت ہونے کی تاکید ہوتی ہے۔ (ص ۲۳۶)

پھر سید صاحبؒ ثابت کرتے ہیں کہ معاندین معجزات کے ظہور کے بعد بھی ایمان نہیں لاتے، انھیں یہ یقین ہوتا ہے کہ ہماری طرح کا ایک مدعی انسان کبھی معجزہ دکھلانے پر قادر نہیں ہو سکتا، اس لئے وہ کوئی خارق عادت امر پیش نہ کرے گا۔ اس طرح اس کی سبکی اور رسوائی عالم آشکارا ہو جائے گی، لیکن قدرت الٰہی آخری حجت کے طور پر ان کے سامنے معجزات اور خوارق عادت بھی پیش کر دیتی ہے، تاہم ان کو دیکھ کر بھی معاندانہ روح ان کے دلوں میں پیغمبروں کی سچائی کا اعتبار نہیں پیدا ہونے دیتی اور وہ اسے خدائی قدرت کا کرشمہ سمجھنے کے بجائے شیطانی عمل اور سحر و جادو قرار دیتے ہیں، حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو متعدد معجزے دکھائے مگر ہر ایک کے جواب میں انھیں یہی سننا پڑا کہ تم جادوگر ہو۔ حضرت موسیٰؑ کے معجزۂ عصا کو دیکھ کر مصر کے جادوگر سجدے میں گر گئے، اور حضرت موسیٰؑ کی پیغمبری کے

یہاں لے آئے، مگر فرعون یہی کہتا رہا: "یہ موسیٰ تم سب کا بڑا جادوگر ہے، جس نے تم کو جادو سکھایا (ص ۲۳۳)

انجیل کے بیان کے مطابق حضرت عیسیٰ نے سب سے زیادہ معجزات دکھائے لیکن

ہر معجزہ کے وقت دو جماعتیں ہو جاتی تھیں ایک معتقدین کی جو یقین کرتی تھی کہ یہ خدا کی طرف سے ہے اور

دوسری کہتی تھی کہ یسوع کے ساتھ شیطان رہتا ہے، انھوں نے متعدد دفعہ لوگوں سے کہا کہ تم

معجزات دیکھتے ہو مگر ایمان نہیں لاتے۔ (ص ۲۳۸)

کفار قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزوں کے طالب ہوتے تھے مگر جب معجزے دیکھتے

تھے تو کاہن اور جادوگر کہتے تھے، غرض معاندین بڑی سے بڑی نشانی دیکھ کر بھی شک و شبہ کے

گرداب سے نہیں نکلتے تھے، اور معجزات کے ظہور کے بعد بھی ان کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی تھی (ص ۲۳۹، ۲۴۰)

غرض کفار و معاندین کے اس اصرار سے کہ پیغمبر ہم کو معجزہ کیوں نہیں دکھاتے یہ ثابت نہیں

ہوتا کہ پیغمبر اسلام نے ان کو سرے سے کوئی معجزہ ہی نہیں دکھایا، تمام انبیاء کی سیر میں شہادت

دیتی ہیں کہ ان سے معجزات صادر ہونے کے بعد بھی معاندین اپنے انکار و اعراض پر نہایت استقلال

کے ساتھ قائم رہے، اور ان کا انکار ایمان سے مبدل نہ ہوا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے معاندین

کو بھی نشانیاں دکھائی جاتی تھیں، مگر انھیں عناد کی کور باطنی کے باعث ان سے تسکین نہیں ہوتی

تھی، چنانچہ کفار قریش کے حال میں قرآن مجید کا بیان ہے۔

"ان کے پاس خدا کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی نہیں آتی لیکن وہ اس سے

اعراض کرتے ہیں، حق ان کے پاس آیا تو انھوں نے اس کو جھٹلایا تو عنقریب جس چیز

کا مذاق اڑاتے ہیں، اس کی حقیقت ان کو معلوم ہو جائے گی، (انعام - ۱) ص ۲۴۰، ۲۵۱)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معجزے نہ دینے کے متعلق شکوک اور اس میں تاخیر کے اسباب

ہم پہلے قلمبند کر چکے ہیں،

معجزۂ شق القمر کے متعلق پہلے سید صاحب نے قدیم اعتراض وجواب کو نقل کیا ہے، (ص ۵۶۳ تا ۵۶۶) اور آخر میں خود اس کے بارہ میں اعتراض کا یہ جواب تحریر کیا ہے۔

"شق القمر اہل مکہ کی طلب پر ایک آیت الٰہی تھی یعنی ان منکروں کو ان کی خواہش کے مطابق ایک نشانی دکھائی گئی تھی، احادیث میں یہ ہے کہ چاند دو ٹکڑے ہو کر نظر آیا، خواہ در اصل چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے ہوں، یا خدا نے ان کی آنکھوں میں ایسا تصرف کر دیا ہو کہ ان کو چاند دو ٹکڑے ہو کر نظر آیا، جو خدا انسانوں کی آنکھوں میں خلاف عادت تصرف کر سکتا ہے، وہ خود چاند میں بھی خلاف عادت تصرف کر سکتا ہے، پھر چونکہ اللہ نے یہ نشانی اہل مکہ کے لیے ظاہر کی تھی، اور ان ہی کے لیے یہ آیۂ ثبوت تھی، اس لئے تمام دنیا میں اس کے ظہور اور رویت کی حاجت نہ تھی، اس بنا پر بالفرض اگر دنیا کے دوسرے حصوں میں شق قمر مشاہدہ نہ ہوا تو یہ حیرت اور تعجب کی بات نہیں، بلکہ اہل مکہ کے علاوہ اور لوگوں کو دوسرے شہروں اور ملکوں میں اس کا نظر نہ آنا ہی مصلحت الٰہی تھی کہ اگر یہ عام طور سے دوسرے اقطاع عالم کے لوگوں کو بھی نظر آتا تو یہ سمجھا جا سکتا کہ یہ آسمان کے طبعی انقلابات میں سے کوئی انقلاب تھا، جیسا کہ اور سیکڑوں قسم کے تغیرات اس سے پہلے ہو چکے ہیں، جیسا کہ فلکیات اور علم بدء الخلق میں مذکور ہیں، لیکن جب اہل مکہ کے علاوہ جو شہر مکہ میں تھے، یا باہر قافلہ میں تھے، صرف ان ہی کو نظر آیا، تو اس بات کی صاف اور صریح دلیل ہے کہ یہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک نشان کے طور پر ظاہر ہوا و للہ الحمد" (سیرۃ النبیؐ جلد سوم۔ ص ۵۶۶ تا ۵۶۸)

تحقیق و تدقیق وجستجو | تلاش و تحقیق اور بحث وجستجو مولانا سید سلیمان ندویؒ کی بڑی اہم خصوصیت ہے، ان کی تمام تحریروں کی طرح یہ جلد بھی ان کی تلاش ومحنت اور تحقیق وتدقیق کا شاہکار ہے اور پر

جو کچھ عرض کیا گیا ہے، وہ ان کی عالمانہ و محققانہ شان کو نمایاں کرنے کے لیے کافی ہے تاہم یہاں ایک مستقل مسئلہ میں ان کی سعی و کاوش اور بحث و تحقیق کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے، جس سے ظاہر ہوگا کہ وہ تلاش و جستجو اور بحث و تحقیق میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھتے تھے۔

سید صاحب نے معراج کی تاریخ کی تعیین اور اس کے عدم تعدد کے مسئلہ میں بڑی محققانہ بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ صحیح اور مستند اور معتبر روایات کے مطابق اور جمہور علما کی رائے کے موافق معراج صرف ایک دفعہ واقع ہوئی، جو لوگ تعدد کے قائل ہیں اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ چونکہ روایتوں میں جزئیات معراج کے بیان میں اختلاف ہے، اس لئے انھوں نے رفع اختلاف کے لیے متعدد دفعہ معراج کا وقوع تسلیم کیا ہے[1]، تاکہ ہر مختلف فیہ واقعہ ایک ایک جداگانہ معراج پر منطبق کیا جائے، لیکن درحقیقت یہ ایک فرض محض ہے، جس کو واقعیت سے کوئی تعلق نہیں، مستند اور صحیح روایات ہمارے سامنے ہیں، اور ان میں تعدد معراج کا اشارہ تک نہیں ہے، ایک ایسے اہم مافوق بشری مشاہدہ اور طویل واقعہ کے متعلق جو اس وقت واقع ہوا جب مسلمانوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی اور جس قدر تھی وہ بھی پراگندہ حال اور منتشر الخیال تھی، اور ایک ایسے واقعہ کے متعلق جس کے رواۃ اکثر وہ لوگ ہیں جو اس وقت پیدا نہیں ہوئے تھے یا بہت چھوٹے تھے، یا مدنی لوگ ہیں، جن کو ہجرت سے قبل کے واقعات کی ذاتی اور بلاواسطہ واقفیت نہ تھی اگر جزئیات میں معمولی اختلاف یا بعض واقعات کی ترتیب میں تقدم و تاخر واقع ہوا ہے تو ان کی تطبیق کے درپے ہونے کی ضرورت نہیں، خود ہمارے سامنے روزانہ واقعات پیش آتے رہتے ہیں ان کے جزئیات کی تفصیل اگر مختلف راویوں سے سنیں یا مختلف اوقات میں ہم خود بیان کریں تو ترتیب واقعات اور دیگر جزئی امور میں بیسیوں اختلافات پیدا ہو جائیں گے

---

[1] امام سہیلی نے روض الانف شرح سیرۃ ابن ہشام میں اسی استدلال کی بنا پر تعدد کا میلان ظاہر کیا ہے (جلد اول مصر، ص ۲۴۴)

بایں ہمہ اصل معاملہ اور اس کے اہم اجزاء کے وقوع میں شک و شبہہ نہ ہوگا۔

بعض ارباب سیر نے دو دفعہ معراج کا ہونا ثابت کیا ہے، وہ ایک کو اسرا اور دوسرے کو معراج کہتے ہیں کہ قرآن میں اسراء اور احادیث میں معراج کا نام آیا ہے، انھوں نے اس کی ضرورت اس لئے سمجھی کہ قرآن کے پندرھویں پارہ میں اسراء کا جو بیان ہے اس میں صرف مکہ سے بیت المقدس تک کا سفر مذکور ہے، اور قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جسم کے ساتھ حالت بیداری میں ہوا حالانکہ معراج میں تو آسمان تک کا سفر ہوا ہے، اور عجیب و غریب واقعات پیش آئے ہیں اور بعض روایتوں میں یہ تصریح ہے کہ یہ خواب تھا، بہرحال یہ بھی استنباط اور قیاس سے آگے نہیں بڑھتا، قرآن مجید کے الفاظ خواب و بیداری دونوں کے متحمل ہیں، اس بنا پر اس میں کوئی شک نہیں کہ معراج ایک ہی دفعہ واقع ہوئی ہے، علامہ زرقانی نے تصریح کی ہے کہ یہی جمہور محدثین متکلمین اور فقہا کی رائے ہے، اور روایات صحیحہ کا تواتر بھی بظاہر اسی پر دلالت کرتا ہے اور اس سے عدول نہیں کرنا چاہئے، حافظ ابن کثیر نے تعدد معراج کے قول کو بالکل لغو اور بے سند اور خلاف سیاق احادیث ٹھرایا ہے، (سیرۃ النبیؐ جلد سوم۔ ص ۳۹۲ و ۳۹۶)

معراج کے تعدد کی تردید اور اس کے ایک ہی دفعہ واقع ہونے کی تحقیق و صراحت کرنے کے بعد وہ اس کے وقت اور زمانہ کی تعیین کی جانب متوجہ ہوتے ہیں، اس سلسلہ میں فرماتے ہیں۔ کہ معراج کے وقت اور زمانہ کی تعیین میں یہ دشواری پیش آتی ہے کہ یہ ہجرت سے پہلے کا واقعہ ہے۔ جب کہ تاریخ اور سنہ کی تدوین نہیں ہوئی تھی، اور عرب میں عموماً اسلام سے پہلے کسی سنہ کا رواج نہ تھا تاہم وقت کے متعلق اتنا تو یقینی طور پر معلوم ہے کہ رات کا وقت تھا، خود قرآن مجید میں ہے، (اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلاً یعنی لے گیا اللہ تعالےٰ اپنے بندے کو رات کے وقت) اور تمام روایات بھی اس بارہ میں متفق اللفظ ہیں لیکن صحیح دن اور تاریخ کا پتہ لگانا نہایت مشکل ہے، محدثین کے یہاں کسی سے بھی

بروایت صحیح اس کی تصریح موجود نہیں ہے، ارباب سیر نے بعض صحابہ، تابعین اور تبع تابعین سے کچھ روایتیں کی ہیں، لیکن ان کی تصریحات مختلف ہیں تاہم اتنی بات پر بلا اختلاف سب کا اتفاق ہے کہ یہ بعثت اور آغاز وحی کے بعد اور ہجرت سے پہلے کا واقعہ ہے جو مکہ معظمہ میں پیش آیا، اس کے بعد سید صاحب ماہ و سال کے متعلق ارباب سیر کے مختلف اقوال پوری تلاش و جستجو سے نقل کر کے ان پر نقد و تبصرہ اور محاکمہ کرتے ہیں، اور آخر میں اپنا محقق اور مرجح فیصلہ یہ سناتے ہیں۔

قدیم راویوں کا بڑا حصہ ایک سال قبل ہجرت کا زمانہ متعین کرتا ہے، ایک دو بزرگ چند مہینے کی مدت اور بڑھا دیتے ہیں، متاخرین میں سے بعض اصحاب نے جو قیاس تاریخی سے تین سال یا پانچ سال قبل ہجرت کا زمانہ متعین کرنا چاہا ہے، اس کا مبنی یہ ہے کہ بخاری میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ خدیجہؓ نماز پنجگانہ کی فرضیت سے پہلے وفات پاچکی تھیں، نماز پنجگانہ بالاتفاق معراج میں فرض ہوئی، پھر بخاری ہی میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حضرت خدیجہؓ نے ہجرت سے تین سال پہلے وفات پائی اور دوسرے راویوں نے بیان کیا ہے کہ ہجرت سے پانچ سال پہلے انتقال کیا، ان مقدمات کو یکجا کر کے انھوں نے یہ نتیجہ نکالنا چاہا ہے کہ معراج کا واقعہ ہجرت سے تین سال پہلے (بقول ابن اثیر)، یا پانچ سال پہلے (بقول قاضی عیاض وغیرہ) پیش آیا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ استدلال اس وقت درست ہو سکتا تھا، جب یہ ثابت ہوتا کہ نماز پنجگانہ کی فرضیت اور حضرت خدیجہؓ کی وفات دونوں ایک ساتھ ہوئیں یا کم از کم یہ کہ پہلا واقعہ دوسرے واقعہ کے چند روز بعد پیش آیا، حضرت عائشہؓ کی روایت سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے، کہ حضرت خدیجہؓ نے معراج (فرضیت نماز پنجگانہ) سے پہلے وفات پائی، اب یہ نہیں معلوم کہ ایک مہینہ پہلے یا سال بھر پہلے یا چند سال پہلے، اس لئے ان قیاسات سے معراج کی تاریخ متعین نہیں ہو سکتی۔

بہرحال ابتدائی راویوں کی کثیر جماعت جن میں بعض نہایت معتبر اور ثقہ ہیں اسی جانب ہو کہ

یہ ہجرت یعنی ربیع الاول ۱۳ء سے ایک سال یا ڈیڑھ سال پہلے کا واقعہ ہے، امام بخاری نے جامع صحیح میں گو کوئی تاریخ نہیں بیان کی ہے، لیکن ترتیب میں وقائع قبل ہجرت کے سب سے آخر میں اور بیعت عقبہ اور ہجرت سے متصلاً پہلے واقعۂ معراج کو جگہ دی ہے، اور ابن سعد نے بھی سیرت میں واقعۂ معراج کا یہی موقع ترتیب میں رکھا ہے، اس سے حدیث اور سیرت کے ان دو اماموں کا یہی منشا ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہجرت سے کچھ ہی زمانہ پہلے خواہ وہ ایک سال ہو یا اور کچھ کم و بیش معراج کا زمانہ متعین کرتے ہیں، ہمارے نزدیک قرآن مجید سے بھی یہی مستنبط ہوتا ہے کہ معراج اور ہجرت کے بیچ میں کوئی زمانہ حائل نہ تھا، بلکہ معراج درحقیقت ہجرت ہی کا اعلان تھا۔

مہینہ کی تعیین مشکل ہے، جو لوگ ہجرت یعنی ربیع الاول ۱۳ء سے ایک سال پہلے کہتے ہیں ان کے حساب سے اگر یہ ربیع الاول ادھر شامل کر لیا جائے تو اُدھر معراج کا ایک مہینہ ربیع الآخر پڑے گا، اور اگر شامل نہ کیا جائے تو ربیع الاول رہے گا، اور اگر عام مشہور و معمول بہ رجب کی تاریخ اختیار کی جائے تو ہجرت سے ایک سال ۸ مہینے پیشتر کا واقعہ تسلیم کرنا ہوگا۔ (ص ۲۰۲ و ۲۰۳)

سید صاحب نے اس جلد میں کہیں کہیں الفاظ و لغات کی تشریح اور نحو و عربیت کے مسائل پر بھی گفتگو کی ہے، اس سے بھی تحقیق و تدقیق میں ان کی عظمت و بلند پایگی ظاہر ہوتی ہے۔

اسرار و حکم کی وضاحت | مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس کتاب کے مباحث کی تعبیر و ترجمانی کے لئے حکیمانہ انداز اختیار کیا ہے، جس سے اکثر امور و مسائل کی غرض و غایت اور حکمت و مصلحت بھی واضح ہو گئی ہے، یہ پہلے گذر چکا ہے کہ قرآن مجید اسباب و علل کا قائل ہے، اور اس نے اشیاء کے خواص و طبائع، ان کے مصالح، ان کی پیدائش کی حکمتیں اور مخلوق الٰہی کے منافع کا ذکر بھی کیا ہے، جس پر سید صاحب نے مفصل بحث کی ہے، ذیل میں بعض احکام و مسائل کے مصالح

قل بیان کئے ہیں، مصنف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شق صدر یا شرح صدر کے بیان میں لکھتے ہیں:

"جن آیتوں میں دیگر انبیاء علیہم السلام کو عطیۂ علم دئے جانے کا ذکر ہے ان میں اکثر میں "علم" کے ساتھ "حکم" کا لفظ بھی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علاوہ خالص شرعی ضرورتوں کے نظم و حکومت اور فیصلۂ احکام کے لئے بے غور و فکر کے بدیہی صحیح اور حاضر علم کی ضرورت ہے، چونکہ معراج ہجرت کا اعلان اور اسلام کے مستقبل کا اعلان تھا جس کے بعد آنحضرت ؐ کو حکم کی طاقت عطا کی جانے والی تھی، اس لیے شرح صدر کے عطیہ کے لیے یہی مناسب موقع تھا، علاوہ ازیں معراج کے حقائق و مناظر جو نفوس نبویہ کے ادراکات کی آخری سرحد ہیں، ان کے احاطہ کے لیے بھی شرح صدر کی ضرورت تھی۔ (صفحہ ۵۰۳ و ۵۰۴)

اس سے شرح صدر کی غرض و غایت اور حکمت و مصلحت واضح ہو جاتی ہے، ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

"شرح صدر یعنی سینہ کا کھول دینا یا اس غرض سے چاک کرنا کہ وہ انوار الٰہی سے معمور کیا جائے، ایک دولت ربانی تھی، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوئی، ارشاد ہوا "اے محمد کیا ہم نے تیرے سینہ کو کھول نہیں دیا یا چاک نہیں کر دیا (انشراح-۱)

"احادیث میں گو اس شرح صدر کی پوری تفصیل مذکور ہے، مگر بہر حال قرآن پاک سے اس کا ثبوت ملتا ہے اگر خواہ یہ ظاہری طور سے یا باطنی رنگ میں علم و حکمت اور نور معرفت کی غیر معمولی اور مافوق بشری بخشش ہو، ہر صورت میں وہ فہم سے ایک بالاتر کیفیت تھی۔" (ص ۵۰۱)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص ذاتی کے بیان میں آپ کی کثرت ازدواج کے خاص وجوہ و مصالح یہ بتائے ہیں۔

"اصل یہ ہے کہ عرب میں نکاح کی تعداد متعین نہ تھی، بلکہ بنی اسرائیل میں بھی،

اس کی تحدید نہ تھی، توراۃ میں ایسے انبیاءؑ اور بزرگوں کے نام بھی ہیں جن کی متعدد بلکہ سیکڑوں بیویاں تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے عہد شباب میں یعنی ۲۵ سے ۵۰ برس کی عمر تک صرف ایک بی بی پر کفایت کی، حضرت خدیجہؓ کے بعد ایک ساتھ دو نکاح کئے حضرت سودہؓ سے جو کبیر السن تھیں، اور حضرت عائشہؓ سے جو صرف ۹ برس کی تھیں، یہ اتنی چھوٹی لڑکی سے نکاح ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ صرف دو خاندانوں میں محبت اور یکجہتی کی ترقی ہی کے لئے ہو سکتا تھا، مدینہ آکر آپؐ نے کئی نکاح کئے، ان نکاحوں پر ایک عمیق نظر ڈالنے سے خود بخود ظاہر ہو جاتا ہو کہ ان میں دو قسم کی عورتیں تھیں، ایک وہ جو رؤسائے قبائل کی لڑکیاں تھیں اور جن سے نکاح کا مقصد اسلام کی بہتری کے لئے تعلقات کی توسیع اور اضافہ تھا، حضرت عائشہؓ صدیق اکبرؓ کی اور حضرت حفصہؓ فاروق اعظمؓ کی صاحبزادی تھیں، حضرت ام حبیبہؓ ابوسفیان رئیس بنی امیہ کی بیٹی تھیں، حضرت جویریہؓ قبیلہ بنی المصطلق کی رئیسہ تھیں، حضرت صفیہؓ رئیس خیبر کی دختر تھیں، ازواج مطہرات میں دوسرے وہ بیوہ عورتیں جن کا سن زیادہ تھا، اور گویا اس طرح ان کی کفالت کا بار آپؐ نے اٹھایا، چنانچہ حضرت سودہؓ، حضرت ام سلمہؓ، حضرت میمونہؓ، حضرت زینبؓ ام المساکین یہ سب بیوائیں تھیں، ایک اور بیوی حضرت زینبؓ بنت جحش تھیں جو گو بیوہ نہ تھیں لیکن مطلقہ تھیں ان کے شوہر نے ان کو طلاق دیدی تھی، اس تفصیل سے آپ کی کثرت ازدواج کے اسباب منکشف ہوئے ہوں گے۔" سیرۃ النبی جلد سوم ص ۸۳۶، ۸۳۷)

بحث و استدلال کی دلنشینی | مولانا سید سلیمان ندویؒ کی بحث کا انداز سلجھا ہوا اور دلائل پیش کرنے کا طرز موثر اور دلنشین ہوتا ہے۔ گذشتہ صفحات میں جو مثالیں پیش کی گئی ہیں، ان سے انکی بحث کی

خوبی، تاثیر اور دلنشینی پوری طرح ظاہر ہو چکی ہے، ذیل میں اس کی براہ راست چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

کتاب کا آغاز اس موثر اور دلنشین پیرایہ میں کیا ہے۔

"جس طرح ہماری مادی دنیا ایک نظام خاص پر چل رہی ہے مثلاً رات کے بعد دن نمودار ہوتا ہے، خزاں کے بعد بہار آتی ہے، ستارے غروب ہوتے ہیں تو آفتاب نکلتا ہے گرمی جاتی ہے تو جاڑے آتے ہیں، پھول اپنے وقت پر کھلتے ہیں درخت اپنے موسم میں پھلتے ہیں، ستارے اپنے معین اوقات پر ڈوبتے اور نکلتے ہیں، اسی طرح روحانی عالم بھی اپنا ایک خاص نظام رکھتا ہے، اس کا بھی ایک آسمان و زمین ہے وہاں بھی تاریکی اور روشنی ہے، خزاں اور بہار ہے فصل و موسم ہے۔

آسمانہاست در ولایتِ جاں کارفرمائے آسمان جہاں

جب روئے زمین پر گناہوں کی تاریکی اور بدیوں کی ظلمت محیط ہو جاتی ہے تو صبح کا تڑکا ہوتا ہے، آفتاب ہدایت نمودار ہوتا ہے، باغِ عالم میں جب برائیوں کی خزاں چھا جاتی ہے، تو موسم بدلتا ہے، اور بہارِ نبوت رونق افزا ہوتی ہے۔" (ص ۔ د ۲)

ایک اور جگہ قرآن کے اعجاز کی اس موثر پیرایے اور دلنشین انداز میں وضاحت کی ہے۔

"قرآن مجید صرف فصاحت و بلاغت ہی کے لحاظ سے نہیں، بلکہ اپنی تمام حیثیات کے لحاظ سے معجزۂ کامل ہے، اس کے معجزۂ کامل ہونے پر مختصر ترین دلیل یہ ہے کہ ساڑھے تیرہ سو برس گذرے کہ کوہ صفا کی چٹان پر کھڑے ہو کر ایک امی نے دنیا سے یہ غیر متزلزل تحدی کی کہ وہ اس کا جواب پیش کرے تو کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ان تیرہ صدیوں کا ایک ایک سال گذر گیا مگر ایک آواز بھی اس تحدی کو قبول کرنے کے لئے بلند نہ ہوئی، اگر صرف فصاحت و بلاغت ہی کو معیار اعجاز

قرار دیا جائے تو کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ عین اس وقت جب ایک امی کی طرف سے جو ایک شعر تک موزوں نہیں پڑھ سکتا تھا (بخاری) یہ مدعیانہ اعلان عرب میں شائع ہوا اس وقت عرب کے قبیلہ قبیلہ میں زبان آور شعرا اور آتش بیان خطباء موجود تھے۔ مگر اس "صورت سرمدی" کے سامنے سب کی زبانیں گنگ ہوگئیں، کفار عرب نے اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کی تکذیب کی کیا کیا کوششیں نہ کیں، انھوں نے اس راہ میں جان و مال قربان کیا، دین و کیش کو برباد کیا، اپنے عزیزوں اور فرزندوں کو نثار کیا، خود اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھیں، ان کے سپاہیوں نے میدان جنگ میں پڑے جانے، ان کے دولتمندوں نے اپنے خزانے کھول دیئے، ان کے شاعروں اور خطیبوں نے اپنی آتش بیانیوں سے تمام ریگستان عرب کو تنور بنا دیا، یہ سب کچھ کیا مگر یہ نہ ہو سکا کہ قرآن مجید کی ایک سورہ کا جواب پیش کریں جو اسلام کے دعوائے حق و صداقت کے کنگرہ کو چشم زدن میں پست کر دیتا، کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس کی مثال لانے سے عاجز تھے، اور جب وہ جو زبان کے اصل مالک اور محاورۂ عرب کے طبعی ماہر تھے، اس کے مقابلہ سے عاجز تھے، تو اس زمانہ کے بعد کے لوگوں کے لئے تو یہ عجز اور درماندگی اور زیادہ نمایاں ہے۔" (صفحہ ۵۲۲ و ۵۲۳)

علامات نبوت قبل بعثت کی بحث کی ابتدا اس دلآویز اور پر اثر انداز میں ہے۔

"ہر شخص اس کو تسلیم کرے گا کہ ممتاز افراد کے سوانح زندگی میں شروع ہی سے ایسے آثار پائے جاتے ہیں جو ان کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی کرتے ہیں، جب یہ ان عام ممتاز افراد انسانی کا حال ہے جو خاندانوں، قوموں اور ملکوں کے صرف ظاہری رہنما اور رہبر ہوتے ہیں تو اس حیثیت سے ان برتر ہستیوں کی نسبت کیا شبہ

ہوسکتا ہے جو قوموں کے روحانی پیشوا اور انسانیت کے حقیقی رہبر اور رہنما ہوتے ہیں؛ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ابتدائی سوانح زندگی میں اس قسم کے واقعات بکثرت ملتے ہیں۔ (ص ۲۲۶)

نفسیاتی توجیہ اور علمائے نفس کے اقوال

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بحث و استدلال کو دلکش اور دلنشین انداز میں پیش کرنے کے لئے مباحث و مسائل کی نفسیاتی توجیہ بھی کی ہے۔ اور تفہیم و وضاحت کے لئے سائیکالوجی اور علم النفس کے ماہرین کے اقوال بھی پیش کئے ہیں؛ ذیل میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں، ایک جگہ یقین معجزات کے اصول نفسی کی وضاحت کے بعد اس بحث کو اس طرح ختم کیا ہے،

"اس لئے ایمان و کفر اور یقین و شک کے وجوہ منطقی طرز استدلال سے نہیں بلکہ زیادہ تر نفسیاتی اصول و قواعد سے ماخوذ ہیں"۔ (ص ۸۰)

"معاندین کو معجزہ سے بھی تسلی نہیں ہوتی" کے زیر عنوان وہ انسانی نفسیات کی اس خصوصیت کا ذکر کرتے ہیں۔

"جب کسی طرف سے اس کے جذبات مخالفانہ ہوتے ہیں تو وہ اس کی کسی بات کو حسن ظن پر محمول نہیں کرتا، اور اس کو اس کی ہر شئی میں شر، خبث اور بدی نظر آتی ہے، جلی سے جلی اور واضح سے واضح برہان بھی اس کے دل کے ریب اور قلب کے شک کو دور نہیں کرسکتے۔ معاندین جو انبیاء کے مکارم اخلاق، حسن عمل، حسن تعلیم اور دیگر علمی و عملی تلقینات کو باور نہیں کرتے اور ان کے کھلے اور بدیہی دعووں کو بھی تسلیم کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے اور ہر قسم کی دلیلوں کے سن لینے کے بعد بھی وہ اپنے لاعلاج مرض شک سے نجات نہیں پاتے"۔ (ص ۲۳۶)

حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو بار بار معجزہ دکھایا مگر وہ ایمان نہ لایا؛ اس کے ثبوت میں

سورۂ زخرف کی ایک آیت نقل کر کے لکھتے ہیں کہ یہ حکایت حضرت موسیٰؑ کے قصہ کا ایک ٹکڑا ہے، جو زمانہ ماضی کا ایک واقعہ تھا جس کو تمام تر صیغۂ ماضی سے ادا ہونا چاہئے تھا لیکن اس میں تین جگہ اللہ تعالیٰ نے مضارع کا صیغہ استعمال کیا ہے، اس سے مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ایک خاص نکتہ نکالا ہے، جس میں معاندین کی نفسی کیفیت بھی بیان کی ہے، لکھتے ہیں۔

"گو یہ واقعہ خاص فرعون موسیٰ کے ساتھ پیش آیا، مگر یہ اسی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ ہر عہد کے فرعون اور ہر پیغمبر کے معاندین کی نفسی کیفیت یہی ہوتی ہے کہ جب ان کے پیغمبر خدا کے احکام اور نشانیاں لے کر ان کے پاس جاتے ہیں تو وہ صدائے خندۂ تحقیر بلند کرتے ہیں۔۔۔ عہد محمدی کے فرعونوں اور معاندوں کی نفسی کیفیت بھی یہی تھی کہ ان کو نشانیاں دکھائی جاتی تھیں، مگر انھیں عناد کی کور باطنی کے باعث ان سے تسکین نہیں ہوتی تھی۔" (ص ۲۴۸ و ۲۴۹)

عالم رویا کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے علمائے نفسیات کا یہ نظریہ پیش کیا ہے۔

"اب جدید عہد ترقی میں سائیکالوجی اور نفسیات کے علما کا مشہور و مقبول نظریہ یہ ہے کہ ہم عالم بیداری میں اپنے جن خیالات، جذبات اور ارادوں اور تمناؤں کو جان کر یا بے جانے کسی سبب سے دبا دیتے ہیں، عالم خواب میں جب ہمارے تعقل اور احساس کی جابرانہ حکومت ان سے اٹھ جاتی ہے تو ان کو ابھرنے کا موقع ملتا ہے، اور وہ ہم کو خواب بن کر نظر آتے ہیں۔" (ص ۳۰۱)

غرض یہ جلد گوناگوں معلومات اور حقائق و دقائق سے پُر ہے، ایک مضمون میں ان سب کو سمیٹ لینا ممکن نہیں۔

کتاب خواں اور صاحبِ کتاب

از

جناب محمد بدیع الزماں صاحب ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پھلواری شریف پٹنہ

اس مضمون کا عنوان "ضربِ کلیم" کی کُل دو ہی اشعار پر مشتمل، اقبالؔ کی درج ذیل نظم، "طالبِ علم" سے ماخوذ ہے، جس کا تجزیہ قرآن کی روشنی میں کیا جا رہا ہے۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں!
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں!

اقبالؔ کے کلام میں جہاں بہت سی قرآنی اصطلاحات ہیں وہاں کچھ اصطلاحات انھوں نے لفظ "صاحب" میں کسرۂ اضافت لگا کر بھی وضع کی ہیں جن میں قرآن اور حدیث کے لاتعداد ارشادات، احکامات اور تعلیمات کو انھوں نے سمو دیا۔ ایسے تو "صاحب" کے لغوی معنیٰ مالک لیا جاتا ہے اور "صاحبِ کتاب" سے وہ شخص مُراد لیا جائے گا جس پر اُس کتاب کا نزول ہوا ہو یا وہ جو اُس کتاب کا مصنّف ہو، مگر اقبالؔ نے اسی اضافت سے ہر جگہ اسے مجازی معنوں میں استعمال کیا ہے۔

اور ہر ایسی اصطلاح میں لفظ "صاحب" سے "پیرو" مُراد لیا ہے جیسے :۔

آگ اُس کی پھونک دیتی ہے برنا و پیر کو
لاکھوں میں ایک بھی ہو، اگر صاحبِ یقیں!

(ضربِ کلیم۔ محرابِ گل افغان کے افکار۔ ۱۱)

کیا بات ہے کہ صاحبِ دل کی نگاہ میں
جچتی نہیں ہے سلطنتِ روم و شام و رے!
(ضربِ کلیم۔ "مردود")

آہ وہ مردانِ حق! وہ عربی شہسوار
حاملِ "خلقِ عظیم"، صاحبِ "صدق و یقین"
(بالِ جبریل۔ "مسجدِ قرطبہ")

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے!
(بالِ جبریل۔ "غزل ۱۰")

فروغِ مغربیاں خیرہ کر رہا ہے تجھے
تری نظر کا نگہباں ہو صاحبِ مازاغ!
(ضربِ کلیم۔ "غزل ص ۸۴")

اقبالؔ اس نظم میں طالبِ علم سے مخاطب ہیں، اور یہ کہہ کر کہ تو "کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں"۔ انھوں نے، قرآن کی روشنی میں، علم کی مقصدیت اور افادیت پر ایک لمبی بحث چھیڑ دی ہے پہلے شعر میں تو انھوں نے ترغیبِ عمل کے رجحانات اجاگر کرنا چاہا ہے، مگر دوسرے شعر میں اسے صاحبِ کتاب سے وابستہ کر کے یہ نکتہ نکالا ہے کہ عمل عشق سے فروزاں ہوتا ہے، جس کا سرچشمہ قرآن اور حدیث ہے، جس کے پیرو ہونے ہی پر صاحبِ کتاب "کے زمرہ میں شامل کیا جانا ممکن ہے، اقبالؔ کے اس عشق میں رچی اور بسی وہ مشعل ہے، جو راہِ حیات میں ہر سنگِ گراں کو ذرّۂ بے مقدار بنا کر ختم کر دیتی ہے۔

اقبالؔ اُن علوم کے مخالف نہیں تھے، جو دنیوی یا درسی کتابوں سے حاصل کیے جاتے ہیں، کیونکہ "تسخیرِ کائنات" کا فریضہ انجام دینے کے لیے ان سے مستفیض ہونا بھی لازمی اور ازبس ضروری ہے، وہ خود اپنے زمانے کی جو دنیا میں اعلیٰ ترین تعلیم ہو سکتی تھی حاصل کر چکے تھے، اور اُس وقت برصغیر ہند میں (جس میں اب ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور برما شامل ہے) ایسے لوگ

انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔ یہ بات بیسویں صدی کی پہلی دہائی کے اوائل سالوں کی ہے۔ "علوم تازہ" کے حصول پر "ضربِ کلیم" کی نظم "محراب گل افغان کے افکار۔ ۹" میں فرماتے ہیں:

کھلے ہیں سب کے لیے غریبوں کے میخانے
علومِ تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں!
اسی سرور میں پوشیدہ موت بھی ہے تیری
ترے بدن میں اگر سوزِ لا الٰہ نہیں!

اسی سوز کی تلقین اقبال نے اپنے صاحبزادے جاوید اقبال (جو حال تک پاکستان سپریم کورٹ کے جج تھے)، کو بھی کی تھی، جب وہ انگلینڈ میں زیرِ تعلیم تھے۔

غارت گرِ دیں ہے یہ زمانہ ۔ ہے اس کی نہاد کافرانہ
سرچشمۂ زندگی ہوا خشک ۔ باقی ہے کہاں مئے شبانہ!
خالی اُن سے ہوا دبستاں ۔ تھی جن کی نگاہ تازیانہ!
جس گھر کا مگر چراغ ہے تو ۔ ہے اُس کا مذاق عارفانہ
جوہر میں ہو لا الٰہ تو کیا خوف ۔ تعلیم ہو گو فرنگیانہ:
شاخِ گل پر چہک ولیکن
کر اپنی خودی میں آشیانہ

(ضربِ کلیم: "جاوید سے (۱)")

اسے اتفاق کہا جائے یا سعادتِ ازلی کی یاوری و مساعدت کہ اقبال نے جتنا زیادہ مغربی افکار و خیالات کا مطالعہ کیا اُتنا ہی ان میں مغربی علوم سے پیدا شدہ تہذیب، تمدن اور ثقافت کے خلاف ایک باقاعدہ ردِ عمل ترقی پذیر ہوتا چلا گیا۔ انھوں نے اس

ردِ عمل کے طور پر ایک زندہ اور آئیڈیل سوسائٹی کی تعمیر کے لیے صرف اسلام اور اس کی تعلیمات کو بطور بنیاد عمل اپنے پیش نظر رکھا، کیونکہ قرآن ایک دستور حیات ہے، اور اسلام فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے،

علوم، خواہ مشرقی ہوں یا مغربی، اقبالؔ ہر طالب علم کے بدن میں لا الٰہ کا سوز دیکھنے کے متمنی تھے، چنانچہ مشرقی علوم کی درسگاہوں اور ان سے فارغ التحصیل طالب علموں سے بھی ان کی مایوسی کا یہی عالم اور یہی وجہ تھی۔

خانقاہوں میں کہیں لذتِ اسرار بھی ہے؟ | مکتبوں میں کہیں رعنائی افکار بھی ہے؟
صد ان کی کد و کاوش کا ہے سینوں کی بے نوری! | یہ پیرانِ کلیسا و حرم! اے وائے مجبوری!
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ! | اُٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک!

اقبالؔ کا یہ کہنا کہ کتاب خواں ہونے کے باوجود اگر طالبِ علم "صاحبِ کتاب" نہ بن سکا تو اس کی وجہ اُن کے نزدیک صرف یہ ہے کہ وہ علم کے ڈانڈے عشق سے استوار نہ کرسکا جو سب سے بڑی قوت محرکہ ہے، اور اسی وجہ سے اس طالب علم کی موجوں میں اضطراب مفقود ہے، کیونکہ جذبۂ عمل صرف جذبۂ عشق سے تقویت پاتا ہے، جو تخلیقی فعلیت کا محرک ہے، اجزاے عالم کی تخلیق سراسر عشق سے ہوتی ہے، اور وجہ آفرینش اور مقصد حیات انسانی عشق کے سوا کچھ نہیں، عشق بوالہوسی کا نام نہیں، اور نہ جیسا غالبؔ نے کہا "خلل ہے دماغ کا" یہ ایک وجدانی کیفیت ہے، جو روحانی مسرت اور کسی بلند مقصد کے حصول کے لیے اپنے کو وقف کر دینے کا نام ہے، جو علم عشق سے محکم نہیں، ویسے علم کو اقبالؔ درج ذیل نظم میں "تخمین و ظن"۔۔۔ اور ویسے طالب علم کو "بندۂ تخمین و ظن" اور "کرمِ کتابی" سے موسوم کرتے ہیں۔

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن!
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن!

بندۂ تخمین و ظن! کرمِ کتابی نہ بن!
عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب!

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات!
علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات!
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات!
علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب!

عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دیں!
عشق کے ادنیٰ غلام صاحبِ تاج و نگیں!
عشق مکان و مکیں! عشق زمان و زمیں!
عشق سراپا یقین، اور یقین فتحِ باب!

شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام
شورشِ طوفاں حلال، لذّتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال، عشق پہ حاصل حرام
علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے اُمُّ الکتاب!

(ضربِ کلیم۔ "علم و عشق")

اقبال کے نزدیک علم جلالِ کائنات سے مرعوب رہتا ہے، جس کے اصول جبری ہیں، اور اس میں وجدانی، الہامی اور ارتقائی انکشافات اور اطلاعات کی گنجائش نہیں جب کہ عشق کی رسائی حدِ ادراک سے بھی پرے ہے۔

علم ترساں از جلالِ کائنات
عشق غرق اندر جمالِ کائنات

علم را بر رفتہ و حاضر نظر — عشق گوید آنچہ می آید نگر
علم پیماں بستہ با آئین جبر — چارۂ او چیست غیر از جبر و صبر
عشق آزاد و غیور و ناصبور
در تماشائے وجود آمد جسور

اقبال نے قرآن و حدیث کی روشنی میں علم کا جو نظریہ قائم کیا اس پر مزید روشنی درج ذیل نظم میں ڈالی گئی ہے۔

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم — کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم
زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک — دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم
چمن میں تربیت غنچہ ہو نہیں سکتی — نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریک نسیم
وہ علم کم بصری جس میں ہمکنار نہیں
تجلیات کلیم و مشاہدات حکیم!

(ضرب کلیم۔ "علم اور دین")

ان اشعار کی رو سے جس علم کو خدا نے دل و نظر کا ندیم بنا کر تجلیات کلیم و مشاہدات حکیم سے ہمکنار کر دیا ہو، وہی علم ہر زمانہ میں حق و باطل کی جنگ میں اپنے بتوں کا آپ ابراہیم رہا ہے، اور جو علم ان سے محروم ہے، اسے اقبال "علم کم بصری" قرار دیتے ہیں، زندگی اور علم کے تعلق کو اقبال نے اس طرح واضح کیا ہے۔

زندگی کچھ اور شے ہے، علم ہے کچھ اور شے — زندگی سوز جگر ہے، علم ہے سوز دماغ
علم میں دولت بھی ہے، قدرت بھی ہے، لذت بھی ہے — ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ!
اہل دانش عام ہیں، کم یاب ہیں اہل نظر — کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ!

شیخ مکتب کے طریقوں سے کشادِ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ!

(ضرب کلیم "تربیت"

علم پر اقبالؔ کے ان سارے نظریات سے یہ کُلّیہ سامنے آتا ہے کہ علم وہ ہے جسے خدا نے
نظر کا ندیم بنایا ہو، اور جو تیجتہً بدن میں سوزِ لا اِلٰہٗ پیدا کرے، دوسرے الفاظ میں
ہے، جسے حاصل کرنے میں انسان میں شانِ فقر پیدا ہو۔ "شانِ فقر" اقبالؔ کے یہاں
ایسی اصطلاح ہے جو "صاحبِ کتاب" کی رگوں میں خون کی طرح دوڑتی ہے، اقبالؔ کے فکری
میں فقر کی بنیادی اہمیت ہے، یہ تزکیۂ نفس یعنی تنزیہی کیفیت کے حصول کی متبادل اصطلاح
نفس و آفاق پر غلبہ اور تفوّق حاصل کرنے میں ممد و معاون ہوتی ہے، ایک صاحبِ فقر
زندگی کا شعار شَعَآئِرَ اللّٰہِ پر قائم کرتا، اور اپنی زندگی کی تصاویر میں "صِبْغَۃَ اللّٰہِ" یعنی اللہ
سے بھرتا ہے۔

"شَعَآئِرَ اللّٰہِ" کے متعلق خدا تعالےٰ فرماتا ہے۔

اے ایمان لانے والو! خدا ترسی کی نشانیوں کو بے حرمت نہ کرو۔ یٰاَیُّھَا
الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰہِ (سورۃ المآئدۃ۔ ۵)
بتوں کی زندگی سے بچو، جھوٹی باتوں سے پرہیز کرو، یکسو ہو کر اللہ کے بندے بنو، اس
کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، اور جو کوئی اللہ کے ساتھ شرک کرے تو گویا وہ آسمان سے
گر گیا۔ اب یا تو اسے پرندے اُچک لے جائیں گے یا ہوا اس کو ایسی جگہ لے جا کر پھینک
دے گی، جہاں اس کے چیتھڑے اُڑ جائیں گے۔

یہ ہے اصل معاملہ (اسے سمجھ لو) اور اللہ کے مقرر کردہ شعائر کا احترام کرے تو یہ

دلوں کے تقویٰ سے ہے۔ "وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّھَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ" ـــــ (سورۃ الحج ۲۲۔ رکوع ۴)

اقبالؔ جب طالب علم سے یہ کہتے ہیں کہ باوجود کرم کتابی بننے کے تو "صاحب کتاب" نہ بن سکا تو وہ یہی کچھ کہنا چاہتے ہیں کہ اللہ کے مقرر کردہ شعائر کا احترام نہیں کرتا جو دلوں کے تقویٰ سے ہو۔ اور اسی لیے تیرے بدن میں سوز لا الٰہ نہیں اور نہ تیرے فکر و عمل کی موجوں میں کوئی اضطراب ہے۔ ان ہی باتوں کو اقبالؔ نے اس طرح بھی نظم کیا ہے۔

اور ہے تیرا شعار، آئینِ ملت اور ہے زشت روئی سے تری، آئینہ ہے رسوا ترا

(بانگ درا۔ شمع اور شاعر، شمع)

"صاحب کتاب" صرف یہی نہیں کہ وہ اللہ کے مقرر کردہ شعائر کا احترام کرتا ہے، بلکہ وہ اپنی زندگی کی تصویر میں اللہ کا رنگ بھرتا ہے، یعنی وہ اللہ کے سارے صفات اپنا لیتا ہے، کیونکہ خدا خود فرماتا ہے۔

"(اے نبیؐ، کہو) اللہ کا رنگ اختیار کرو (صِبْغَۃَ اللّٰہِ) اُس کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہوگا؟ اور ہم اُسی کی بندگی کرنے والے لوگ ہیں۔" (سورۃ البقرہ ۲۔ رکوع ۱۶)

جب صاحبِ کتاب اپنے مجسمہ کے خدوخال میں اللہ کا رنگ بھر لیتا ہے، تو وہ خدا کے اتنے قریب ہو جاتا ہے، کہ شاہد و مشہود کا فرق اور امتیاز مٹ جاتا ہے، اسے دیکھ کر لوگوں کو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ اللہ کا رنگ زیادہ گہرا ہے، یا "صاحب کتاب" کا۔

میں انتہائے عشق ہوں، تو انتہائے عشق دیکھے مجھے، کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

(بانگ درا۔ غزلیات حصہ اوّل)

"شَعَآئِرَ اللّٰہِ" اور "صِبْغَۃَ اللّٰہِ" سے دراصل "حُبًّا لِلّٰہِ" مراد ہے۔

"ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں" (وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ) (سورۃ البقرۃ ۲ - ۲۰ رکوع ۲۰)

چونکہ خدا انسان کی گرفت میں نہیں آسکتا اور انسان کسی انسان ہی کے قول کو سن کر اور فعل کو دیکھ کر ان پر عمل کرتا ہے، اور جس رنگ میں وہ رنگا ہے اُسی رنگ میں اپنے کو رنگتا ہے۔ اس لئے خدا نے "حُبًّا لِّلّٰہِ" کا رُخ اُس برگزیدہ نبیؐ کی طرف موڑ دیا کیونکہ وہ مجسم قرآن تھے اور حضورؐ کی ذاتِ اقدس قرآن کی عملی تصویر اور تفسیر ہے۔

"اے نبیؐ، لوگوں سے کہہ دو کہ "اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا، اور تمہاری خطاؤں سے در گزر فرمائے گا۔" اُن سے کہو کہ۔ "اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔ پھر اگر وہ تمہاری یہ دعوت قبول نہ کریں تو یقیناً یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ ایسے لوگوں سے محبت کرے جو اُس کی اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت سے انکار کرتے ہوں۔ (سورۃ آلِ عمران ۳ - رکوع ۴)

فقر کی اصطلاح درجِ ذیل آیات کا ترجمان ہے، جس سے گزر کر ہی ایک انسان "شعائر اللہ" کا احترام کرتا ہے، اور خود میں "صِبْغَۃَ اللّٰہِ" بھرتا ہے۔

"قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۙ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۭ (فلاح پا گیا وہ جس نے پاکیزگی اختیار کی اور اپنے رب کا نام یاد کیا پھر نماز پڑھی)" (سورۃ الاعلیٰ ۸۷ - رکوع ۱)

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا - (یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا) (سورۃ الشمس ۹۱ - رکوع ۱)

فقر کے ان ہی راہوں پر چل کر جب صاحبِ کتاب "شعائر اللہ" اختیار کر لیتا ہے تو اس پر اسرارِ جہانگیری کھلتے ہیں، اور اُس کی مٹی میں خاصیتِ اکسیری پیدا ہوتی ہے، اور یہی میراثِ مسلمانی اور سرمایۂ شبیری ہے، جس کے سامنے فغفوری کلک جھکتی ہے۔ ؎

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے "فقر جس میں ہے بے پردہ روح قرآنی

(ضرب کلیم "سلطانی")

اقبال کے نزدیک ہر علم کا اپنی جگہ پر مقام ہے، مگر وہ فقر پر اولیت حاصل نہیں کرسکتا، دونوں کا دائرۂ کار الگ الگ ہے، مگر ایک باشعور انسان ان دونوں کے حسین امتزاج سے حد ادراک کی اس منزل کو طے کر لیتا ہے، جہاں فرشتوں کے بھی پر جلنے لگتے ہیں۔ اقبال کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہر طالب علم عشق اور علم کی صحیح طریقے پر تربیت و تزئین کر کے اپنی خودی کو مرتبۂ کمال تک پہنچائے کیونکہ یہی مقصودِ فطرت ہے، اور یہی رمزِ مسلمانی۔ ان دونوں کے دائرۂ کار پر اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ — فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ
علم کا مقصود ہے پاکیٔ عقل و خرد — فقر کا مقصود ہے عفتِ قلب و نگاہ
علم فقیہہ و حکیم، فقر مسیح و کلیم — علم ہے جویائے راہ، فقر ہے دانائے راہ
فقر مقامِ نظر، علم مقامِ خبر — فقر میں مستی ثواب، علم میں مستی گناہ

علم کا "موجود" اور، فقر کا موجود اور

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰہ، اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰہ (بالِ جبریل۔ غزل ۵۹)

الغرض اقبال کے نقطۂ نظر سے جب انسان کی خودی عشق سے صیقل ہو کر فقر کے لبادہ میں جلوہ گر ہوتی ہے، یعنی جب وہ سچے دل سے اتباعِ شریعت کرنے لگتا ہے تو وہ "صاحبِ کتاب" ہو جاتا ہے، جو خالص قرآنی تصور ہے، ایسا انسان داعیٔ اسلامؐ کے اخلاقِ حسنہ کا مقلد اور گفتار و کردار میں اللہ کی برہان ہو جاتا ہے، اور اس کے مزاج میں "قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت" کے چاروں عناصر ایک حسین تناسب سے جاگزیں ہو جاتے ہیں، اس مجسمہ کی تصویر تو سارا قرآن اور حضورؐ

ذاتِ اقدس ؐ ہے، مگر نظم "طالب علم" اور اس مضمون کے عنوان کا جو تجزیہ قرآن کی روشنی کیا جارہا ہے، اس لیے دونوں کی مناسبت سے ذیل میں چند ایسی آیات درج کی جارہی ہیں۔ جو صاحبِ کتاب ؐ کے مجسمہ کا اجمالی خاکہ پیش کرتی ہیں :۔

" الف، لام، میم، یہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں، ہدایت ہے اُن پرہیزگار لوگوں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، (ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ) نماز قائم کرتے ہیں، جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے، اُس میں سے خرچ کرتے ہیں، جو کتاب تم (محمدؐ) پر نازل کی گئی ہے، (یعنی قرآن) اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں ان سب پر ایمان لاتے ہیں، اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں، ایسے لوگ اپنے رب کی طرف سے راہِ راست پر ہیں، اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔ (سورۃ البقرہ ۲۔ رکوع ۱)

حقیقت میں جو لوگ متقی ہیں اُن کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی بُرا خیال اگر انھیں چھو بھی جاتا ہے تو فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں، اور پھر انھیں، صاف نظر آنے لگتا ہے کہ ان کے لیے صحیح طریقۂ کار کیا ہے۔" (سورۃ الاعراف، رکوع ۲۴)

"ہماری آیات پر تو وہ لوگ ایمان لاتے ہیں جنھیں یہ آیات سُنا کر جب نصیحت کی جاتی ہے تو سجدے میں گر پڑتے ہیں، اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ اُس کی تسبیح کرتے ہیں اور تکبر نہیں کرتے، اُن کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں، اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے انھیں دیا ہے، اُس میں سے خرچ کرتے ہیں پھر جیسا کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ان کے اعمال کے جزا میں ان کے لیے چھپا رکھا گیا ہے، اُس کی کسی متنفس کو خبر نہیں ہے، بھلا کہیں یہ ہو سکتا ہے کہ جو شخص مومن ہو وہ اُس شخص کی طرح ہو جائے، جو فاسق ہو ؟"۔ (سورۃ السجدہ ۳۲۔ رکوع ۲)

"بھلا یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ شخص جو تمہارے (محمدؐ کے) رب کی اس کتاب (قرآن) کو جو اس نے تم پر نازل کی ہے، حق جانتا ہے، اور وہ شخص جو اس حقیقت کی طرف سے اندھا ہے، دونوں یکساں ہو جائیں ؟ نصیحت تو دانشمند لوگ ہی قبول کیا کرتے ہیں اور ان کا طرزِ عمل یہ ہوتا ہے کہ اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں، اسے مضبوط باندھنے کے بعد توڑ نہیں ڈالتے، ان کی روش یہ ہوتی ہے کہ اللہ نے جن جن روابط کو برقرار رکھنے کا حکم دیا ہے انھیں برقرار رکھتے ہیں، اپنے رب سے ڈرتے ہیں، اور اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں ان سے بُری طرح حساب نہ لیا جائے، اُن کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے رب کی رضا کے لیے صبر سے کام لیتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، ہمارے دئے ہوئے رزق سے علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں، اور بُرائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔ (سورۃ الرعد ۱۳ ۔ رکوع ۳)

"سچے اہلِ ایمان تو وہ لوگ ہیں، جن کا دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتا ہے اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے، اور وہ اپنے رب پر اعتماد رکھتے ہیں، جو نماز قائم کرتے ہیں، جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں، اُن کے لیے ان کے رب کے پاس بڑے درجے ہیں، قصوروں سے درگزر ہے، اور بہترین رزق ہے۔ (سورۃ الانفال ۸ رکوع ۱)

یہ (قرآن) تو ایک نصیحت ہے، اب جس کا جی چاہے اس سے سبق حاصل کرلے .....
وہ (خدا) اس کا حقدار ہے، کہ اس سے تقویٰ کیا جائے، اور وہ اس کا اہل ہے کہ (تقویٰ کرنے والوں کو) بخش دے۔" —— (سورۃ المدثر ۷۴ ۔ رکوع ۲)

یہ (قرآن) ایک نصیحت ہے، اب جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ

اختیار کرے"۔ (سورۃ الدھر ۷۶۔ رکوع ۲)

"جو شخص ڈرتا ہے، وہ نصیحت قبول کرے گا، اور اس سے گریز کرے گا وہ انتہائی بدبخت جو بڑی آگ میں جائے گا۔ پھر اس میں مرے گا نہ جئے گا"۔ (سورۃ الاعلیٰ ۸۷۔ رکوع ۱)

"(پس آج یہ رحمت اُن لوگوں کا حصہ ہے) جو اس پیغمبر نبی اُمّی (صلّی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی اختیار کریں، جس کا ذکر انھیں اپنے یہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ وہ انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، ان کے لیے پاک چیزیں حلال کرتا ہو۔ اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے، اور ان پر سے بوجھ اُتارتا ہے، جو ان پر لدے ہوئے تھے، اور وہ بندشیں کھولتا ہے، جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے، لہذا جو لوگ اس پر ایمان لائیں، اور اس کی حمایت اور نصرت کریں اور اس روشنی (قرآن) کی پیروی اختیار کریں جو اس کے ساتھ نازل کی گئی ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں"۔ (سورۃ الاعراف ۷۔ رکوع ۱۹)

"اور اے پیغمبرؐ، جو لوگ اس کتاب پر ایمان لے آئیں اور (اس کے مطابق) اپنے عمل درست کرلیں، انھیں خوشخبری دے دو کہ ان کے لیے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی"۔ (سورۃ البقرہ ۲۔ رکوع ۳)

"طٰہٰ، ہم نے یہ قرآن تم (محمدؐ) پر اس لئے نازل نہیں کیا ہے کہ تم مصیبت میں پڑ جاؤ، یہ تو ایک یاددہانی ہے، ہر اس شخص کے لئے جو ڈرے"۔ (سورۃ طٰہٰ ۲۰۔ رکوع ۱)

"لوگو، تمھارے رب کی طرف سے تمھارے پاس دلیل روشن آگئی ہے، اور ہم نے تمھاری طرف ایسی روشنی (قرآن) بھیجی ہے، جو تمھیں صاف صاف راستہ دکھلانے والی ہے، اب جو لوگ اللہ کی بات مان لیں گے، اور اس کی پناہ ڈھونڈیں گے اُن کو اللہ اپنی رحمت اور اپنے فضل و کرم کے دامن میں لے گا، اور اپنی طرف آنے کا سیدھا راستہ

اُن کو دکھاوے گا۔" (سورۃ النساء ۴۔ رکوع ۲۲)

یہ تھا "صاحب کتاب" کا اجمالی خاکہ جن کے بدن میں سوز لا الٰہ اور جن کے فقر میں رُوحِ قرآنی بے پردہ ہے، اب تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ فرمائیں جن کے متعلق ارشادِ ربانی ہے :-

"وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (اور نامراد ہوا، وہ جس نے اس کو دبا دیا یعنی جس نے نفس کا تزکیہ کرنے اور اُسے بُرائیوں سے پاک کرنے کی بجائے اپنے نفس کے بُرے رجحانات کو اُبھار کر اچھے رجحانات کو دبا دیا۔)" (سورۃ الشمس ۹۱۔ رکوع ۱)

ایسے ہی لوگوں کو اقبالؔ "صاحب کتاب نہیں" سے موسوم کرتے ہیں، جو ترجمان ہے درج ذیل آیات کا۔

"ہم (خدا) اُن کا اپنا ہی ذکر اُن کے پاس لائے ہیں، اور وہ اپنے ذکر سے منہ موڑتے ہیں۔" (سورۃ المومنون ۲۳۔ رکوع ۴)

"لوگو، ہم نے تمھاری طرف ایک ایسی کتاب بھیجی ہے، جس میں تمھارا ہی ذکر ہے۔ کیا تم سمجھتے نہیں ہو۔؟" (سورۃ الانبیاء ۲۱۔ رکوع ۱)

"پس اے نبیؐ، جو شخص ہمارے ذکر سے منہ پھیرتا ہے، اور دنیا کی زندگی کے سوا جسے کچھ مطلوب نہیں ہے، اُسے اس کے حال پر چھوڑ دو ـــ ان لوگوں کا مبلغ علم بس یہی کچھ ہے۔" (سورۃ النجم ۵۳۔ رکوع ۲)

"جو شخص رحمان کے ذکر سے تغافل برتتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مسلّط کر دیتے ہیں، اور وہ اپنی جگہ پر سمجھتے ہیں، کہ ہم ٹھیک جا رہے ہیں۔" (سورۃ الزخرف ۴۳۔ رکوع ۴)

"اگر تم یقینی علم کی حیثیت سے (دُنیا حاصل کرنے کے دُھن کی روش کے انجام کو) جانتے ہوتے تو تمھارا یہ طرز عمل نہ ہوتا۔ (كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ) (سورۃ التکاثر ۱۰۲۔ رکوع ۱)

"ہم اس قرآن کے سلسلۂ تنزیل میں وہ کچھ نازل کر رہے ہیں جو ماننے والوں کے لیے

تو شفا اور رحمت ہے، مگر ظالموں کے لیے خسارے کے سوا اور کسی چیز میں اضافہ نہیں کرتا۔" (سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ رکوع ۹)

" اگر ہم نے یہ قرآن کسی پہاڑ پر بھی اُتار دیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دبا جا رہا ہے۔ اور پھٹا پڑتا ہے، یہ مثالیں ہم لوگوں کے سامنے اس لیے بیان کرتے ہیں کہ وہ اپنی حالت پر غور کریں۔" (سورۂ الحشر ۵۹۔ رکوع ۳)

" یہ (قرآن) ربُّ العالمین کا نازل کردہ ہے، پھر کیا اس کلام کے ساتھ تم اعتنائی برتتے ہو۔ اور اس نعمت میں اپنا حصّہ تم نے یہ رکھا ہے کہ اسے جھٹلاتے ہو۔
(سورۂ الواقعہ۔ ۵۶۔ رکوع ۳)

الغرض اقبالؔ اس مختصر سی نظم میں طالبِ علم کو اپنے دماغ (علم، عقل) کے ساتھ دل کو بھی عشق سے روشن کرنے کی تلقین کرتے ہیں، کیونکہ جب تک علم کے ساتھ عشق بھی کار فرما نہ ہو مقصدِ حیات پورا نہیں ہو سکتا۔ اور یہی ہے "اسرار کتاب" جس کے متعلق وہ خود فرماتے ہیں۔

تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر!

(بالِ جبریل۔ غزل۔ ۲۹)

اقبال کامل

ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ و شاعری پر یہ کتاب اوس وقت لکھی گئی تھی جب کہ یوسف حسین خاں کی روحِ اقبال کے علاوہ اور کوئی کتاب قابلِ ذکر قابلِ مطالعہ اردو میں موجود نہیں تھی، اس میں اکٹر اقبال کے مختصر سوانحِ حیات کے ساتھ اون کی شاعری کے اہم موضوعوں کی نہایت دلنشین تشریح کی گئی ہے، مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی۔　　قیمت۔ ۲۵ روپیے

تاریخ غزبی

از

صاحبزادہ شوکت علی خاں، ڈائرکٹر عربی و فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ راجستھان، ٹونک

شمالی ہند میں اردو زبان کی قدیم ترین کتابوں میں تاریخ غزبی ایک اہم اور نایاب ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے، عطاحسین خان تحسین کی کتاب "نو طرز مرصع" جو قصہ چہار درویش کا پہلا ترجمہ ہے، اس سے بھی پچیس سال پہلے لکھی گئی تھی، یہ ایک ضخیم اسلامی تاریخی مثنوی ہے جس میں نہ صرف تاریخی مواد ملتا ہے، بلکہ ثقافتی اقدار، عصری رجحانات، اسلامی روایات، علوم و فنون کے آثار و اعلام، علمی مباحث، معاشرتی، مذہبی اور تمدنی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں، ......

ظاہر میں یہ ایک مثنوی ہے، لیکن ایک مذہبی، علمی اور ثقافتی گنج گرانمایہ ہے جو اسلامی تاریخ کی شکل میں منظوم کیا گیا ہے، قطع نظر اس کے کہ یہ ایک علمی ذخیرہ ہے، یہ ایک مذہبی مثنوی بھی ہے، یہ ان عظیم الشان ماخذ میں بھی شمار ہونے کے لائق ہے، جو ایک طرف اردو کی تعمیر و فروغ کی تاریخ مرتب کرنے میں مدد دیتے ہیں، تو دوسری طرف اردو، کے ان علاقوں کی بھی نشان دہی کرتے ہیں، جہاں اردو، ان علاقوں کی مقامی زبانوں کے اثر سے بنتے بنتے پھیلتی گئی، ایک طرف اردو اگر دکن میں جنم لے رہی تھی تو دوسری طرف پنجاب میں اس سے پہلے پیدا ہو چکی تھی، لیکن اس سے کہیں پہلے وہ راجستھان میں بھی پیدا ہو چکی تھی، اور یہاں کے مقامی اثر سے وہ .... امتزاجی رنگ میں جلوہ گر ہونے لگی تھی۔

تاریخ غریبی اپنی گوناگوں دلچسپیوں اور داخلی شواہد و حقائق کی بنا پر اس امر کی طرف نشاندہی
...تی ہے کہ بارہویں صدی ہجری کے نصف اوّل میں ہندوستانی زبان کا یہاں خاصہ چلن تھا،
...یسا کہ تاریخ غریبی کی زبان سے اندازہ ہوتا ہے، اسی اعتبار سے اردو کی ساخت و پرداخت
...متعین کرنے میں یہ ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

علامہ پروفیسر محمود شیرانی نے دو قسطوں میں اس اہم مخطوطہ پر اورنٹیل کالج میگزین میں
...فصیل سے بحث کی ہے، جو اب مقالات شیرانی کی جلد دوم کی زینت ہے۔ اس وقت تک
...ن کے پاس صرف ایک ہی نسخہ تھا، جو موصوف کو سید خیرالدین صاحب وکیل ٹھکانجات
...ے پور سے دستیاب ہوا تھا۔ بقول ان کے تاریخ غریبی میں سات سو صفحات ہیں اور دس ہزار
...شعار پر محتوی ہے۔ ادارۂ ہٰذا کا نسخہ قدرے مختلف ہے، اُس میں کل صفحات آٹھ سو پچیس ہیں اور
...م و بیش دس ہزار سات سو پچیس اشعار ہیں۔ جس کے ہر صفحہ پر تیرہ سطور کا مسطر متعین ہے محمود
...شیرانی کے نسخہ کی کتابت کا سال ۱۲۴۲ھ ہے اور یہ مذکورہ سال کتابت اس لئے قرار پاتا
ہے، کہ اس کے کاغذ پر ۱۲۴۲ھ چھپا ہوا ہے، اور ہمارے نسخہ کا سال کتابت ۱۲۶۷ھ مرقوم
ہے، جس کا ترقیمہ فارسی میں ہے۔ جو اس طرح ہے۔ "ہر کہ خواند دعا طمع دارم، زانکہ من بندۂ
...نہگارم، تمت تمام شد کتاب تاریخ غریبی من تصانیف محمد جی میاں ولد شیخ مجتبیٰ کاتب الحروف
...قیر حقیر میران جی میاں بن سید عبداللہ ساکن بنوانہ بتاریخ نہم شہر جمادی الاوّل ۱۲۶۷ھ
...ن نوشتم صرف کردم روزگار، من نمانم این بماند یادگار، تمت تمام شد، کار من نظام شد۔"!
اس واضح ترقیمہ سے نہ صرف تاریخ کتابت متعین ہوتی ہے، بلکہ مصنف کے نام کا بھی بیّن
ثبوت مل جاتا ہے۔ اور کاتب الحروف کا بھی۔ جو محمود شیرانی والے نسخہ میں نہیں ہے، اس لیے کہ
خود محمود شیرانی نے لکھا ہے کہ مصنف کا کہیں نام نہیں ملتا، صرف اتنا ملتا ہے کہ وہ خوب میاں کا

خانہ زاد ہے، اور میاں عیسٰیؒ اس کے مرشد ہیں، خوب میاں عرف اور سید مرتضیٰ اصل نام ہے، جن کا چھٹی پشت میں حضرت میران سید محمد مہدی جونپوری سے سلسلہ ملتا ہے[1]، بندگی میاں محمد عیسٰی اہل دائرہ (شیخاواٹی راجستھان) کے مقبول ترین پیشوا گزرے ہیں۔ جو ۱۱۲۱ھ میں عماد الدین کی وفات کے بعد مسندِ ارشاد پر جلوہ افروز ہوئے ہیں، اور ۱۱۵۱ھ میں انتقال کرتے ہیں[2]

ایک تیسرا نسخہ ہمیں سیکر سے دستیاب ہوا ہے جو اوّل و آخر سے ناقص ہے، ابتدا سے چار صفحات اور آخر سے چند شعر غائب ہیں، اس کا مسطر بھی تیرہ سطور پر مشتمل ہے کل بیات سو چھیانوے صفحات ہیں۔ آخری سرخی اس طرح ہے "ختم الکتاب واللہ اعلم بالصواب" اور جب کا آخری شعر اس طرح ہے:

اس غریب نیں (نے) لکھی غریبی
بھیجے سب کوں (سب کو) نفع نصیبی

متذکرہ دونوں نسخوں کی کتابت میں اختلاف ہو سکتا ہے، آخر الذکر نسخہ قدرے صاف نستعلیق میں ہے۔ اور پختہ ہے، اور بارہویں صدی ہجری کے آخری نصف میں مکتوبہ ہے، اور بہت ممکن ہے کہ یہی مصنف کا اصل نسخہ ہو، اس لیے کہ اب تک مصنف کا اصل نسخہ معلوم نہیں ہو سکا ہے، ایک تو مرورِ ایام سے اس کا کچھ حصہ ضائع ہو گیا، دوسرے اس کا ترقیمہ نہ ہونے سے دورِ کتابت کا یقین ہونے میں دشواری درپیش ہے، تیسرے یہ کہ اس علاقہ میں سے دستیاب ہوا ہے، جہاں مہدویہ تسلط رہا ہے، یعنی شیخاواٹی کے علاقہ سیکر کی ایک درگاہ کے سجادہ نشین کے پاس سے ملا ہے، شیرانی صاحب والے نسخہ کو اگر ۱۱۴۳ھ کے کاغذ پر چھپے سال کو سال کتابت مان لیا جائے تو ان کے نسخے کو تقدم زمانی حاصل ہو جاتا ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ جس سال کاغذ کی

---

[1] مقالات محمود شیرانی جلد دوم۔ ص ۲۴۲ [2] ایضاً

ساخت ہوئی ہو، اسی سال کتابت بھی کی گئی ہو۔ سنہ ۱۰۴۲ھ میں کاغذ بنا، ہندوستان کب آیا، اور کب تک رہا۔ اور پھر کب کتابت ہوئی یہ کوئی یقینی نہیں ہے۔ اگر یہی سال کتابت مان بھی لیا جائے تو تاریخ کتابت سنہ ۱۱۵۵ھ قرار پاتی ہے اور سال تصنیف سنہ ۱۰۵۸ھ مرقوم ہے اس لحاظ سے تاریخ تصنیف سے پہلے کس طرح کتابت کی جا سکتی ہے کاغذ کی ساخت کا سال کاغذ پر سنہ ۱۰۴۲ء درج ہے، جو سنہ ۱۱۵۵ھ سے مطابقت کرتا ہے۔ اس لئے ہم اس نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں کہ تینوں نسخ میں صرف ادارے کے مخزونہ نسخہ کی کتابت متعین ہے۔ جو سال تصنیف کے ستانوے سال بعد ہوئی ہے۔ حالانکہ سیکر والے نسخہ کو تقدم زمانی حاصل ہے۔ لیکن اسکی تاریخ کتابت درج نہیں ہے۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ یہی نسخہ زیادہ مستند معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ راجستھان میں دائرۂ شیخاواٹی کے علاقے میں مہدویہ خانوادے میں محفوظ رہا ہے۔ جیسا کہ ترقیمہ میں اور صفحۂ اول و سوم کی مرقومہ تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ ترقیمہ میں کاتب نے اس تصنیف کو محمد جی میاں بن شیخ مبتی کی بتایا ہے، اور اپنا نام کاتب الحروف فقیر حقیر میران جی میاں بن سید عبد اللہ ساکن جھنوانہ لکھا ہے۔

یہ حضرت میران سید محمد مہدی جونپوری جو مہدوی سلسلہ کے بانی مبانی تھے ان کی اولاد یا سلسلہ سے معلوم ہوتے ہیں، نام کی نسبت بھی اس امر واقعہ کی طرف دلالت کرتی ہے۔ تیسرے صفحہ پر یہ تحریر ہے، "این کتاب فقیر میرانجی صاحب منجلے میاں است، اگر کسے دعوی کند دروغ باشد"۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مالک کتاب اور کاتب الحروف ایک ہی ہیں جن کو عرف عام میں منجلے میاں بھی کہتے تھے، جن کا اصلی نام سید محمود تھا، جیسا کہ صفحۂ اول کے ایک نوٹ سے ظاہر ہوتا ہے جس سے تاریخ وفات کاتب بھی برآمد ہوتی ہے، وہ نوٹ اس طرح ہے۔ "بتاریخ بست و ہفتم ماہ رجب سنہ ۱۱۶۳ھ روز دوشنبہ وقت نماز ظہر انتقال قبلہ سید محمود معروف میرانجی میاں صاحب مرحوم شد"۔ ان تحریروں سے یہ نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

۱ ۔ اسم مصنف متعین ہو جاتا ہے، اس لیے کہ کاتب نے تاریخ غزیبی کو من تصانیف محمد حاجی میاں ولد شیخ مجتبیٰ لکھا ہے۔

۲ ۔ اس نسخہ کی ملکیت بھی کاتب الحروف کی رہی ہے، جو اس نے خود مصنف کے تعلق خاطر سے اپنے لیے لکھا ہوگا۔

۳ ۔ کاتب الحروف کا سال وفات بھی اسی سے واضح ہو جاتا ہے۔

۴ ۔ کاتب کا اصل نام، عرفیت، ولدیت اور مصنف کا نام مع ولدیت بھی ان تحریروں سے متعین ہو جاتے ہیں، لیکن مصنف اور کاتب کے حالات پھر بھی پردۂ خفا میں ..... ہیں، پروفیسر محمود شیرانی نے مصنف کا نام بھی نہیں بتایا، صرف قیاساً یہ بتایا ہے کہ شاید غریب مصنف کا تخلص ہو، جو خوب میاں کے خانہ زاد اور میاں عیسیٰ کے مرید معلوم ہوتے ہیں، ہمارے نسخہ سے مصنف کا نام ضرور متحقق ہو جاتا ہے، لیکن حالات زندگی اور دوسری تصانیف کا پتہ نہیں چلتا۔ مصنف عالم دین اور متبحر فاضل ضرور نظر آتے ہیں، جیسا کہ ان کی اس گرانقدر تصنیف سے مترشح ہوتا ہے اور پھر ترقیمہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے، کہ انکی اور تصانیف میں سے یہ تاریخ غزیبی ایک اہم تصنیف ہے۔

تاریخ تصنیف: ۔ پروفیسر محمود شیرانی نے داخلی شواہد کی روشنی میں تصنیف کی تاریخ متعین کی ہے، کہ کچھ سال میں یہ کتاب مکمل ہوئی۔ اس لئے کہ ابتدائی اشعار میں ایک شعر یوں ہے۔ ؎

گیارہ سے چوسٹھ پر بنی
پوری کری فضل کر دھنی

ترقیمہ کے آخری شعروں میں اس طرح ہے۔ ؎

شہر بیانے میں یہی پوری ہوئی کتاب — لکھنے پڑھے جو کوئی سنے سیکوں ہوئے ثواب

تیرھویں جو صفر کی پیر بارینہ آج ٭ گیارہ سو ستر بھٹے جو اسو پورن کاج

اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ۱۱۶۲ھ میں کتاب کی ابتدا ہوئی اور ۱۱۷۰ھ میں اس کی تکمیل ہوئی۔ جیسا کہ اوپر کے دونوں شعروں سے ظاہر ہوتا ہے، اور یہ تصنیف بیانہ میں ہوئی ہے، جو بقول شیرانی صاحب صدریہ خانوادے کے مراکز میں سے ایک اہم شہر رہا ہے بیانہ بھرتپور میں ہے، اور اب بھی یہاں کے قدیم آثار و کتبات عہد رفتہ اور عظمت پارینہ کی یاد دلاتے ہیں۔

اس نسخہ پر کاتب نے ترقیمہ میں اپنے آپ کو ساکن بوانہ بتایا ہے، جو شیخاوائی علاقہ میں ہے، اور دائرے کے قریب ہے، دائرہ شیخاوائی کا قدیم علمی مرکز رہا ہے، جہاں صدری تسلط و مرکزیت کے آثار و اعلام، سندات و مخطوطات اور تبرکات کی شکل میں اب بھی موجود ہیں، تیسرا نسخہ شیخاوائی کے ایک اور ضلع سیکر سے دستیاب ہوا ہے جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے، پروفیسر محمود شیرانی کو بھی یہ اسی علاقہ سے فراہم ہوا تھا، اس طرح محمود شیرانی نے جب تاریخ غزبی پر مقالہ لکھا تھا، اس وقت صرف یہی ایک نسخہ معرض وجود میں تھا، جو پنجاب لائبریری لاہور کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس کے بعد ہمیں دو نسخے اور مل چکے ہیں، دونوں اس ادارے میں موجود ہیں، تاریخ غزبی کا زیر نظر نسخہ جس کا تذکرہ کیا جا رہا ہے، ان تینوں میں مکمل ترین نسخہ ہے حالانکہ وہ بھی اصل نہیں ہے، ۱۲۶۷ھ کا نوشتہ ہے، لیکن مکمل معلومات کا حامل ہے۔

کتاب حمد و نعت و منقبت سے شروع ہوتی ہے۔ اس کے بعد صدریہ سلسلہ کے جو پانچ اصحاب کبار ہیں ان کے مناقب کے ساتھ مثنوی آگے بڑھتی ہے، پھر آفرینش نور محمدی سے حضور سرور کائنات فخر موجودات صلعم کے حالات و واقعات سے بحث کرتی ہے، جس میں انبیائے کرام کے قرانی قصص بھی بیان کیے گئے ہیں، اور علمی و دینی مباحث، احادیث اور آیات قرآنیہ بھی پیش کی گئی ہیں، اور مثنوی کے زور کلام اور اقدار کے پیش نظر اخلاقی اور سبق آموز قصے بھی بیان کیے گئے ہیں۔

جن میں قرآنی قصص کے علاوہ اولیائے کرام کے مشہور واقعات بھی ملتے ہیں، احادیث اور فقہی فروع
واصول کی روشنی میں بھی بہت سے واقعات کو قلمبند کیا گیا ہے۔ جو اسلامی معاشرے اور ثقافتی
ومذہبی اقدار کو پیش کرتے ہیں، ہر عنوان کو سرخیوں میں لکھا ہے، اور ہر واقعہ کے بعد کچھ دوہے، اور
سورٹھ بھی دیئے ہیں۔ محمود شیرانی نے اس کو مثنوی ہی قرار نہیں دیا ہے۔ بلکہ اس کے وزن کو ہندی زا
کہا ہے، جس کو حضرت امیر خسروؒ نے فارسی سے متعارف کرایا تھا۔

تاریخ اردو، قدیم اردو کے ماخذ میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ اس لیے کہ اب تک جن قدیم
مخطوطات کا ذکر ملتا ہے، ان سے دکنی، ہریانی، پنجابی اور گجراتی زبانوں کے اثرات اردو میں
دکھائی دیتے ہیں۔ اب تک راجستھانی زبان کے اثرات مکمل طور سے روشناس نہیں ہوئے۔
پہلی بار اس ضخیم مثنوی تاریخ نوبی سے اردو کے لسانی ارتقا میں راجستھانی اثرات پوری پوری
طرح واضح ہوتے ہیں، اس کے ذریعہ نہ صرف لسانی ارتقا میں راجستھان کا اثر دکھائی دیتا ہے۔
بلکہ راجستھان کے مختلف بالخصوص مارواڑی اور ڈھونڈاری زبانوں کے اثرات، تصریفی قواعد،
ضرب الامثال وغیرہ کا مکمل طور سے اثر ملتا ہے۔ راجستھانی اثرات سے بہت سے الفاظ کی
نئی شکل بدلی ہوئی ملتی ہے، جو قدیم اردو میں پائے جاتے ہیں۔ ان قدیم الفاظ کا اس کتاب میں
کافی ذخیرہ ملتا ہے، جیسے باج سے باجن، جو باج کی جمع ہے دگانے والا، قندیل راجستھان میں مستعمل ہے
جس کی جمع قندیلاں اس کتاب سے ظاہر ہوتی ہے، جیسا کہ راجستھانی زبان میں رائج ہے، بہت سے
الفاظ راجستھان میں مستعمل ہیں، جو اب تک ٹونک کے عوام الناس میں بھی بولے اور سمجھے جاتے ہیں
جیسے باورچی کو بیرچی، جانور کو جناور، چوٹی کو چونٹا، بھیا کو بھاجی، بادمیں کو بادلیں، توکو تیں، تیرا کو
توسوں، تجھکو کو تجھکوں، کب کو کد، ایسا کو ایساں، کبھی کو کبھو، بے خبر کو بے خبرا، جماعت کو جمات
دکھیل کو دکھیلا، سو کو سے دسیکڑا، اسی طرح بہت سے ایسے الفاظ جو خاص طور پر راجستھانی

ہی ہیں، تاریخ غریبی میں بکثرت پائے جاتے ہیں جو اردو میں راجستھانی اثر کو بالواسطہ ثابت کرتے ہیں۔ ہو جیو، دیجو، لیجو، بتلاجے، چلاجے، دے ہوں، لے ہوں، لوں گا، دوں گا، اس کوں، جائے کو جاجے بتائے کو بتاجے، کہنے کو کہہ جے، رہنے کو رہ جے، ان اشعار میں سے یہ چند الفاظ منتخب کئے ہیں طوالت کے خوف سے تمام اشعار کوٹ کرنے کے بجائے صرف دو شعر ہی پیش کئے جاتے ہیں۔

اس کوں اپنے پاس بلاجے　　　بھانت بھانت سمجھا جے

سب کو اللہ نیکی دیجو　　　خیر عاقبت ان کی کیجو،

اور اس کے مطالعہ سے بہت سے راجستھانی محاورات ملتے ہیں مثلاً بندی وان اب تک قیدی کے معنیٰ میں بولا جاتا ہے، اور پریشانی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، رسانا بمعنی غصہ ہونا بھلکانا چمکانا کے معنیٰ میں، جام پھل امرود، پسارنا، پھیلنا یعنی پاؤں پسارنا، پاؤں پھیلانا، سودھی، سیدھی کے بجائے، دھرا بمعنی رکھنا، اپڑ جانا، دھڑ جانا کے معنیٰ میں لوگ، لگائی، مرد و عورت کے معنیٰ میں۔ یہ ارادہ ارادت کا بگڑا ہوا ہے، بہار دینا، جھاڑ دینا کے معنیٰ میں۔ ہارے ہونا یعنی تھک جانا بوڑھی ہونا، باز آنا، باؤ، ہوا، نٹنا، انکار کرنا۔ ٹیبا، ٹیلہ، راجستھانی اثرات کے علاوہ عربی فارسی کے الفاظ کا غلبہ بھی نظر آتا ہے، چند الفاظ اپنی ہیئت بگاڑ کر راجستھانی اثر سے بالکل الگ سے لگتے ہیں، جیسے احد کو احدا لکھا ہے کہیں اول احد لکھا ہے، جو پہلے اور ایک کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے، صفت، تردد، غریب، عاجز جیسے بہ غریب عاجز تبلادے، یا ایک تردد دل میں آئے۔ نفع نصیبی، غریبی کے وزن کی خاطر نصیبی لکھ دیا گیا۔ مثلاً

اس غریبی نیں رلے، لکی غریبی

پہنچے سب کوں دسب کوں نفع نصیبی

نے کے بجائے نیں۔ کو کے بجائے کوں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کہیں تو راجستھانی اثرات سے

الفاظ بگڑے ہوئے ہیں، کہیں بدل کے آتے ہیں، اور کہیں جو عربی فارسی کے الفاظ استعمال ہوتے ہوتے بگڑ کر راجستھانی میں داخل ہو گئے، ایسے الفاظ بھی اس میں بکثرت ہیں، اور بہت سے ایسے الفاظ بھی اس میں کثرت سے ملتے ہیں، جو مصنف نے ضرورتِ شعری اور قافیہ کی خاطر خود بدل دیئے ہیں، اور ان کی املا تک بدل ڈالی۔ املا کی بدلی ہوئی شکل میں سمجھتا ہوں کاتب کی مرہونِ منت ہے
قافیہ کی کوئی پابندی نظر نہیں آتی۔ طا کو تا، الف کو عین سے بدل دیا، اور سین کو صاد سے بدل ڈالا، زا کو ضاد سے۔ حائے حُطّی کو ہائے ہوز سے بدل دیا۔ ضرورتِ شعری کے لحاظ سے کہیں الف گرا دیا۔ کہیں الف کو عین سے بدل دیا۔ کہیں صحیح کو راجستھانی تلفظ کی طرح صحی لکھدیا۔ قافیہ کی پابندی کی خاطر اکثر املا کے قواعد کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، پوری مثنوی میں مارواڑی اور ڈھونڈاری زبان و بیان کے پرتو زیادہ نظر آتے ہیں۔ جو مقامی رسم الخط کو بھی کہیں کہیں ظاہر کرتے ہیں
مثنوی تاریخِ غریبی ایک علمی، مذہبی اور لسانی اعتبار سے ایک اہم تصنیف تو ہے ہی ثقافتی اور ادبی لحاظ سے بھی ایک قابلِ قدر سرمایہ ہے، جو ایک طرف اگر لسانی مباحث چھیڑتی ہے تو دوسری طرف علمی، ادبی اور مذہبی معلومات بھی فراہم کرتی ہے، بلکہ اس دور کے اقدار، اطوار، آثار اور مروجہ اصطلاحیں، اور روزمرہ کے محاورات، عربی فارسی کے بگڑے ہوا الفاظ کا ذخیرہ راجستھانی شکل میں لسانی تغیر و تبدل انداز فکر، طرز تحریر اور مقامی زبان و بیان سے فارسی زبان کی آمیزش سے جو خوش رنگ امتزاج پیدا ہو جاتا ہے، اس کا پورا پورا اثر اس مثنوی سے جلوہ گر ہوتا ہے، جو اردو کے راجستھان پر اثرات اور راجستھان کے اردو، فارسی پر اثرات کی ترجمانی کرتی ہے، یہی نہیں بلکہ جہاں اس سے اسلامی تاریخ و تمدن اور مذہبی روایات و حقائق سامنے آتے ہیں، راجستھانی ثقافتی جھلکیاں بھی سامنے آتی ہیں، جو ہمارا مشترکہ تہذیبی سرمایہ اور ثقافتی ورثہ ہے، ایک طرف اگر تاریخِ غریبی اردو کے ابتدائی خط و خال متعین کرتی ہے۔

ردوسری طرف مشترکہ تہذیب کے دل پسند اور بیش بہا سرمایہ کی بھی نشاندہی کرتی ہے، جہاں
وہ تاریخی روایات وحکایات کو پیش کرتی ہے، وہاں راجستھان میں عہد دیہ تسلط کے آثار و
ند ار اور عصری اثرات و روایات کو بھی منظر عام پر لاتی ہے اس لئے اس تاریخ سے اب
ہیں نہ صرف اردو کے لسانی تاریخ کا مطالعہ کرنا پڑے گا، بلکہ اس میں الفاظ و معانی اور
سا ورات وروایات کا جو غیر معمولی ذخیرہ ہے، اس کو بھی پرکھنا پڑے گا، جہاں تاریخ کے
ناردا علام پر تبصرہ کرنا پڑے گا۔ وہاں علمی ادبی اور مذہبی قدروں کو بھی دیکھنا پڑے گا، ایک
مقرر کرنی ہوگی، اور ایک درس متعین کرنا ہوگا، اس اعتبار سے تاریخ غزنی اردو زبان
دب کا ایک بیش بہا اور قابلِ قدر ماخذ ہے، جو اپنے داخلی شواہد وحقائق لسانی ساخت و
داخت اور امتیازی شان امتزاج کے لحاظ سے اپنے دور کی اہم بالشان دستاویز ہے۔

نقوش سلیمانی

ہندوستانی اور اردو زبان و ادب سے متعلق مختلف ادبی کانفرنسوں کے خطبہ ہائے
رارت، تقریروں، تحریروں، تنقیدوں، تبصروں اور مقدموں کا مجموعہ جن کا انتخاب خود فاضل
منف نے اپنی زندگی میں کیا تھا، اور نہایت اہتمام سے معارف پریس میں چھپوایا تھا۔
ی اڈیشن کا عکسی اڈیشن اسی اہتمام کے ساتھ دارالمصنفین نے معارف پریس میں
ھپوا کر شائع کیا ہے۔ یوں تو اس مجموعہ کا ہر مضمون مصنف کی تلاش وجستجو اور تحقیق
شاہکار ہے۔

قیمت ۳۰ روپیے "منیجر"

اسلام اور مستشرقین جلد اوّل

پر

کچھ اظہارِ خیالات

از جناب شیخ نذیر حسین صاحب

مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

مکرمی و معظمی جناب سید صاحب السلام علیکم

دار المصنفین کے سمینار ۱۹۸۲ء کی روداد کی پہلی اور دوسری جلد موصول ہوئی، آپ نے جس محبت اور خلوص سے میرا ذکر کیا ہے، میں اس کے لیے شکر گذار ہوں۔

روداد کی جلد اوّل (صفحہ ۲۰۰) میں مفتی سیاح الدین کاکا خیل کی تقریر پڑھ کر حیرت اور افسوس ہوا، میرا گمان ہے کہ انھوں نے سنی سنائی باتوں پر اعتماد کر کے اردو دائرۂ معارف اسلامیہ کے خلاف غلط بیانی کی کوشش کی ہے، انھیں بغور دیکھنے اور پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا، ان کی یہ ساری تقریر بے خبری، اور تنگ نظری کی دلیل ہے۔

مفتی سیاح الدین صاحب پاکستان میں رہتے ہوئے ہماری غلطیوں اور فرو گذاشتوں (اگر فی الواقع کوئی ہوں) کی نشاندہی کر سکتے تھے، اور ہم ان کی بروقت تصحیح بھی کر سکتے تھے، ہم خط و کتابت سے ان کی غلط فہمی کو دور کر کے ان کی پوری تسلی و تشفی بھی کر سکتے تھے،

ہم انھیں اطمینان دلا سکتے تھے کہ ہم مستشرقین کے تعصب اور ان کی غلط بیانیوں سے اچھی طرح واقف ہیں، اور ہم علوم اسلامیہ کی ترجمانی ان سے بہتر انداز میں کر سکتے ہیں، خدا معلوم کہ انھوں نے غصہ نکالنے کیلئے دارالمصنفین کے سمینار کو کیوں پسند کیا، شاید انھیں کسی وجہ سے کوئی ذاتی شکایت ہے۔

بہرحال میں مفتی سیاح الدین صاحب اور ان کے دوسرے ہم نواؤں کی آگاہی کیلئے اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی امتیازی خصوصیات کا ذکر کرتا ہوں جن کی وجہ سے اس تصنیف کو ایک جداگانہ اور مستقل حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔

۱۔ مقالات میں ضروری اضافے، ترمیم و تنسیخ اور اضافات اسلامی تصورات اور اسلامی سوانحی کتاب کی روشنی میں کئے گئے ہیں۔

۲۔ اصل مقالات میں سنین، واقعات، حقائق اور مآخذ میں ضروری تصحیح کی گئی ہے۔

۳۔ پاکستان اور اسلامی ہند سے متعلق اہم موضوعات پر نئے مقالات لکھوائے گئے ہیں۔ اور برصغیر کی ممتاز شخصیتوں کو خاص طور پر شامل کیا گیا ہے۔

۴۔ اسلامی عقائد، نظریات اور عبادات پر نئے مضامین علمائے ادارات نے خود لکھے ہیں یا پاکستان کے مشاہیر اہل علم سے لکھوائے گئے ہیں، اس بارے میں ہمیں مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم (کراچی)، اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب (پیرس)، کی قلمی معاونت حاصل رہی ہے۔

۵۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ اور آپ کی حیات طیبہ کے مختلف گوشوں پر ایک مبسوط مقالہ، جو ۰ ۲ صفحات پر مشتمل ہے، ایک رکن ادارہ نے لکھا ہے۔

۶۔ قرآن مجید کی تمام سورتوں کے مطالب و مضامین پر علیحدہ علیحدہ مقالات لکھے گئے ہیں،

۷۔ اسلامی اور پاکستانی زبانوں اور ان کے ادب پر جامع مقالات کا اضافہ کیا گیا ہے۔

۸ ۔ اسلامی ادبیات (عربی، فارسی، اردو، پنجابی وغیرہ) میں نعت گوئی کے موضوع پر ایک سلسلۂ مضامین لکھوایا گیا ہے۔

۹ ۔ اسلامی ممالک (انڈونیشیا سے لیکر موریطانیہ تک) کے آجکل کے حالات کی طرف خاص توجہ مبذول کی گئی ہے، اور اسلامی تحریکات کو خاص جگہ دی گئی ہے۔

۱۰ ۔ جلد ۱۳/۱ کا موضوع علم اور علما ہے، اور یہ جلد جملہ علوم اسلامیہ کی تاریخ کے لیے وقف ہے، یہ سارے مقالات علمۂ ادارت کے نتائج قلم کا نتیجہ ہیں، جن کو مفتی صاحب مترجمین کے حقیر نام سے یاد کرتے ہیں۔

۱۱ ۔ اسلامی ہند کی اہم شخصیتوں اور مشاہیر اہل علم کے متعلق نئے مقالات لکھے یا لکھوائے گئے ہیں، مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ انگریزی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (قدیم) میں نواب سید صدیق حسن مرحوم پر مضمون آدھے صفحے کا ہے، جو ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (الہ آباد یونیورسٹی) کا تحریر کردہ ہے، جب کہ ہم نے نواب صاحب کے حالات چار، پانچ صفحات میں لکھ دیئے ہیں۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے نئے انگریزی ایڈیشن میں کراچی کے ایک مسلمان مقالہ نگار نے، جو خیر سے اس کے علمۂ ادارت میں بھی شامل ہے، "دارالعلوم" کے عنوان پر ایک مختصر سا مقالہ لکھا ہے، جس میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کا ذکر نازیبا الفاظ میں کیا ہے جب کہ راقم السطور نے ۳۰ ۔ ۴۴ صفحات کا مفصل مقالہ بعنوان مکاتب و مدارس لکھا ہے۔ اور اس میں عالم اسلامی کے دینی مدارس (زمانہ قدیم سے عصر حاضر تک) کے حالات کے علاوہ بھارت کے موجودہ عربی مدارس بشمول ندوۃ العلماء کا مناسب الفاظ میں ذکر کیا ہے، یہ مقالہ ڈاکٹر سید سلمان ندوی (ڈربن) دیکھ اور پڑھ چکے ہیں۔

اس ضمن میں ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب صدر شعبہ، جن کی جلد صحت یابی کے ہم س

تمنی ہیں، کے مبسوط مقالے "المنقّح والمعلوم" کا ذکر بھی مناسب ہوگا، جس میں اسلام کے اصول تعلیم و تربیت پر حکیمانہ گفتگو کی گئی ہے، اور یہ خاصے کی چیز ہے۔ اس طرح کے سینکڑوں نئے مقالات ہیں، جن کا ذکر موجب طوالت ہوگا۔

۱۲ ۔ جو موضوعات مطبوعہ جلدوں میں شائع نہیں ہو سکے یا جن مشاہیر کا ذکر نہیں آسکا ن کے حالات کے لئے ایک علیحدہ جلد پیش نظر ہے، جس کا نام تکملہ ہوگا۔

۱۳ ۔ مختصر اردو دائرہ معارف اسلامیہ کی تدوین کا آغاز کر دیا گیا ہے۔

اب یہ فیصلہ ناظرین معارف، شرکائے سیمینار اور دوسرے اہل علم کے ہاتھ ہے کہ آیا اردو دائرہ معارف اسلامیہ صرف یہودی مستشرقین کے مقالات کی نقل ہے یا ادارہ کے شرکائے کار نے خود بھی بے شمار نئے مضامین لکھ کر اس میں اپنی آنکھوں کا تیل اور جگر کا خون بھی شامل کر دیا ہے۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ، ۲۰ جولائی ۱۹۷۶ء کو اپنے بھتیجے محمد میاں مرحوم اور مولوی معین اللہ نائب ناظم ندوۃ العلماء کی معیت میں ہمارے ادارے میں تشریف لائے تو انھوں نے اپنے تاثرات میں لکھا۔ !

"برسوں سے آرزو تھی کہ اس عظیم الشان علمی کام کے مرکز اور اس کی سرگرمی کو بچشم خود دیکھوں اور اس کے فاضل رفقاء و شرکائے کار سے ملوں .... جب سے یہ کام مولوی محمد شفیع صاحب مرحوم کی نگرانی میں شروع ہوا، اس وقت سے میرے دل میں اس کی بڑی قدر و منزلت تھی، اور میں اس کو پاکستان کے لیے باعث فخر سمجھتا تھا، واقعہ یہ ہے کہ جس پیمانے اور جس بلند ہمتی اور دیدہ وری و دیدہ ریزی سے یہ کام (جو عالم اسلام کے ذمہ عرصۂ دراز سے قرض اور فرض تھا) یہاں انجام پا رہا ہے، اس کی نظیر عرب ملکوں میں (جن میں علمی حیثیت سے

مصر سب سے آگے ہے ، جو اس کام کی تکمیل کے سب سے زیادہ مستحق تھے ، نہیں پائی جاتی "۔

" میں حکومت پاکستان ، پنجاب یونیورسٹی اور دائرہ معارف اسلامی کو اس پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دل سے دعا کرتا ہوں کہ یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچ کر مسلمانوں کے لیے باعث سرخروئی اور تمام دنیا کے اہل علم اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے تحفہ بے بہا ثابت ہو "

چند ماہ ہوئے ہم نے بعض ہندی مشاہیر علما (مولانا محمد الیاس ، محمد اعلی تھانوی ، (کشاف اصطلاحات الفنون) اور محمد انور شاہ) پر لکھے ہوئے مطبوعہ مضامین کی نقلیں مولانا موصوف کی خدمت میں بغرض تبصرہ روانہ کی تھیں ، ان مضامین کو پڑھ کر حضرت مولانا نے راقم السطور کے نام خط میں یہ لکھا ۔

لکھنو ۔ ۱۰ فروری ۱۹۸۶ء

مکرمی شیخ صاحب زید لطفہ

عنایت نامہ معہ اردو انسائیکلو پیڈیا کے تراشے کے ملا ۔ مولانا الیاس صاحب پر اس میں اچھی تخلیص آگئی ہے ، آپ نے انسائیکلو پیڈیا کی شکل میں بڑی علمی و دینی خدمت انجام دی ہے ، اللہ تعالےٰ قبول فرمائے ، امید ہے کہ بقیہ جلدیں بھی ندوۃ العلماء کی لائبریری پابندی سے بھیجتے رہیں گے ، خدا کرے سب طرح سے خیریت ہو ۔

محترمی ڈاکٹر سید عبد اللہ صاحب کی خدمت میں سلام والسلام ۔ ابوالحسن علی

چند برس ہوئے کہ مصر سے لائیڈن کے SHORTER ENCYCLOPAEDIA OF ISLAM کا عربی ترجمہ الموسوعۃ العربیہ المیسرہ (قاموس الاسلامی) کے نام سے شائع ہوا تھا ۔ اس کے بے بصر مترجموں نے کسی حذف و اضافہ اور اصلاح و تبدیلی کے بغیر یہ ترجمہ شائع

کر دیا تھا۔ اس پر پیپر نقد و تبصرہ کرتے ہوئے استاد انور الجندی (قاہرہ) نے ابوظبی کے مجلہ منار الاسلام (۱۱ مارچ ۱۹۸۰ء) میں لکھا ہے کہ الموسوعۃ العربیہ المیسرہ کے مترجموں کے لیے یہ مناسب تھا کہ وہ ترجمہ کرتے وقت پنجاب یونیورسٹی کے شائع کردہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کو پیش نظر رکھتے۔

اب اہل علم ذرا غور فرمائیں کہ دنیائے اسلام کے دو جلیل القدر مصنف و مفکر ہمارے کام کی تحسین و تصویب فرما رہے ہیں اور ایک ہمارے مفتی صاحب ہیں، جو دار المصنفین کے سیمنار میں ہمارے خلاف قرار داد پاس کرانے اور ہمارے کیے کرائے پر خط تنسیخ پھرانے کے لیے کوشاں تھے، مفتی صاحب ساری عمر لائل پور (فیصل آباد) کی جامع مسجد میں دینی کتب پڑھاتے اور ان کی شرحوں و حاشیوں کی ورق گردانی کرتے رہے ہیں، علمی تحقیق کا جدید انداز اور نیا پیرایہ بیان ان کے ذوق و مزاج سے مختلف اور ان کے فکر و نظر کی سطح سے ذرا اونچا ہے۔ اس لئے وہ استشراق کے وسوسوں میں پھنس گئے ہیں۔ ؎

سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجا است

بہر حال میں مفتی صاحب اور ان جیسے دوسرے کرم فرماؤں کی اطلاع کے لیے عرض کرتا ہوں کہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے شرکائے کار انگریزی کے علاوہ علوم عربیہ اسلامیہ میں بھی درک رکھتے ہیں، اور قومی غیرت و دینی حمیت میں کسی بڑے سے بڑے مولوی سے پیچھے نہیں ہیں۔ ان میں سے بیشتر کی عمریں پڑھنے پڑھانے تصنیف و تالیف اور تحقیق و تدقیق میں گذری ہیں، اور ان کی علمی خدمات کا اعتراف بیرون ملک کے فضلاء نے بھی کیا ہے۔

میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ ہمارا یہ کام غلطیوں اور فرو گذاشتوں سے

بالکل مبرا اور پاک ہے، کیونکہ کسی انسان کی علمی کاوش کو حرف آخر کا درجہ نہیں دیا جاسکتا، کہ علم و تحقیق کا قدم ہمیشہ آگے بڑھتا رہتا ہے، ہمیں اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کا پورا احساس و اعتراف ہے، لیکن میں صاحبان علم و فضل اور ارباب ذوق کی خدمت میں یہ گزارش ضرور کروں گا، کہ وہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ (اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام) کا مقابلہ و موازنہ دیگر ممالک اسلامیہ کے شائع کردہ عربی، فارسی اور ترکی کے اسلامی انسائیکلو پیڈیاؤں سے کرکے ہمارے کام کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ لگائیں۔ ۱۱ر جون سنہ ۱۹۸۶ء

مکاتیب شبلی حصہ اول و دوم

مولانا شبلیؒ نے اپنی ۵۷ سالہ زندگی میں اپنے اعزا و تلامذہ و احباب کو ہزاروں خطوط بھی لکھے تھے، جن کے جمع کرنے کا خیال سید صاحبؒ کو مولانا کی زندگی ہی میں ہوگیا تھا، مگر یہ مولانا کے انتقال اور دار المصنفین کے قائم ہونے کے سال دو سال کے بعد مکتوب الیہم سے حاصل کرکے جمع کیے گئے، جو دو جلدوں میں آئے، ان خطوط میں مولانا کے ملی و قومی خیالات، و تعلیمی افکار، ادبی و تاریخی نکات، مذہبی و دینی جذبات سب اکٹھا ہوگئے ہیں، یہ درحقیقت مولانا کے عہد کی ہر قسم کی اجتماعی جد و جہد کی تاریخ ہے۔

پہلی جلد میں عزیزوں اور ہر شعبۂ زندگی کے مشاہیر احباب کے نام خطوط ہیں، اور دوسری جلد تمام تر ان کے لائق تلامذہ، اور شاگردوں کے نام کے خطوط پر مشتمل ہے، اس سے ادب کی صنف خطوط نگاری میں بھی مولانا کے مرتبہ کا اندازہ ہوجائے گا، یہ تمام خطوط ہر صاحب علم و ادب کے مطالعہ کے لائق ہیں۔

قیمت علی الترتیب - ۲۲ روپیہ و ۱۸ روپیہ

جون ۱۹۸۶ء

(۲)

حضرت محترم و مکرم السلام علیکم و رحمۃ اللہ تعالیٰ و برکاتہٗ

نامۂ گرامی مورخہ ۲۰ مئی ۱۹۸۶ء مجھے ۱۰ جون ۱۹۸۶ء کو مل گیا، اور اس کے ساتھ "اسلام ا
مستشرقین" مقالات کے مجموعے بھی، جلد اول، جلد دوم، جلد چہارم، جلد پنجم، اور اسلامیات اور مغربی مستشرقین
و مسلمین مصنفین (جلد سوم عدم وصول ہے جو زیر طبع ہے)، آج جمعہ کو میں نے ان مقالات کو از اول
آخر دیکھا، بلکہ جلد اول تو کہنا چاہئے کہ سب ہی پڑھ ڈالی، آپ نے جس انداز سے تحریر فرمایا ہے میں
خود کو ایک بار پھر دارالمصنفین میں پایا۔

میں بخوبی اندازہ لگا سکتا ہوں کہ ان مقالات کی تدوین اور ترتیب میں کیا کیا مراحل در پیش
رہے ہوں گے، حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر بڑا کام کس طرح آپ نے کر ڈالا ہے، ان مقالات کی بڑی
اہمیت ہے، میں اب زیادہ محسوس کرتا ہوں کہ "اسلام اور مستشرقین"۔ . . . کا نفرنس اعظم گڈھ میں
نہ ہوتی تو اس درجہ قابل لحاظ و قدر مواد جمع ہونا ممکن نہ ہوتا، از راہ کرم میری طرف سے دلی مبارکباد قبول
فرمائیے اس عظیم خدمت پر۔

آپ نے میرا ذکر بڑی محبت سے فرمایا ہے، میں تو اب تک قیام کیلئے تو تعمیر کرنے کمرے کے اہتمام کو فراموش نہیں کر
ہوں، اب جلد اول میں آپ کے قلم سے لکھا ہوا اپنا حال پڑھ کر حیران ہوں کہ کیسے شکریہ ادا کروں ممکن نہیں ہے۔

ایک دکھ یہ بھی ہے کہ حضرت مفتی عتیق الرحمان صاحب اور پروفیسر سعید اکبر آبادی اب ہمارے درمیان نہیں
ان دونوں نابغۂ روزگار رجال سے میرے ذاتی تعلقات قدیم تھے، جلد اول میں انکا حال پڑھا تو دل بے قرار ہو گیا
مفتی صاحب سے دہلی میں دو بار جا کر ملا تھا، ان کو میں نے ہمیشہ پر امید پایا، معذوری کو انھوں نے بڑے حوصلے کے سا
قبول کیا تھا، پروفیسر اکبر آبادی تو کراچی میں تھے اپنے بارے میں وہ خود نہیں جانتے تھے، مگر میں جانتا تھا
کہ ان کا بچنا ممکن نہیں، آخر دم تک ہم نے ان کو نہیں بتایا کہ سرطان جگر کے وہ مریض ہیں، یہاں ان
دختر نیک اختر نے ایک اکیڈمی ان کے نام پر بنائی ہے افتتاحی تقریب میں میں بھی شریک ہوا تھا، خدا کرے
انکے مقالات چھپ سکیں۔

آپ کا مخلص

حکیم محمد سعید

ادبیات

غزل

از

جناب وارث ریاضی ایم اے، چمپارن، بہار

کبھی نزدیک رہتا ہے کبھی وہ دور رہتا ہے
وہ اپنی فطرتِ سیماب سے مجبور رہتا ہے

وہ جلوے جو فریبِ آگہی دیتے ہیں نظروں کو
انھیں جلووں کی تابانی سے دل پُر نور رہتا ہے

سنا ہے جب سے میں نے "وادیِ ایمن" کا افسانہ
تجلی ریز دل میں مثلِ شعلہ طور رہتا ہے

نگاہِ عشق سے وہ حُسنِ پنہاں چھپ نہیں سکتا
اگرچہ نکہتِ گُل کی طرح مستور رہتا ہے

سمجھتا ہے جو اپنے آپ کو مجبور دنیا میں
وہی انساں ہر اک گام پر مجبور رہتا ہے

نہ جانے کون ہے وہ بے نیازِ جام و میخانہ
کہ جو پیتا نہیں، آٹھوں پہر مخمور رہتا ہے

جمالِ علم و دانش ہے کمالِ خاکساری سے
وہ عالم کیا جو اپنے علم پر مغرور رہتا ہے

عبث ہے ماہ سیماؤں سے امیدِ وفا رکھنا
کہ اُن کی مملکت میں جور کا دستور رہتا ہے

خدا کا شکر ہے کہ بادۂ اسرارِ الفت سے
مرا پیمانۂ شعر و سخن معمور رہتا ہے

یہ وارثؔ بھی پرستارِ جمالِ یار ہے لیکن
وصال و ہجر کے جھگڑوں سے کوسوں دور رہتا ہے

مطبوعاتِ جدیدہ

تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات و احسانات — از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۴۴، مجلد، قیمت ۵۰؍ نئے پیسے

پتہ: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، پوسٹ باکس نمبر ۱۱۹، لکھنؤ۔

"اسلام ایک ابر کرم تھا، اور سطح خاک کے ایک ایک چپہ پر برسا" اس کے گوناگوں انعامات سے تمام نوع انسانی متمتع ہوئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت بھی ایک نعمت تھی، اور آپ کی امت بھی دنیا کے لئے سراپا خیر و برکت تھی، اس کے قدم جس سرزمین پر پڑے وہ گل و گلزار ہو گئی، اور مذہب و عقیدہ، تہذیب و معاشرت اور سیاست و تمدن کوئی چیز بھی اس کے اثرات سے خالی نہیں رہی، یہ کتاب نامور عالم و مصنف اور مشہور داعی و مفکر مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے گہربار قلم کا تازہ افادہ ہے، اس میں دنیا پر اسلامی عطایا اور بخششوں کا جائزہ لیا گیا ہے، جو مولانا کا محبوب موضوع ہے، اور اس پر وہ اپنی تصنیفی زندگی کی ابتدا ہی میں "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" نامی معرکۃ الآرا کتاب لکھ چکے ہیں اور اپنی دعوتی و تبلیغی تقریروں اور علمی و دینی اجتماعات میں بھی وہ اس پر برابر اظہار خیال فرماتے رہے ہیں، مگر زیر نظر کتاب میں انھوں نے اپنی گوناگوں مشغولیتوں کی وجہ سے انتخاب و اختصار سے کام لیا ہے، اور دنیا کو اسلام کی جانب سے عطا ہونے والے ان دس اہم اور بنیادی عطیات و انعامات کا ذکر کیا ہے، توحید کا صاف اور واضح عقیدہ، انسانی وحدت و مساوات کا تصور، انسانی شرافت و عظمت، عورت کے حقوق، نفسیات انسانی میں حوصلہ مندی اور اعتماد و افتخار کی آفرینش، دین و دنیا کا اجتماع، دین و علم کے

درمیان مقدس دائمی رشتہ کا قیام و استحکام، علم و عقل سے اعتقاد کی ہمت افزائی، عالمی رہنمائی اور انفرادی و اجتماعی اخلاق کی نگرانی کرنے والی امت کا ظہور، عقیدہ و تہذیب کی عالمی وحدت، فاضل مصنف نے قرآنی آیات و احادیث سے اسلامی تعلیم پیش کرکے دلشگاف انداز میں ثابت کیا ہے کہ یہ سب چیزیں دنیا کے لیے اسلام کا بیش بہا عطیہ و انعام ہیں، اور ان کے انسانی زندگی پر دور رس اثرات و نتائج مترتب ہوئے، اس سلسلہ میں ان امور کے بارہ میں اسلام سے پہلے کی مختلف قوموں اور ملکوں کے عقائد و نظریات بھی بیان کئے ہیں، اس تقابل سے اسلام کے عطیہ و برکت کی خوبیاں اور خصوصیات اور اس کی عظمت و اہمیت زیادہ نمایاں ہو گئی ہے۔ یہ کتاب عربی زبان میں لکھی گئی تھی، مولوی شمس تبریز خاں صاحب نے اس کو اردو کا جامہ پہنایا ہے، ترجمہ میں مصنف کے مخصوص اسلوب و طرز نگارش، زور بیان اور روانی اور داعیانہ و حکیمانہ انداز کو باقی رکھنے کی پوری کوشش کی ہے، لیکن آیتوں کے ترجمہ میں کہیں کہیں تسامح ہو گیا ہے جیسے صفحات ۲۲، ۶۹، ۷۱، ۷۲، ۹۶ اور ۱۱۲ پر، توقع ہے کہ لائق مترجم اپنی بالغ نظری سے خود ان کی تصحیح کریں گے، ص ۳۶ اور ص ۱۱۳ پر بعض فقروں اور لفظوں کے ترجمے چھوٹ گئے ہیں۔

مسلمانوں کے مسائل و جذبات کو سمجھنے کی کوشش کیجئے } از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۰ قیمت تین روپیہ۔ پتہ۔ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ باکس ۱۱۹، لکھنؤ۔

یہ کتابچہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی اس گفتگو پر مشتمل ہے، جو دانشوروں اور صحافیوں کے ایک منتخب مجمع کے سامنے دلی میں کی گئی تھی، اس میں پہلے ہندوستان کے مختلف فرقہ و مذہب کے لوگوں کو ایک دوسرے کے احساسات و جذبات سے واقف ہونے اور ان کے مسائل و معاملات کو سمجھنے کی ضرورت و اہمیت بتائی ہے، پھر عقیدہ و مذہب، دینی تعلیم جس کا دوسرے درجہ میں اردو بھی

شامل ہے، مسلم پرسنل لا، نبی اکرمؐ، قرآن مجید، مسجدوں اور مقامات مقدسہ (مکہ و مدینہ) کے بارہ میں مسلمانوں کے شدید جذباتی تعلق کا ذکر کیا ہے، اور اس کا لحاظ کرنے کو حق پسندی، حب الوطنی اور ہمسائگی کا تقاضا بتایا ہے، اسی گفتگو میں ظلم و تشدد، فرقہ پرستی و جارحیت، اخلاقی و انتظامی انتشار، رشوت اور بدعنوانی کو ملک کے لئے زبردست خطرہ قرار دیا ہے، اور ہندوستانی پریس اور اخبار نویسوں کو ان کی ذمہ داری کا احساس دلاتے ہوئے واقعات کی رپورٹنگ اور مختلف فرقوں اور جماعتوں کی شکایات و مطالبات کی روداد پیش کرنے میں رنگ آمیزی اور جانبداری سے بچنے کا مشورہ دیا ہے، اس کتابچہ کی ہر سطر سے مولانا کے اخلاص، دردمندی، حب الوطنی، انسان دوستی، قوم کی خیر خواہی اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے بے چینی و بے قراری کا اندازہ ہوتا ہے، اور یہ ملک کے ذمہ دار اور سنجیدہ افراد کے لیے ایک لمحہ فکریہ ہے۔

معاشرہ کی مہلک بیماریاں اور ان کا علاج } تالیف شیخ احمد بن حجر، ترجمہ مولانا نصیر احمد ملی تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۰۰، مجلد، قیمت ۲۰ روپیہ پتہ، دار المعارف ۱۳ - محمد علی بلڈنگ، بھنڈی بازار، ممبئی ۳

الدار السلفیہ ممبئی کا مشہور اشاعتی ادارہ ہے، وہ مولانا مختار احمد ندوی کی نگرانی میں برابر اصلاحی و دینی کتابیں شائع کر رہا ہے، اس نے عربی کی متعدد ضخیم کتابیں اور عربی کتابوں کے اردو ترجمے بھی شایع کئے ہیں، حکومت قطر کے مفتی و قاضی شیخ احمد بن حجر کی اکثر کتابوں کے اردو ترجمہ کی اشاعت کا سہرا بھی اسی کے سر ہے، زیر نظر کتاب بھی شیخ کی عربی تصنیف تطہیر المجتمعات من ارجاس الموبقات" کا اردو ترجمہ ہے، اس میں معاشرتی زندگی میں پھیلی ہوئی برائیوں کا تذکرہ کرکے ان کے انسداد و اصلاح کی تلقین کی گئی ہے، شریعت کی اصطلاح میں انہی برائیوں کا نام کبائر (بڑے گناہ) ہے، لائق مصنف نے اس کتاب میں اصلاً کبیرہ گناہوں کی مذمت و شناعت بیان کرکے ان کا علاج

بتایا ہے، شروع میں تین مقدمے ہیں، پہلے مقدمہ میں گناہ کی قسموں صغیرہ وکبیرہ کی تعریف، کبائر کی تعداد اور اس بارہ میں اہل علم کے اختلاف رائے وغیرہ کا ذکر ہے، دوسرے مقدمہ میں گناہوں کے نقصان اور ان کے برے اثرات اور ان کی سزاؤں کی تفصیل دی گئی ہے، تیسرا مقدمہ ان آیات واحادیث پر مشتمل ہے، جن میں نیکوکاروں کے جنت میں عیش وآرام اور گنہگاروں کے لئے دوزخ میں تکلیفوں اور شدتوں کا تذکرہ ہے، اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے، اس میں ۷۰ کبائر کا ذکر اور ان کی ممانعت اور نقصان کے بارہ میں آیات واحادیث درج ہیں، مصنف نے کبائر کی فہرست میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے آل واصحاب کی زندگی کی فلم بنانے کو بھی گنایا ہے، اور لکھا ہے کہ رسولؐ کی عظمت وتوقیر امت پر فرض ہے، اور آپ کی زندگی کی فلم بنانا آپ کے ساتھ کھلا ہوا استہزا، مذاق اور توہین ہے، اور فلم بنانے والوں کی اکثریت لہو ولعب کی شیدائی جھوٹی اور مکار ہوتی ہے، اور کسی منظر کی فلمبندی کی غرض وغایت تمسخر اور مذاق ہوتا ہوتا ہے، اس لئے یہ سراسر کفر وزندقہ ہے، انھوں نے جاندار چیزوں کی تصویر بنانا اور انھیں گھروں یا دوکانوں میں لٹکانا کو بھی کبیرہ گناہ میں شمار کیا ہے، لیکن اس میں اور بعض دوسرے مسائل میں جو دلائل تحریر کئے گئے ہیں، وہ زیادہ صریح نہیں ہیں، اس لئے ممکن ہے دوسرے لوگ انھیں مصنف کی شدت پر محمول کریں، علاوہ ازیں کبائر کی تحدید بھی مشکل ہے، سلف سے اس کے بارہ میں نہ تو صریح اقوال منقول ہیں اور نہ ان کی تعداد پر ان کا اتفاق ہے، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ فاضل مصنف نے جن مفاسد کی نشاندہی کی ہے، ان سے پورا معاشرہ مسموم اور تباہ وبرباد ہو رہا ہے، اس اعتبار سے اس کتاب کی اشاعت ایک اہم اصلاحی ودینی خدمت ہے، ترجمہ اچھا ہے، تاہم کہیں کہیں زبان اور معیاری ہونی چاہئے تھی، ص ۹۳ پر اوجاع کا ترجمہ بھوک کیا ہے، یہ وجع کی جمع ہے، جس کے معنی تکلیف کے ہیں۔

روح اخلاق :- مرتبہ جناب ریاض الدین احمد صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۱۰۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۲ روپیہ، پتہ۔ دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش، ۹۹۔ گوئن روڈ۔ لکھنؤ۔ ۱

جناب ریاض الدین احمد صاحب سابق پرنسپل مجیدیہ انٹر کالج الہ آباد اب دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کے جنرل سکریٹری ہیں، ان کی زندگی درس وتدریس میں گذری ہے، اور انھیں تعلیم وتربیت کے مسائل کا براہ راست تجربہ اور ان سے اچھی واقفیت ہے، ان کا دل دین وملت کے درد اور قلب قوم وملت کی اصلاح وخیر خواہی کے جذبہ سے معمور ہے، اس لئے مسلمانوں اور خصوصاً ان کی نئی نسل اور طلبہ کی اصلاح وتربیت کے لئے وہ زیادہ فکرمند رہتے ہیں، یہ کتاب اسی فکرمندی کا نتیجہ ہے، اس زمانہ میں تعلیم کا معیار جس قدر پست ہے اس سے زیادہ تربیت کا نظام ابتر ہے، طلبہ کی بے راہ روی اور بدعنوانی سے معاشرہ اور ملک کا حال نہایت درہم برہم ہو رہا ہے۔ مصنف نے طلبہ کی دینی واخلاقی اصلاح اور ذہنی ودماغی تربیت کے خیال سے اس کتاب میں دلچسپ اور موثر واقعات سادہ اور سلیس زبان میں قلمبند کئے ہیں، اس سے خدا کے خوف، اس پر اعتماد ویقین، دین سے تعلق اور آخرت کے تصور میں اضافہ ہوتا ہے، حسن عمل علوئے اخلاق، والدین کی اطاعت اور پڑوسیوں کے حقوق کو ادا کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، بزرگان دین سے عقیدت بڑھتی ہے، خلق کی خدمت اور نفع رسانی کا ولولہ اور شوق پیدا ہوتا ہے، دنیا سے بیزاری اور معیوب عادتوں اور برے اخلاق سے نفرت ہوتی ہے، اس لئے اسکا مطالعہ طلبہ کے اخلاق واعمال کو بنانے اور ان کی سیرت وکردار کو سنوارنے اور پاکیزہ اور صالح معاشرہ کو فروغ دینے میں مدد ومعاون ثابت ہوگا، اگر اسلامیہ اسکولوں اور مسلم تعلیمی اداروں کے طلبہ کو اس میں درج واقعات کو روز آدھ چند منٹ سنانے کا اہتمام کیا جائے تو یہ طریقہ وعظ

ارشادات زیادہ موثر اور سودمند ہوگا، کتاب میں کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں،
جیسے بشر حافی کو بشیر حافی، شیخ سری سقطی کو سقطی اور ابو طلحہ کو ابو طلعہ لکھا ہے۔

دنیا میں اسلام اور مسلمان :- ترجمہ و تالیف، جناب حافظ محمد نسیم قریشی صاحب،
تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی۔ صفحات ۲۰۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۲۵ روپے
پتہ - دانش محل بک سیلرز - امین الدولہ پارک، لکھنؤ - ملا

زیر نظر کتاب دنیا کے مختلف علاقوں میں اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے عربی اور انگریزی
اخبار و رسائل میں چھپنے والے مضامین کا اردو ترجمہ ہے، یہ کل چودہ مضامین کا مجموعہ ہے پہلے مضمون
میں آسٹریلیا میں اسلام اور مسلمانوں کا حال بیان کیا ہے، دو مضامین یورپ کے دو ملکوں یونان
اور فرانس میں اسلام اور مسلمانوں کے حالات کا مرقع پیش کرتے ہیں، براعظم افریقہ سے چار مضامین
ہیں، ان میں مالی، وسطی افریقہ، جنوبی افریقہ اور مشرقی افریقہ میں اسلام اور مسلمانوں کی سرگرمیاں
دکھائی گئی ہیں، مشرقی ایشیا کے مندرجہ ذیل سات ملکوں میں اسلام اور مسلمانوں کے حالات کا
اجمالی خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ جاپان، تھائی لینڈ، چین، میشیا، نیپال، جنوبی کوریا، مالدیپ، ان سب
مضامین میں ان ملکوں کے مختصر طبعی و قدرتی، تاریخی و جغرافیائی اور معاشرتی و سیاسی حالات اور ان میں
آباد لوگوں کے مذاہب و عقائد کا تذکرہ کرنے کے بعد ان کی آبادی، رقبہ، مسلمانوں اور غیر مسلموں
کی تعداد، مقامی زبان، پیداوار اور ذرائع معیشت وغیرہ کا ذکر ہے، اور یہ بتایا گیا ہے، کہ ان میں
اسلام کی اشاعت کیسے ہوئی؟ اس سلسلہ میں اسلام کی دعوت و تبلیغ میں حصہ لینے والے افراد
اور اصلاحی و دینی خدمات انجام دینے والے اداروں اور تنظیموں کی مساعی کا ذکر بھی آگیا ہے، اور
مسلمانوں کے دینی، اخلاقی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی حالات کے علاوہ عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں
مسیحی استعمار اور ریشہ دوانی اور دوسرے مذاہب کے لوگوں سے مسلمانوں کے تعلقات کا جائزہ

بھی لیا گیا ہے، مسلمانوں کے مدارس، مساجد، اور انجمنوں کا تذکرہ بھی ہے، اس پر بھی بحث و گفتگو کی گئی ہے کہ ان ملکوں میں اسلام کی اشاعت و فروغ کے آئندہ امکانات کیا ہیں؟ اس ضمن میں اشاعت اسلام میں حائل دشواریوں اور مسلمانوں کو درپیش مسائل و ضروریات کی جانب مسلمانوں کی بین الاقوامی برادری کی توجہ منعطف کرا کے مسلم حکومتوں اور ان کے بااثر افراد، جماعتوں اور اداروں کو ان کی امداد کی ترغیب دلائی گئی ہے، یہ کتاب مفید ہے، اور اس سے دنیا کے مختلف ملکوں کے مسلمانوں کے حالات و مسائل اور ان کی سرگرمی اور جدوجہد کا ایک حد تک اندازہ ہوتا ہے، اگر اس میں انگلستان اور امریکہ میں اسلام اور مسلمانوں کے بارہ میں معلومات بھی فراہم کئے گئے ہوتے تو اس کی اہمیت بڑھ جاتی، ایک جگہ "جدید اسلامی تہذیب" (صفحہ ۲۵) لکھا ہے، یہاں جدید کا لفظ نامناسب ہے" ایک جگہ باشندہ کے بجائے ہندی لفظ باسی (صفحہ ۱۵) استعمال کیا ہے صفحہ ۱ پر نامعلومات مقامات اور صفحہ ۱۲۴ پر مسلمانوں کی مضبوط روابط لکھا ہے جو ممکن ہے کتابت کی غلطی ہو۔

مقالات انور :- مرتبہ جناب مسعود انور علوی کاکوری، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۰۰، مجلد مع گردپوش قیمت ع؎ روپیہ۔ پتہ کتب خانہ انوریہ، تکیہ شریف کاظمیہ کاکوری، ضلع لکھنؤ۔

یہ گیارہ مضامین کا مجموعہ ہے، اکثر مضامین تصوف اور صوفیہ کے بارہ میں ہیں، چند مضامین ادبی نوعیت کے بھی ہیں۔ اول الذکر نوعیت کے مضامین میں خوارق و کرامات کا ذکر زیادہ ہے اور ان کے اکثر مندرجات بھی محل نظر ہیں، مصنف میں لکھنے پڑھنے کی صلاحیت ہے، مگر انھیں احتیاط و سلامت روی کو مد نظر رکھنے اور مضامین کی کمیت کے بجائے کیفیت کی جانب زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

دعوت اسلام، ظالم کون؟ اکابر ملت کا پیغام، } مرتبہ ۱ و ۲ مولانا محمد عبدالملک جامی و مرتبہ سوم مولانا نسیم احمد غازی و مولانا افتخار فریدی، تقطیع متوسط کاغذ و طباعت اچھی صفحات ۳۲، ۲۴، ۲۴ پتہ مولانا افتخار فریدی، فریدی بلڈنگ، سنبھلی گیٹ، مرادآباد۔

جناب مولانا افتخار فریدی کو دعوت و تبلیغ دین کے کام سے خاص دلچسپی اور طبعی مناسبت ہے اور وہ اسلام کی نشر و اشاعت اور مسلمانوں کی اصلاح و سربلندی کے لئے برابر فکرمند بھی رہتے ہیں اسی مقصد سے وہ مفید دینی و اصلاحی کتابچے خود بھی مرتب کرکے اور دوسروں سے بھی مرتب کراکے شائع کرتے رہتے ہیں، یہ تینوں کتابچے بھی ان کے دعوتی شوق و ذوق اور تبلیغی جوش و جذبہ کے نتیجہ میں شائع ہوئے ہیں، اول الذکر دونوں رسالے مولانا محمد عبدالملک جامعی کے قلم سے ہیں، جو مرادآباد کی سکونت ترک کرکے عرصہ سے مدینہ منورہ میں آباد اور مختلف دینی و دعوتی سرگرمیوں میں منہمک اور مدرسہ تحفیظ القرآن کے نگراں ہیں، مولانا فریدی کی طرح اسلام کی دعوت و اشاعت اور امت کی صلاح و فلاح کے لیے انھوں نے بھی اپنی زندگی وقف کردی ہے، پہلے کتابچہ میں ہر مسلمان کو اسلام کا داعی و مبلغ بننے کی تلقین کی ہے، اور یہ دعوت دی ہے کہ اسلام کا پیغام حق و صداقت سنا کر پوری دنیا کو بنانے اور سنوارنے کے لیے اسے کمربستہ رہنا چاہئے، دوسرے کتابچے میں ایک بے ادب اور گستاخ کے اس نارو افقرۂ "خدا ظالم ہے، اور ظالموں کا ساتھ دیتا ہے" کی مختلف انداز سے تردید کرکے دکھایا ہے کہ دراصل خود انسان ظالم ہے، اس ضمن میں خدا کی ربوبیت رحمت حکمت غیبی امداد، مظلوموں کی دستگیری اور ظالموں سے انتقام لینے کی عجیب عجیب صورتوں کا ذکر کیا ہے، اس میں ایک جگہ مولانا شبلیؒ کے بارہ میں لکھا ہے کہ انکے اولاد نہیں تھی (ص۱۱) یہ صحیح نہیں ہے انکے بیٹے بیٹیاں دونوں تھیں، تمام لوگوں کے ناموں کے ساتھ مولانا لکھنے کا اہتمام کرتے ہیں یہی اہتمام مولانا شبلیؒ کے نام کے ساتھ بھی کیا جاتا تو بہتر تھا، تیسرے رسالہ میں اساتذہ و طلبائے مدارس کے لیے مفید اور بیش قیمت ہدایتیں اور نصیحتیں درج ہیں ادھر عربی مدارس جس صورت حال سے دوچار ہیں اسکے پیش نظر اس رسالہ کا مطالعہ خاص طور پر بہت ضروری ہے ان رسائل کی حیثیت کسی مرتب کتاب جیسی نہیں ہے اسلئے ان میں اصل موضوع سے ہٹ کر بھی بعض باتیں کہی گئی ہیں تاہم ذکر بھی نہایت مفید ہیں یہ تینوں رسالے دینی و اصلاحی حیثیت سے مفید، موثر اور دلپذیر ہیں جو بڑی دلسوزی، دردمندی اور اخلاص و نیک نیتی سے لکھے گئے ہیں ہر مسلمان کو انھیں خود بھی پڑھنا چاہئے، اور ان کی توسیع اشاعت میں بھی حصہ لینا چاہئے۔　"ض"

سلسلۂ مذہبی رواداری

تاریخ ہند کا سلسلہ اب تک اٹھائیس کتابوں تک پہنچ چکا ہے، اسی ضمن میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ ہے، جو تین جلدوں پر مشتمل ہے،

جلد اوّل اس میں مغل دور سے پہلے کے مختلف خاندانوں کے مسلمان حکمرانوں مثلاً محمد بن قاسم، محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، علاء الدین خلجی، محمد بن تغلق وغیرہ کی مذہبی رواداری و ملی وسعتی کے واقعات پیش کئے گئے ہیں قیمت ۲۰ روپے۔

جلد دوم ۔ اس میں مغل فرماں روا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے حکمراں، شیر شاہ، اسلام شاہ پھر مغل شہنشاہ اکبر، جہانگیر، شاہجہاں کی مذہبی رواداری وغیرہ کے دلچسپ واقعات قلمبند کئے گئے ہیں قیمت ۲۶ روپے۔

جلد سوم ہندوستان کے مغل عہد کے مشہور مورخ سر جدو ناتھ سرکار کی کتاب کا جواب خود ان کی کتاب کے حوالوں سے اس طرح پیش کیا گیا ہے، کہ اورنگزیب عالمگیر اور اس کے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری وغیرہ کی تفصیلات آگئی ہیں، مولانا شبلی کی مضامین عالمگیر، اور مولانا سید نجیب اشرف صاحب ندوی مرحوم کی مقدمۂ رقعات عالمگیر کے بعد اورنگزیب عالمگیر پر دوسری اہم اور پر از معلومات کتاب جس میں اس کے پورے پچاس سالہ عہد حکومت و فرمانروائی کی پوری تاریخ آگئی ہے، قیمت: ۳۵ روپے،

اسلام کی مذہبی رواداری ۔ اس میں مستند حوالوں سے مذہبی رواداری، غیر مسلم رعایا کے ساتھ سلوک اور ذمیوں کے حقوق کے متعلق مذہب اسلام کی تعلیمات اور ان پر مسلمانوں کے عمل کو پیش کیا گیا ہے، (زیر طبع)

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

جسٹرڈ نمبر ایل۔ زیڈ ایم۔ این پی ۴۳

اگست سنہ ۱۹۸۶ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

قیمت تین ۳ روپئے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

مکتبہ اقبال

۷۶۹۰۱-۰(پ)

جلد ۱۲۸ ماہ ذی الحجہ سنہ ۱۴۰۱ھ مطابق ماہ اگست سنہ ۱۹۸۱ء عدد ۲

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے کچھ ایسے مایۂ ناز اور قابل فرزند پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی خدمت سے علوم و فنون میں چار چاند لگا کر اس برصغیر کے مسلمانوں کے سروں کو اونچا کیا ہے۔

اسی درسگاہ سے ایسے افراد بھی نکلے جنھوں نے اپنی اولو العزمی اور خوش سلیقگی سے اپنی آیندہ نسلوں کے لیے محنت، عزم اور قوت ارادی کے شاہین کو زیر دام لانے کے مثالی نمونے پیش کیے ہیں، ان ہی میں بھوپال کے مولانا حافظ عمران خان ندوی ولا ازہری کا نام نامی بھی ہے، ان کی عملی زندگی کا آغاز ندوہ کے مہتمم کی حیثیت سے ہوا، مگر قدرت کو یہ منظور تھا کہ وہ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں اور سرگرمیوں کو بھوپال کی تاج المساجد کے لیے بروئے کار لاکر مسلمانوں کی مذہبی سرخروئی اور ملی خودداری کا سرتاج بنادیں، جب اس کی از سر نو تعمیر کا کام ان کے سپرد کیا گیا تھا تو یہ وہاں کے سابق حکمرانوں اور مسلمانوں کی غفلت شعاری اور پست ہمتی کا ایک سوالیہ نشان تھی لیکن اس کو مولانائے موصوف نے اپنی ہمت، جد و جہد اور سخت کوشی کا گنبد مینا کر دکھایا، ان کے یقین محکم اور عمل پیہم کی بدولت یہ دہلی کی شاہجہانی اور لاہور کی عالمگیری مسجد کے برابر دکھائی دیتی ہے، شاہجہاں اور عالمگیر کی ان مسجدوں کی تعمیر کے واسطے شاہی خزانے کھلے رہے، مگر مولانا عمران خان ندوی نے اپنی تہی دستی میں جو کشادہ دستی، بے سر و سامانی میں جو میر سامانی، بلکہ اپنی قلندری میں جو شاہنشاہی دکھائی وہ شاہی خزانے سے زیادہ کارگر ثابت ہوئی، اس مسجد سے ان کو جو عشق ہے اسی کا نور و حضور و سرود شاید ان کے لیے زاد راہ آخرت بنے، جس کی بدولت کیا عجب ان کو بارگاہ ایزدی میں وہی مقبولیت حاصل ہو جو اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کو ہوتی ہے۔

ان کا دوسرا تازہ شاندار کارنامہ مطالعۂ سلیمانی کی طباعت و اشاعت ہے، معارف کے ناظرین کو یاد ہوگا کہ ستمبر ۱۹۸۵ء میں انھوں نے تاج المساجد کی بزم سلیمانی کی طرف سے حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے صد سالہ جشن پیدایش کے سلسلہ میں ایک سمینار منعقد کیا تھا، اس میں جو دھوم دھام اور تزک و احتشام نظر آیا

وہ ان کی بلند حوصلگی کی روایتی شان کے عین مطابق تھا، اس میں جتنے مقالات پڑھے گئے اور اس موقع پر جو مباحثے ہوئے، ان سب کو بڑے سلیقہ سے ترتیب دے کر ایک کتاب کی صورت میں شایع کیا گیا ہے، ایسی عمدہ کتابت اور طباعت کے ساتھ اردو کی بہت کم کتابیں شایع ہوئی ہوں گی، اس میں بھی وہی خوش ذوقی ہے جو مولانا کی زندگی کے ہر کام میں نظر آتی ہے، اس کے لیے دارالمصنفین ان کے گلے میں مبارکباد کا زریں ہار پہنانے کے لیے آگے بڑھتا ہے۔

دارالمصنفین اس حیثیت سے شرمسار ہے کہ جو کام اس کی طرف سے ہونا چاہیے تھا، وہ مولانا نے اپنی طرف سے انجام دے کر یہاں کے خدمت گذاروں کو شرمندہ کیا، وہ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے بہت ہی محبوب شاگرد تھے، اس محبوبیت کا مظاہرہ مطالعۂ سلیمانی ہی کی اشاعت سے کیا جا سکتا تھا، دارالمصنفین کے خدمت گذاران کے اس کارنامہ کو اپنا ہی کارنامہ تصور کریں تو شاید ان کو اس سے اختلاف نہ ہوگا۔

اس میں مقالات سمیت ۷۰ تحریریں ہیں جن میں بڑی رنگارنگی ہے، ان کی ترتیب میں یہ عنوانات قائم کیے گئے ہیں: (۱) رہنما خطبات (۲) علوم و فنون سلیمانی پر نظر (۳) فقہیات (۴) تاریخ نگاری (۵) تحقیق و تنقید (۶) لسانیات (۷) تہذیب و تمدن (۸) ادب و شاعری (۹) صحافت (۱۰) طب (۱۱) تصنیفات سلیمانی (۱۲) تعارف و تبصرہ، (۱۳) دیگر نگارشات اردو، عربی (۱۴) ملی سیاسیات و تحریکات (۱۵) سیرت و شخصیت (۱۶) دارالافتاء بھوپال میں (۱۷) بارگاہ سلیمانی میں (۱۸) معاصرین سے روابط؛ ان کے علاوہ مباحثات بہم اور اختتامی تقریر کے بھی الگ عنوانات ہیں۔

مذکورۂ بالا عنوانات کے ماتحت جو مقالات شایع ہوئے ہیں، ان کے مطالعہ سے حضرت سید صاحبؒ کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کے گوناگوں کمالات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی، وہ کیا نہ تھے؟ ماہر قرآنیات، قابل قدر فقیہ، وسیع النظر مورخ، دیدہ ور محقق، بلند پایہ نقاد، خوش مذاق زبان دان، اسلامی تہذیب و تمدن کے عاشق زار، شعر و ادب کے بے مثال اداشناس، علمی و ادبی صحافت کے پیش رو، طب کے رمز شناس، اردو و عربی کے اعلیٰ انشاپرداز، ملی سیاسیات و تحریکات کے بہت بڑے غمگسار اور سلوک و معرفت کے بحر کے شناور، سچ تو یہ ہے کہ ان کی شخصیت

مستقل ایک تحریک تھی۔

ان کی ہشت بلکہ صد پہل ہیرے جیسی شخصیت اور کمالات کا مطالعہ کرنا آسان نہیں جتنا زیادہ ان کا مطالعہ کیا جائے گا، ان کے نئے نئے پہلو سامنے آئیں گے، جن کو سمیٹ کر لکھنا ایک بڑا مشکل کام ہے، پھر بھی زیرِ نظر مجموعہ میں حضرت سید صاحبؒ کے بہت سے پہلو سامنے آگئے ہیں، ان پر کوئی کچھ لکھتا ہے تو یہ خاکسار اپنی چشمِ مجنوں کی وجہ سے اس میں حسنِ لیلیٰ ہی پاتا ہے۔ اس مجموعہ کی خوبی یہ ہے کہ اس میں سارے کے سارے مقالہ نگار آج کل کے بعض نقادوں اور مقالہ نگاروں کی طرح نرگسیت اور معروضیت کے مرض میں مبتلا نہیں ہیں، ایسے مریضوں کو مولانا عمران خان ندوی نے اپنے یہاں آنے کی زحمت بھی نہیں دی، اور وہ آتے بھی تو شاید ان کی بارعب شخصیت کی موجودگی میں اپنی مریضانہ ذہنیت کا اظہار کرنے کی ہمت بھی نہیں کرتے یہی وجہ ہے کہ یہ مجموعہ حضرت سید صاحبؒ کے گوناگوں کمالات کا ایک خوشنما گلدستہ بن گیا ہے، مگر یہ بات بھی نوکِ قلم پر بے اختیار آرہی ہے کہ اس میں شاید مرتب کی لاعلمی اور بے خبری میں ایک آدھ مضمون ایسا بھی شایع ہو گیا ہے جو اس عقیدت نامہ کے عارضِ گلرنگ کے لیے ایک کیل مہاسہ بن گیا ہے، جہاں کسی کے علم و فن کے گیسوئے تابدار کو اور تابدار بنانے کی کوشش ہو، وہاں کی مشاطہ گری میں ایسی رخنہ اندازی مناسب نہیں، ہاں جہاں معروضیت کی دیوالی منائی جائے وہاں ایسے ایک دیے کیا، کئی دیوں کی گنجایش نکل سکتی ہے۔

مولانا عمران خان ندوی کے ساتھ ڈاکٹر مسعود الرحمٰن ندوی اور ڈاکٹر محمد حسان ندوی بھی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے جس تن دہی سے سمینار کو کامیاب بنایا تھا اسی محنت سے ایک دیدہ زیب اور دلفریب مجموعہ کی ترتیب میں ہر قسم کی مدد کر کے ایک بڑا فرض ادا کیا، جس سے اردو زبان کو ایک عمدہ کتاب حاصل ہو گئی۔

مقالات

قرآن اور مستشرقین

از ڈاکٹر التہامی نقرہ صدر شعبہ قرآن و حدیث کلیۃ الزیتون تیونس یونیورسٹی تیونس۔

ترجمہ :- از عبید اللہ کوٹی ندوی۔ رفیق دار المصنفین،

(۲)

ایک خطرناک بات یہ ہے۔ کہ لیبان نے عربی و اسلامی تمدن کے بارے میں منصفانہ رویہ اختیار کیا ہے۔ وہ اس تمدن پر فریفتہ ہو کر اس کی طرف سے دفاع کرتا ہے، وہ مغربی تمدن پر اس کے اثرات کا بھی تذکرہ کرتا ہے۔ اس کا یہ رویہ قارئین پر اثر انداز ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد ہی جب قرآن و رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور شریعت اسلامیہ کے بارے میں اس کے خیالات نظر سے گزرتے ہیں تو اچانک یہ محسوس ہوتا ہے کہ لیبان معروضی انداز تحقیق کو نظر انداز کر چکا ہے۔ اور اب وہ حقیقت سے گریز کر رہا ہے[1]

---

[1] وہ عربوں کے تمدن کی تعریف محض اس لئے کرتا ہے کہ اس کو ایک غیر جانبدار مورخ سمجھ کر قارئین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پاک کے متعلق اس کی رائے کو صحیح سمجھیں، مستشرقین کا یہ شیوہ رہا ہے کہ جب وہ کچھ زہریلی باتیں کہنا چاہتے ہیں تو وہ بہت کچھ تعریف اور تحسین کی باتیں لکھ کر اپنی زہریلی باتوں کا جواز نکال لیتے ہیں، لیبان کا بھی یہی موقف رہے لیبان کے دام فریب میں ہمارے بہت سے ارباب علم پھنس گئے ہیں۔ اسی لئے اس کی کتاب کا ترجمہ بڑے آب و تاب کے ساتھ کیا گیا، اور اب بھی اس کو شوق سے پڑھتے ہیں، اس کی کتاب کے حوالے بھی دیئے جاتے ہیں، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کلام پاک کے متعلق جو کچھ اس نے لکھا ہے اس کے بعد تو مسلمان اس کی کتاب کو چھونا بھی پسند نہ کریں تو بہتر ہے۔ (مترجم)

قرآن مجید اور اس کے اصل سرچشمہ کے بارے میں کچھ مستشرقین کے خیالات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ حقیقت وحی سے بے خبر ہیں، وحی کا تعلق علم کے اکتسابی طریقوں سے نہیں ہے۔ وہ نفسیاتی الہامات سے بالاتر ہے، نفسیات کے مقررہ اصولوں اور عظیم شخصیتوں کے سوانحی حالات میں اور ایک نبی کے حالات میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ نادر شخصیتیں گولڈ زیہر کے بقول کچھ نہ کچھ امراض میں مبتلا ہوتی ہیں۔ اور یہ ان کے خیال میں دنیا کی عظیم قوموں کے رہنما، جذب اور وارفتگی کے مرض کا شکار ہوتے ہیں۔ لیکن وحی کو اس طرح کے کسی جذب یا نفسیاتی مرض کا نتیجہ سمجھنا، خود مستشرقین کی اپنی ناواقفیت کی دلیل ہے۔ اس کا اندازہ درج ذیل اقوال سے ہوگا۔

ویلز (G. Wells) کا یہ خیال ہے کہ مقدس مذہبی افراد کی صف میں شامل ہونے کی غرض سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دور کہولت میں ان کے احساسات اور حوصلہ مندانہ جذبات نے اس بات پہ آمادہ کیا کہ وہ ایک نئے دین کی بنیاد رکھیں۔ چنانچہ انھوں نے ایسا مجموعہ تیار کیا جس میں خرافاتی عقائد اور سطحی روایات و رسوم درج ہیں، انھوں نے اپنی قوم میں اس مجموعہ کی اشاعت کی اور کچھ لوگوں نے ان کی پیروی بھی کی۔[۱]

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مذہبی معلومات حاصل ہوئیں ان کا ماخذ گولڈ زیہر کے لفظوں میں دو عنصر تھے، خارجی اور داخلی، وہ لکھتا ہے کہ

"نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا پیام دراصل ان مذہبی خیالات اور دینی معلومات کا خلاصہ تھا۔ جو آپ کو یہودی اور عیسائی حلقوں سے روابط کی وجہ سے حاصل ہوئے ان خیالات سے بہت زیادہ متاثر ہونے کے بعد آپ کو یہ یقین ہو گیا۔ کہ اپنے ہم وطنوں میں ان کے ذریعہ سچے مذہبی جذبات کو بیدار کیا جا سکتا ہے، بیرونی عناصر سے حاصل

---

[۱] الاسلام والثقافۃ العربیہ فی مواجہۃ الاستعمار۔ ص ۲۳۹ (ط الرسالہ۔ مصر)

کی ہوئی یہ تعلیمات آپ کے ذوق و وجدان میں پیوست ہوگئیں۔ آپ کا یہ خیال تھا کہ
ان کی مدد سے رضائے الٰہی کے حصول کی راہ میں، آپ زندگی کو ایک نیا رنگ دینے
میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

یہ خیالات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دل و دماغ میں جاگزیں ہوگئے۔ بیرونی اثرات نے
ان پر اس قدر اثر ڈالا، کہ یہی خیالات ان کا عقیدہ بن گئے۔ لیکن وہ ان کو وحی الٰہی سمجھتے رہے[1]
بلاشیر، اپنی تحقیقات میں معتدل نظر آتا ہے۔ مگر وہ قرآن کے اصل سرچشمہ پر بحث کرتے
ہوئے خاص طور پر اس نکتہ پر زور دیتا ہے کہ" قرآن کے بیان کردہ واقعات اور یہودی اور
عیسائی قصص و حکایات کے درمیان مشابہت پائی جاتی ہے۔ یہ مشابہت مستشرقین کی
توجہ کا مرکز بن گئی ہے۔ اس کے نزدیک، ابتدائی مکی سورتوں میں مسیحی اثرات بہت واضح
ہیں۔ اور انجیل کے غیر تسلیم شدہ نسخوں خصوصاً کتاب پیدائش میں جو اس زمانہ میں عام تھی، اور
قرآنی قصص میں مشابہت موجود تھی۔ اس بحث کے سلسلہ میں بلاشیر کچھ محققین کے خیالات پیش
کرنے کے بعد، یہ ثابت کرتا ہے کہ" بانیٔ اسلام" اور مسیحی راہبوں کے درمیان رابطہ کی وجہ سے
دونوں میں باہم تعلقات استوار ہوئے۔ اور یہ تعلقات مسلسل برقرار رہے[2]"

ایک اور کتاب تاریخ الادیان (Manuel de l'histoire des religions)
درج ذیل خیال ظاہر کیا گیا ہے۔ کہ

"دعوت اسلام کے ابتدائی عہد میں، قرآن میں نبی کا اسلوب جذباتی ہے۔ مختصر
جملوں اور شاندار اسلوب میں وہ نمایاں طور پر رنگ آمیزی کرکے۔ جزا و سزا کی

---

[1] گولڈزیہر۔ العقیدۃ والشریعۃ فی الاسلام (ترجمہ۔ یوسف موسیٰ وغیرہ) ص ۱۲۔ طبع مصر ۱۹۴۶ء

[2] Le Probleme du Mahomet: 6. (P.U.F. Paris 1952)

کیفیات کو بیان کرتے ہیں۔ آیات کی تکرار سے اکتاہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ بلکہ کہیں کہیں تو اس تکرار سے برعکس مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن کچھ عرصہ گزرنے کے بعد، نبیؐ کا یہ ابتدائی اسلوب بدل گیا۔ اب وہ نبیوں کے واقعات کو عجیب پرسکون آہنگ میں پیش کرنے لگے۔ چنانچہ یوسفؑ اور ان کی بیوی (پوتیفار) کی داستان محبت کو انھوں نے اسی انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ اسلوب ایران اور ترک کے بہت سے شعراء کے لیے خیال انگیز ثابت ہوا۔ لیکن آخری دور میں ان کے اسلوب نے اپنی حرارت اور فن کو گم کر دیا۔ اب نبیؐ یہود و نصاریٰ سے بحث و نظر پر فریفتہ دکھائی دیتے ہیں[۱]

بہرحال مستشرقین کی اکثریت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی اور قرآن کے سرچشمہ کے بارے میں صحیح نتیجہ تک پہنچنے میں ناکام رہی ہے۔ مغربی مصنفین نے کسی دلیل و ثبوت کے بغیر اپنے ہی نقطۂ نظر کی تکرار جاری رکھی۔ ان میں عصبیت کے زخم خوردہ محققین جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا قرآن و اسلام کے موضوع پر گفتگو کرتے ہیں۔ تو ان کے قلم و زبان میں کدال اور پھاوڑہ کی جیسی صفت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ فلپ ایرنجی نے پیرس کے ایک مجلہ[۲] میں ایک مضمون لکھا۔ اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کردار کشی کی غرض سے ایسی بات لکھی ہے۔ جس سے کوئی بھی شریف محقق اپنا دامن داغدار کرنا پسند نہ کرے گا۔ اس نے اپنے مقالہ میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ محمدؐ مکہ میں یہود سے اکثر ملاقاتیں کرتے رہے ہیں۔ حالانکہ مؤلف کے نقطۂ نظر کی تردید اس بات سے ہو جاتی ہے کہ یہودی بود و باش مدینہ میں تھی، مکہ میں نہ تھی، وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ "محمدؐ" اپنے خادم زید سے جو عیسائیوں کے غلام رہ چکے تھے، یہودی اور مسیحی مذاہب کے بارے میں استفادہ کی غرض سے

---

[۱] من القرآن۔ محمد صبیح۔ ص ۱۴۰، ۱۴۳۔ طا مصر ۱۹۳۹ء۔

[۲] المجلۃ الاسیویہ سنہ ۱۹۰۰ء۔

سوالات کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے خادم سے زیادہ فہیم تھے"۔ اس کے بعد مؤلف لکھتا ہے کہ

" محمدؐ، مدینہ میں یہودیوں کے شاگرد تھے۔ یہود نے ہی یہ شخصیت تیار کی تھی انھوں نے جو داستانیں یہود و نصاریٰ سے سنیں، جبرئیل نے ان میں ہی اضافہ و تحسین کا کام انجام دیا۔

مذکورۂ بالا اقتباس میں مؤلف نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں عجیب متضاد بات لکھی ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ سے مستفید ہوئے۔ اور جبرئیل بھی ان کے پاس آتے رہے۔ یہود و نصاریٰ سے استفادہ کے لئے مؤلف کے پاس کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے۔ وہ اس بارے میں کوئی عقلی دلیل بھی پیش نہیں کرسکا۔ پھر یہ بھی اقرار کرتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جبرئیل آیا کرتے تھے۔

مستشرقین اور مغربی دانشوروں کی طرف سے مذکورۂ بالا خیالات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن و حدیث دونوں کا سرچشمہ ایک ہی تھا۔ تو پھر ان دونوں کے اسلوب بیان، طرز ادا اور طریق تعبیر میں نمایاں فرق کیوں ہے۔ کسی بھی ایک شخص کے لئے خواہ وہ کتنا ہی بڑا فن کار ہو، کیا یہ ممکن ہے کہ وہ ایک خاص اسلوب میں گفتگو کرنے کے بعد اسے خدا کی طرف سے نازل کردہ کلام قرار دے پھر اس کے بعد، اس سے بالکل ہی مختلف دوسرا اسلوب اختیار کرتا رہے۔ اور اسے اپنا کلام قرار دے۔

کیا دو طرح کا کلام جس کا اسلوب اور انداز ایک دوسرے سے بالکل ہی مختلف ہو۔ ایک ہی شخص کے بس میں ہے؟ کیا یہ بات قطعی نہیں کہ کلام کا اسلوب و انداز، اپنے متکلم کی شخصیت کا پتہ دیتا ہے۔؟

قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تالیف و ترتیب کا نتیجہ ہوتا تو اسے اپنی طرف منسوب کرلینے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔

کیفیات کو بیان کرتے ہیں۔ آیات کی تکرار سے اکتاہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ بلکہ کہیں کہیں
تو اس تکرار سے برعکس مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن کچھ عرصہ گزرنے کے بعد، نبیؐ کا یہ
ابتدائی اسلوب بدل گیا۔ اب وہ نبیوں کے واقعات کو عجیب پرسکون آہنگ میں پیش
کرنے لگے۔ چنانچہ یوسفؑ اور ان کی بیوی (پوتیفار) کی داستان محبت کو انھوں نے
اسی انداز میں پیش کیا ہے۔ یہ اسلوب ایران اور ترک کے بہت سے شعراء کے لیے
خیال انگیز ثابت ہوا۔ لیکن آخری دور میں ان کے اسلوب نے اپنی حرارت اور فن
کو گم کر دیا۔ اب نبیؐ یہود و نصاریٰ سے بحث و نظر پر فریفتہ دکھائی دیتے ہیں۔[1]

بہر حال، مستشرقین کی اکثریت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول وحی اور قرآ
سرچشمہ کے بارے میں صحیح نتیجہ تک پہنچنے میں ناکام رہی ہے۔ مغربی مصنفین نے کسی دلیل
کے بغیر اپنے ہی نقطۂ نظر کی تکرار جاری رکھی۔ ان میں عصبیت کے زخم خوردہ محققین
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا قرآن و اسلام کے موضوع پر گفتگو کرتے ہیں۔ تو ان کے قلم و
کدال اژدہا دوزہ کی جیسی صفت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ فلپ ایرنجی نے پیرس کے ا
ایک مضمون لکھا۔ اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کردار کشی کی توقع سے ایسی بات
جس سے کوئی بھی شریف محقق اپنا دامن داغدار کرنا پسند نہ کرے گا۔ اس نے اپنے مقالہ میں
کیا ہے کہ محمدؐ مکہ میں یہود سے اکثر ملاقاتیں کرتے رہے ہیں۔ حالانکہ مؤلف کے نقطۂ نظر کی ت
بات سے ہو جاتی ہے کہ یہود کی بود و باش مدینہ میں تھی، مکہ میں نہ تھی، وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ "محمدؐ"
زید سے جو عیسائیوں کے غلام رہ چکے تھے، یہودی اور مسیحی مذاہب کے بارے میں استفادہ

---

[1] من القرآن۔ محمد صبیح۔ ص ۱۲۰، ۱۲۲ - طا مصر ۱۹۳۹ء۔

[2] المجلۃ الاسبوعیۃ سنہ ۱۹۰۳ء۔

سوالات کیا کرتے تھے۔ وہ اپنے خادم سے زیادہ فہیم تھے۔" اس کے بعد مؤلف لکھتا ہے کہ

" محمد، مدینہ میں یہودیوں کے شاگرد تھے۔ یہود نے ہی یہ شخصیت تیار کی تھی انھوں نے جو وہ سنا نہیں یہود و نصاریٰ سے سنین، جبرئیل نے ان میں ہی اضافہ و تحسین کا کام انجام دیا۔

مذکورہ بالا اقتباس میں مؤلف نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں عجیب متضاد بات لکھی ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ سے مستفید ہوئے۔ اور جبرئیل بھی ان کے پاس آتے رہے۔ یہود و نصاریٰ سے استفادہ کے لئے مؤلف کے پاس کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے۔ وہ اس بارے میں کوئی عقلی دلیل بھی پیش نہیں کر سکا۔ پھر یہ بھی اقرار کرتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جبرئیل آیا کرتے تھے۔

مستشرقین اور مغربی دانشوروں کی طرف سے مذکورہ بالا خیالات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قرآن و حدیث دونوں کا سرچشمہ ایک ہی تھا۔ تو پھر ان دونوں کے اسلوب بیان، طرز ادا اور طرق تعبیر میں نمایاں فرق کیوں ہے۔ کسی بھی ایک شخص کے لئے خواہ وہ کتنا ہی بڑا فن کار ہو، کیا یہ ممکن ہے کہ وہ ایک خاص اسلوب میں گفتگو کرنے کے بعد اسے خدا کی طرف سے نازل کردہ کلام قرار دے پھر اس کے بعد اس سے بالکل ہی مختلف دوسرا اسلوب اختیار کرتا رہے۔ اور اسے اپنا کلام قرار دے۔

کیا دو طرح کا کلام جس کا اسلوب اور انداز ایک دوسرے سے بالکل ہی مختلف ہو۔ ایک ہی شخص کے بس میں ہے؟ کیا یہ بات قطعی نہیں کہ کلام کا اسلوب و انداز، اپنے متکلم کی شخصیت کا پتہ دیتا ہے۔؟

قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تالیف و ترتیب کا نتیجہ ہوتا تو اسے اپنی طرف منسوب کر لینے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔

مستشرقین کی طرف سے ایک اور نادر خیال بھی پیش کیا گیا ہے۔ کلیمان ہوار (Huart) نے اپنے ایک مقالہ میں، قرآن کے ایک نئے سرچشمہ کی دریافت کا دعویٰ کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ قرآن مجید، امیہ بن ابی الصلت کے اشعار سے ماخوذ ہے۔ اس نے امیہ بن ابی الصلت[1] کے اشعار اور قرآنی آیات کے درمیان موازنہ کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ امیہ بن ابی الصلت کی طرف ان اشعار کی نسبت . . . . . نسبت درست ہے۔ کیونکہ ان اشعار میں ثمود و صالح وغیرہ کے واقعات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور قرآن میں ان ہی واقعات کی تفصیل دی گئی ہے۔ اس کا استدلال یہ ہے۔ کہ یہ اشعار اگر زمانہ مابعد کے تسلیم کئے جائیں تو یہ ضروری ہو گا کہ ان میں، اور قرآن کے بیان کردہ واقعات میں کامل طور پر یکسانیت پائی جائے۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ نظم قرآن میں، امیہ کے اشعار سے استفادہ کیا گیا تھا۔ اور اسی لئے امیہ بن ابی الصلت سے مقابلہ آرائی کی اور اس کے شعری نمونوں کو باقی نہیں رہنے دیا۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ قرآن کا نیا پن برقرار رہے۔ اور ان کے اس دعوئ پر کوئی حرف نہ آئے کہ یہ قرآن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمانی وحی کے ذریعہ حاصل ہوا ہے۔

مصر کے مشہور فاضل ادیب طہٰ حسین نے مذکورہ بالا غلط بیانی کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> " ان بحثوں میں مستشرقین کا یہ طرز عمل حیرت انگیز ہے، کہ وہ روایات سیرت کو مشکوک قرار دیتے ہیں، ان میں سے بعض نے تو ان روایات کی صحت ہی کا سرے سے انکار کر دیا ہے، وہ ان روایات کو تاریخ کا ایک مستند ماخذ تسلیم نہیں کرتے۔ ان میں سے ایک

---

[1] دور جاہلیت اور عہد اسلام کا شاعر ہے۔ ایک نبی کی بعثت کی خبر دیا کرتا تھا۔ اور اپنے ہی بارے میں اسکو نبی ہونے کی توقع تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عطا ہوئی تو اس نے حسد کی وجہ سے آپ کو نبی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا، ذبت پرستی سے بیزار تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکے اشعار سنے تو فرمایا کہ اس کی زبان مومن ہو لیکن دل کافر ہے، وہ اپنے اشعار میں انبیاء کے واقعات بیان کیا کرتا تھا۔ (دیکھئے الشعر والشعراء - ابن قتیبہ صہ ۲۹ ط مصر ۱۳۲۲ھ)

گروہ کا نقطۂ نظر خالص علمی اور تحقیقی ہے۔ وہ سنت نبوی کو احادیث و اخبار کا ایسا مجموعہ قرار دیتا ہے جس میں وضعی روایات موجود ہیں اور بحث و تحقیق کے بعد ان میں سے صحیح واقعات کو الگ کرنے کی ضرورت ہے۔ روایات کے بارے میں یہ تمام مستشرقین اپنے ایک ہی موقف پر سختی کے ساتھ ساتھ قائم ہیں اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ امیہ بن ابی الصلت اور اس کے شعری سرمایہ پر اپنے اعتماد کا اظہار کرتے ہیں۔ حالانکہ سیرت کے مقابلہ میں امیہ کے اشعار، اپنی سند اور راویوں کی صدق و دیانت کے اعتبار سے کچھ زیادہ معتبر نہیں، ان روایات پر مستشرقین کے اعتماد و اعتبار کا راز کیا ہے؟ اس کی یہ وجہ تو نہیں ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کے محققین پر وہ جس تعصب کا الزام رکھتے ہیں۔ اس میں وہ خود ہی گرفتار ہو گئے۔[1]

ہم اس بحث کی مزید وضاحت کے لیے قرآن مجید کی چند آیتیں درج کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ امیہ کے کچھ اشعار بھی درج کریں گے (حالانکہ امیہ کی طرف ان اشعار کی نسبت مشکوک ہے

فتول عنهم یوم یدع الداع	تو آپ ان کی طرف سے کچھ خیال نہ کیجئے
الی شیٔ نکر خشعا ابصارهم	جس روز ایک بلانے والا فرشتہ (ان کو)
یخرجون من الاجداث کانهم	ایک ناگوار چیز کی طرف بلائے گا۔ ان کی
جراد منتشر (قمر ۶-۷)	آنکھیں ذلت کی وجہ سے جھکی ہوں گی
	اور قبروں سے اس طرح نکل رہے ہوں گے
	جس طرح ٹڈی (چاروں طرف) پھیل جاتی ہے)
إنا جعلنا ما علی الارض زینة	ہم نے زمین پر کی چیزوں کو اس زمین کے لئے
لها لنبلوهم ایهم احسن عملا	باعث رونق بنایا تاکہ ہم ان لوگوں کی

---

[1] الادب الجاہلی ۔ طٰہٰ حسین ۔ ص ۱۴۲ ۔ طاقاہرہ ۱۹۵۸ء

وانا لجاعلون ما علیها صعیدًا جرزا (کہف - ۸۰) | آزمائش کریں کہ ان میں زیادہ اچھا عمل کون کرتا ہے اور ہم اس (زمین) پر کی چیزوں کو ایک صاف میدان (یعنی فنا) کر دیں گے۔

کلما ألقی فیها فوج سألهم خزنتها الم یاتکم نذیر قالوا بلی .... (ملک ۹-۸) | ۸. جب (دوزخ) میں کوئی گروہ (کافروں کا) ڈالا جائے گا تو اس کے محافظ ان لوگوں سے پوچھیں گے کہ کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا (پیغمبر) نہیں آیا۔

امیہ بن ابی الصلت کے اشعار[1] یہ ہیں۔

ویوم موعدهم ان یحشروا زمرا | یوم التغابن اذ لا ینفع الحذر
مستوسقین مع الداعی کأنهم | رجل الجراد زفته الریح منتشر
وأبرزوا بصعید مستو جرز | وانزل العرش والمیزان والزبر
یقول خزانها ما کان عندکم | ألم یکن جاء کم من ربکم نذر
قالوا بلی فتبعنا فتیة بطروا | وغرنا طول هذا العیش والعمر

(ترجمہ) (۱) قیامت کے دن جب لوگ گروہ در گروہ جمع کئے جائیں گے تو وہ سود و زیاں میں کمی بیشی کا دن ہوگا۔ اس روز بچ نکلنے کی ساری کوششیں عبث ہو جائیں گی۔

(۲) وہ پکارنے والے کی آواز پر اس طرح اکٹھے ہو جائیں گے جیسے کہ ٹڈیوں کا دل ہو، اور تیز ہوا نے ان کو منتشر کر دیا ہو۔

(۳) ان کو چٹیل میدان میں لایا جائے گا جہاں عدالت، انصاف، میزانِ عمل اور آسمانی کتب موجود ہونگی۔

---

[1] المعانی الحدیثۃ ۔ البستانی ۔ ج ۱ ص ۳۰۱ ط بیروت ۱۹۳۲ء۔

۴۔ وہ دوزخ میں ان سے سوال کریں گے کہ تمہارے پاس عمل کی پونجی کیا ہے ؟ کیا تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس کوئی آگاہی دینے والا نہیں آیا ؟

۵۔ وہ جواب دیں گے کہ آگاہی دینے والے آئے لیکن ہم نے متکبر جوانوں کا ساتھ دیا ہم کو زندگی اور عیش کی فراوانی نے دھوکہ میں ڈال دیا تھا۔

ان اشعار کو اس حریفانہ طرز عمل سے کوئی مناسبت نہیں جو امیہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اختیار کر رکھا تھا، وہ آپ کے رفتار کی ہجو اور آپ کے مخالفین کی حمایت میں پیش پیش تھا۔ غزوۂ بدر میں جو مشرک قتل کئے گئے، ان کے غم میں اس نے مرثیے لکھے۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے خیالات اخذ کئے ہوں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ اس نے ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ کیا ہو؟ پھر اگر قرآن مجید کے جواب میں یہ اشعار کہے گئے ہوتے تو ان میں اور قرآنی نصوص میں یکساں تعبیرات نہ ہوتیں نہ شاعر تو اس بات کی کوشش کرتا ہو کہ اس کے اشعار کو تکلف اور تصنع سے پاک سمجھا جائے۔ (یہی وجہ ہے کہ مذکورہ بالا اشعار کی امیہ کی طرف نسبت کو درست نہیں سمجھا گیا ہے) ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں اس کے حقیقی کردار کی جھلک بھی موجود نہیں ہے۔ ان اشعار کا مصنوعی انداز بیان، امیہ کے معیار و مقصد کے مطابق بھی نہیں ہے۔

ایک اور مستشرق سی ٹسڈل (C. Tisdall) ناقدین قرآن کے شبہات بیان کرنے کے بعد، قرآن کے ربانی سرچشمہ پر نقد کرتا ہے۔ اس نے امرء القیس کی طرف منسوب درج ذیل اشعار نقل کئے ہیں۔ ان میں قرآنی تعبیرات موجود ہیں۔

دنت الساعة وانشق القمر   عن غزال صاد قلبی و نفر

احور قد حرت فی اوصافه   ناعس الطرف بعینیه حور

وانا لجاعلون ما علیها صعیداً	آزمائش کریں کہ ان میں زیادہ اچھا عمل
جرزاً (کہف ...)	کون کرتا ہے اور ہم اس (زمین) پر کی چیزوں
	کو ایک صاف میدان (یعنی فنا) کر دیں گے
کلما ألقی فیها فوج سألهم	(۲) جب (دوزخ) میں کوئی گروہ (کافروں) کا
خزنتها الم یاتکم نذیر	ڈالا جائے گا، تو اس کے محافظ ان لوگوں
قالوا بلی .... (ملک ۹۱۰)	سے پوچھیں گے کہ کیا تمھارے پاس کوئی ڈرانے
	والا (پیغمبر) نہیں آیا۔

امیہ بن ابی الصلت کے اشعار[1] یہ ہیں۔

ویوم موعدهم ان یحشروا زمرا	یوم التغابن اذ لا ینفع الحذر
مستوسقین مع الداعی کأنهم	رجل الجراد زفته الریح منتشر
وأبرزوا بصعید مستوٍ جرز	وانزل العرش والمیزان والزبر
یقول خزانها ما کان عندکم؟	ألم یکن جاء کم من ربکم نذر
قالوا بلی فتبعنا فتیة بطروا	وغرنا طول هذا العیش والعمر

(ترجمہ) (۱) قیامت کے دن جب لوگ گروہ در گروہ جمع کئے جائیں گے تو وہ سود و زیاں میں کتر بیونت کا دن ہوگا۔ اس روز بچ نکلنے کی ساری کوششیں عبث ہو جائیں گی۔

(۲) وہ پکارنے والے کی آواز پر اس طرح اکٹھے ہو جائیں گے جیسے کہ ٹڈیوں کا دل ہو، اور تیز ہوا نے ان کو منتشر کر دیا ہو۔

(۳) ان کو چٹیل میدان میں لایا جائے گا جہاں عدالتِ انصاف میزانِ عمل اور آسمانی کتب موجود ہونگی۔

---

[1] المجانی الحدیثۃ، البستانی۔ ج ۱ ص ۲۰۶ ط بیروت ۱۹۴۶ء

۴۔ داروغۂ جہنم سوال کریں گے کہ تمہارے پاس عمل کی پونجی کیا ہے؟ کیا تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس کوئی آگاہی دینے والا نہیں آیا۔؟

۵۔ وہ جواب دیں گے کہ آگاہی دینے والے آئے لیکن ہم نے متکبر جوانوں کا ساتھ دیا ہم کو زندگی اور عیش کی فراوانی نے دھوکہ میں ڈال دیا تھا۔

ان اشعار کو اس جاہلانہ طرز عمل سے کوئی مناسبت نہیں جو امیہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اختیار کر رکھا تھا۔ وہ آپ کے کفار کی ہجو اور آپ کے مخالفین کی حمایت میں پیش پیش تھا۔ غزوہ بدر میں جو مشرک قتل کئے گئے، ان کے غم میں اس نے مرثیے لکھے۔ بہر حال یہ کیونکر ممکن ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے خیالات اخذ کئے ہوں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ کیا ہو؟ پھر اگر قرآن مجید کے جواب میں یہ اشعار کہے گئے ہوتے ان میں اور قرآنی نصوص میں یکساں تعبیرات نہ ہوتیں۔ شاعر تو اس بات کی کوشش کرتا ہو کہ اس کے اشعار کو تکلف اور تصنع سے پاک سمجھا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ بالا اشعار کی امیہ کی طرف نسبت کو درست نہیں سمجھا گیا ہے) ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں اس کے عملی کردار کی جھلک بھی موجود نہیں ہے۔ ان اشعار کا مصنوعی انداز بیان، امیہ کے معیار و مقصد کے مطابق بھی نہیں ہے۔

ایک اور مستشرق سی ٹسڈل (C.Tisdall) نامی قرآن کے شبہات بیان کرنے کے بعد، قرآن کے ربانی سرچشمہ پر نقد کرتا ہے۔ اس نے امرء القیس کی طرف منسوب درج ذیل اشعار نقل کئے ہیں۔ ان میں قرآنی تعبیرات موجود ہیں۔

دنت الساعۃ وانشق القمر — عن غزال صاد قلبی و نفر

احور قد حرت فی اوصافہ — ناعس الطرف بعینیہ حور

بسما هر من لحاظ فانك　　　　نرعتني كمشيم المنتصا

۱۔ قیامت قریب آگئی، اور چاند پھٹ گیا لیکن مجھ ہرنی کی صفت جو ہے عجب نے ساعت کی جس نے میرے دل کا شکار کیا، اور چل گئی،

۲۔ وہ بڑی اور روشن آنکھوں والی ہے، اس کی خوبیاں دیکھ کر میں متحیر ہو گیا ہوں، اس کی آنکھیں نشیلی ہیں، شفاف اور سپید حلقہ میں سیاہ پتلی حسن میں اضافہ کر رہا ہے،

۳۔ اس کے قاتل نگاہوں کے تیر نے مجھے ایک لاغر قیدی بنا دیا ہے،

عربی زبان و ادب کا ایک ماہر ادیب اور مبصر عباس محمود عقاد لکھتا ہے کہ بس اسلام کی عربی زبان، اور قرآن کی زبان میں یکسانیت ثابت کرنے کے لئے الٹ پلٹ بحث کرنے والے یہ مستشرقین اپنی نادانی سے یہ سمجھتے ہیں کہ علمائے اسلام مذکورہ بالا اشعار کی دور جاہلیت سے نسبت کا انکار کرتے ہیں۔ عاجز اور بے بس نظر آتے ہیں ان مستشرقین کا ذوق ادب شناس نہیں ہے۔ کیونکہ ان اشعار پر پہلی نظر پڑتے ہی یہ یقین ہو جاتا ہے کہ امراء القیس یا کسی بھی جاہلی شاعر کی طرف ان کو منسوب کرنا ایک غیر ادبی حرکت ہے[1]

قرآن مجید فصیح و بلیغ عربی زبان کا بلند ترین نمونہ ہے۔ اس لیے اس دور میں نثر و نظم میں جو عربی تعبیرات موجود تھیں، اور مخاطب سے گفتگو اور افہام و تفہیم کیلئے جو محاورے مانوس تھے۔ قرآن نے ان کو بھی استعمال کیا ہے۔ حضرت عمرؓ اور بعض دوسرے صحابہ کرام نے بعض مسائل پر اظہار خیال کیا تو قرآن نے اپنی ہدایت اور رہنمائی کے ضمن میں ان کے لفظوں کو بھی نقل کیا ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ کیسے نکالا جا سکتا ہے کہ قرآن کو ان سے ماخوذ قرار دیدیا جائے۔ اور پھر امیہ کے قول دنت الساعة۔ اور قرآنی الفاظ اقتربت الساعة میں ادبی نقطۂ نظر سے بڑا فرق ہے[2]

---

[1] اسلامیات، ا، عباس محمود لعقاد۔ ص ۱۵۱، ۵۲۔ طا مصر دار الشعب۔ [2] قرآنی لفظ "اقتربت" کا صوتی آہنگ قیامت کی ہولناکی کو زیادہ واضح کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ معنوی اعتبار سے بھی اقتربت کا لفظ زیادہ جامع ہے۔ (مترجم)

دور جدید کے سائنسی انکشافات اور علمی تحقیقات نے قرآنی بیانات کی تصدیق کی ہے۔ کائنات کے بارے میں اس کے نقطۂ نظر اور انسانوں کے لیے اس کی ہدایات اور رہنمائی کی صحت پر اب تو نئے سائنسی دلائل بھی میسر آ گئے ہیں۔ قرآن جس کثرت کے ساتھ علمی حقائق سے بحث کرتا ہے، اس کی کوئی دوسری مثال، کتب آسمانی میں موجود نہیں، قرآن کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اگر وہ اس زمانہ میں نازل ہوتا تب بھی دور جدید کی علمی ترقیوں کے درمیان اس کے بیانات اپنی جگہ ثابت شدہ اور اٹل رہتے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایسا قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف ذاتی صلاحیتوں ہی کا نتیجہ ہو؟ کیا گردوپیش کے یہودو نصاریٰ یا بدو عربوں سے استفادہ کرکے ایسا قرآن پیش کرنا ممکن تھا؟

انسانی تاریخ میں کیا کسی ایسے امی کی مثال موجود ہے۔ جو جوانی کی سرحدوں کو پار کر گیا ہو اور علم اور دانشوری کی کوئی بات اس میں نہ پائی جاتی ہو[1] اس نے اس عرصہ میں نہ تو شاعری اور خطابت کے جوہر دکھائے ہوں، اور نہ ہی تاریخی بیرز۔ اور بڑے رہنماؤں کی طرح اس میں ترقی اور بلندی کی طرف جست لگانے والا حوصلہ پایا گیا ہو، پھر وہی امی چالیس برس مکمل کرتے ہی اچانک ایک نئے دور کے بانی کی حیثیت سے نمودار ہو۔ انسانوں کے مذہبی عقائد و روایات اور مذہبی قوانین کی اصلاح کرے، ایسا اجتماعی و روحانی انقلاب برپا کر دے جس کی پوری انسانی تاریخ میں کوئی نظیر نہ ہو، ایسی عمر میں کسی امی کی طرف سے اچانک کسی کام کا آغاز کرنا۔ کسی علم و فن کی بنیاد ڈالنا۔ یا نئے قوانین وضع کرنا۔ اور عمومی انقلاب سے آنا ممکن نہیں۔ ایسے کارنامے انجام دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ سابق میں اس کے لیے تیاریاں مکمل کر لی گئی ہوں، اور عنفوان شباب میں اس کے نئے

---

[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دانشوری قبل اسلام بھی زبان زد تھی۔ تعمیر کعبہ کے موقع پر حجر اسود کے نزاعی مسئلہ کو آپ ہی نے اپنی دانشمندی سے حل کیا تھا۔ (مولف)

لازمی شرائط و اوصاف حاصل کرنے گئے ہوں۔ لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعوت سے پہلے امی ہی تھے، انھوں نے جو انقلاب برپا کیا۔ اس کے لئے۔ ان کی پچھلی زندگی میں، تعلیم و تربیت اور حصول استعداد کے وہ مواقع نہیں تھے۔ جن کی بنا پر آئندہ زندگی میں ان سے کسی بڑے کام کی توقع کی جاتی۔)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے قبل اور بعد کی زندگی میں جو نمایاں فرق نظر آتا ہے وہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ قرآن کسی نئی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ انسانی نفسیات پر اثر انداز ہونے کی وہ حیرت انگیز صلاحیت، جو بعد میں آپ کے اندر پیدا ہو گئی تھی۔ وہ یقیناً اس وحی کا پرتو ہے جو آپ پر اثر انداز ہو چکی تھی۔ چنانچہ قرآن مجید میں یہ کہا گیا ہے کہ :

وانزل الله عليك	اور اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اور علم کی باتیں
الكتاب والحكمة	نازل فرمائیں اور آپ کو وہ باتیں بتلائی
.... وعلمك مالم	ہیں۔ جو آپ نہ جانتے تھے اور آپ پر اللہ
تكن تعلم وكان فضل الله	کا بڑا فضل ہے۔
عليك عظيما۔ (نساء ۔ ۱۱۳)	

وحی قرآنی کا سرچشمہ ذات محمدیؐ سے باہر تھا۔ اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ قرآن نے نبی کی ذاتی رائے اور شخصی مزاج سے کئی جگہ اختلاف کیا ہے۔ مثلاً ایک موقع پر نبی پر عتاب کرتے ہوئے یہ تاکید کی گئی تھی کہ

ما كان لنبي ان يكون له أسرى	نبی کی شان کے لائق نہیں کہ ان کے
حتى يثخن في الأرض	قیدی باقی رہیں بلکہ قتل کر دیئے جائیں،

---

۱ الوحی المحمدی۔ رشید رضا۔ ص ۳۰۲

تریدون عرض الدنیا والله یرید الآخرة والله عزیز حکیم، لولا کتاب من الله سبق لمسکم فیما أخذتم عذاب عظیم،

انفال ۶۷-۶۸

جب تک کہ وہ زمین میں اچھی طرح (مقابلہ پر آنے والے ان کفار کی خون ریزی نہ کرلیں۔ تم تو دنیا کا مال و اسباب چاہتے ہو اور اللہ تعالیٰ آخرت (کی مصلحت) کو چاہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑے زبردست حکمت والے ہیں)۔ اگر اللہ تعالیٰ کا ایک نوشتہ (مقدر) نہ ہو چکتا تو جو امر تم نے اختیار کیا ہو۔ اسکے بارہ میں تم پر کوئی بڑی سزا واقع ہوتی۔

بدر کے قیدیوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نرم خوئی کی وجہ سے فدیہ لیکر چھوڑ دیا تھا آپ کو یہ توقع تھی کہ اس بات کا حریف طاقتوں پر اچھا اثر پڑے گا۔ اور آپ کی قوم بھی شاید ہدایت پا جائے۔ لیکن آپ کو دوسرا طرز عمل اختیار کرنے کی تاکید کی گئی۔ اور یہ بتایا گیا، کہ اس موقع پر حکمت الٰہی کے مطابق کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیئے تھا۔ اس عتاب میں مقام ربوبیت اور مقام عبدیت کا فرق بہت زیادہ نمایاں ہے۔ طرز کلام ایسا ہے کہ متکلم اور مخاطب دونوں کی حیثیت واضح طور پر مختلف نظر آتی ہے۔

غزوۂ تبوک میں شرکت سے باز رہنے پر جب منافقین نے آپ کے سامنے اپنے اپنے عذر پیش کئے تو ان کو آپ نے شریک نہ ہونے کی اجازت دیدی، اس پر یہ عتاب نازل ہوا۔

عفا الله عنك لم أذنت لهم حتى يتبين لك الذين صدقوا وتعلم الكاذبين (توبہ۔ ۴۳)

اللہ تعالیٰ نے آپ کو معاف (تو) کر دیا لیکن آپ نے ان کو (ایسی جلدی) اجازت کیوں دیدی تھی جب تک کہ آپ کے سامنے سچے لوگ ظاہر نہ ہو جاتے اور آپ جھوٹوں کو معلوم نہ کر لیتے۔

مستشرقین کا یہ دعویٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گردو پیش کے ان یہودیوں اور عیسائیوں سے معلومات اخذ کی تھیں جو اسلام قبول کرنے کے بعد آپ کے صحابی و رفیق بنے۔ یہ محض ایک ذہنی خیال ہے۔ ان کا ایمان لے آنا تو اس بات کا ایک قطعی ثبوت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والی وحی ایک اٹل صداقت تھی، ان کو جو پیغام حق سنایا گیا تھا۔ وہ اگر انہی سے استفادہ کرکے ترتیب دیا گیا ہوتا تو وہ لوگ آپ کو چھوڑ کر اپنے اپنے دین کی طرف واپس لوٹ جاتے، وہ رسول کی عقیدت و محبت میں مخلص نہ ہوتے، اور نہ ہی اسلام کے لئے اپنی دعوتی خدمات میں وہ اس قدر جانفشانی کرتے، اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تکلیفوں پر پیہم صبر و تحمل، سرکشی اور عناد پر مسلسل ضبط اور برداشت کا رویہ، تاریخی شہادتوں کی بنا پر اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ آپ کی نبوت برحق تھی۔ اور آپ کا پیغام ایک ابدی صداقت تھا۔ اس پر آپ کو کامل یقین تھا۔ اور مختلف مذاہب کے جو لوگ آپ پر ایمان لائے وہ بھی پیغام اور پیغمبر دونوں کی صداقت کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

انسانی تاریخ میں جھوٹی نبوت کے دعویدار شعبدہ باز مفکرین اور دجل و فریب میں مبتلا قائدین اپنی تحریکوں اور دعوتوں کے لیے اس قدر قربانیاں پیش نہیں کرتے۔ اور ان کے پیروؤں میں ایسا ہی ایمان و اخلاص، اور حکموں کی ایسی ہی بجا آوری نظر نہیں آتی ہے۔ اس کا نمونہ تو ہم کو سیرت نبوی میں یا صحابۂ کرام ہی کے حالات میں نظر آتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زبردست نبوی کردار اور اس کے حیرت انگیز نتائج کے بعد بھی اگر کسی دلیل نبوت کی جستجو ہو تو یہ ایسا ہی ہوگا۔ جیسا کہ کسی عظیم معمار اور ماہر انجینیر نے بڑی عظیم اور پرشکوہ عمارتیں تعمیر کی ہوں اور ان کا مشاہدہ کرنے کے بعد بھی کوئی شخص فن تعمیر سے ان کی واقفیت کا ثبوت طلب کرے۔

سویڈن کے ایک مستشرق ٹار اینڈریکے (Tor Andrae) نے اپنی کتاب محمدؐ، ان کی زندگی اور عقائد میں، یہ لکھا ہے کہ اس موضوع پر مستشرقین کی بحث و نظر کا طریقہ مفید نہیں ہے۔ اس نے یہ صراحت کی ہے کہ

"نبوت کو ہزاروں جزئی عناصر کا مجموعہ قرار دے کر پھر اس کے جوہر کا تجزیہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ ایک محقق کا فرض تو یہ ہے کہ وہ ایک ماہر مبصر کی طرح یہ دیکھے کہ مختلف عناصر اور محرکات سے وہ جوہری وحدت کس طرح وجود میں آگئی جس میں زندگی کے تمام علامتیں پائی جاتی ہیں۔ اسلام اس بات کا منکر نہیں ہے کہ یہودی، مسیحی اور حنیفی (ابراہیمی) مذاہب اور عربی روایات سے اس کے روابط نہیں ہیں، لیکن اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ وہ محض مذکورۂ بالا عناصر ہی کا مجموعہ ہو۔"[1]

قرآن مجید میں جو غیبی خبریں اور علمی حقائق بیان کیے گئے ہیں۔ ان سے ثابت ہو جاتی ہے کہ قرآن کسی انسانی عقل و فہم کا نتیجہ نہیں ہے۔ چنانچہ جن مسلم یا غیر مسلم محققین نے قرآن کے بیان کئے ہوئے علمی اور کائناتی حقائق کا مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے اس حقیقت کا بھی اعتراف کیا ہے۔

فرانس کے ایک محقق ڈاکٹر موریس بوکائی نے اپنی کتاب "قرآن، بائبل اور سائنس" میں اپنے مطالعہ کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"قرآن نے جن سائنسی گوشوں پر بحث کی ہے وہ میرے لیے خاص طور پر حیرت انگیز ہے۔ یہ بحثیں پوری طرح جدید سائنسی علوم کے مطابق ہیں۔ میں نے پہلے سے کوئی فیصلہ کئے بغیر، بڑی بیدار مغزی کے ساتھ معروضی انداز میں قرآنی بیانات کا مطالعہ کیا تھا۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں نے غیر شعوری طور پر، اس مطالعہ میں ان معلومات۔

---

[1] مجلۃ مجمع اللغۃ العربیۃ دمشق۔ محمد کامل عیاد، ج ۳ م ۴۴/ ۱۹۶۹ ص ۱۰۱

کا بھی اثر قبول کیا ہو، جیسے جوانی کی عمر میں حاصل ہوئی تھیں، اس زمانہ میں اکثر لوگوں کی طرف سے اسلام کے خلاف گمراہیوں کے بارے میں باتیں ہوا کرتی تھیں، صرف یہ جاننے کے لیے کہ اس مذہب کا بانی ایک انسان ہے، یہ آسمانی مذہب نہیں ہے۔ اس لیے اللہ کے یہاں بھی اس مذہب کی کوئی وقعت نہیں ہے، یہ ممکن تھا کہ میں اسلام کے بارے میں پھیلے ہوئے ان غلط خیالات میں بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح اب بھی الجھا رہتا۔

"میں نے چند روشن خیال لوگوں سے ملاقات کی، وہ قرآن کے ماہر نہ تھے، تاہم ان سے گفتگو کے بعد، اسلام کے بارے میں میرے ذہن میں جو تصویر ابھری وہ مغربی ذرائع سے حاصل ہونے والے خیالات سے بالکل ہی مختلف تھی۔ میں نے قرآن کے مطالعہ کو اپنا نصب العین بنایا، تنقیدی مطالعہ کی غرض سے مختلف اہم حواشی کی مدد سے قرآن کی ایک ایک آیت کا جائزہ لیا، یہ حقیقت میرے لیے چونکا دینے والی تھی۔ کہ قرآن نے کائناتی مظاہر کے بارے میں خاص طور پر دقیق اشارے کئے ہیں۔ اور وہ ان تصورات و افکار کی تائید میں ہیں۔ جو کائنات کے بارے میں اس وقت تک ہمیں دریافت ہوئے ہیں۔ محمدؐ کے زمانہ میں کسی بھی انسان کے بس میں یہ بات نہ تھی کہ کائناتی مظاہر کے بارے میں ہمارے دریافت کردہ نظریات و حقائق کا ایک ادنیٰ تصور بھی قائم کر لیتا۔ اس کے بعد میں نے بہت سی ایسی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ جو مسلمان اہل علم نے خاص طور پر قرآن کے سائنسی پہلوؤں پر لکھی ہیں۔ توراۃ میں ہم کو نمایاں طور پر سائنسی اغلاط ملتی ہیں لیکن قرآن میں اس طرح کی کوئی ایک غلطی بھی دستیاب نہیں ہوئی، اس صورت حال نے میرے سامنے ایک اہم سوال پیدا کر دیا۔ اور وہ یہ ہے کہ قرآن کا مؤلف اگر کوئی انسان ہوتا تو ساتویں صدی عیسوی میں وہ ایسی باتیں کیسے لکھ سکتا تھا۔ جو دور جدید کی تحقیقات

کی روشنی میں بھی بالکل درست ثابت ہوں۔ قرآن کا جو نسخہ اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ وہی نسخہ یقینی طور پر ابتداء ہی سے اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔ نزول قرآن کے زمانہ میں کوئی بھی انسان جس کا علمی افق، ہزار سال گزر جانے کے بعد بھی ہماری علمی سطح سے زیادہ وسیع اور جدید تر ہو، ایسا ممکن نہیں، واقعہ یہ ہے کہ مختلف موضوعات پر قرآنی اشارات حیرت انگیز حد تک سائنسی پہلو رکھتے ہیں۔ جس کو پڑھ کر ہم چونک جاتے ہیں۔

سائنس نے جن مسائل پر غور وفکر کیا ہے۔ ان میں سے قبل ولادت بچہ کی نشو ونما کے مختلف مراحل کا مسئلہ بھی ہے۔ بطن مادر میں بچہ کی نشو ونما کے جو مراحل قرآن میں بیان کئے گئے ہیں۔ ان کا علم الجنین کے سائنسی انکشاف سے موازنہ کرکے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ قرآنی آیات اور جدید تحقیقات کس حد تک اپنے نتائج میں یکساں ہیں[1]۔

ڈاکٹر بوکائی کی مذکورہ بالا شہادت بڑا وزن رکھتی ہے وہ ایک محقق عالم اور نکتہ رس اسکالر ہے۔ اس نے قرآن کی ایک ایک آیت کا بغور مطالعہ کیا ہے ایک ماہر اور مبصر عالم کی حیثیت سے سائنسی علوم کی روشنی میں اس نے اپنی تحقیق کے جو نتائج اہل علم کے سامنے پیش کئے ہیں۔ اس سے علم کی شان دوبالا ہو جاتی ہے اس نے دوسرے مستشرقین کی طرح یہ رائے نہیں دی کہ قرآن یہودیوں اور عیسائیوں کی معلومات پر مشتمل ایک ایسی کتاب ہے جسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ترتیب دیا ہو۔

بوکائی کے تحقیقی نتائج کے بالکل ہی برعکس، ایک اور مستشرق الحداد[2]، قرآن مجید پر اپنے تحریر کردہ حواشی میں دوسری رائے کا اظہار کرتا ہے۔ اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ بند لفافہ کو کھولے اور پڑھے بغیر ہی اظہار خیال کی جرأت کر رہا ہے، وہ لکھتا ہے کہ

---

[1] موریس بوکائی۔ القرآن والتوراۃ والعلم۔ ص ۲۰۰، ۲۰۱ ۔ ۲۴۱ ۔ دار المعارف مصر ۱۹۷۷ء۔ [2] الحداد نے "دراسات قرآنیہ" کے سلسلہ کی کئی کتابیں لکھی ہیں، جن پر اس کا نام "الاستاذ الحداد" درج ہے، اس کے حواشی قرآن پر تاریخ اشاعت اور پبلشر کا نام بھی موجود نہیں ہے، غالباً وہی یوسف الحداد ہے جو ایک لبنانی عیسائی ہے۔ (مؤلف)

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کتابی تعلیم اور انجیل سے واقفیت کا راز یہ ہے کہ ان کے پڑوس میں خدیجہؓ کے چچازاد بھائی جو بنو اسد قبیلہ سے تھے، موجود تھے، وہ ایک مسیحی عالم تھے۔ انھوں نے ہی اپنے چچا کی بیٹی خدیجہ کا آپ سے نکاح کیا، تاریخی واقعات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ورقہ نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا۔ وہ تورات و انجیل کا عربی زبان میں ترجمہ کرتے تھے۔ اس لیے وہ یقیناً ایک بڑے عیسائی عالم تھے، نبوت سے پہلے محمدؐ ان کے پڑوس میں پندرہ برس رہے، کیا عرب کے نابغہ محمدؐ بن عبد اللہ کے لئے یہ مدت، تورات و انجیل کا علم حاصل کرنے کے لئے کافی نہ تھی۔؟

صحیح بخاری میں یہ صراحت بھی ہے کہ محمدؐ، غار حرا سے، جب خائف ہو کر لوٹے تو ورقہ نے ہی ان کی دعوت اور نبوت کی تصدیق کی۔ مگر ورقہ کے انتقال کے بعد، وحی کا سلسلہ رک گیا، جس پر محمدؐ نے کئی بار خودکشی کر لینے کا ارادہ کیا، مدینہ میں بھی ہم کو نبی کے ساتھ یہودیوں اور عیسائیوں کا ایک حلقہ نظر آتا ہے۔ یہ لوگ مسلمان ہو گئے تھے یا انھوں نے اسلام کا ساتھ دیا تھا۔ موذن رسولؐ بلال حبشی، ایک عیسائی دولت مند صہیب رومی ایک اور عیسائی سلمان فارسی، اور یگانۂ روزگار یہودی عبد اللہ بن سلام جو کعب احبار کے ساتھ مسلمان ہوئے، یہ تمام لوگ ہم کو اس محفل میں نظر آتے ہیں، ظاہر ہے۔ کہ ان لوگوں کی گفتگو کا اصل محور تورات و انجیل ہی رہی ہو گی۔ اور یہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ نبیؐ اور قرآن، کا ماحول، ہر پہلو سے اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) ہی کا ماحول تھا۔ محمدؐ اور قرآن کا علمی و ثقافتی مرجع یہی لوگ تھے نہ کہ وحی الٰہی۔ اور نزول آیات [1]

حداد کا یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود و نصاریٰ سے استفادہ کیا تھا

---

[1] الحداد: القرآن والکتاب، قسم ۲ ۔ اطوار الدعوۃ القرآنیہ ۔ ص ۱۰۶۰ ۔ ۱۰۵۹۔

اور جاہلیت کی تمام تر تاریخی دستاویزات اس کے برعکس یہ ثابت کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر گرد و پیش کے ماحول کا کچھ بھی اثر نہ تھا۔ انھوں نے تو اپنے ماحول ہی کے مانوس عقیدوں اور روایتوں کے خلاف ایک نئی دعوت پیش کی، جس کی یہود و نصاریٰ اور مشرکین، سب ہی نے مخالفت کی تھی۔ بشر فارس نے خاص اسی موضوع پر فرانسیسی زبان میں "الشرف عند العرب قبل الاسلام" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اور اس میں اسلام پر یہودی اور مسیحی اثرات کی تردید کی ہے۔

حداد نے بخاری کی عبارت کا مفہوم بھی غلط سمجھا ہے۔ کہ "ورقہ کے انتقال کے بعد وحی کا سلسلہ رک گیا"۔ بخاری میں تو یہ ہے کہ کچھ دنوں کے بعد ورقہ کا انتقال ہو گیا، اور وحی کا سلسلہ رک گیا تھا"۔ اس عبارت میں یہ بات نہیں کہی گئی ہے کہ "ورقہ کے انتقال کی وجہ سے وحی کا سلسلہ رک گیا"۔ ان دونوں فقروں میں ترتیب مقصود ہوتی تو دونوں جملوں کے درمیان حرف عطف فَ ہوتا، جو ترتیب کے اعتبار سے تاخیر کے معنی میں آتا ہے۔ حرف وَ (اور) ترتیب زمانی کے لیے استعمال نہیں ہوتا ہے۔

حداد نے اپنے ذاتی رجحان کی وجہ سے، قرآن و انجیل، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان غلط مبحث سے بھی کام لیا ہے۔ اس کا یہ خیال ہے کہ

> "قرآن اور نبی، دونوں مسیح کی نبوت اور انجیل کے پیغام پر پوری طرح ایمان رکھتے ہیں لیکن نبی عربی نے مسیح کی ولدیت کو تسلیم نہیں کیا۔ کیونکہ انھیں مسیح کی کامل معرفت حاصل نہیں ہوئی، ان کا گمان یہ ہے کہ فرزند الٰہ ہونے کے لیے لازمی طور پر، مسیح کے لیے، اللہ سے جسمانی رشتہ ضروری ہے۔ اور اللہ کے لیے بیوی ماننا اور اس سے ازدواجی رشتہ قرار دینا بھی لازمی تھا[4]
>
> قرآن میں ہے بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنّٰی یَکُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ (الانعام-۱۰۲)
>
> وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے۔ اس کے اولاد کہاں ہو سکتی ہے، حالانکہ اس کی کوئی بیوی تو ہے نہیں۔"

---

[4] المسیح فی القرآن۔ ص ۲۲۸۔

ان کا یہ بھی خیال ہے۔ کہ اللہ کو عالم جسدی کی طرح، روحانی عالم میں بھی فرزندکی احتیاج
ہوتی ہو حالانکہ قرآن میں ہے۔ وما ینبغی للرحمٰن ان یتخذ ولدا ۰ مریم ۹۲ (خدائے
رحمان کی شان نہیں کہ وہ اولاد اختیار کرے۔) دراصل فرزندی کا تعلق عالم جسد سے
ہے۔ جس پر اس کے وجود کا پرتو جلوہ فگن ہے۔ بنی عربی کو مسیح کی فرزندی کی معرفت حاصل
ہو جاتی تو وہ ان کو بے تکلف اللہ کا بیٹا تسلیم کر لیتے کیونکہ قرآن میں ہے کہ قل ان کان
الرحمٰن ولد فانا اول العابدین ۰ زخرف ۸۱ (آپ کہئے اگر خدائے رحمان کے اولاد ہو
تو سب سے اول اس کی عبادت کرنے والا میں ہوں)۔

مذکورۂ بالا آیتوں میں جو باتیں حسنؔ اور کے عقیدہ و خیال کے مطابق نہ تھیں ان کا سرچشمہ وہ
بنی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو قرار دیتا ہے۔ اور جن آیتوں کو وہ اپنے عقیدہ و خواہش کے موافق پاتا
ہے۔ ان کو قرآن کی طرف منسوب کرتا ہے۔ مثلاً قرآن کی آیت: اولئٓک الذین ھدی اللہ
فبھدٰھم اقتدہ ۰ انعام ۹۰ (یہ حضرت ایسے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے (صبر کی) ہدایت کی تھی تو آپ
بھی ان ہی کے طریقہ پر چلئے) پر اس نے درج ذیل حاشیہ لکھا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں قرآن بنی عربی کو نسل ابراہیمی کے ان نبیوں کا طریقہ اختیار کرنے کا حکم دیتا
ہے جن کو اللہ نے کتاب و نبوت اور ایک خاص طرح کی دانش سے نوازا تھا، اللہ کی طرف سے
یہ رہنمائی اور ہدایت تورات و انجیل میں موسیٰ و عیسیٰ کے ذریعہ سے موجود ہے[1]

(باقی)

---

[1] المدراد المسیح فی القرآن۔ ص ۲۲۰

سلسلۂ اسلام مستشرقین جلد چہارم

تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر مستشرقین کے اعتراضات کے جواب ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی نے جو کچھ
لکھا ہے۔ وہ سب اس میں جمع کر دیا گیا ہے۔　　　قیمت - ۳/۰ روپیہ

سیرۃ النبیؐ جلد سوم

پر

کچھ اعتراضات اور ان کے جوابات

از ضیاء الدین، اصلاحی،

سیرۃ النبیؐ جلد سوم کی گوناگوں خوبیوں اور خصوصیات پر ہم تفصیل کے ساتھ اپنے گذشتہ مضمون میں بحث کر چکے ہیں۔ لیکن اس جلد پر بعض لوگوں نے کچھ اعتراضات بھی کیے ہیں۔ اس لیے ہم ان پر بھی ایک نگاہ ڈال لینا مناسب سمجھتے ہیں۔

اس جلد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کا ذکر ہے۔ اور معجزات کے بارہ میں جیسا کہ ہم نے لکھا ہے لوگ عام طور پر افراط و تفریط میں مبتلا ہیں، مخالفینِ اسلام کی طرح خود مسلمانوں کے عقل پرست اور تجدد پسند طبقہ کے خیال میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی خوارقِ عادات سے خالی تھی یا آپ کو حسی معجزات کے بجائے صرف معنوی معجزات عطا کئے گئے تھے، اس کے مقابلہ میں قدامت پسند طبقہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و مناقب میں اضافہ و کثرت دکھانے کے لئے آپ کی جانب گوناگوں معجزات و خوارق منسوب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں اس کو رطب و یابس اور مستند و غیر مستند ہر قسم کی روایات کو قبول کرنے میں تامل نہیں ہوا ہے۔

اس افراط و تفریط کے مقابلہ میں سیرۃ النبیؐ جلد سوم میں معجزات کے سلسلہ میں اعتدال

وتحقیق کا نقطۂ نظر اختیار کیا گیا ہے، اس لئے نہ تو معجزات کا انکار کیا گیا ہے۔ اور نہ آپؐ کی ہر ہر بات کو جس میں ذرا بھی اعجوبہ نظر آیا، معجزہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس بنا پر اس میں آپ کے انہی معجزات وخصائص کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے۔ جو قرآن مجید سے صراحتاً یا اشارتاً ثابت ہیں یا جو صحیح وثابت حدیثوں میں مذکور ہیں، رہے وہ معجزات جن کا ذکر موضوع، منکر اور ضعیف روایات میں ہے۔ اُن سے یا تو اس میں تعرض ہی نہیں کیا گیا ہے۔ یا اگر تعرض کیا گیا ہے۔ تو ان روایات واحادیث پر تنقید کی گئی ہے۔ جن پر ان معجزات کا دارومدار ہے۔ ظاہر ہے اس طرح کے معجزات بکثرت تھے۔ مگر مصنف سیرت کا بیان ہے کہ انھوں نے اس طرح کے انہی معجزات کو موضوع بحث بنایا ہے جو عام طور سے ہمارے ملک میں مشہور ہیں۔ اور میلاد کی محفلوں میں ان کو بصد شوق وذوق پڑھا اور سنا جاتا ہے۔

سیرت کے اس معتدل نقطۂ نظر پر پہلے گروہ کا اعتراض یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی معجزات وخوارق سے خالی ہے۔ تو اس میں آپؐ کے اس قدر معجزات کا ذکر کیوں اور کیسے کیا گیا ہے، دوسرے گروہ کو شکایت یہ ہے کہ سیرت میں آپؐ کے اُن معجزات سے کیوں تعرض نہیں کیا گیا ہے، جو ضعیف ہی نہیں موضوع اور منکر روایتوں میں مذکور ہیں، اس گروہ کے نزدیک ایمانیات و احکام سے متعلق روایات میں تو تشدد سے کام لیا جاسکتا ہے، مگر فضائل ومناقب پر مشتمل احادیث میں تساہل اور نرمی روا ہے۔

پہلے گروہ کے اعتراض کے جواب میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ اور خود مصنف سیرت نے بھی جابجا اس کا جواب دیا ہے۔ اس لئے سردست اس کے اعتراضات سے صرف نظر کیا جاتا ہے اور صرف دوسرے گروہ کے اعتراضات پر بحث کی جاتی ہے مگر اس سے قبل دو اصولی باتوں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ جن کو پیش نظر نہ رکھنے ہی کی وجہ سے سیرت پر اس قسم کے فضول اعتراضات عائد کئے گئے ہیں، ہمارے خیال میں اگر ان دونوں باتوں کو ملحوظ رکھا جائے تو سیرت پر سارے اعتراضات کی جڑ

خود بخود کٹ جائے گی۔

ہم اپنے مضمون میں وضاحت سے لکھ چکے ہیں کہ سیرۃ النبیؐ کی تالیف میں صحت و استناد کا خاص خیال رکھا گیا ہے، اس لیے قرآن مجید اور احادیث صحیحہ ہی کو اس کا ماخذ قرار دیا گیا ہے۔ اور ضعیف و موضوع روایات سے بحث و استناد سے پرہیز کیا گیا ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ابتداء میں سلسلۂ سیرت کے بانی مولانا شبلیؒ کا خیال یہ تھا کہ وہ تمام تر قرآن مجید ہی کی روشنی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ مرتب کریں لیکن بعد میں انھوں نے اس کا دائرہ وسیع کر دیا۔ اور قرآن مجید کے علاوہ جن دوسرے صحیح و مستند مآخذ و ذرائع سے اس میں مدد لی ہے، ان کا ذکر سیرت جلد اول کے مقدمہ میں موجود ہے۔ اس اصول کی بنا پر ضعیف اور موضوع روایتوں کے لیے سیرۃ النبیؐ میں کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی تھی اور معاملہ چاہے احکام و عقائد کا ہو یا فضائل و مناقب کا، ضروری ہے کہ ہر ایک میں صحیح و ثابت حدیثوں ہی کو بنیاد بنایا جائے اور سیرت نبویؐ کے کسی گوشہ کو بھی ضعیف و موضوع حدیثوں سے داغدار نہ کیا جائے۔

دوسری بنیادی چیز یہ ہے کہ سیرۃ النبیؐ کی جلدیں دراصل جدید علم کلام کی اساس و بنیاد ہیں اور یہ ان اعتراضات و شبہات کے جواب میں لکھی گئی ہیں جو عقل پرستوں، مخالفینِ اسلام اور خصوصاً مستشرقین اور یورپ کے فضلا کی جانب سے اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات و تعلیمات کے بارے میں کیے جاتے ہیں، اس لیے اس میں آیات و احادیث کی درست اور حقائق پر مبنی تاویل و توجیہہ بھی کی گئی ہے۔ اور ایسا مدلل، سائنٹفک اور دلنشین انداز بھی اختیار کیا گیا ہے جس سے معترضین کو بھی پوری تسلی و تشفی اور اطمینان ہو جائے اور معجزات، ایمانیات، اخروی عالم کے حقائق اور دوسرے مابعد الطبیعاتی مسائل کے بارہ میں کسی شک و انکار کی گنجائش باقی نہ رہے۔ ایسی صورت میں سیرت میں رطب و یابس مواد اور کتب احادیث و سیرت کی نامعتبر روایات کو کسی حال میں بھی ماخذ نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ کیونکہ انھی کی بنیاد پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات و سیرت کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

جو لوگ سیرۃ النبی کے اس نقطۂ نظر اور ماخذ و مصادر کے بارے میں اس کے اصول و طریقہ کو سامنے نہیں رکھتے وہ اس پر خواہ مخواہ بے سرو پا اعتراضات کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اس میں روایات واحادیث کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور انھیں تنقید و تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا گیا ہے۔ اور ان کی تاویل و توجیہ کی گئی ہے۔

ہمارے پیش نظر اس وقت ترجمان السنۃ جلد چہارم ہے۔ اس کا مقدمہ تمام تر سیرۃ النبی جلد سوم کے رد میں لکھا گیا ہے۔ اور سیرت و مصنف سیرت کا نام لئے بغیر بلا حوالہ اس کے اقتباسات نقل کر کے ان کی تردید کی گئی ہے۔ معلوم نہیں نام لینے میں کیوں تکلف سے کام لیا گیا ہے۔ اور حوالہ نہ دینے میں کیا مصلحت تھی۔

ترجمان السنۃ میں سیرۃ النبی جلد سوم پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں۔ ان کا لب لباب تو صرف یہ ہے کہ سیرت میں ضعیف اور غیر مستند احادیث سے ثابت معجزات کو کیوں نظر انداز کیا گیا ہے۔ اور ضعیف و موضوع روایات پر نقد و جرح سے کیوں کام لیا گیا ہے مصنف ترجمان السنۃ کے خیال میں معجزات کی ایسی تاویل و توجیہ کی گئی ہے جس کا نام تاویل و انکار بھی نہیں تحریف ہے۔ اس کے ثبوت میں جو باتیں کہی گئی ہیں۔ ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ سیرت میں معجزات کو اضافی قرار دیا گیا ہے۔

۲۔ قدرت کے قاہرانہ مظاہر کو بھی زبردستی مادی قوانین کے تحت داخل کیا گیا ہے، معجزات کا تجزیہ و تحلیل کر کے آیات ربانیہ اور تائیدات الٰہیہ کی روح فنا کر دی گئی ہے۔

۳۔ معجزات کی حقیقت کھوکھلی کر دی گئی ہے۔

۴۔ معنوی معجزات پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اور حسی معجزات کو ظاہری سطحی اور اصل اعجاز کی روح سے خالی یا کمزور قرار دیا گیا ہے۔ اس سے حسی معجزات کی اہمیت خود بخود گر گئی ہے۔ اور انھیں

قرآن کی نظر میں بھی بے حیثیت بتایا گیا ہو۔

۵۔ معجزات کی تعداد کم سے کم بتائی گئی ہے۔

۶۔ سید صاحبؒ محدثین کی اصطلاح اور فن کے معمولی قواعد سے ناواقف اور حدیث سے بے خبر تھے، انھوں نے محدثین کبار سے بدظنی و بدگمانی پیدا کی ہے، کتب دلائل کے مسلّم مولفین سے بد اعتقادی ظاہر کی ہے۔ اور ان کے بارہ میں خلاف واقع اور خطرناک طرز نگارش اختیار کی ہے۔

یہ اعتراضات عائد کرنے کے بعد جو نتائج نکالے گئے ہیں، ان کو بھی نقل کر دینا مناسب ہو گا۔

مصنف سیرت کے ذہن میں معجزہ کی حقیقت منقح نہیں تھی۔ اس کی صحیح حقیقت تک ان کی رسائی نہ ہو سکی اور وہ اس کی تاریخ سے بھی ناآشنا تھے، انھوں نے معجزات کے باب کو دھکا لگانے کی سعی ناکام کی ہے، معتزلہ کی تائید کی ہے، اور وہ معجزات کے خلاف محاذ قائم کرنے والوں میں تھے۔ سید صاحب معنوی معجزات پر زور دیکر حقیقت ناشناسی کے جرم کے مرتکب، ہی نہیں بلکہ غیر شعوری طور پر انکار یا تاویل معجزات کی دلدل میں پھنس گئے ہیں، انھوں نے صحیح معجزات کو مشتبہ بنانے کا نیا طرز اختیار کیا ہے، شاہ ولی اللہ اور جمہور اور اکابر محدثین کے طریقے سے ناواقف تھے۔

جن لوگوں نے سیرۃ النبیؐ جلد سوم کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ وہ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان اعتراضات کا اصلیت اور نفس مباحث سے کوئی تعلق نہیں ہے، اور یہ زیادہ غور و فکر پر مبنی نہیں ہیں۔ اور نہ سیرت کے نقطۂ نظر کے مطابق ہیں۔ ان کا اصولی جواب تو اوپر گذر چکا ہے۔ تاہم سطور ذیل میں خاص خاص اعتراضات پر مختصر بحث کی جاتی ہے۔

کیا معجزہ اضافی ہے | سیرۃ النبیؐ جلد سوم میں "دلائل و معجزات اور فلسفہ جدیدہ" کا باب مشہور فلسفی مولانا عبد الباری ندویؒ کا لکھا ہوا ہے، اسی میں بعض پہلوؤں سے معجزہ کو اضافی کہا گیا ہے۔ جس کی تردید ترجمان السنۃ میں اس طرح کی گئی ہے،

"معجزہ خدائی فعل ہوتا ہے۔ اس میں رسول کی قدرت، اس کے اختیار، اس کے ارادہ اور اس کی توجہ و تاثیر نفسی کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ تو پھر یہ فیصلہ بدیہی ہے۔ کہ معجزہ کبھی اضافی بھی نہیں ہو سکتا۔ یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ جو کل تک کسی نبی کا معجزہ ہو وہ مادی ترقیات کے بعد معجزہ باقی نہ رہے۔ مثلاً دوسرے ملک کی آواز سن لینا اگر کل معجزہ تھا تو وہ "لاسلکی" کی ایجاد کے بعد بھی معجزہ رہے گا۔ کیونکہ معجزہ کی حقیقت میں اس کا "بلا واسطہ اسباب ظاہری" ہونا رکن لازم ہے۔ لہذا اگر آج بھی آلات کے بغیر کوئی شخص دوسرے ملک کی آواز سن لیتا ہے۔ تو بیشک وہ آج بھی معجزہ کہلائے گا۔ اور اگر بالفرض کل جو آواز سنی گئی تھی۔ وہ اسی لاسلکی کے اصول پر تھی۔ خواہ اس وقت لوگوں کو اس کا علم تھا یا نہ تھا۔ تو جس طرح وہ آلہ اس ایجاد کے بعد معجزہ نہیں کل بھی اس کو معجزہ نہیں کہا جا سکتا۔"

(ترجمان السنۃ جلد چہارم۔ ص ۱۰۱)۔

یہاں معجزہ کے خدائی فعل ہونے کے بارہ میں سیرۃ النبیؐ کا نقطۂ نظر جان لینا ضروری ہے۔ کیونکہ ترجمان السنۃ کے مصنف نے ایک جگہ سیرۃ النبیؐ کے مصنف پر یہ اعتراض بھی عائد کیا ہے کہ وہ معجزات کو رسولؐ کی طاقت کا نتیجہ سمجھے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"اس حقیقت یہ ہے کہ معجزات پر بحث کرنے والے اگر اس طرف بھی نظر کر لیتے کہ معجزات رسولؐ کی طاقت سے نہیں خدا تعالیٰ کی قدرت سے ظاہر ہوتے ہیں تو آیات نبوت کو نوامیس طبیعیہ کے بجائے نوامیس الٰہیہ پر قیاس کر کے دیکھتے اور تمام بحثیں جو ایک محکوم مادہ کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہیں۔ خود بخود ساقط ہو کر رہ جاتیں۔" (ایضاً۔ ص۱۱۰)

اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سیرت میں معجزات کو خدا کے بجائے رسول کا فعل قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ اس میں یہ ذیلی عنوان قائم کیا گیا ہے۔ "معجزہ کا سبب صرف ارادۂ الٰہی ہے"

اور اس کے تحت مولانا سید سلیمان ندویؒ تحریر فرماتے ہیں۔

"قرآن مجید نہ تو اسباب مادیہ کا منکر ہے۔ اور نہ عالم کے نظام کار کو علل و مصالح سے خالی تسلیم کرتا ہے۔ لیکن وہ ان تمام اسباب و علل سے مافوق ایک اور قادر اور ذی ارادہ ہستی کو فرمانروائے کل یقین کرتا ہے جس کی مشیت اور ارادہ کی قوت سے کائنات کی یہ مشین چل رہی ہے۔ معجزہ کا سبب اور علت براہ راست اس کی مشیت اور ارادہ ہے ..... اسی لئے انبیاءؑ نے یہ تصریح کی ہے کہ جو کچھ ان سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ صرف خدا کی قدرت، مشیت اور اذن سے ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ ظاہری علل و اسباب کے مطابق ہوں تو وہ پیغمبر اور خدا کے باہمی ربط و علاقہ کی دلیل کیونکر بن سکتے ہیں۔ کفار ان کو دیکھ کر فوراً کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو فلاں سبب سے ہوا ہے۔ اس لیے خدائی نشان ہونے کا ثبوت کیونکر بہم پہنچ سکتا ہے۔" (سیرۃ النبیؐ جلد سوم۔ ص ۲۰۲)

حضرت سید صاحبؒ نے "مسئلہ اسباب و علل میں افراط و تفریط" کے زیرعنوان جو کچھ لکھا ہے۔ اس میں بھی اسی حقیقت کو نہایت واشگاف انداز میں دکھایا ہے۔ اور افراط و تفریط کے بجائے یہ اعتدال کی راہ اختیار کی ہے۔

"قرآن مجید اسباب و علل، مصالح و حکم اور طبائع و خواص کے وجود کو تسلیم کرتا ہے اور اس جماعت کا ساتھ نہیں دیتا، جو ان چیزوں کا انکار کرتی ہے، اور یہ جانتی ہے کہ ان چیزوں کے تسلیم کرنے سے قدرت و مشیت الٰہی کے عقیدہ . . . .

کا ابطال لازم آتا ہے، حالانکہ یہ تو اس وقت لازم آتا ہے، جب ان اسباب، علل اور طبائع و خواص کو خدا سے مستقل اور مستغنی تسلیم کیا جائے اور قرآن اس کی تعلیم نہیں دیتا، قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ اشیا اسباب و علل سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور ان میں طبائع و خواص ہیں۔ لیکن

یہ اسباب و علل اور طبائع و خواص خود خلاق عالم کے پیدا کردہ اور مقرر کردہ ہیں، اور وہ ان ہی پر عموماً کار بند رہتا ہے۔ لیکن وہ اس درجہ ان کا مجبور اور پابند نہیں کہ وہ ان میں تغیر نہ کر سکتا ہو۔ اور کبھی اپنے خاص حکم و ارادہ سے بھی وہ ان کو شکست نہ کر سکتا ہو۔ کیونکہ اس عقیدہ سے کفر پرورش پاتا ہے۔ اور خدا کی قدرت اور عظمت میں فرق آجاتا ہے، اسی لیے ہر موقع پر قرآن مجید نے اپنی تعلیم میں، اس نکتہ کو لمحوظ رکھا ہے کہ اسباب و علل کے ساتھ ساتھ خدا کی مشیت اور ارادہ کو پیش نظر رکھتا ہے تاکہ انسانوں میں خدا کی معذوری، مجبوری اور عدم قدرت کا تصور نہ پیدا ہو اور نہ اس کی مشیت و ارادہ پر خود اس کی مشیت و ارادہ کے سوا خارجی پابندیاں عائد ہوں،

ہم نے اوپر اسباب و علل اور طبائع و خواص کے ثبوت میں جس قدر آیتیں لکھی ہیں، غور کرو ان سب میں فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ نے خود اپنی طرف کی ہے۔ جس کا یہ مطلب ہے کہ ان مسبباب کے اسباب و علل اور اشیا کے طبائع و خواص خود اس نے اپنی مشیت وارادہ اور اپنے حکم و امر سے بنائے ہیں اور ہر جگہ اس کی توضیح کر دی ہے۔ تاکہ ظاہر بیں انسان ان ظاہری علل و اسباب اور طبائع و خواص کو دیکھکر اشیا کی علت حقیقی کا انکار کر کے مبتلائے الحاد یا اسباب و خواص کو مستقلاً شریک تاثیرمان کر گرفتار شرک نہ ہو جائے، یہ انبیاءؑ کی تعلیم کا خاص طریقہ ہے۔ اور قرآن نے اس نکتہ کو کہیں فراموش نہیں کیا ہے، یہاں تک کہ انبیائے کرام اور بزرگان خاص کو بھی عادت جاریہ اور ظاہری علل و اسباب کے خلاف باور کرنے میں جب استعجاب اور استبعاد ہوا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو متنبہ کیا ہے۔ اور ان کے اس استعجاب اور استبعاد کو اپنی قدرت اور مشیت کو یاد دلا کر رفع کیا ہے۔"

(سیرۃ النبیؐ جلد سوم۔ صفحہ ۲۶۹، ۲۷۰)

س اسی لیے نقل کیا گیا ہے تاکہ مصنفِ ترجمان السنۃ کے اعتراض کی حقیقت پوری
ور یہ معلوم ہو جائے کہ انھوں نے مصنفِ سیرت کی جانب ایسی بات منسوب
ے لکھی نہیں ہے۔ بلکہ نہایت دو ٹوک انداز میں ثابت کیا ہے کہ معجزہ خدائی فعل
ی کی قدرت و مشیئت سے ظاہر ہوتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ مصنف ترجمان السنۃ
یر ہی یہ اعتراض عائد کر دیا ہے، اور اس کی بنیاد پر جو عمارت تعمیر کی ہے۔
پر ان کے دوسرے اعتراضات کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ کس قدر بے
کے خدائی فعل ہونے کا مسئلہ تھا۔ اب رسول کے ارادہ، توجہ اور تاثیر نفسی
مل یہ مصنفِ سیرت کے اپنے خیالات نہیں ہیں بلکہ جدید فلسفہ کے ماہرین کے افکار
نے ترجمانی کی ہے۔ اور جو مثالیں دی ہیں۔ ان کا مقصد معجزہ کے مابعد الطبیعاتی
یا نا ہے۔ مولانا عبدالباری ندویؒ لکھتے ہیں۔

اکٹر البرٹ مول کا ابھی نام لیا جا چکا ہے۔ اس جرمن فاضل کی کتاب "ہپناٹزم
پر سب سے بہتر نہایت محققانہ اور مستند خیال کی جاتی ہے، ڈاکٹر موصوف نے
دکھایا ہے کہ بہت سے معجزات کی توجیہ نہایت آسانی کے ساتھ تنویم مقناطیسی
ہے" (سیرۃ النبیؐ جلد سوم۔ ص ۱۵۳)

فلاسفہ کے نظریات پیش کر کے معجزات کی جو توجیہ کی گئی ہے، وہ نہ معجزات کا
ن میں تحریف، بلکہ ان کے متعلق شکوک و شبہات رفع کر کے یہ دکھلانا ہے کہ
حال اور مستبعد نہیں ہیں، انہی حکماء و فلاسفہ کے افکار و خیالات کی توضیح اور
کے ضمن میں ان کے اس شبہ کا ذکر آ گیا ہے۔

ہ اسی وقت تک معجزہ ہے جبتک کہ اس کے نفسی یا مادی قوانین و علل کا انکشاف

نہیں ہوتا، لاسلکی پیام رسانی کے انکشافات سے پہلے اگر کوئی شخص ہندوستان میں بیٹھ کر ایک سکنڈ میں امریکہ کا کوئی واقعہ معلوم کر لیتا تو یہ کسی معجزہ سے کم نہ ہوتا۔ لیکن اب معمولی بات ہے" (سیرۃ النبی جلد سوم صفحہ ۱۹۰)

اس شبہہ کا جواب سیرت میں یہ دیا گیا ہے۔

"بے شبہہ اس معنی کر کے معجزہ یقیناً اضافی شے ہے۔ اور ہمیشہ رہے گا، کوئی معجزہ ایسا نہیں پیش کیا جاسکتا جو اس احتمال اضافیت سے خالی ہو۔ کیونکہ انسان کا علم ہی تمام تر اضافی ہے اگر اس کا علم قطعی و محتم طور پر تمام قوانین فطرت کا احاطہ کر سکتا تو البتہ کسی حد تک معجزہ کی نسبت یہ مطالبہ بجا ہو سکتا تھا۔ کہ ابد الآباد تک کسی قانون فطرت سے اس کی توجیہہ نہ ہونی چاہیے۔ لیکن جب ہمارا علم ہی اضافی ہے تو کوئی معجزہ احتمال اضافیت سے کیسے خالی ہو سکتا ہے"

..... لہذا جو شے آج معجزہ ہے بالفرض کل وہ طبعی واقعہ ثابت ہو جائے تو بھی اس سے آج اس کے معجزہ ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ اور معجزہ کی غرض و غایت کو پورا کرنے کے لیے اسی قدر کافی ہے۔" (سیرۃ النبیؐ جلد سوم۔ ص۱۹۶)

یہاں دو باتیں الگ الگ ہیں جن کو معترض نے گڈمڈ کر دیا ہے۔ پہلی بات میں ان کا اور سیرت نگار کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یعنی کل تک جو چیز معجزہ تھی۔ اگر آج کی ترقی کے نتیجہ میں اس کی توجیہہ کی صورت پیدا ہو جائے اور اس میں کوئی خاص اعجاز نظر نہ آئے تب بھی وہ چیز معجزہ رہے گی، دوسری بات یہ ہے کہ موجودہ ایجاد و ترقی کے زمانہ میں اگر وسائل ایجاد و ترقی سے کام لیے بغیر کوئی چیز معجزانہ طور پر رونما ہو تو وہ معجزہ کہلائے گی یا نہیں، سیرت میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا ہے۔ اس نسبت سے سیرت کے مصنفین پر جو اعتراض کیا گیا ہے، وہ بالکل بے سر و پا ہے، البتہ اس میں جدید فلاسفہ کا یہ خیال نقل کیا گیا ہے کہ "اب اس میں اس قدر اعجاز نہیں ہے، جو ایجاد سے پہلے تھا۔ بلکہ یہ ایک معمولی بات ہے"۔

اس کو مصنف سیرت کی جانب منسوب کرنا صریح زیادتی ہے، سیرت میں اسے نقل کرکے معجزات کو اس حیثیت سے اقرب الی الفہم ثابت کیا گیا ہے کہ جن چیزوں کو کل تک مستبعد خیال کیا جاتا تھا۔ اب جب وہ ممکن ہو گئی ہیں تو کسی کو معجزات میں شک وشبہہ کی گنجائش کہاں باقی رہتی ہے۔

مولانا بدر عالم صاحب کو یہ زیب نہیں دیتا تھا کہ وہ بے سوچے سمجھے ایک بے بنیاد اعتراض کرکے مصنف سیرت پر طنز کریں کہ "معجزات کی طرف سے جوابدہی کرنے والوں کے خود اپنے ذہن میں ہی معجزہ کی حقیقت منقح نہیں ہے۔" (ص۱۹)

اس تفصیل سے اہل نظر خود اندازہ کرسکتے ہیں کہ سیرۃ النبیؐ میں معجزہ کو علی الاطلاق اضافی شے قرار نہیں دیا گیا ہے۔ بلکہ ایک خاص نوعیت سے اضافی بتایا گیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر پوری طرح غور کر لیا جاتا تو یہ مضحکہ خیز اعتراض نہ کیا جاتا۔

ترجمان السنۃ کے دوسرے اعتراضات مثلاً "قدرت کے قاہرانہ مظاہر کو بھی زبردستی مادی قوانین کے تحت داخل کیا گیا ہے۔ یا معجزات کی حقیقت کھوکھلی کر دی گئی ہے۔ یا انھیں بے روح اور اعجاز سے خالی بتایا گیا ہے۔ اسی طرح معنوی معجزات پر زور دیکر حسی معجزات کی اہمیت کم کر دی گئی ہے" وغیرہ بھی سراسر غلط اور عدم غور و فکر کا نتیجہ ہیں ہم ان کی اور پہلے اعتراض کی تردید کے لیے سیرۃ النبیؐ جلد سوم کے چند اقتباسات نقل کرتے ہیں۔ تاکہ اصحاب علم خود فیصلہ کرلیں کہ معجزات کے بارہ میں سیرۃ النبیؐ کا موقف کس قدر اعتدال وسلامتی پر مبنی ہے، جو لوگ اسے غلط ثابت کرنا چاہتے ہیں وہ دراصل خود انکے قصور علم وفہم کا نتیجہ ہے۔

"تیسرا احتمال یہ ہے کہ کسی مادی واسطہ کا حذف و اضافہ کیے بغیر براہ راست خدا نے صرف ارادہ "کن فیکون" سے قمر کو شق اور مسیحؑ کو پیدا کر دیا۔ یہی آخری صورت عمیق النظر فلاسفہ و متکلمین اور اہل حق کا مذہب ہے۔ بلکہ پہلے احتمال کی تو خود کلام مجید کی رو سے گنجائش نہیں۔

اس لیے کہ تنویم کا عمل اس کے عامل کے علم و ارادہ کے تحت ہوتا ہے، اور معجزات میں انبیاء علیہم السلام کے علم و ارادہ کو قطعاً دخل نہیں ہوتا، اسی لئے وہ فرمائش و تحدی پر کسی آیت یا معجزہ کو خود پیش کر سکنے سے عجز کا صاف اعتراف اور اس امر کا غیر مشکوک اعلان کرتے ہیں کہ "آیات تو صرف اللہ ہی کے اختیار میں ہیں"۔ (إِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ اللَّهِ ۔ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِنْدَ رَبِّي) اور اگر رسول ان کو پیش کرتا یا کر سکتا ہے۔ تو صرف اللہ ہی کے براہ راست حکم و اذن سے، خود کسی رسول میں ہرگز اس کی طاقت نہیں کہ اللہ کی مرضی و مشیت کے بغیر کوئی آیت یا معجزہ پیش کر سکے (مَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ) اگر عامل تنویم کی طرح انبیاء علیہم السلام اپنے ہی علم و ارادہ سے معجزات ظاہر کرتے ہوتے تو حضرت موسیٰ اپنے عصا کو سانپ کی صورت میں ظاہر فرما کر خود اسی سے کیوں ڈرتے اور اس کے پھر عصا بنا دینے کو اللہ تعالیٰ براہ راست اپنی طرف کیوں منسوب فرماتا کہ "ڈرو نہیں۔ ہم اس کو پھر اسی چھڑی ہی بنا دیں گے"۔ (لَا تَخَفْ سَنُعِيدُهَا سِيرَتَهَا الْأُولَىٰ)

باقی اور جتنے احتمالات اوپر بیان ہوئے ہیں۔ وہ بھی بس احتمالات و تاویلات ہی کے درجہ میں ہیں۔ لیکن تاویل خواہ بعید ہی ہو تکذیب کے مقابلہ میں اہون ہے۔ لہذا یہ درحقیقت ایسے طفل مزاج عقل پرستوں پر اتمام حجت اور انکار و تکذیب کی راہ سے ان کو بچانے کے لیے ہیں۔ جو بچوں کی طرح مٹھائی (عقل) کا نام لئے بغیر کسی اعلیٰ حقیقت کی طرف ملتفت ہی نہیں ہوتے اور جن کی عقل، عقل کے نام سے اتنی مرعوب ہے کہ خود عقل کی نارسائی تک بھی رسائی نہیں پا سکے ہیں۔

ورنہ اصل بحث و توجہ کی بات ایک ہی ہے کہ سارے کارخانۂ فطرت کی اساس و بنیاد کوئی بے شعور و بے ارادہ مبدأ ہے یا اندر باہر نفس و آفاق میں جو کچھ بھی ہے۔ اور ہوتا ہے تمامتر

بالذات و براہ راست کسی علم و ارادہ والی ذات کی مشیئت و قدرت کا ظہور ہے۔

فلسفہ اور فلسفیانہ عقل کے لیے ایک طرف تو یہ بات بہت پرانی ہو چکی ہے کہ جہاں کہیں جو کچھ بھی ہے یا ہو رہا ہے۔ وہ ایک ہی ہستی کی جلوہ فرمائی و کارفرمائی کے مظاہر ہیں۔ اور فلسفہ تصوریت کی رو سے (جس کا جدید فلسفہ میں خصوصاً دور دورہ ہے) یہ ہستی اسی نوعیت کی ہے جس کو ہم شاعر بالذات نفس و روح یا انا و ایغو سے تعبیر کرتے ہیں، باقی مادہ و طبیعت یا مادی و طبعی عوامل و قوانین کی ساری تعبیرات و اصطلاحات و فرضی معنی ہیں۔
تیرے الفاظ نے کر رکھے ہیں دفتر پیدا   ورنہ کچھ بھی نہیں اللہ کی قدرت کے سوا

(سیرۃ النبیؐ جلد سوم ص ۱۰۹ تا ۱۱۰)

آگے پھر لکھتے ہیں :-

" غرض یقین معجزہ کی اولین شرط خدا اور غیب کا یقین ہے، اس کے بعد اپنے اپنے علم و مذاق کے مطابق توجیہہ معجزات کی جس طرح یہ پہلی صورت ممکن ہے کہ دعا قوانینِ فطرت (خواہ نفسی یا مادی) ہی کے کسی مخفی عمل کا نتیجہ ہوں۔ اسی طرح مداخلت کی (خواہ براہ راست ہو یا بواسطہ حذف و اضافہ) " دوسری صورت " بھی قابل قبول ہے۔ انگلستان کے مشہور منطقی ولیم اسٹانل جیونس نے ایک نہایت ضخیم کتاب "اصول سائنس" کے نام سے لکھی ہے۔ جس میں آخری نتیجہ یہ نکالا ہے کہ

" اور علم سائنس کی حقیقت و نوعیت کے متعلق جو بحثیں گذری ہیں ان سے ایک نتیجہ جو نہایت صاف طور پر نکلتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم کارخانہ فطرت میں مداخلتِ خداوندی کے امکان کو کسی طرح باطل نہیں ٹھہرا سکتے ..... جس قوت نے کائنات مادی کو خلق کیا ہے، وہ میرے نزدیک اس میں حذف و اضافہ بھی کر سکتی ہے۔ اس قسم کے واقعات

ایک معنی کر کے ہمارے لیے ناقابلِ تصور کیے جاسکتے ہیں، پھر بھی یہ اس سے زیادہ ناقابل تصور نہیں ہیں۔ جتنا کہ خود عالم کا وجود ہے۔" مگر جو شخص اس خالق کائنات قوت ہی کا قطعاً منکر ہو، جو سرے سے غیب ہی پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ اور جو آرنسٹ ہیگل (جرمنی کا مشہور ملحد و مادہ پرست) کی طرح خود خدا، روح، حشر و نشر وغیرہ کو معجزات (یعنی اوہام و خرافات) قرار دیتا ہو۔ اور جس کے نزدیک "معجزات کا یقین جہالت و بربریت کی آخری نشانی ہو جس کا فنا کر دینا ہی علم و تمدن کی فتح ہوگی" تو ایسے آدمی کو آپ کسی معجزہ کا اس معنی میں کیونکر یقین دلا سکتے ہیں، کہ وہ کسی غیبی قوت کا آفریدہ ہے۔ یا جس شخص سے ظاہر ہوا ہے۔ اس کے عالم غیب کے ساتھ رابطہ و تعلق (نبوت) کی آیت یا نشانی ہے۔

یقین کی اوپر جو حقیقت بیان کی گئی ہے۔ اس کے لحاظ سے معجزہ پر بہ حیثیت آیت نبوت کے یقین کرنے کیلئے ضروری ہے کہ غیب پر ایمان ہو جس کے بغیر یقین معجزہ کی خواہش کا پیدا ہونا ناممکن ہے، پھر بھی جس شخص کی نسبت کوئی معجزہ بیان کیا جاتا ہو۔ یا جس سے یہ ظاہر ہوا ہو اس کی زندگی۔ إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ کی تفسیر اور ظاہری و باطنی کمالات کا بجائے خود ایک معجزہ ہو (یہ چیزیں خواہش یقین کے لیے مویدات کا کام دیں گی) اور سب سے آخری لیکن سب سے مقدم شرط یہ ہے کہ فرعون و ابوجہل کی طرح دل میں خصومت و عناد، خودی و خود بینی، ذاتی اغراض یا ہوا و ہوس کے موانع یقین نہ موجود ہوں۔ جس طرح ان شرائط کی عدم موجودگی میں کوئی دلیل بھی یقین معجزات پر آمادہ نہیں کر سکتی۔ بالکل اسی طرح ان کی موجودگی میں کوئی دلیل یقین معجزات سے باز نہیں رکھ سکتی۔" (سیرۃ النبیؐ۔ جلد سوم۔ صفحہ ۲۰۲ تا ۲۰۴)

ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو۔

"اس دلیل یا آیت کی جو غرض و غایت ہو سکتی ہے۔ اس کی نفسی حقیقت کو یوں سمجھو کہ

مذہب کی بنیاد تمام تر اسرار و غیوب پر ہے۔ سب سے بڑا سرِ غیب بلکہ غیب الغیب خود خدا کا وجود اور اس کی ذات ہے حشر و نشر جن و ملک وحی والہام تمام چیزیں ایک عالم غیب ہیں نبوت نام ہے، اسی عالم غیب کے ساتھ روابط و علائق کا، معجزہ میں بھی چونکہ ایک طرح کا غیب پایا جاتا ہے۔ یعنی وہ عالم ظاہری کے سلسلۂ علل و اسباب سے الگ معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے جو شخص غیب پر ایمان رکھتا ہے۔ اس کا نفس قدرۃً اس یقین کی جانب مائل ہو جاتا ہے کہ جس برگزیدہ انسان سے معجزہ ظاہر ہوا ہے، وہ عالم غیب سے خاص تعلق رکھتا ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص غیب پر ایمان نہیں رکھتا۔ یعنی سرے سے خدا اور مذہب ہی کا منکر ہے تو ظاہر ہے۔ کہ اس کے لئے معجزہ تصدیق نبوت کی نہ کوئی دلیل بن سکتا ہے۔ اور نہ آیت کسی نبی کے صادق یا کاذب ہونے کا تصفیہ تو اس کے بعد کی شے ہے کہ پہلے آدمی نفس اس امر کا قائل ہو کہ خدا کا کوئی وجود ہے۔ اور وہ ہدایت خلق کے لئے انبیاء کو بھیجتا یا بھیج سکتا ہے۔ جو آدمی نقطہ، خط یا سطح وغیرہ مبادی اقلیدس ہی کا قائل نہیں۔ اس کو تم اقلیدس کی کوئی شکل کیسے سمجھا سکتے ہو۔ جس طرح علوم کی فرعی تفصیلات کے ماننے کے لئے پہلے ان کے مبادی کا ماننا لازمی ہے، اسی طرح تفصیلات مذہب پر یقین کرنے کے لئے پہلے نفس مذہب کا یقین ضروری ہے!! (سیرۃ النبیؐ جلد سوم صفحہ ۱۸۶-۱۸۷)

دراصل پوری کتاب میں معجزات کے بارے میں یہی تصور و نظریہ ملتا ہے، اس کے بعد کون یہ باور کر سکتا ہے۔ کہ معجزہ کی حقیقت سیرت کے مصنف کے ذہن میں منقح نہیں تھی۔ اور انھوں نے اسے خدائی فعل قرار نہیں دیا ہے اور قدرت کے قاہرانہ مظاہر کو زبردستی مادی قوانین کے تحت داخل کیا ہے۔ یا معجزہ کی حقیقت کھوکھلی کر دی ہے اور اسے اعجاز سے خالی اور بے روح کر دیا ہے۔ یہ تو خود اعتراض کرنے والے کی اپنی رائے ہے۔ جس سے ان کی یہ توقع پوری نہیں ہو سکتی کہ دوسرے

بھی اسکی تائید کریں۔ سیرۃ النبی انہی لوگوں کے لئے نہیں لکھی گئی ہے۔ جو معجزہ کو مانتے اور تسلیم کرتے ہیں۔ بلکہ یہ اصلاً جدید ذہن و دماغ کی تشفی کے لئے لکھی گئی ہے۔ اور اس کا مقصد ان لوگوں کو مطمئن کرنا ہے۔ جو ہر چیز کو عقل کی ترازو پر تولتے ہیں۔ اس لئے، اس میں ایسا پیرایہ اختیار کیا گیا ہے۔ جس کو معترضین تاویل، انکار اور تحریف کا نام دے رہے ہیں۔ تاویل و توجیہ اگر کی گئی ہے۔ تو معجزہ کی حقیقت کو قریب الفہم بنانے اور عقلاً بھی اسے ممکن ثابت کرنے کے لئے کی گئی ہے۔ سیرت کے مصنف کو کیا خبر تھی کہ ان کی صحیح تاویل و توجیہ اور معتدل نقطہ نظر کے نافہمی سے وہ معنی پہنا دئے جائیں گے جو ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہ تھے۔

مصنف ترجمان السنۃ کے اس طعن و طنز پر مبنی اعتراض کی حقیقت بھی ملاحظہ کر لی جائے۔ لکھتے ہیں۔

"اس عبارت میں بھی عجیب طریقے پر اپنے عجز و ضعف کا اظہار ہے۔ کیونکہ یہاں معجزہ کو صرف ایک طفل تسلی کے درجہ میں تسلیم کیا گیا ہے۔ حالانکہ شریعت میں اس کا نام دلائل نبوت رکھا گیا ہے، اللہ تعالےٰ نے قرآن کریم میں معجزات دکھانے کی ایک حکمت یہ بھی بیان کی ہے کہ اس سے خصوم کی حجت ختم ہو جاتی ہے۔ اب غور فرمائیے کہ قرآن کی نظر میں جس امر کو قاطع حجت سمجھا جائے۔ اس کو دلائل کی فہرست سے خارج کر کے صرف ایک تائید کا مقام دیدینا کتنی نادانی ہے۔ درحقیقت یہ معجزہ کی قاہرانہ حقیقت تک نارسائی کا نتیجہ ہے۔"
(ترجمان السنۃ ج ۳ ص ۱۹)

وہ عبارت ملاحظہ ہو جس کی بنا پر یہ نار وا انداز بیان اختیار کیا گیا ہے۔

"معجزہ بجائے خود نبوت کی کوئی منطقی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ جس شخص میں ظاہری و باطنی کمالات یعنی اصلی خصائص نبوت و اوصاف حمیدہ عام انسانوں کے مقابلہ میں فوق العادۃ حد تک مجتمع ہوتے ہیں، اس کے حق میں معجزہ محض تائید مزید کا کام دے سکتا ہے، اور جس شخص پر نبوت کے اصلی خصائص و کمالات روحانی موثر نہ ہوں وہ بلاشبہ نبی کو بھی زیادہ سے زیادہ

ایک بڑا ساحر قرار دے گا۔ جیسا کہ منکرین نے ہمیشہ کہا ہے کہ ھٰذا لساحر کذاب۔

اِنَّ ھٰذَا لَسَاحِرٌ عَلِیۡمٌ (سیرۃ النبیؐ جلد سوم۔ ص ۱۹۳)

سیرۃ النبیؐ میں اسی مفہوم کو دوسری جگہ اور زیادہ وضاحت سے اس طرح پیش کیا گیا ہے۔

"اوپر آغاز کلام میں معجزہ کا جو مفہوم بیان کیا جا چکا ہے، اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ معجزہ نبوت کی کوئی منطقی دلیل نہیں ہے، البتہ جو شخص مذہب کا قائل ہے۔ غیب پر ایمان رکھتا ہے۔ اور اس سنت الٰہی کا معتقد ہے کہ بندوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے خدا ان ہی کے اندر سے کسی نہ کسی برگزیدہ بندہ کو اپنے پیام کے ساتھ بھیجتا رہا ہے۔ اس کے سامنے جب کسی مقدس انسان کی طرف سے اس پیام کے حامل یا نبی ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے اور یہ داعی الی اللہ اپنے ظاہری و باطنی کمالات، اخلاقیہ و اوصاف حمیدہ کے لحاظ سے عام انسانوں سے برتر نظر آتا ہے۔ تو اس شخص کے دل میں ایمان کی ایک لہر پیدا ہوتی ہے، اب اگر اس پیغمبر سے کوئی معجزہ یا واقعہ ظاہر ہوتا ہے یا اس کی طرف کسی معجزہ کا انتساب کیا جاتا ہے تو وہ اس کی صداقت کی ایک آیت یا نشانی کا کام دیتا ہے۔ جس سے ذوق ایمان کی تقویت ہوتی ہے۔ اور اس طرح ایمان کے تشنہ کام نفوس کے لئے ایک معنی کر کے معجزہ براہ راست خود نبوت کی نہیں البتہ مدعی نبوت کی صداقت کی ایک نفسی دلیل بن جاتا ہے۔" (سیرۃ النبی۔ جلد سوم۔ ص ۱۸۶)

مذکورہ بالا اقتباسات کو خوب غور سے پڑھئے۔ اور بتائیے کہ کیا اس میں معجزہ کے دلیل حجت قاطع ہونے کا کہیں انکار کیا گیا ہے۔ اور اسے دلائل کی فہرست سے خارج کیا گیا ہے۔ یا اس کے صرف منطقی دلیل ہونے سے انکار کیا گیا ہے۔ اور دونوں میں جو فرق ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ جہاں تک معجزات کے دلائل نبوت ہونے کا تعلق ہے۔ سیرت کے مولف کو نہ صرف یہ کہ

اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بلکہ وہ اسے پوری طرح مانتے تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس جلد کا نبوت کے عام دلائل و معجزات کے لیے مخصوص کیا ہے۔ اور آیات و دلائل نبوی کے عنوانات بھی قائم کئے ہیں۔ اور ان کا تعلق انبیاء علیہم السلام اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتوں سے دکھا اور واضح کیا ہے، لکھتے ہیں۔

"قرآن مجید میں اکثر انبیاءؑ کے سوانح و حالات کے ضمن میں ان آیات اور معجزات کا بھی بیان ہے۔ جو ان کو خدا کی بارگاہ سے عطا ہوئے تھے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیات و دلائل انبیاءؑ کے سوانح کا ضروری جزء ہیں۔ . . . . . قرآن مجید میں جن انبیاء کا تذکرہ ہے۔ ان میں کم و بیش حسب ذیل انبیاءؑ کے آیات و دلائل بیان ہوئے ہیں، حضرت نوحؑ۔ حضرت لوطؑ۔ حضرت صالحؑ۔ حضرت ہودؑ۔ حضرت شعیبؑ، حضرت زکریاؑ۔ حضرت یونسؑ۔ حضرت موسیٰؑ۔ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد رسول اللہ صلوات اللہ علیہم اجمعین۔ بعض ایسے انبیاء بھی ہیں۔ جن کے آیات و دلائل کے ذکر سے قرآن خاموش ہے، مثلاً حضرت اسحٰقؑ۔ حضرت اسمٰعیلؑ۔ حضرت ذوالکفل حضرت یسعؑ وغیرہ۔ لیکن اس خاموشی سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ ان کو کسی قسم کی نشانی اور دلیل نہیں عطا ہوئی تھی۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "ہر نبی کو کچھ ایسی باتیں دی گئیں۔ جن کو دیکھ کر لوگ اس پر ایمان لائے . . . . قرآن مجید نے انبیاءؑ کے ان معجزات کو عموماً آیت یعنی نشانی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔" (سیرۃ النبیؐ۔ جلد سوم۔ صفحہ ۲۱۱ - ۲۱۲)

ترجمان السنۃ کے مصنف کی تغلیط کے لیے ہم چند اور اقتباسات بھی نقل کرتے ہیں

"معجزات کا صدور اکثر اس طرح ہوتا ہے کہ معاندین یہ سمجھ کر کہ پیغمبر کاذب ہے اس سے کسی خرقِ عادت کا مطالبہ کرتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ وہ اسکو پیش نہیں کر سکتا۔

اور اس طریقہ سے لوگوں میں اس کی رسوائی ہوگی۔ اور اس کے دعوی کی تکذیب ہو جائے گی۔

لیکن اللہ تعالے اس خرق عادت کو ظاہر کر دیتا ہے۔ اور اس سے پیغمبر کی رسوائی اور فضیحت کے

بجائے اس کی صداقت اور راست بازی اور عالم آشکارا ہو جاتی ہے۔ اور اس بنا پر معجزہ اس کے

صدق پر ایک نشانی اور آیت بن جاتی ہے۔ فرعون نے جادوگروں کو جمع کر کے چاہا کہ حضرت

موسیٰؑ کو رسوا کرے۔ مگر یہی واقعہ حضرت موسیٰؑ کی کامیابی اور فرعون کی ناکامی کا سبب بن گیا

اور سینکڑوں جادوگروں نے حضرت موسیٰؑ کی دعوت پر صدائے لبیک بلند کر دی اس بنا پر

معاندین کا وجود اعلان نبوت کی بلند آہنگی اور شہرت کے لئے ضروری ہے" (سیرۃ النبیؐ جلد سوم صـ)

" الغرض ناقصین اور معاندین کے لیے جس طرح صدق نبوت کے دوسرے دلائل بیکار

ہوتے ہیں معجزہ کی شہادت بھی بیکار ہوتی ہے۔ (ایضاً۔ صـ۱۱) اس سے معلوم ہوا کہ

صرف معجزہ ہی نبوت کی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ ہر طبیعت صالحہ اور قلب سلیم کے لیے پیغمبر کی

صداقت کی مختلف دلیلیں موثر اور کارگر ہوتی ہیں" (ایضاً۔ صـ۱۳)

درج ذیل اقتباس میں متعدد لوگوں کے معجزات دیکھکر ایمان لانے کا ذکر ہے۔ اگر سیرۃ النبیؐ

کے مصنف معجزہ کے دلیل نبوت ہونے کے قائل نہ ہوتے تو ان واقعات کو کیوں قلمبند کرتے ملاحظہ ہو۔

" ایسے لوگ بھی تھے۔ جو ان روحانی و اخلاقی معجزات کے مقابلہ میں مادی معجزات سے

متاثر ہونے کی زیادہ قابلیت رکھتے تھے۔ قریش کے بہت سے لوگ فتح روم کی پیشین گوئی

کو پوری ہوتی دیکھکر اسلام لے آئے۔ ایک سفر میں ایک قبیلہ کی عورت آپ کی

انگلیوں سے پانی کا چشمہ بہتے دیکھکر اپنے قبیلہ میں جا کر کہتی ہے کہ آج میں نے عرب کے

سب سے بڑے جادوگر کو دیکھا۔ اور اسی استعجاب نے پورے قبیلہ کو مسلمان کر دیا۔

متعدد یہودی اس لئے مسلمان ہوگئے کہ گزشتہ انبیاؑ کی کتابوں میں آنے والے پیغمبر کی

جو نشانیاں بتائی گئی تھیں وہ حرف بحرف آپ میں صحیح نظر آتی تھیں۔ متعدد یہودی
علماء نے آکر آپ کا امتحان لیا۔ اور جب آپ نے ان کے سوالوں کے جوابات صحیح دئیے
تو وہ آپ کی نبوت پر ایمان لائے۔ ایک شخص نے کہا کہ میں اس وقت آپؐ کو سچا رسول تسلیم کروں
گا۔ جب یہ خرمے کا خوشہ آپ کے پاس آکر آپ کی رسالت کی شہادت دے۔ اور
جب یہ تماشا اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تو مسلمان ہو گیا۔ ایک سفر میں ایک اعرابی نظر آیا
آپؐ نے اس کو اسلام کی دعوت دی اس نے کہا آپ کی صداقت کی شہادت کون دیتا ہے۔
آپ نے فرمایا۔ سامنے کا درخت اور یہ کہکر آپ نے اس درخت کو بلایا۔ وہ اپنی جگہ سے
اکھڑ کر آپ کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ اور تین بار اس کے اندر سے کلمۂ توحید کی آواز آئی۔
یہ دیکھ کر وہ مسلمان ہو گیا۔ سراقہ بن مالک جو ہجرت کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور
حضرت ابوبکر صدیقؓ کے تعاقب میں گھوڑا دوڑاتے آ رہے تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ
آپؐ کی دعا سے تین دفعہ ان کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس گئے۔ تو ان کو یقین ہو گیا
کہ اسلام کے اقبال کا ستارہ نقطۂ اوج پر پہنچ کر رہے گا۔ چنانچہ خط امان حاصل کیا۔
اور بعد کو مسلمان ہو گئے (سیرۃ النبیؐ۔ جلد سوم۔ صفحہ ۱۱۶)

ایک اور اقتباس پر اس سلسلہ کو ختم کیا جاتا ہے۔

"حامل رسالت اپنے ابنائے جنس کو جو دعوت دیتا ہے اور دنیا کو جو پیام پہنچاتا
ہے۔ اس کی سچائی کی واضح ترین دلیل یا آیت اگرچہ خود یہ پیام اور اس کے حامل کا مجسم
وجود ہوتا ہے۔ تاہم بہ اقتضائے۔ لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِي یا بہ لحاظ اتمام حجت اس داعی حق
کے تعلق سے کچھ ایسے واقعات ظاہر ہوتے ہیں۔ جو عام حالات میں انسانی دسترس سے باہر
نظر آتے ہیں۔ اور ان کی توجیہ و تعلیل سے انسانی عقل اپنے کو درماندہ پاتی ہے۔

"حضرت ابراہیمؑ پر آگ سرد ہو گئی۔ حضرت موسیٰؑ کا عصا اژدہا بن گیا۔ حضرت عیسیٰؑ
بے باپ کے پیدا ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چشم زدن میں مسجد حرام سے لیکر مسجد اقصیٰ
وسدرۃ المنتہیٰ تک کی سیر کرلی۔ ان واقعات کی توجیہ سے چونکہ عقل انسانی عاجز ہے اس لئے
ان میں ایک طرح کا غیب نظر آتا ہے۔ اور جس شخص کے تعلق سے ان کا ظہور ہوتا ہے عالم
غیب کے ساتھ اس کے روابط کی نشانی وآیت یا تائید غیبی کا کام دیتے ہیں قرآن مجید کی
زبان میں اس قسم کے واقعات کا نام بینات۔ براہین یا زیادہ تر آیات۔
(آیات بینات) ہے۔ محدثین ان کو "دلائلِ نبوت" سے تعبیر کرتے ہیں اور علمائے متکلمین کی اصطلاح
میں ان ہی کو معجزات کہا جاتا ہے" (سیرۃ النبیؐ جلد سوم صفحہ ۱۱۰)

کیا ان اقتباسات کے بعد بھی کوئی شخص اس اعتراض کو تسلیم کر سکتا ہے کہ معجزات کو سیرۃ النبیؐ
میں دلائل کی فہرست سے خارج کر دیا گیا ہے۔ اور انھیں نبوت یا نبی کے دلائل تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔

معترض کے خیال میں سیرۃ النبیؐ میں معجزہ کو صرف ایک تائید کا مقام دینا نادانی ہے۔ لیکن اولاً
تو یہ مفروضہ ہی صحیح نہیں ہے کہ معجزہ کو صرف تائید کا مقام دیا گیا ہے۔ کیونکہ اوپر جو اقتباسات دئے گئے ہیں
وہ اس کی تردید کے لئے کافی ہیں ثانیاً سیرت میں جس حیثیت سے معجزہ کو تائید مزید کہا گیا ہے۔ وہ بالکل
درست ہے، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کسی ظاہری و مادی نشان کو دیکھکر اسلام قبول نہیں کیا تھا۔
ان کے سامنے جب معراج کا واقعہ بیان کیا گیا تو انھوں نے کفار قریش کی طرح اس کو جھٹلانے کے بجائے
اس کی تصدیق کی۔ اس طرح یہ معجزہ ان کے لئے تائید مزید بنا۔ حضرت ابراہیمؑ کو احیائے موتیٰ میں
کوئی شبہہ نہیں تھا۔ لیکن انھوں نے تائید مزید اور اطمینان قلب کے لیے اللہ تعالےٰ سے اس کی کیفیت
بھی جاننی چاہی تھی۔

ظاہر ہے اس حیثیت سے معجزہ کو تائید کا مقام دینا صحیح ہے۔ اور اس پر اعتراض کرنا خود

ایک نادانی ہے۔

کیا سیرۃ النبیؐ میں حسی معجزات کی اہمیت گرادی گئی ہے؟ مولانا بدر عالم میرٹھی مرحوم کا ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ مولانا سید سلیمانؒ ندوی نے معنوی معجزات پر زور دے کر حسی معجزات کی اہمیت کم کردی ہے۔

گو اوپر سیرۃ النبیؐ سے جو طویل اقتباسات نقل کئے گئے ہیں وہ اس کی تردید کے لیے کافی تھے۔ تاہم اس کی اہمیت کی وجہ سے اور اس بنا پر کہ مولانا بدر عالم صاحب نے اس کا بار بار اعادہ کیا ہے۔ ہم اس اعتراض پر مزید بحث کرتے ہیں۔ وہ رقمطراز ہیں۔

"بعض اہل علم کو یہ دیکھکر کہ قرآن کریم معجزہ طلبی کی ممانعت کرتا ہے یہ مغالطہ لگ گیا ہے کہ شاید یہ ممانعت اس لیے ہے کہ حسی معجزات میں اصل اعجاز کی روح نہیں ہوتی یا کمزور ہوتی ہے۔ اس کے بعد علم کلام میں یہ دیکھکر کہ نبوت اور معجزہ میں کوئی تلازم نہیں ہے۔ یہ مغالطہ اور زیادہ پختہ ہوگیا ہے۔ بلکہ زور قلم میں یہاں تک بھی نکل گیا ہو کہ حسی معجزات کی قرآنی نظر میں کوئی حیثیت و وقعت ہی نہیں۔ حالانکہ سب سے پہلے ایک موٹی سی بات قابل غور یہی تھی۔ کہ قرآن کریم جن معجزات کے مطالبہ کی ممانعت کرتا ہے۔ کیا وہ رسولوں کے معنوی معجزات ہیں؟ اگر وہ معنوی معجزات نہیں صرف حسی معجزات ہیں۔ اور انہی کے مطالبہ کی وہ ممانعت کرتا ہے۔ تو کیا اس سے یہ نتیجہ صاف برآمد نہیں ہوتا کہ ہمیشہ سے معجزات صرف حسی معجزات ہی کو سمجھا جاتا تھا۔ پھر ان کے اعجاز کو پھیکا کرنا کہاں تک درست اور معقول بات ہے۔ (ترجمان السنۃ۔ ج ۴۔ ص ۹۶)

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں۔

"خلاصہ یہ ہے کہ حسی معجزات عوام و خواص سب کی اصطلاح میں حقیقی معجزات ہوئے ہیں۔ وہ کسی کے نزدیک بھی صرف سطحی اور ظاہری نہیں ہوئے۔ خود قرآن کریم نے

ان کا نام "آیات" ہی رکھا ہے یعنی "معجزات و خوارق" اور انبیاء علیہم السّلام کے معجزات میں ان حسی معجزات ہی کا ذکر فرمایا ہے۔ محدثین نے بھی ان ہی کو ہمیشہ اعتنا کے ساتھ جمع فرمایا ہے۔ اور کتب دلائل کا بیشتر حصہ انھی کے لئے وقف ہوا ہے۔ اہل کتاب اور منکرین کی طرف سے بھی ان ہی کا مطالبہ ہوتا رہا ہے۔ اور اس بنیاد پر ہوتا رہا ہے کہ یہی وہ نوع تھی جو دوسرے انبیاء علیہم السّلام کی نبوتوں میں ثابت ہوتی رہی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں شق القمر، اسطوانہ حنانہ۔ انگشتان مبارک سے پانی کے چشمے ابلنا، کھانے میں برکت۔ پانی میں برکت وغیرہ وغیرہ۔ جو تواتر سے ثابت شدہ واقعات ہیں۔ یہ سب آپ کے حسی ہی معجزات تھے، پھر کون کہہ سکتا ہے کہ حسی معجزات صرف سطحی اور ظاہری ہوتے ہیں۔ اور قرآن پاک کی نظر میں ان کی کوئی حیثیت و وقعت نہیں اور وہ آپ کی زندگی میں نمایاں طور پر موجود نہ تھے۔" (ترجمان السنۃ جلد چہارم۔ ص ۱۳۱)

دراصل یہاں غلط بحث کر دیا گیا ہے۔ ورنہ حضرت سید صاحبؒ کو نہ حسی معجزات کی اہمیت سے انکار ہے۔ اور نہ وہ ان کو ظاہری اور سطحی قرار دیتے تھے۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ قرآن مجید میں خوارق و معجزات کو آیات کہا گیا ہے۔ اور کفار حسی معجزات کا مطالبہ کرتے تھے۔ البتہ سید صاحبؒ نے معجزات کی دو قسمیں کی ہیں۔ معنوی و باطنی اور ظاہری و مادی، اور اسی تقسیم کے لحاظ سے انھوں نے معنوی معجزات کو حسی و ظاہری معجزات پر ترجیح دی ہے۔ اور تفصیل سے بتایا ہے کہ اہل نظر اور حقیقت شناسوں کے لئے یہی باطنی آثار و علامات نبوت کی حقیقی نشانیاں ہیں، رہے ظاہری نشانات تو وہ سطحی اور ظاہر بیں نگاہوں کے لئے ہیں۔ جو ہر چیز کو ان ظاہری ہی آنکھوں سے دیکھکر پہچانتی ہیں ان کے نزدیک قرآن مجید بھی معنوی معجزات ہی کو نبوت کی اصل علامات قرار دیتا ہے۔ اسی لئے معاندین جب آپ سے معجزات طلب کرتے تو محسوس و مادی نشانیوں کے بجائے قرآن مجید انھیں نبوت کی

اصل روح اور اس کے حقیقی آثار و دلائل کی جانب توجہ دلاتا ہے۔ سید صاحبؒ کو یہاں کوئی مغالطہ نہیں ہوا ہے۔ بلکہ اسی لحاظ سے انھوں نے بتایا ہے کہ نبوت اور ظاہری معجزات میں کوئی تلازم نہیں، نبوت کے اصل لوازم وحی، مکالمۂ الٰہی، تزکیہ، انذار، تبشیر، تعلیم اور ہدایت ہیں، اپنے اس مدعا کو ثابت اور مستحکم کرنے کے لئے وہ قرآن مجید سے استدلال بھی کرتے ہیں، ملاحظہ ہو۔

"اسی بنا پر جب معاندین نے معجزہ کا مطالبہ کیا ہے تو قرآن مجید نے اکثر اس کے جواب میں نبوت کی اصلی حقیقت کی طرف ان کو متوجہ کیا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ۔

(بقرہ ۱۴-۱۳)

اور جن کو علم نہیں وہ کہتے ہیں خدا خود ہم سے کیوں باتیں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی، ان سے پہلے لوگوں نے بھی اسی طرح کہا تھا، دونوں کے دل ایک ہی قسم کے ہوگئے۔ ہم نے تو نشانیاں لوگوں کیلئے کھول دی ہیں جو یقین کرتے ہیں اے محمدؐ! ہم نے تجھ کو سچائی دے کر نیکوکاروں کو خوشخبری سنانے والا اور بدکاروں کو ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ (جنکو اب بھی یہ نشانیاں نہ نظر آئیں) تو ان دوزخیوں کا حال تجھ سے نہ پوچھا جائیگا۔

وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ۔ (عنکبوت-۵)

اور وہ کہتے ہیں کہ اس پر اسکے پروردگار کی طرف سے نشانیاں کیوں نہیں اتری ہیں۔ کہدے کہ نشانیاں تو خدا کے پاس ہیں اور میں تو کھلا ڈرانے والا ہوں، کیا ان کافروں کو یہ نشانی کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر کتاب اتاری جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنزِلَ	اور کافر کہتے ہیں کہ اس پر کوئی نشان اس کے
عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ ۗ إِنَّمَا أَنتَ مُنذِرٌ ۖ	پروردگار کی طرف سے کیوں نہیں اتارا جاتا۔
وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ۔	اے محمدؐ تو ڈرانے والا ہو اور ہر قوم کا ایک ہدایت
(رعد - ۱)	کرنے والا ہوتا ہے۔
وَقَالُوا لَوْلَا يَأْتِينَا بِآيَةٍ مِّن رَّبِّهِ ۚ	اور کہتے ہیں کہ یہ پیغمبر اپنے پروردگار کی طرف
أَوَلَمْ تَأْتِهِم بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ	سے کوئی نشانی ہمارے پاس کیوں نہیں لاتا
الْأُولَىٰ (طٰہٰ - ۸)	کیا اللہ کے پاس گزشتہ کتابوں کی گواہی نہیں
	پہنچی۔ (سیرۃ النبیؐ جلد سوم - ص ۲۲۱ و ۲۲۵)

یہ اور اسی طرح کی دوسری آیتوں کی وجہ سے سید صاحبؒ نبوت کے معنوی آثار و علامات کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ ان کا یہ استدلال درست نہیں ہے۔ اور قرآن مجید کے نزدیک معنوی روحانی آیات کو اہمیت حاصل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے کفار کو نفس معجزہ مانگنے پر نہیں بلکہ مادی اور ظاہری معجزات طلب کرنے پر تنبیہ کی ہے۔ اور بتایا ہے کہ نشانیوں کے ظاہر ہونے کے بعد بھی یہ عناد سے طلب معجزہ پر مصر ہیں۔ چنانچہ ان تمام مقامات میں جہاں کفار کی اس طلب معجزہ کا ذکر ہے یہ تصریح موجود ہے۔ اور انھیں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ان خوارق سے انھیں تسلی نہ ہوگی ان کو چاہئے کہ نبوت کے اصلی آثار و علامات کی طرف توجہ کریں کہ سعادت مند دلوں کی تسلی ان ہی سے ممکن ہے۔ (باقی)

اردو میں حمدیہ شاعری

از

جناب سید یحییٰ نشیط صاحب کالی (دولت خاں، بہار اشٹر)

مذاہبِ عالم کی تاریخ گواہ ہے کہ خدا کا تصور کسی نہ کسی صورت میں ہر وقت موجود رہا ہے۔ اتنا ہی نہیں دورِ جدید کی غیر مہذب اور دورِ عتیق کی مہذب ترین قوموں میں بھی اگر ہم جھانکیں تو وہاں بھی خدا کا تصور ہمیں ملے گا۔

چنانچہ پروفیسر میکس مولر افریقی مذہب کے عناصرِ اعلیٰ پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ "اوجی یا اشانتی قبائل کے نزدیک آسمان سب سے بڑا معبود ہے، جسے وہ شخصی خدا، خالق اور تمام اچھائیوں کا مالک مانتے ہیں"...... بشمین قوم کے لوگ بھی خالقِ حقیقی میں یقین رکھتے ہیں۔ انکا کہنا ہے کہ اسی نے سب چیزیں بنائی ہیں اور ہم اسکی عبادت کرتے ہیں۔ عراق کی قدیم بابلی اور آشوری قوموں میں بھی خدا کا تصور پایا جاتا تھا انکی حمد و مناجات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی عظیم ترین قوت کا نفوذ اور اثر تسلیم کرتے تھے، ان کے یہاں قوت خداوندی رحمٰن اور رحیم اور عفو و درگذر کرنے والی تھی۔

قدیم مصر میں "پتاح" کا تصور خدا کے تصور سے قریب تر تھا۔ اس کے بارے میں ایک قدیم مصری شاعر کا یہ خیال ملاحظہ فرمائیے۔

"کسی باپ نے تجھے پیدا نہیں کیا اور نہ کسی ماں نے تجھے جنم دیا۔ تو نے خود اپنے کو بنایا، بغیر کسی دوسری ہستی کی مدد کے"۔

یونانِ قدیم میں جب تکوینِ عالم کے سلسلے میں غور کیا گیا تو فلاسفۂ یونان اس نتیجے پر پہنچے کہ

خدا ایک ہے۔ جو دیوتاؤں اور انسانوں میں سب سے بڑا ہے۔ اس کا جسم اور دماغ مثل انسان کے نہیں ہے، وہ سراپا بصارت، سراپا سماعت اور سراپا عقل ہے۔" امریکہ کی قدیم ازتیق قوم میں خدا کا یہ تصور تھا کہ "وہ اپنی صیقل شدہ ڈھال میں انسانوں کے کل اعمال دیکھتا ہے، روح کو قبض کرنے کے لیے وہ تاریک راستوں میں مثل ہوا کے دوڑتا ہے، وہ مجیب الدعوات بھی ہے"[۵]

ہمارے وطن میں بھی معبود پرستی کا رجحان پایا جاتا ہے، چنانچہ ان کے قدیم مذہبی صحیفہ رگ وید میں پرجاپتی کی حمد اس طرح کی گئی ہے۔

"پرجاپتی نے کاریگر کی طرح اس عالم کو گھڑا، دیوتاؤں کے ابتدائی زمانے میں لاشے سے شے وجود میں آئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک آگ جو بہت سی جگہوں میں روشن ہوتی ہے، ایک سورج جو سب پر چمکتا ہے، ایک شفق ہے، جو ان سب کو منور کرتی ہے وہ جو ایک ہے۔ یہ سب کچھ ہو گیا ہے۔"

یجروید میں خدا کی توصیف اس طرح کی گئی ہے۔ "خدا ایک ہے، وہ غیر متحرک ہے تاہم دماغ سے زیادہ سریع السیر ہے۔ حواس اس تک نہیں پہنچ سکتے، اگرچہ وہ ان میں ہے۔"

اتھروید میں جس خدائے برتر کی تعریف کی گئی ہے وہ "ورن" ہے۔ اس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

کہ ______ ورن آقائے اعلیٰ دیکھتا ہے۔

گویا وہ نزدیک ہو جب کوئی شخص کھڑا ہوتا یا چلتا یا چھپتا ہے۔ اگر وہ لیٹ جاتا ہے یا اٹھتا ہے۔ جب دو آدمی پاس بیٹھ کر کانا پھوسی کرتے ہیں، تو بھی شاہ ورن کو اس کا علم ہوتا ہے، وہ وہاں مثل ثالث کے موجود ہوتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ اگر کوئی آسمان سے پرے بھاگ کر جانا چاہے، تو بھی وہ شاہ ورن سے نہیں بچ سکتا۔"

---

[۵] "Encyclopaedia of Religion" بحوالہ نگار خدا نمبر لکھنؤ جنوری فروری ۱۹۵۶ء ص [illegible]۔

ایران کے مانوی مذہب میں بھی اللہ کی حمد و ثنا کے گیت گائے گئے ہیں، یہودیوں کے یہاں بھی خدائے واحد کا تصور پایا جاتا ہے۔ اور قوم انصاریٰ کے پیغمبر عیسیٰ علیہ السلام نے بھی خدائے واحد کی دعوت دی۔ چنانچہ یوحنا کے تیسرے باب کی سترہویں آیت میں بیان ہوا ہے کہ "خدا واحد اور برحق ہے"۔ لوقا کی انجیل میں کہا گیا ہے کہ "کوئی نیک نہیں مگر ایک یعنی خدا"۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی ہر مہذب و غیر مہذب قوم میں خدائے واحد کی پرستش کے آثار نمایاں ہیں، بقول مولانا ابوالکلام آزاد ـــ

"آسٹریلیا کے وحشی قبائل سے لیکر تاریخی عہد کے متمدن انسانوں تک کوئی بھی اس (خدا کے) تصور کی امنگ سے خالی نہیں رہا۔ رگ وید کے زمزموں کا فکری مواد اس وقت بننا شروع ہوا تھا جب تاریخ کی صبح بھی پوری طرح طلوع نہیں ہوئی تھی اور حتیوں (Hittites) اور عیلائیوں نے جب اپنے قبیلہ انہ تصورات کے نقش و نگار بنائے تھے تو انسانی تمدن کی طفولیت نے ابھی ابھی آنکھیں کھولی تھیں، مصریوں نے ولادت مسیح سے ہزاروں سال پہلے اپنے خدا کو طرح طرح کے ناموں سے پکارا، اور کالڈیا کے صنعت گروں نے مٹی کی پکی ہوئی اینٹوں پر حمد و ثنا کے وہ ترانے کندہ کئے، جو گزری ہوئی قوموں سے انہیں ورثے میں ملے تھے"۔[1]

لیکن علاوہ اسلام کے ادیانِ عالم میں وحدانیت کا تصور بڑی حد تک ناقص ہی رہا۔ اس کی بڑی وجہ تو یہی ہو سکتی ہے کہ پیغمبرانِ دین اور مصلحینِ قوم سے عقیدت میں غلو ان قوموں میں اس قدر رواج پاتا گیا کہ "خدائی صفات" بھی ان جلیل القدر اور عظیم ہستیوں سے منسوب کر دیئے جانے لگے تھے۔

---

[1] مولانا ابوالکلام آزاد۔ "غبارِ خاطر"۔ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ ص ۱۲۸ - ۱۲۷۔

(زرتشت (۶۶۰ - ۵۸۳ ق۔م) کے یہاں خدائے واحد کا قدیم تصور ہونے کے باوجود یزدان و اہرمن کی ثنویت پیدا ہو گئی۔ قوم ہنود نے مختلف دیوتاؤں کی صورتوں میں ایک خدا کی پرستش شروع کی اور رفتہ رفتہ ایک کے بجائے زمین آسمان کے کئی دیوتا مانے جانے لگے۔ عیسائی قوم میں ایک خدا کا تصور بڑھتے بڑھتے "خدا اور اس کا بیٹا" اور پھر خدا، عیسیٰ، اور روح الامین کی تثلیث میں تبدیل ہو گیا۔ صرف اسلام ہی ایک ایسا دین ہے۔ جو باوجود ادیان عالم میں سب سے کم عمر ہونے کے خدا کی وحدانیت کا صحیح ترین اور واضح تصور پیش کرتا ہے۔

اس بزرگ و برتر ہستی کے آگے جب انسان خود کو بے بس و مجبور تصور کرتا ہے، تو پھر اللہ کا خوف اس کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے، اسی خوف کے ساتھ جب عقیدت کا جذبہ بھی شامل ہو جائے تو پھر اللہ کی بڑائی اس کی زبان سے نکلتی ہے۔ خوف و عقیدت کا یہی اظہار حمدیہ نغموں اور تمجیدی زمزموں میں کیا جاتا ہے۔ جن سے ادبیات عالم کا بیشتر حصہ بھرا پڑا ہے۔ ان نغموں میں خدا کی مختاری اور انسان کی مجبوری، خدا کی کارسازی اور انسان کی کوتاہ دستی، خدا کی چارہ سازی، اور انسان کی درماندگی خدا کی توصیف اور انسان کی تحقیر کا برملا اظہار ہوتا ہے۔ دور جاہلیت کی عربی شاعری میں کچھ ایسے آثار پائے جاتے ہیں۔ جو "حمدیہ شاعری" کی نشاندہی کرتے ہیں۔ زید بن عمرو بن نفیل کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔ ؎

عبادک یخطئون و انت رب بکفیک المنایا والحتوم

(یعنی تو پروردگار ہے، سب لوگوں کا بادشاہ ہے۔ موتیں اور فیصلے تیرے ہی قبضہ میں ہیں)

أرباً واحداً ام الف رب ادین اذا تقسمت الامور

ترکت اللات والعزیٰ جمیعاً کذالک یفعل الرجل البصیر

(یعنی میں ایک پروردگار کو مانوں یا ہزار کو جب کاموں کی تقسیم ہو میں نے لات و عزیٰ

سب کو چھوڑ دیا۔ سمجھدار آدمی ایسا ہی کیا کرتا ہے۔

ملائکہ اور حاملینِ عرش کا ذکر بھی اس دور کی شاعری میں خوب ہوا ہے۔ امیہ بن ابی الصلت کے تین اشعار یہاں بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

رجل وثور تحت یمینه　　والنسر للاخری ولیث مرصد
والشمس تطلع کل آخر لیلة　　حمراء یصبح لونها یتورد
تابی فما تطلع لنا فی رسلها　　الا معذبة والا تجلد

(یعنی آدمی اور بیل اس کے دائیں پاؤں کے نیچے ہیں۔ اور کرگس ایک پائے کا اور شیر دوسرے پائے کا محافظ ہے)

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرتؐ نے امیہ کے اس شعر کو سن کر فرمایا تھا کہ اس نے سچ کہا ہے، اور اس کے بعد امیہ کے یہ اشعار۔ ع والشمس تطلع .... الخ پڑھے۔ جن کا مطلب ہے: سورج ہر رات کے ختم ہونے کے بعد صبح کو سرخ اور گلابی رنگ کا نکلتا ہے۔ وہ خوشی سے ہمارے لیے طلوع نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ معذب ہو کر اور تازیانہ کھا کر آتا ہے (یعنی خدا کی قدرت سے مغلوب رہتا ہے۔)

حضرت حسانؓ بن ثابت الانصاری (م ۴۰ھ)۔ مشرف باسلام ہونے پر اللہ کی حمد اور اس کی بڑائی یوں بیان کرتے ہیں۔

وانت اله الخلق ربی وخالقی　　بذلك ما عمرت فی الناس اشهد
تعالیت رب الناس من قول من دعا　　سواك الها انت اعلیٰ وامجد
لك الخلق والنعماء والامر کله　　فایاك نستهدی وایاك نعبد[1]

---

[1] بحوالہ۔ عربی میں نعتیہ کلام (مرتبہ عبداللہ عباس ندوی) لکھنؤ ۱۹۷۵ء ص ۲۵۔

"اور ساری مخلوق کا معبود میرا رب اور خالق ہے، ہم زندگی بھر اس کی شہادت دیتے رہیں گے۔ سارے جہاں کے رب تیری بڑی شان بڑی ہے، اور تو بلند ہے۔ اس شخص کے دلوں سے جو تیرے سوا کسی اللہ کو پکارتا ہے تو بہت بلند اور بڑائیوں والا ہے حیات بخشی اور نفع رسانی اور ساری حکمرانی صرف تیری ہے، ہم تجھ ہی سے ہدایت مانگتے ہیں۔ اور تیری ہی عبادت کرتے ہیں"۔

خدا کے متعلق اس طرح کا تصور جدید عربی شاعری میں بھی دکھائی دیتا ہے، العصبۃ الاندلسیۃ" تحریک سے وابستہ امریکہ کے عربی شعرا تو حمدیہ زمزمہ خوانی میں رطب اللسان رہتے ہیں، اس تحریک کا مقصد عربی ادب کے قدیم خزانوں سے بے تعلقی اختیار کرنا نہیں ہے بلکہ نئی زندگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک فکری احول کو کامیابی کے ساتھ عربی میں جنم دینا ہے۔

جہاں تک فارسی زبان وادب کا تعلق ہے، تو اس میں حمدیہ نغموں کا سراغ اوستا سے ملنے لگتا ہے، اس مقدس کتاب کے تمام اجزا "یسنا" ویسپرد (Visupro) وندیدا، یشت اور خردہ اوستا میں خدائے بزرگ وبے ہمتا، آھورمزد، ایزدون اور فرشتوں کی حمد وثنا، پاکی وسچائی، نیکوکاری اور سعی عمل کی تعریف ہے، اور دیوؤں، اہرمن، جھوٹ، خیانت اور فریب کی برائی بیان ہوئی ہے۔

فارسی زبان کو جب عروج حاصل ہوا، تو مذہبیات سے اس کا دامن بھر گیا۔ چنانچہ قدیم فارسی شعرا میں شیخ فضل اللہ ابوسعید ابوالخیر (م ۳۵۷ھ۔ ۴۴۰ھ) عراقی، سعدی، رومی اور جامی جیسے مشہور شعراء نے بڑے بلند پایہ حمدیہ شعر لکھے ہیں۔ اس سلسلے میں ابوالخیر کی ایک حمدیہ رباعی ملاحظہ ہو۔

حق تعالیٰ کہ مالک الملک است — لیس فی الملک غیرہ مالک

مے رساند بیلت دگر مارا　　　　انہٗ قادر علےٰ ذالک[1]

رودکیؔ (م ۳۲۹ھ ۹۴۰ء) نے حمد کے سلسلہ میں جو شعر کہے ہیں وہ ضرب المثل کا حکم رکھتے ہیں۔ ایک شعر دیکھیے۔

خود ثنا گفتن ز من ترک ثنا است　　　　کیں دلیل ہستی و ہستی خطا است[2]

خدا کی ہستی کے سامنے ہماری ہستی ہی کیا ہے۔ چنانچہ رومیؔ کا یہ کہنا کس قدر معنی خیز ہے کہ اے خدا اگر میں تیری تعریف کرتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میرا بھی وجود ہے، لیکن تیری ہستی کے سامنے میری ہستی کا تصور ہی غلط ہے، چنانچہ میں اگر تیری تعریف کرنے لگوں تو یہ بات تعریف کے بالکل ضد ہو جائے گی۔ یہ ان کا دوسرا شعر بھی کیا تیور رکھتا ہے۔

اے خدا از فضل تو حاجت روا　　　　با تو یاد ہیچ کس نبود روا[3]

اے خدا تیری یاد کے ساتھ کسی اور کی یاد کرنا جائز و مناسب نہیں تیرے ہی فضل سے حاجت روائی ممکن ہے۔

عراقیؔ (م ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔) نے بھی عنایت الٰہی سے دستگیری کی دعا کس موثر اور لطیف پیرائے میں کی ہے۔

راہ باریک است و شب تاریک و مرکب لنگ و پیر

اے سعادت رخ نمای و ای عنایت دستگیر

ز آفتاب مہر خود حمد مرا نورے ببخش

تا چو ذرہ در فضائے حمد تو یابم مسیر

---

[1] ابوسعید ابوالخیر (مرتبہ آقائے م ۔ ۱۴ ۔ رازی) "تاثرات" لاہور۔ ص ۹۶۔

[2] رومیؔ (مرتبہ تلمذ حسین)، مرآۃ المثنوی۔ حیدرآباد ۱۳۵۲ھ۔ ص ۳۳۵۔

[3] ایضاً۔

انداز عاشقانہ بھی ہے، اور معشوقانہ بھی۔

ذیل میں حمد کی ان تینوں قسموں کا سرسری جائزہ پیش کیا جا رہا ہے۔

شرعی حمد | جہاں تک شریعت اسلامیہ میں حمد کے مقام کا تعلق ہے۔ تو ہمارے شعراء نے قرآن و حدیث سے اس میں سرمو انحراف نہیں کیا۔ اللہ العالمین کی ذات و صفات اور اس کی قدرت کا ملہ کا بیان کرتے ہوئے اردو شعراء نے قرآنی نکات اور حدیث میں بیان کردہ ارشادات کو اپنی شاعری میں کما حقہ برتا، صرف اتنا ہی نہیں بلکہ خدا کی حمد و ثنا بیان کرتے وقت بعض اشعار قرآنی آیات کے مطالب سے اتنی مطابقت رکھتے ہیں کہ محسوس ہونے لگتا ہے، گویا یہ کسی آیت قرآنی کا منظوم ترجمہ ہی ہے۔

شرعی اعتبار سے لفظ "اللہ" خدا کا اسم ذات ہے۔ قرآن و احادیث میں متعدد جگہ اس لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ مثلاً "اللہ لا الہ الا ہو"، "اللہ واحد القہار" وغیرہ۔ اسی اسم ذات کے تحت خدا کے جملہ صفات آتے ہیں جنھیں "اسماء الحسنیٰ" کہا جاتا ہے۔ ان میں سے کچھ صفات تو ذاتی ہیں اور کچھ فاعلی۔ مثلاً "الاحد" اللہ کی صفت ذاتی ہے۔ تو "الرزاق اور الجبار" وغیرہ صفت فاعلی، ہمارے شعراء نے اللہ تعالیٰ کی ان صفات کو مختلف طور پر اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ اسی وجہ سے باعتبار موضوع اگرچہ حمدیہ شاعری محدود محسوس ہوتی ہے، لیکن انداز بیان اور خیالات کے تنوع نے اسے بہت زیادہ وسعت بخشی ہے۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کی "صفت رحیمی" ہی کو لیجئے کہ ہر شاعر نے اسے اپنے انداز میں پیش کیا ہے۔

ناسخ کہتے ہیں۔ ؎

نہیں حساب ہے جس طرح اس کی رحمت کا		یوں ہی ہمارے گناہوں کا بھی شمار نہیں[۱]

یقین کو تو بخشہ ملیقین ہے کہ ؎

---

[۱] ناسخ (مرتبہ رشید حسن خاں) انتخاب ناسخ، دہلی ۱۹۷۲ء ص ۲۰۵

ہیں دوزخ سے آشنا مت ڈراز اہد کہ ظاہر ہے

خدا ایسا ستم کب اپنے بندوں پر روا رکھے[۵۳]

اور میرؔ نے تو واعظ سے صاف صاف کہدیا۔

خیال چھوڑ دے واعظ تو بے گناہی کا　　رکھے ہے شوق اگر رحمت الٰہی کا[۵۴]

دیا شنکر نسیمؔ "حمد باری" کو "فرۂ قلم" سمجھتے ہیں۔ ان کی حمدیہ شاعری میں گہری عقیدت اور اخلاص پایا جاتا ہے۔ لالہ نانک چند کھتری لکھنوی بھی حمد باری تعالےٰ میں سرشار نظر آتے ہیں۔ یقین میں ڈوبے ہوئے یہ حمدیہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

حشر میں جب مرے اعمال تلے اے ناظمؔ　　تو گراں رحمتِ معبود کا پلہ نکلا

اور

اپنی رحمت سے کیا تھا تو نے مجھ کو سرفراز　　کیا حقیقت تھی مری، میں ایک مشتِ خاک تھا

حالیؔ اللہ کی رحمتِ بے پایاں سے ناامید نہیں ہیں۔ کیونکہ

دیکھا ہے ہم نے عالمِ رحمت کو غور سے　　ہے شش جہت میں قحط دلِ ناامید کا

شرمِ کرم کی ہیں یہی گر پردہ داریاں　　انجام ایک ہوگا شقی و سعید کا

دوزخ ہے گر وسیع تو رحمت وسیع تر　　"لا تقنطوا" جواب ہے "ھل من مزید" کا

جدید ترقی پسند اور اشتراکی رجحان رکھنے والے شعراء بھی اللہ تعالےٰ کی رحمت کا یقین رکھتے ہیں۔ وقار خلیل کی یہ حمدیہ نظم قابلِ غور ہے۔

---

[۵۳] یقین (مرتبہ۔ مرزا فرحت اللہ بیگ) دیوانِ یقین، علیگڈھ سنہ ۱۹۳۰ء ص ۴۳

[۵۴] میرؔ۔ کلیاتِ میر (جلد اول)، رام نراین لال بینی مادھو۔ الٰہ آباد۔ سنہ ۱۹۴۲ء ص ۴۲۹ دیوان پنجم

[۵۵] الطاف حسین حالیؔ (مرتبہ۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی) کلیاتِ حالیؔ جلد اول لاہور سنہ ۱۹۶۸ء ص ۵۰

که بود کز نور تو روشن شود تیره دلم؟

که بود آید شب بیچارهٔ خوار حقیر

از هوای خود بفریادم، اغثنی یا مغیث

در پناهِ لطف افتادم، اجرنی یا مجیر[1]

اب رہے مولانا عبدالرحمٰن جامی (م ۸۹۸ھ/۱۴۹۲ء) تو انھوں نے بھی اللہ رب العزت

حمد و ثنا بڑے دل نشین انداز میں کی ہے۔

حمد خدا نیست که از کلک کن	بر ورق باد نوید سخن
نطق و ثنایش چه تمناست این	عقل و ثنایش چه سوداست این
رشتهٔ فکرش که بود پر گهر	پر بود این جا ز گره سربسر
می دهد این رشته ز سبحه نشان	صد گره افتاده درو ذره سان[2]

عربی و فارسی کی طرح ہی اردو کے شعری سرمایے میں حمدیہ شاعری کو خاص مقام حاصل ہے۔ شعرائے اردو نے اپنے عقیدت و ایمان کے گلہائے معطر حمدیہ اشعار کی لڑیوں میں پرو کر باری تعالیٰ کے اوصاف حمیدہ اور اسمائے حسنہ کے گیسوہائے معنبر سجائے ہیں۔ خدائے عزوجل کی تحمید کے یہ نقش ہائے دل پذیر اور ثنا و توصیف کے یہ دُر ہائے بے نظیر شعری پیکر میں ڈھل کر ادبی سرمایے میں اضافہ کرتے رہے ہیں۔ دیگر اصناف سخن کی طرح ہی حمدیہ و نعتیہ شاعری کے سلسلے میں بھی اردو شعرا نے ایرانی شعرا کے اس قبیل کے نمونوں کو اپنے سامنے رکھا، لیکن قابلِ غور امر یہ ہے کہ ان کے تخیل نے دیگر اصناف کی طرح اس صنف میں بھی اپنے ہی دلی جذبات کی اپنے مخصوص انداز میں ترجمانی کی ہے۔ بلکہ جا بجا ایرانی مذہبی روایت

---

[1] عراقی۔ (مرتبہ سعید نفیسی) کلیاتِ عراقی، تہران۔ ۱۳۳۵ھ ش ص ۹۳۔

[2] جامی۔ تحفۃ الاحرار۔ نولکشور۔ لکھنؤ۔ ص ۱۲۔

ہٹ کر بھی کچھ باتیں لکھی ہیں۔

اردو شعرا اپنے دیوان کی ابتدا حمد سے کرنے کا اہتمام کیا کرتے تھے، اور آج بھی اکثر و بیشتر اس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ برادرانِ وطن کے یہاں چونکہ معبود پرستی کا رجحان ہے۔ اس لئے انھوں نے بھی اس روایت کو اپنایا اور ایسی حمدیں لکھیں جن میں خالص اسلامی رنگ جھلکتا ہے۔

اصنافِ شاعری میں مثنوی کے اجزائے ترکیبی میں حمد و مناجات کا شمار ہوتا ہے۔ مثنوی نگار شعرا نے اس میدان میں اپنے فن کا بڑھ چڑھ کر مظاہرہ کیا ہے، چنانچہ پندرھویں صدی عیسوی کی پہلی مستقل تصنیف نظامی کی "کدم راؤ پدم راؤ" اور میرانجی شمس العشاق (م ۹۰۲ھ / ۱۴۹۶ء) کی تصانیف میں حمدیہ ترانوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔ سولھویں و سترھویں صدی میں اشرف کی "نوسرہار" مقیمی کی "چندر بدن و مہیار" ابن نشاطی کی "پھولبن" غواصی کی "مینا ستونتی" اور "طوطی نامہ" نصرتی کی "گلشنِ عشق" اور "علی نامہ" اور فائز کی "رضوان شاہ و روح افزا" میں حمدیہ اشعار کی وافر مقدار موجود ہے۔ شمالی ہند کے شعرائے متقدمین اور متوسطین کی مثنویوں میں حمدیہ شاعری پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ اور دورِ جدید کے شعرا کے یہاں بھی حمدیہ نغمے مل جاتے ہیں۔ صوفی شعرا نے حمد کے علاوہ دلکش مناجاتیں بھی لکھی ہیں۔ خدا کے تصور کی فلسفیانہ توضیح کرنے والی نظمیں بھی اردو شاعری کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ ایسی نظمیں لکھنے والوں میں علامہ اقبال (م ۱۳۵۷ھ / ۱۹۳۸ء) کا مقام بلند تر ہے۔ اس طرح اردو کی حمدیہ شاعری کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

اولاً شرعی حمد۔ جو اللہ تعالےٰ کی ذات و صفات اور قدرتِ کاملہ کی تعریف پر مشتمل ہے۔

ثانیاً۔ فلسفیانہ حمد۔ اس میں بھی اسلامی فلسفے کو بنیاد بنا کر کہی گئی حمدوں کا شمار ہوتا ہے، اور

ثالثاً۔ متصوفانہ حمد۔ اس میں صوفیانہ طرزِ استدلال کی حامل حمدوں کا شمار ہوتا ہے جن میں تخاطب کا

اختر الایمان۔ کے یہاں بھی وقت کے تصور کو خدا سے جوڑ دیا گیا ہے۔ چنانچہ اپنے مجموعہ کلام "بنت لمحات" کے پیش لفظ میں وہ کہتے ہیں۔

" میری ان نظموں میں "وقت" کا تصور اس طرح ملتا ہے جیسے یہ بھی میری ذات کا ایک حصہ ہے . . . . . کبھی یہ گذرے ہوئے وقت کا علامیہ بن جاتا ہے۔ کبھی خدا بن جاتا ہے . . . . یہ تصور "مایا" کا تصور ہے۔ نہ "فنا" کا . . . . . یہ ایک زندہ و پائندہ ذات ہے جو "انت" ہے۔"[1]

منطقیاتی زاویۂ نظر سے بھی فلسفیوں نے دلائل کی جانچ پرکھ کر کے خدا کے وجود کو ثابت کیا ہے۔ چنانچہ کتب السیر میں امام فخر الدین رازیؒ کے متعلق ایک واقعہ ملتا ہے کہ، امام رازی کا کسی گاؤں میں ایک بوڑھی عورت کے پاس سے گذر ہوا۔ وہ چرخہ اپنے سامنے رکھ کر کسی خیال میں غرق تھی۔ امام رازی کے پوچھنے پر وہ بوڑھیا چونک پڑی اور کہنے لگی کہ میں غور کر رہی ہوں کہ آخر میرا چرخہ کیوں نہیں چلتا۔ امام رازی نے اپنے ہاتھوں سے اس چرخہ کو گھمایا اور چرخہ چلنے لگا اتنے میں بوڑھیا کو شرارت سوجھی اور اس نے چپکے سے چرخے کو دوسری سمت گھمایا جس کی وجہ سے چرخہ رک گیا۔ امام رازی نے جو طاقت لگائی تو چرخہ ٹوٹ گیا۔ انھیں بڑا افسوس ہوا۔ لیکن بوڑھیا کہہ اٹھی کہ چرخہ ٹوٹ گیا ہے تو بن جائے گا۔ لیکن اس چرخے نے ایک پیچیدہ مسئلہ حل کر دیا ہے کہ خدا ایک ہے۔ اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ اگر اس کائنات کے چرخے کو دو خدا چلاتے تو دونوں کی کشاکش اور زور آزمائی میں یہ چرخہ ٹوٹ جاتا۔ وغیرہ وغیرہ۔ قرآن کریم کی حسب ذیل آیت میں اس نظریہ کی وضاحت اس طرح ملتی ہے۔

وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَٰهٍ إِذًا لَّذَهَبَ — اور اس (اللہ تعالیٰ) کے ساتھ کوئی اور

---

[1] اختر الایمان۔ بنت لمحات۔ بمبئی ۱۹۶۹ء۔ ص ۱۵۔

كُلُّ إِلٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ۔ (مومنون ۔ ۵)   معبود نہیں ورنہ اگر ایسا ہوتا تو ہر معبود اپنی مخلوق کو ساتھ لے لیتا اور ایک دوسرے پر چڑھائی کرتے۔)

اردو شعرا نے خدا کے متعلق اس منطقیانہ نکتے کی وضاحت اپنے اشعار میں نہایت عمدگی سے کی ہے۔ اسمٰعیل میرٹھی کا یہ شعر بطور مثال پیش خدمت ہے۔

سخت فتنہ جہان میں اٹھتا   کوئی تجھ سا تیرے سوا نہ ہوا[1]

ایمیوئل کانٹ نے اخلاقی بنیادوں پر خدا کے وجود کو بحال کرنے کی کوشش کی تھی اس کا نظریہ مشہور حدیث "تَخَلَّقُوا بِأَخْلَاقِ اللّٰه" سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس نظریے کی وضاحت بھی اردو شعرا نے مختلف پیرائے میں کی ہے مثلاً علامہ اقبال اپنی نظم "مدنیت اسلام" میں رقمطراز ہیں۔

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے   یہ ہے نہایت اندیشہ و کمال جنوں

عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال   عجم کا حسن طبیعت عرب کا سوز دروں[2]

"خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات" کے متعلق اقبال فرماتے ہیں۔

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت   یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلماں

یہ چار عناصر صفاتِ مولا اگر "خاکی و نوری نہاد" بندے میں آجائیں تو پھر مومن بندے کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے۔ ع

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال نے خدا کے متعلق تمام فلسفیانہ استدلال و نظریات میں "ایمان" کا عنصر ملا کر "فلسفۂ الٰہ" کو قرآنی تصور الٰہ سے جوڑ دیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے

---

[1] اسمٰعیل میرٹھی۔ کلیات اسمٰعیل میرٹھی ۱۹۱۰ء ص ۔ ۲۲۲ [2] اقبال (علامہ) کلیات اقبال (ضرب کلیم) پروین بکڈپو۔ دہلی۔

وہ پہلا حرف، جو گنجینۂ اسرارِ عالم، ہنرِ معنی زو	وہی تو ابتدائے احساس حرکت اور حرارت ہو
وہ بینا ہے، وہ دانا ہے وہ سرچشمۂ رحمت کا	تجلی ہی تجلی ہے، تبسم ہی تبسم ہے
وہی باقی ہے، سب فانی	اسی کے ذکر کو ترسیل کا ابلاغ کہتے ہیں۔

یہ چند مثالیں ہیں، جو شرعی حمد کے ضمن میں دی گئیں۔ اب آیئے فلسفیانہ حمد پر غور کریں۔

فلسفیانہ حمد: تصورِ اللہ فلسفے کا دلچسپ اور بنیادی موضوع رہا ہے۔ مابعد الطبیعی تفکرات کی عقدہ کشائی کے لیے اہلِ فلسفہ ہمیشہ سرگرداں رہے ہیں۔ ان کے پاس دلیل و برہان کے بغیر تحقیق کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہوتی۔ اسی لئے اُس ماورق الفطری ہستی کے تعلق سے ان کے یہاں جتنی موشگافیاں پائی جاتی ہیں اتنی اور کہیں نہیں ملتیں۔ انھوں نے خدا کی ذات کی تحقیق کے لیے ریاضیات، طبیعیات، منطقیات اور اخلاقیات جیسے موضوعات پر مباحثہ کرکے اور اپنے دلائل و براہین پیش کرکے خدا کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔

عجمی فلاسفہ میں فیثا غورث اور کاسینس نے ریاضیاتی نقطۂ نظر سے اللہ کی وحدانیت ثابت کرنے کی کوشش کی تھی، ان کا خیال تھا کہ جس طرح تمام اعداد ایک عدد یعنی وحدت سے نکلے ہیں، اسی طرح اللہ بھی ایک ہے جس سے یہ کائنات وجود میں آئی ہے، یہی وحدتِ مطلقہ ہے۔ اردو کے دکنی شاعر مختار اور صوفی شاعر امجد حیدرآبادی نے اپنے حمدیہ اشعار میں اسی فلسفیانہ نکتے کی وضاحت کی ہے۔ مختار کہتے ہیں۔

احد ہے ولی وو عدد کا نہیں	عدد کا احد اس کے حد کا نہیں
دلے وو عدد میں ہوا ہے ظہور	عدد ہور احد سب اسی کا ہے نور[1]

امجد کی یہ رباعی بھی ملاحظہ کیجئے۔

ذرّے ذرّے میں ہے خدائی دیکھو	ہر بت میں ہے شانِ کبریائی دیکھو

[1] مختار۔ معراج نامہ (قلمی) ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد۔ ورق ۱۔ ب

اعداد تمام مختلف ہیں باہم	ہر ایک میں ہے مگر اکائی دیکھو

اس رباعی کی شرح خود حضرت امجدؔ نے یوں بیان کی ہے

" ۲ مجموعہ ہے ۱+۱ اکا اور ۳ مجموعہ ہے ۱+۱+۱ اکا قس علی ہذا۔ اکائی ہر عدد میں
موجود ہے اور (۱) خود عدد نہیں ہے کیونکہ عدد حاشیتین کے مجموعہ کو کہتے ہیں جیسے
(۲) اس کا ایک حاشیہ (۱) ہے اور دوسرا حاشیہ (۳)۔ (۱) اور (۳)
کا مجموعہ (۴) اور (۴) کا نصف (۲) ہوتا ہے۔ فافہم۔"[1]

طبیعیاتی بنیادوں پر بھی بعض فلاسفہ نے خدا کے وجود کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً علی محمد ابن محمد ابن یعقوب الملقب ابن مسکویہ (م ۱۰۳۰ئ) نے ارسطو کی تقلید کرتے ہوئے محرک اولی یا علت العلل کا نظریہ پیش کیا جس سے یہ ثابت کیا گیا کہ کائنات کی تمام چیزیں متحرک اور تغیر پذیر ہیں۔ لہٰذا ان کا ایک محرک اولی بھی ہے، جو غیر متحرک ہے۔ اور یہی خدا ہے۔ غالبؔ کا یہ شعر اسی نظریہ کی تائید میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے	پر تو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے[2]

اسی طرح برگساں کے نظریہ استدام یا فلسفہ زماں میں بھی طبعی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ برگساں کا یہ نظریہ مشہور حدیث "لا تسبوا الدھر فان الدھر ھو اللہ" سے مطابقت رکھتا ہے۔ علامہ اقبالؔ نے اسی نظریہ کو قرآن کے اختلاف لیل و نہار سے ملا کر پیش کیا ہے۔ چنانچہ اقبالؔ جہاں یہ کہتے ہیں۔

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے	صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ

وہاں ع نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ" کا بھی اعتراف کرتے ہیں۔

---

[1] سید حسین احمد۔ رباعیات امجدؔ۔ جلد اول۔ طبع پنجم حیدرآباد۔ ص ۳۰ [2] غالب۔ دیوان غالب۔ ایمان ایڈیشن۔ الہ آباد۔ ص ۱۰۹۔

ہم جیتی پہلو نکال کر اپنی حمدیہ شاعری کو چمکایا ہے۔

متصوفانہ شاعری | حمدیہ شاعری کی تیسری قسم ہمارے نزدیک متصوفانہ حمد ہے۔ جس طرح فلسفے نے دماغ کے سہارے خدا کی کھوج کی ہے۔ اسی طرح تصوف میں "قلب" یا "دل" کے سہارے خدا کو تلاش کیا جاتا ہے۔ جو زیادہ تر جذبات پر منحصر ہوتا ہے۔ تصوف کی بنیاد دراصل روحانیت پر ہے یہی روحانی علم ہند کے میں "ویدانت" اور باطنیت کے نام سے مشہور ہوا اور اسلام میں تصوف کے نام سے۔

صوفیوں کے یہاں اللہ تعالیٰ کے ذکر و اشغال کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ مراقبہ میں خدا اور اپنی ذات پر غور و فکر کرایا جاتا ہے، تسبیحات و اوراد کی خاص طور پر مشق کرائی جاتی ہے۔ جسے روح کی غذا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ غرض کہ اللہ کی بڑائی بیان کرنا، اس کی یاد کرنا اور اسی کے ذکر میں رطب اللسان رہنا صوفیوں کے شعائر اور پاکیزہ عادات میں شمار ہوتے ہیں۔

باری تعالیٰ کا تصور صوفیوں کے یہاں تین طرح کا ملتا ہے۔ اس اعتبار سے صوفیا تین گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ ایجادیہ۔ وجودیہ اور شہودیہ۔ ایجادیہ کے نظریہ کے مطابق کائنات کی تخلیق "لاشے" سے ہوئی ہے۔ اس لئے خالق مخلوق سے جدا ہے۔ اس نظریے کے ماننے والے "ہمہ از اوست" کے قائل ہیں۔ انسان خدا کی مخلوق و محکوم اور خدا اس کا خالق و حاکم ہے۔ ایجادیوں کا کلمہ "لا معبود الا ھو" ہے۔ ان کے یہاں سالک روحانی سفر طے کرنے کے بعد بھی "انا عبدہ" سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

وجودیوں کے یہاں کائنات میں بجز خدا کے کوئی نہیں ہے۔ خالق اور مخلوق کا جوہر ایک ہے، اس نظریہ کے مبلغ فرقۂ باطنیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا۔ کہ "وجود حقیقی فقط ایک ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہے۔ اور باقی ہر وجود اس کا ظل ہے، جو اپنی بقا کے لیے اس پر منحصر ہے۔ لہٰذا ایک اللہ ہی واجب الوجود ہے۔ باقی ہر شے وجود ممکن۔ ہر وجود ممکن چونکہ عدم سے وجود میں آتا ہے، اس لیے وہ حادث ہے۔ اور ہر حادث قدیم یا حقیقی نہیں ہو سکتا۔ اس جگہ یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وجود

ممکن حقیقی نہیں تو پھر وہ باطل ہوا۔ متکلمین نے قرآن کی روشنی میں اس اشکال کو اس طرح دور کر دیا کہ

"وجود ممکن نہ تو حقیقی ہے نہ باطل بلکہ موجود بالحق، یا قرآن کی اصطلاح میں تخلیق بالحق ہے"[1]

خدا کے وجود کا یہی نظریہ "وحدت الوجود" کہلاتا ہے۔ اس نظریے کے حامی "لاموجود الاھو"

کا کلمہ بلند کرتے ہیں۔ یہی کلمہ تصوف کی زبان میں "ہمہ اوست" کہلاتا ہے۔ اس نظریے کے تحت خدا اور

انسان میں وہی نسبت سمجھی جاتی ہے، جو قطرہ اور دریا میں ہے۔ یا حباب اور پانی میں ہے۔ وحدۃ الوجودی

نظریے کے مطابق عشق۔ عاشق اور معشوق تینوں ہیں ایک ہیں۔ ان کے یہاں عشق کی آخری منزل

میں طالب و مطلوب کا تعلق ۔ ع

من تو شدم، تو من شدی من تن شدم، تو جان شدی

کا ہو جاتا ہے۔ سالک ہمیشہ "خدا" کے وصل کا خواہاں "فراق" کے احساس سے تڑپتا رہتا ہے۔

اس نظریے کے مبلغین میں ذوالنون مصری (م سنہ ۲۴۶ھ ۸۶۰ء)، بایزید بسطامی (م سنہ ۲۶۱ھ

۸۷۴ء)، ابوسعید خراسانی (م ۴۴۰ھ ۱۰۴۹ء) محی الدین ابن العربی (م ۶۳۸ھ ۱۲۴۰ء) اور الجیلی (م ۸۳۲ھ ۱۴۲۸ء) کافی مشہور ہوئے۔

اس نظریے کو عوام الناس سمجھنے میں قاصر رہے، اور بعض دینی گمراہی کا شکار ہو گئے، اس لیے علماء کے ایک طبقہ میں اس کی

برابر مخالفت ہوتی رہی۔ اس نظریے کے مخالفین میں شیخ رکن الدین۔ علاء الدولہ نے بغداد میں

اور شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے ہندوستان میں شہودیہ دبستانِ خیال کی بنا ڈالی تھی۔

وحدۃ الوجودی نظریے کے رد میں ان لوگوں کا کہنا تھا کہ "عالم و مافیہا آئینہ کے مانند ہے جس میں صفاتِ

الٰہی کا عکس نظر آتا ہے"۔ سالک کو تمام موجودات میں ذاتِ الٰہی نظر آتی ہے۔ اور وہ ایک خدا کا

مشاہدہ ان چیزوں میں کرتا ہے۔ خدا کا غیر ان کے یہاں معدوم ہے، خدا کے متعلق اس طرح کا تصور

شہودیہ نظریہ کی اساس ہے۔

تصوف میں خدا کے متعلق ایک اور نظریہ ہے۔ اس کی رو سے خدا کو ـــ

---

[1] ارمغان مالک۔ فارابی کا نظام فکر جلد دوم دہلی ۱۹۷۱ء۔ ص ۲۱۲۔

(۱) حقیقتِ انتہائی سمجھا گیا ہے۔

(ب) اس حقیقتِ انتہائی کو "جمال" یہ حسنِ ازلی قرار دیا گیا ہے۔

(۳) یہ حقیقتِ انتہائی ہی "نورِ اولیٰ" یا "نورِ مجرد" بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے تعلق سے تصوف کے ان نظریات کی توضیح اردو کی حمدیہ شاعری میں نہایت عمدگی سے کی گئی ہے۔ اردو شعراء نے چونکہ مندرجۂ بالا میں سے کسی خاص نظریہ ہی کو اپنی حمدیہ نظموں کا محور نہیں بنایا۔ بلکہ اکثر و بیشتر ان کے یہاں ایک ہی حمد میں تمام نظریات کے حامل اشعار بآسانی دستیاب ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اردو کے ان شعراء کو ہم ایکادیہ، وجودیہ یا شہودیہ وغیرہ خانوں میں نہیں بانٹ سکتے۔ تاہم ان نظریات کی توضیح کرنے والے چند حمدیہ اشعار ہم بطور مثال ذیل میں درج کر رہے ہیں۔

(ایکادیہ)(۱)　تیرے نسیمِ لطف سے گل کو شگفتگی
وابستہ تیرے حکم پہ چلنا نسیم کا　(کلیاتِ شیفتہ ص۱)

(۲)　تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا
کیسی زمیں بنائی، کیا آسماں بنایا
پاؤں تلے بچھایا کیا خوب فرشِ خاکی
اور سر پہ لاجوردی اک سائباں بنایا
مٹی سے بیل بوٹے کیا خوشنما اگائے
پہنا کے سبز خلعت ان کو جوان بنایا　(کلیاتِ اسمٰعیل میرٹھی ص۲۳)

(وجودیہ)(۱)　دیکھ تو کثرت میں وحدت کو ذرا
سو مقاموں میں یہ چھائی ہے نوا
(میر حسن۔ رموز العارفین۔ ص۳)

(۲) موجود اگرچہ نام خدا وہ گماں نہیں — تس پر بھی آہ یاں تو کسو پر عیاں نہیں (دیوان اثر ص ۲۰)

(۳) دل ہر قطرہ سازِ انا البحر — ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا (دیوان غالب ایمان ایڈیشن ص ۳)

(۳) شہودیہ (۱) جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا

تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا (دیوان درد۔ ص ۱۹)

(۲) ہے جلوہ گاہ تیرا کیا غیب کیا شہادت

یاں بھی شہود تیرا، واں بھی حضور تیرا (ایضاً ص ۱۳)

(۴) خدا بحیثیت حسن ازلی الف (۱) حسن تیرا جو ہے عالمگیر

جم ہے نے آج نا سکندر ہے (دیوان فائز ص ۲۱)

(۲) محو دیدار ترے حسن کے ہو جاتے ہیں

تاب آئینے تجھے دیکھ کے کب لاتے ہیں (دیوان عشق اورنگ آبادی۔ ص ۶۳)

(ب) نورانی (۱) تاباں ہے اس نگاہ سوں مج دل میں نور آج

جس نور میں ہوا ہے ہر اک کوہ طور آج (انتخاب حاتم ص ۱۱۹)

(۲) مقدور نہیں اس کی تجلی کے بیاں کا

جوں شمع سراپا ہو اگر حرف زباں کا (انتخاب سودا ص ۳۴)

آخر میں یہ کہنا ہے کہ مجموعی حیثیت سے اردو کی حمدیہ شاعری جلال وجمال کی حامل، نشاط وانبساط اور کیف وسرور کی شاعری ہے، جو عقیدت وایمان کے لحاظ سے نہ صرف بصیرت افروز ہے، بلکہ عشق کے والہانہ جذبات کی صحیح ترجمان ہونے کی وجہ سے قاری کے دل کی تاریک گہرائیوں میں سرور وکیف کی شمعیں روشن کر دیتی ہے۔

باب التقریظ والانتقاد

حنائے علی گڑھ

از
ڈاکٹر فرحت فاطمہ۔ ایم اے، پی ایچ ڈی، لیکچرار شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی

حنائے علی گڑھ یہ ۱۰۷ صفحے کا مجموعۂ مکاتیب ہے۔ جس میں پروفیسر رشید احمد صدیقی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر خواجہ احمد فاروقی اور دیگر مشاہیر کے خطوط شامل ہیں۔ اور جسے میسور کے ممتاز نقاد اور ادیب پروفیسر محمد عبد القادر نے پندرہ صفحے کے دلکش مقدمے اور حواشی کے ساتھ بنگلور سے شایع کیا ہے۔ ملنے کا پتہ اردو لائبریری سنٹر، ۳۰، سٹی مارکیٹ بنگلور، اور بک ڈپو انجمن ترقی اردو، اردو بازار جامع مسجد دہلی ہے۔ کتابت۔ طباعت اور کاغذ نہایت اعلیٰ۔ قیمت چالیس روپیے۔

خطوط کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ سیاسی۔ مذہبی۔ ادبی۔ علمی اور نجی۔ لیکن سب سے اچھے خط وہ ہوتے ہیں جو کسی کی فرمایش پر نہ لکھے جائیں، بلکہ از خود لکھ جائیں، اچھے خط اور اچھے شعر میں اہتمام اور زبردستی کو دخل نہیں ہوتا۔ جو دل سے نکلتا ہے وہی کاغذ پر اتر جاتا ہے۔ اچھا شعر اور اچھا خط کڑی کمان کا تیر ہے۔ وہ بس ہو جاتا ہے۔ اس میں نہ تصنع کو دخل ہے اور نہ تکلف کو۔ ہم دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اچھا خط حسن اتفاق کا نام ہے۔ ہمارے ناقص عشق سے یار کا حسن بے نیاز ہے۔ اس کے حسین چہرے کو نہ آب ورنگ کی ضرورت ہے۔ اور نہ خال وخط کی۔ ع

بہ آب ورنگ وخال وخط چہ حاجت روئے زیبا را

اس مجموعہ کے تمام خطوط نجی ہیں۔ لکھنے والے کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں تھا کہ یہ کبھی منظر عام

ئیں گے۔ اسی لیے ان میں بے ساختگی اور بے ریائی ہے۔ اور بلا کا خلوص ہے۔

حنائے علی گڑھ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی علی گڑھ سے باہر جانے کے لیے بہت کم آمادہ ہوتے تھے۔ اگر مجبور آ جاتے تو آخری ٹرین سے جاتے اور پہلی ٹرین سے واپس آ جاتے۔ علی گڑھ سے اس غیر معمولی وابستگی کے پیش نظر، قادر صاحب نے رشید صاحب کو میرزا عبد القادر بیدل کا یہ شعر لکھا ؎

دنیا اگر دہند نہ جنبم زجائے خویش   من بستہ ام حنائے قناعت بہ پائے خویش

اور اس میں ذرا سے تصرف کی اجازت چاہی۔ ع

من بستہ ام حنائے علی گڑھ بہ پائے خویش

رشید صاحب پھڑک گئے۔ اور بیدل سے ہم نامی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے لکھا

"شعر عبد القادر بیدل از تصرف بہ عبد القادر علیگ"

اس مجموعہ میں عبد القادر صاحب کا ایک بسیط مضمون بھی رشید صاحب پر شامل ہے۔ جو ۱۹۴۲ء میں ساقی دہلی کے سالنامہ میں شایع ہوا تھا۔ اور جو عبد القادر صاحب کی نقادی اور بالغ نظری کا ثبوت ہے۔ یہ بہترین خراج عقیدت ہے۔ جو ایک عزیز طالب علم اپنے محترم استاد کو پیش کر سکتا ہے۔ در اصل پوری کتاب ایک قرض ہے جو گردنیم باز پہ تھا۔ اور جس کو عبد القادر صاحب نے، اپنے شفیق بزرگوں اور مخلص دوستوں کے سامنے بڑی سلیقگی دیانت داری، خوش مذاقی اور خوبصورتی کے ساتھ اتارا ہے۔

ان خطوں میں ۴۴ برس کی کہانی ہے۔ جس کی طرف صرف جنبم سخن سے اشارہ کیا گیا ہے، یہ تعلقات ۱۹۳۲ء میں شروع ہوئے۔ جب عبد القادر صاحب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ اور اپنی غیر معمولی لیاقت خوش ذوقی اور فہم و فراست کی بدولت

صفِ اول کے لکھنے والوں میں شمار ہونے لگے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ تعلقات رشید صاحب، ان کے حلقہ اور نیازمندوں سے بھی بہت گہرے ہوگئے تھے۔ اور ان کی حیثیت گھر کے ایک فرد کی سی ہوگئی تھی۔ ان خطوں کے پیچھے جو فضا ہے وہ بڑی مخلصانہ اور دل آسا ہے۔ اس میں بڑی نیرو برکت ہے۔ رخِ سخن پر لطف و مرحمت بھی ہے۔ اور وہ محبت بھی جو اب ناپید ہے خطوں میں جتنے افراد ہیں وہ حافظ کے لفظوں میں عشق کے ہم راز اور رِ دنیا کے ہم نفس ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے وائس چانسلر، گورنر اور نائب صدر کی حیثیت سے بھی خط لکھے ہیں۔ اور سب میں مہر و محبت کا وہی عالم ہے۔ جو اول دن تھا۔ بلکہ جیسے جیسے وہ ترقی کے بام بلند تک پہنچتے گئے۔ ان کی محبت اور ان کے خُلق میں اضافہ ہوتا گیا۔ ان کی شرافت اور ان کا انکسار اس پیڑ کی طرح تھا جو پھلوں سے لدا ہوا ہو اور بوجھ سے نیچے کو جھکتا جائے۔ عبدالقادر صاحب پر رشک آتا ہے کہ ان کے کاتبینِ خطوط رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر ذاکر حسین، علامہ نیاز فتح پوری، خواجہ احمد فاروقی، سلطان حیدر جوش وغیرہم ہیں۔

اس مجموعے میں نہایت دلچسپ حواشی اور فٹ نوٹ بھی ہیں۔ خواجہ احمد فاروقی کا ایک خط اس طرح شروع ہوتا ہے۔

"حضرت جوانی بہ دل است نہ بہ سال۔ میرا تو مدعا یہ تھا کہ آپ اس نگارِ آتشین رخ کو چار پر بلائیں گے۔ اور کہیں گے کہ یہ دنور افروزی، امریکہ جارہی ہیں۔ اس رنگ ڈھنگ سے بات نہ ہوسکی۔ فیلوشپ کی گفتگو اس سطح پر زیادہ مناسب تھی۔"

اس پر عبدالقادر صاحب نے جو حاشیہ چڑھایا ہے۔ وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ لکھتے ہیں۔

"میں نے فاروقی صاحب کو کھانے پر بلایا۔ ان کے ہمراہ ڈاکٹر نیانائیک تھے۔ اور ان کی حسین و جمیل سکریٹری بھی تھیں۔ "حسین و جمیل" کتابی چہرہ۔ نرگسی آنکھیں۔ ترا شیدہ گھنگھرالے

بال، سرخ و سفید رنگ، عمر ۱۲ - ۲۲ کی"

"فاروقی صاحب کا اس لڑکی کو غالب کے الفاظ میں نگارِ آتشیں رخ سے تعبیر کرنے کی داد نہیں دی جا سکتی"

"فیض کو مدحِ زلف و لب و رخسار کرنے میں تامل تھا۔ اس لئے کہ جانے کس رنگ میں تفسیر کریں اہلِ ہوس"

لیکن فاروقی صاحب کے پاس لسان الغیب کا فتویٰ ہے۔ میرے نزدیک یہ گناہ نہیں ہے۔ روئے نکو کی تعریف تو بیاضِ مسیحا کا ایک نسخہ ہے۔ جس سے عمر بڑھ جاتی ہے۔

روئے نکو معالجۂ عمر کوتہ است   ایں نسخہ از بیاضِ مسیحا نوشتہ اند

عبدالقادر صاحب کا خیال ہے کہ خواجہ احمد فاروقی کے خطوط اگر شائع ہو جائیں تو وہ ان کی تمام تصانیف پر بھاری ہوں گے۔ یہی رائے قبلۂ محترم ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی کی ہے۔ جو ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ میں ادبیات عربی کے پروفیسر ہیں۔ اور لیڈز ([illegible]) یونیورسٹی کے فارغ التحصیل ہیں اور جو ان کے خطوط کو کتابی شکل میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ؎

ز من دانم و دل داند ایں نامہ چہا دیدم   صد بار ز بے تابی وا کردم و پیچیدم

اس زمانہ میں جب کہ علم مجلسی اٹھتا جا رہا ہے۔ اور بے فرصتی کی بدولت دیوان خانے کی محفلیں سرد ہو گئی ہیں، اور تار اور ٹیلی فون کی افزونی سے خط کتابت کی اعلیٰ روایتیں ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ خانۂ علی گڑھ ایک نعمت ہے۔ جس میں عمرِ رفتہ کے بعض خوشگوار لمحوں کو جاوداں بنا دیا گیا ہے، ان میں تمام خطوط ادب کا شاہکار نہیں ہیں، اور نہ ہو سکتے تھے لیکن ان میں خلوص کی دولت ہے، وفا کی خوشبو ہے اور رضیہ احمد صدیقی اور ذاکر صاحب کی حیثیت تو بلاشبہ پیرِ مغاں اور مامنِ وفا کی ہے، عبدالقادر صاحب ماشاءاللہ "جوان بخت جہاں" ہیں۔ ان کے متعلق صرف یہی عرض کیا جا سکتا ہے۔ ؎

قدح پُر کن کہ من از دولتِ عشق   جوان بخت جہانم گرچہ پیرم
چناں پُر شد فضائے سینہ از دوست   کہ فکرِ خویش گم شد از ضمیرم

مطبوعاتِ جدیدہ

رسالہ نوریہ سلطانیہ: مرتبہ۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ۔ تصحیح و تعلیق و مقدمہ ڈاکٹر محمد سلیم اختر صاحب تقطیع کلاں کاغذ عمدہ۔ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۰۰، قیمت تحریر نہیں۔ پتہ: مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، پاکستان۔

یہ ہندوستان کے مشہور عالم اور محدث کبیر حضرت شاہ عبدالحق دہلویؒ کی تصنیف ہے جو ابھی تک غیر مطبوعہ بلکہ تقریباً ناپید تھی، مگر اب پاکستان کے فاضل محقق ڈاکٹر محمد سلیم اختر نے اس کے متن کی تصحیح کر کے اسے اپنے عالمانہ مقدمہ و تعلیقات کے ساتھ بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے، شاہ صاحب نے یہ رسالہ فرمانروائے ہند نورالدین محمد جہانگیر کے لیے لکھا تھا۔ اس میں بادشاہ کے فرائض: سلطنت کے ارکان، قواعد، آداب اور اس کی بھلائی و خیر خواہی کی مفید اور اہم باتیں بیان کی گئی ہیں۔ یہ رسالہ ایک مقدمہ کے علاوہ پانچ وصل پر مشتمل ہے، مقدمہ میں پہلے بادشاہ کے دربار میں حاضری کے آداب اور اس کے عادل، سایۂ خدا اور جانشینِ مصطفےٰ ہونے کی حیثیت سے اس کی اہمیت و عظمت واضح کی گئی ہے، جس سے ظاہر ہے کہ وہ بادشاہت کو بالکل ہی غیر اسلامی طرزِ حکومت خیال نہیں کرتے تھے، پھر رسالہ کی تالیف کا مقصد اور اس کے مباحث کا خلاصہ دیا گیا ہے، پہلا وصل ارکانِ سلطنت کے بیان میں ہے جو یہ چار چیزیں ہیں۔ خزانہ۔ لشکر۔ لشکر میں اتفاق، عدل اور مخلوق پر ظلم و ستم نہ کرنا۔ شاہ صاحب نے ان سب کی اہمیت و ضرورت بتائی ہے۔ دوسرے وصل میں ان چاروں امور کے حصول و استحکام کے طریقے بیان کر کے دکھایا ہے کہ انہی کی بدولت سلطنت مستحکم اور پائندہ ہو سکتی ہے۔ تیسرے وصل میں ان امور، آداب [illegible] کا ذکر ہے۔ جن کو بادشاہ کو

متصف ہونا چاہیے۔ اس میں اور باتوں کے علاوہ زیادہ زور اس پر دیا ہے کہ قوت اور زور بازو میں بادشاہ کو سب سے فائق اور شجاعت و بہادری میں سب سے ممتاز ہونا چاہیے، جسمانی قوت پیدا ہونے کے وسائل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسے پہلوانوں کی طرح صبح کو ورزش کرنی چاہیے۔ کہا جاتا ہے کہ ورزش اگر جہاد کی نیت سے ہو تو بادشاہ کے لیے یہ تہجد سے افضل ہے۔
چوتھے وصل میں اجرائے امور سلطنت کے سلسلہ کی مفید باتیں تحریر کی گئی ہیں، آخر میں گزشتہ سلاطین کی عدل پروری، عفو، حلم، کرم، احسان، قوت اور شجاعت کے واقعات وحکایات درج ہیں، ڈاکٹر محمد سلیم نے اپنے مقدمہ میں شاہ صاحب کے حالات اور کارناموں پر محققانہ بحث کرکے رسالہ کا تعارف کرایا ہے، اور اس کے بعض اہم مضامین کی نشاندہی کی ہے۔ اور ان تین نسخوں کی خصوصیات تحریر کی ہیں جن سے مقابلہ و مراجعت کرنے کے بعد یہ متن شائع کیا گیا ہے۔ اسی حصہ میں شاہ صاحب کی شرح مشکوٰۃ اشعۃ اللمعات کے پہلے صفحہ اور دہلی میں ان کی آرام گاہ کا عکسی فوٹو بھی ہے۔ تعلیقات آخر میں درج ہیں۔ ان میں متن کے مندرجات کے ماخذ کی نشاندہی، آیات و احادیث کی تخریج اور رسالہ میں مذکور اشخاص و مقامات کے بارہ میں معلومات قلمبند کئے گئے ہیں۔ تعلیقات کے بعد ۱- مار د اعلام کے تین اشارے بھی ہیں۔
ڈاکٹر محمد سلیم نے یہ رسالہ بڑی تحقیق و محنت سے ایڈٹ کیا ہے، اس کا اندازہ ماخذ و مراجع کی طویل فہرست سے بھی ہوتا ہے، شروع میں مرکز کے ڈائرکٹر کی تحریر میں یہ سخن گسترانہ باتیں بھی آگئی ہیں کہ پیش نظر رسالہ اور قدما کی دوسری تصنیفات میں بعض ایسے واقعات درج ہوتے ہیں جن کی تاریخی حیثیت سے کوئی اصلیت نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ افسانہ ہوتے ہیں، دوسرے شاہ صاحب نے عباسی خلفاء ہارون رشید، مامون اور معتصم باللہ جیسے ستمگروں کا ذکر عظمت و احترام سے کیا ہے۔ اور انھیں امیر المومنین بھی لکھا ہے۔ جب کہ انھوں نے شیعی اماموں پر ہی نہیں بلکہ ائمہ سنن

پر بھی ظلم و بیداد کیا ہے، مرکز کے مدیر کا نام معلوم نہیں ورنہ اندازہ ہوتا کہ اس تحریر میں کون سا زاویۂ نگاہ کام کر رہا ہے۔ ان کی پہلی بات کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس چیز کو وہ بے اصل سمجھتے ہیں۔ ممکن ہے چھان بین کے بعد وہ بے اصل نہ ہو، باقی ان خلفا کے امیر المومنین ہونے میں کیا شبہ ہے۔ اور شاہ صاحب نے ان کی جس پہلو سے تحسین کی ہے۔ وہ قابل اعتراض نہیں ہے، اگر کسی حکمران کی کمزوریاں انگلیوں پر گنی جا سکتی ہوں اور اس کی خوبیاں حد شمار سے باہر ہوں تو وہ اپنی چند کمزوریوں کے باوجود اچھا حکمران ہے۔ اس نایاب رسالہ کی اشاعت پر اہل علم کو ڈاکٹر محمد سلیم اختر اور مرکز تحقیقات دونوں کا شکر گزار ہونا چاہئے۔

فہرست مشترک نسخہ ہائے خطی فارسی پاکستان جلد چہارم | مرتبہ جناب احمد منزوی صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ عمدہ، طباعت ٹائپ، صفحات ۷۹۲، قیمت ۱۰۰ روپیے، پتہ مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان، اسلام آباد، پاکستان۔

اس فہرست کی پہلی جلد کا ان صفحات میں ذکر آچکا ہے، دوسری اور تیسری جلد موصول نہیں ہوئی ہے۔ یہ دراصل پاکستان کے مختلف کتب خانوں میں موجود فارسی مخطوطات کی فہرست ہے، زیر نظر جلد کی ابتدا نمبر ۱۰۸۰۳ سے اور انتہا ۶۲۲۳۴ پر ہوئی ہے، اس طرح اس میں ۵۵۵ فارسی مخطوطات کا ذکر تین حصوں (۹۲ تا ۱۰۰) میں ہے۔ پہلے حصہ ہندوی میں ہندوؤں اور ان کے مذہب سے متعلق کتابوں کے نام درج ہیں، جن کے اکثر مصنفین بھی ہندو ہیں، دوسرا حصہ فلسفۂ عملی یعنی اخلاق و آداب کی کتابوں پر مشتمل ہے، اور تیسرے حصہ کا عنوان پیشہا و آداب پیشہ وران ہے۔ اس میں آہنگری، سپاہگیری، بافندگی، سقائی، جواہر شناسی، شکار و میر شکار، تیر اندازی و کمانداری، کفش دوزی، خوراک پزی، دلاکی، ہنرکنی، وغیرہ سے متعلق کتابوں کی فہرست ہے۔ کتابوں کے نام حروف تہجی کے مطابق درج ہیں اور ہر مخطوطہ کے بارے میں ضروری معلومات کے علاوہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ کن پاکستانی کتب خانوں میں

موجود ہیں۔ یہ جلد بھی فہرست نگاری اور کتاب شناسی کے ماہر احمد منزوی صاحب نے محنت اور سلیقہ سے مرتب کی ہے، آخر میں تین فہرستیں ہیں پہلی کتابوں کے اور دوسری مصنفین کے ناموں کے اعتبار سے ہے اور تیسری متن میں وارد ناموں کی ہے۔ مرکز تحقیقات نے یہ فہرست شائع کر کے مفید علمی خدمت انجام دی ہے۔

حیات مصلح الامت :- مرتبہ مولانا اعجاز احمد اعظمی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۷۰۵ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۵۰ روپیہ ناشر دائرۃ الاشاعت خانقاہ مصلح الامت الٰہ آباد۔

مولانا شاہ وصی اللہ صاحب حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے اجل خلفا میں تھے۔ جو ان کے بعد خود بھی ایک بڑے شیخ طریقت اور اسرار تصوف کے واقف و ماہر ہوئے اور ایک بڑے طبقہ کو ان کی ذات سے فیض پہنچا۔ اس سے پہلے تذکرہ مصلح الامت پر معارف میں تبصرہ ہو چکا ہے۔ اب مولانا کے جانشین مولانا قاری محمد مبین صاحب کی نگرانی میں یہ دوسری سوانح عمری مرتب کی گئی ہے۔ گو پہلی کتاب بھی کمتر نہ تھی تاہم ع ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است، پیش نظر کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے میں صاحب سوانح کی پیدائش سے وفات تک کے حالات و واقعات قلمبند کئے گئے ہیں جس میں مولانا کے خاندان، ولادت، تعلیم، حضرت تھانوی کی خدمت میں حاضری و وابستگی، تعلیم سے فراغت کے بعد مختلف مدارس میں درس و تدریس کی خدمت انجام دینے اور شادی کا تذکرہ ہے پھر اپنے شیخ مولانا تھانوی کے ایما سے اپنے وطن فتح پور (اعظم گڈھ) میں فروکش ہو کر خلق خدا کی اصلاح و تربیت کے لئے وقف ہو جانے کا ذکر ہے، اس ضمن میں شب و روز کے معمولات، خانقاہ کے اصول و ضوابط، طالبین و سالکین کے لیے ہدایات، دستور العمل اور نظام الاوقات کی تفصیل بیان کی گئی ہے اور مجلسوں کا حال اور اصلاحی و تبلیغی کام کے لیے قرب و جوار کی بستیوں میں بھی گاہے ماہے تشریف لیجانے کا ذکر ہے، اس سے دعوت و اصلاح کے کام میں مولانا وصی اللہ صاحب کی مستعدی، باقاعدگی اور بیدار مغزی

کا پتہ چلتا ہے۔ مگر افسوس کہ فتح پور میں ان کی اصلاحی و دینی سرگرمیوں میں بعض لوگ رخنہ انداز ہونے لگے، ان کے رکیک انداز اور مسلمانوں کو تفرقہ و انتشار سے بچانے کے لئے مولانا پہلے گورکھپور اور آخر میں الٰہ آباد تشریف لے گئے جہاں ان کا دائرۂ فیض اور زیادہ وسیع ہو گیا۔ اس کتاب کے پہلے حصہ میں اس کی اور دوسری جگہوں میں مولانا کے سفر کی روداد بیان کی گئی ہے، اور آخر میں دوبارہ حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہونے اور جہاز میں انتقال فرما جانے کے المناک سانحہ کا ذکر ہے۔ ان سادہ واقعات کے ضمن میں متعدد ایسے حالات و کیفیات بھی زیرِ تحریر آگئے ہیں، جن سے مولانا کی عظمت و بلند پایگی، دینی و اصلاحی جذبہ اور دوسری ممتاز خوبیوں کا اندازہ ہوتا ہے، دوسرے حصہ میں مولانا کے ذوق و مزاج، ان کی خصوصیات خلوت گزینی، ذوقِ عبادت، ذاتِ نبوی سے شیفتگی، قرآن مجید سے تعلق، زہد و اتقا، مریدین اور وابستگان پر لطف و شفقت امت کی اصلاح کے لئے فکرمندی، حزم و تدبر، علمی ذوق اور حسن قبول وغیرہ کی داستان سنائی ہے، ایک حصہ میں اس عہد کے دوسرا کابر علماء و مشائخ سے مولانا کے روابط بیان کئے ہیں، اسی سلسلہ میں ان کے استاذ مولانا ابراہیم بلیاوی کے ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے اور دونوں کی باہمی خط و کتابت کا ذکر ہے، اسی حصہ میں مولانا کی کرامتوں اور دعا کی مقبولیت، سلوک و تصوف کی لطیف باتوں اور اصلاح باطن کے بعض نکات بھی بیان ہوئے ہیں۔ اس کے ایک حصہ میں مولانا کی ظاہری و معنوی اولاد کا تذکرہ بھی ہے، جس میں تصنیفات کا مختصر تعارف کرایا ہے، آخر میں چند موثر و دلپذیر وعظ نقل کئے گئے ہیں۔ اور مولانا تھانویؒ کے انکے نام کے تین ۳ خطوط بھی دے گئے ہیں، ان پر حضرت کا مختصر مگر بلیغ اور حکیمانہ جواب بھی ہے، ایک بڑا پر اثر مضمون مولانا عبد الباری ندوی کا "چار ہفتہ ایک کہف میں"۔ صدق لکھنؤ سے شامل کیا گیا ہے، شروع میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے قلم سے ایک مقدمہ ہے، اس میں مولانا شاہ وصی اللہ صاحب کی دعوت و اصلاح کی بعض نمایاں خصوصیات مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں تحریر کی ہیں، مولانا وصی اللہ صاحب

جس پایہ کے مرشد و مصلح تھے، اور انھوں نے جس مناسب انداز میں دلسوزی، انہماک اور اخلاص سے اصلاح و دعوت کا کام انجام دیا ہے۔ اس کتاب سے اس کا مرقع سامنے آجاتا ہے، اس لحاظ سے یہ بڑی مفید ہے۔ البتہ حدود و مراتب کا خیال رکھنا بڑا نازک مگر نہایت ضروری امر ہے اس کتاب میں کہیں کہیں حد سے بڑھی ہوئی عقیدت مندی کی وجہ سے اس کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ چنانچہ مولانا کے وطن چھوڑنے کی مثال ہجرت نبوی سے دی گئی ہے اور پھر دوبارہ وطن میں واپسی کو فتح مکہ سے تعبیر کیا گیا ہے، یہ کتاب فتح پور اور الہ آباد میں مولانا کی قیام گاہ، ان کی مجلس اور اس میں نشست گاہ، مسجد و مدرسہ اور خانقاہ نیز خطوط کے عکسی فوٹو سے بھی مزین ہے۔

پورنیہ کے دو ولی : مرتبہ جناب اکمل یزدانی جامعی صاحب، تقطیع متوسط کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۱۰۴، قیمت آٹھ روپیہ، پتے (۱) سلیمان اکیڈمی، بہادر گنج، مقام وڈاکخانہ بہادر گنج، ضلع پورنیہ (بہار) (۲) اپنا کتب خانہ کٹیہار (بہار) (۳) صادق کتاب گھر، کچہری روڈ، پورنیہ۔ بہار

یہ کتاب پورنیہ سے تعلق رکھنے والے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کے دو خلفاء کا تذکرہ ہے، اس کے مرتب جناب اکمل یزدانی کو لکھنے پڑھنے کا اچھا ذوق ہے۔ اور وہ عرصہ سے پورنیہ کی تاریخ کا مطالعہ کرکے اس کے بارہ میں معلومات اکٹھا کرتے رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے یہاں کے ممتاز اشخاص کے بارہ میں بھی بڑا مواد جمع کیا ہے، لیکن حالات کے غیر مساعد ہونے کی وجہ سے ان تمام لوگوں کا تذکرہ شائع کرنے کے بجائے ابھی انھوں نے اسی دور کے دو بزرگوں کا یہ تذکرہ شائع کیا ہے، پہلے بزرگ مولانا منور حسین صاحب کا تذکرہ زیادہ مفصل ہے اس میں ان کے وطن، خاندان، ماحول، تعلیم و تدریس، سلوک و تصوف، قومی، ملی، دینی اور تبلیغی خدمات کے علاوہ ان کے منتخب ارشادات و ملفوظات اور بعض تقریروں کا خلاصہ دیا ہے۔

اس میں مولانا حسین عثمانی سے ان کے بیعت ہونے اور پھر حضرت شیخ الحدیث سے اجازت وخلافت پانے اور ان دونوں بزرگوں سے روابط کی تفصیل بھی ہے، دوسرے بزرگ مولانا امام الدین صاحب کے بھی خاندانی حالات اور حصول تعلیم کی روداد بیان کی ہے، اور پھر حضرت شیخ سے ان کے تعلق، رمضان کے معمولات اور تبلیغی سرگرمیوں کا ذکر ہے، شروع میں ایک مقدمہ ہے، اس میں پورنیہ کے بارہ میں مختصر تاریخی وجغرافیائی معلومات اور اسلام کی اشاعت میں صوفیائے کرام کی تبلیغی جدوجہد کا ذکرہ ہے، اس سلسلے میں کئی صوفیائے کرام اور ان کے سلاسل اشاعت اسلام کی مرکزی جگہوں، خانقاہوں اور تکیوں کا ذکر بھی آگیا ہے، یہ معلومات بوکانن ہملٹن صاحب کے پورنیہ اکاؤنٹ ۱۸۰۹ء سے ماخوذ ہیں، اس میں پست طبقوں کے قبول اسلام کا سبب اعلیٰ طبقہ کے ہندوؤں کے نفرت وحقارت آمیز رویے کو بتایا گیا ہے۔ یہ کتاب اچھی ہے، مگر کتابت وطباعت کی متعدد غلطیاں ہیں۔

نظریۂ ادب اور ادیب :- از جناب شاہ رشاد عثمانی صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۳۰، مجلد مع گردپوش، قیمت ۲۰ روپے۔ پتہ: مجیرواشکاف بیت الرشاد، نیا کریم گنج، گیا، بہار۔

جناب شاہ رشاد عثمانی کے ادبی وتنقیدی مضامین کے اس مجموعہ میں انہی شعراء اور ادیبوں کی کاوشوں پر بحث وتبصرہ کیا گیا ہے۔ جو ترقی پسندی اور جدیدیت کے شور وغوغا میں بھی پاکیزہ اور تعمیری ادب کو فروغ دینے میں مشغول ہیں، اسی حیثیت سے اس میں پروفیسر عبدالمغنی کی تنقید نگاری، حفیظ میرٹھی کی غزل گوئی، ہبیں زیدی کی نظم نگاری اور ام نسیم کے طنزیہ مضامین کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اس کے بعد تعمیری ذوق ورجحان رکھنے والے کئی افسانہ نگاروں اور نعت گو شعراء کے خصوصیات فن کا جائزہ لیا ہے۔ اختر اورینوی کے ناول حسرت تعمیر اور ڈاکٹر سید عابد حسین کے ڈرامہ پردہ غفلت کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے۔ مصنف کی تحریری عمر زیادہ نہیں ہے

اس لیے زبان و بیان اور خیالات میں جو کچھ کسر ہے۔ وہ مشق کے بعد رفع ہو جائے گی۔ مجموعی حیثیت سے یہ کتاب مصنف کی بہتر صلاحیت اور اچھے ذوق کا ثبوت ہے۔

اردو کے کلاسیکی شعرا، جلد اوّل :- مرتبہ جناب ایم۔ حبیب خاں صاحب، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۰۰، قیمت ڈھائی روپیہ۔ پتہ۔ انڈین بک ہاؤس علی گڑھ۔

جناب ایم حبیب خاں لائبریرین کتب خانہ انجمن ترقی اردو ہند نے اردو کے اہم اور بلند پایہ شعرا پر مفید تنقیدی مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ اس کا پہلا حصہ ہے جس میں ولیؔ۔ میرؔ، سوداؔ۔ دردؔ۔ میر حسنؔ۔ مصحفیؔ۔ انشاؔ۔ جرأتؔ، ناسخؔ۔ اور آتشؔ کی شاعری کے اہم پہلوؤں اور نمایاں خصوصیات پر مختلف مشہور اہل قلم کے اچھے اور متوازن مضامین اکٹھا کیے گئے ہیں۔ لائق مرتب نے شروع میں ہر شاعر کے مختصر حالات کے علاوہ اس کے کلام کا نمونہ بھی دیدیا ہے۔ آخر میں دلی و لکھنؤ کے دبستان شاعری کے عنوان سے ایک مختصر مگر مفید مضمون بھی درج ہے۔ جن شعرا پر اس کتاب میں تنقیدی مضامین درج ہیں۔ لائق مرتب نے ان پر لکھی گئی مفید تنقیدی کتابوں اور مضامین کی فہرست بھی دیدی ہے۔ تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ طلبہ کیلئے خاص طور پر بہت مفید ہے۔

بچوں کی کہانیاں حصہ اول و دوم :- مرتبہ جناب اکبر رحمانی صاحب۔ تقطیع اوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ہر دو حصے ۲۰، قیمت تحریر نہیں، پتہ مکتبہ آموزگار، کاشانہ بھیل، بھوانی پیٹھ جلگاؤں۔

جناب اکبر رحمانی کو علمی و تعلیمی مسائل سے دلچسپی بھی ہے اور وہ اردو کی خدمت کا جذبہ بھی رکھتے ہیں۔ ان کی کوشش سے جلگاؤں میں ایجوکیشنل اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اس کے ماتحت اردو میں تعلیمی و تدریسی موضوعات اور بچوں کے ادب پر مفید کتابیں شائع کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے۔ یہ کتابیں اسی سلسلہ کی کڑی اور بچوں کے لیے سبق آموز کہانیوں پر مشتمل ہے۔ امید ہے بچوں میں اردو کے فروغ اور ان کی ذہنی و دماغی نشو و نما میں مدد ملے گی۔

"ض"

سلسلۂ مذہبی رواداری

تاریخ ہند کا سلسلہ اب تک اٹھائیس کتابوں تک پہنچ چکا ہے، اسی ضمن میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ ہے، جو تین جلدوں پر مشتمل ہے،

جلد اوّل اس میں مغل دور سے پہلے کے مختلف خاندانوں کے مسلمان حکمرانوں مثلاً محمد بن قاسم، محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، علاء الدین خلجی، محمد بن تغلق وغیرہ کی مذہبی رواداری وغیرہ کے واقعات پیش کئے گئے ہیں، قیمت ۲۲ روپے۔

جلد دوم :۔ اس میں مغل فرماں روا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے حکمراں شیر شاہ، اسلام شاہ، پھر مغل شہنشاہ اکبر، جہانگیر، شاہجہاں کی مذہبی رواداری وغیرہ کے دلچسپ واقعات قلمبند کئے گئے ہیں، قیمت ۲۲ روپے۔

جلد سوم ہندوستان کے مغل عہد کے مشہور مورخ سر جدو ناتھ سرکار کی کتاب کا جواب خود ان کی کتابوں کے حوالوں سے اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر اور اس کے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری وغیرہ کی تفصیلات آگئی ہیں، مولانا شبلی کی مضامین عالمگیر، اور مولانا سید نجیب اشرف صاحب ندوی مرحوم کی مقدمۂ رقعات عالمگیر کے بعد اورنگ زیب عالمگیر پر دوسری اہم اور پر از معلومات کتاب جس میں اس کے پورے پچاس سالہ عہد حکومت و فرمانروائی کی پوری تاریخ آگئی ہے، قیمت :۔ ۳۵ روپے،

اسلام کی مذہبی رواداری :۔ اس میں مستند حوالوں سے مذہبی رواداری، غیر مسلم رعایا کے ساتھ سلوک اور ذمیوں کے حقوق کے متعلق مذہب اسلام کی تعلیمات اور ان پر مسلمانوں کے عمل کا نمونہ پیش کیا گیا ہے، (زیر طبع)

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

قیمت تیس روپئے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

برید فرنگ

۱۹۲۰ء میں علامہ سید سلیمان ندوی نے مولانا محمد علی وغیرہ کے ساتھ وفد خلافت کے ایک رکن اور طبقۂ
خصوصاً مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے نمائندہ کی حیثیت سے مسئلۂ خلافت پر اس دور کے برطانوی وزیر اعظم مسٹر لائڈ
سے گفتگو کرنے اور ترکوں کے حق میں فیصلہ کے لئے لندن کا سفر کیا تھا، اور اسی ضمن میں وہ فرانس، اٹلی وغیرہ
بھی آتے جاتے رہے، ان تمام مقامات سے ہندوستان کے جن بزرگوں، دوستوں، اور عزیزوں کو
انھوں نے جو خطوط لکھے تھے، وہ اس میں جمع کردیئے گئے ہیں، اس کا پہلا اڈیشن خود سید صاحب کی زندگی
میں ان کے پیش لفظ کے ساتھ ان کے اشاعتی ادارہ مکتبۃ الشرق کراچی سے شائع ہوا تھا، ایک عرصہ
کے بعد بمبئی سے اس کا دوسرا اڈیشن مولانا فضل ربی ندوی نے شائع کیا، اسی دوسرے اڈیشن کا عکس
اڈیشن دارالمصنفین نے اپنے مطبع معارف میں چھپوا کر شائع کیا ہے،

اس میں اس دور کی پوری دنیائے اسلام کے سیاسی و اجتماعی حالات، مسلمانوں کے سیاسی مسائل
اور مصر، اسلامی ملک کے مسلمان اکابر و مشاہیر کی دلچسپ ملاقاتوں کی تفصیل بھی آگئی ہے، اس دور کی
اسلامی سیاست کو سمجھنے کے لئے اس کا مطالعہ بہت ضروری ہے،

قیمت :- ۰۰۔۱۸ روپئے

جلد ۱۳۸ ماہ محرم الحرام سنہ ۱۴۰۷ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۸۶ء عدد ۳

مضامین

مقالات

آثار علمیہ وادبیہ

وفیات

شذرات

ادھر گذشتہ تین مہینے میں اس برصغیر میں چار ۴ ہستیاں ایسی ہوئیں جن سے علمی حلقے کو بڑا صدمہ پہونچا، ان کی یادیں برابر آتی رہیں گی۔

جناب محمد طفیل اڈیٹر نقوش لاہور اپنے کسی کام سے اسلام آباد آئے، رات کو خوش خوش سوئے تو اپنی میٹھی نیند ہی میں ۵ رجولائی ۱۹۸۶ء کو اللہ کو پیارے ہوئے، اور اپنے بے شمار قدردانوں کو سوگوار چھوڑ گئے، انھوں نے نقوش کو اپنی ادارت میں ایک علمی فیکٹری بنا رکھا تھا، جس طرح کسی فیکٹری سے مشینیں ڈھل کر نکلتی ہیں، اسی طرح نقوش سے طرح طرح کے علمی و ادبی نمبر نکلتے رہے، غزل نمبر، افسانہ نمبر، مکاتیب نمبر، خطوط نمبر، شخصیات نمبر، طنز و مزاح نمبر، منٹو نمبر، پطرس نمبر، لاہور نمبر، آپ بیتی نمبر، ادب عالیہ نمبر، ادبی معرکہ نمبر، غالب نمبر، میر تقی میر نمبر، شوکت تھانوی نمبر، میر انیس نمبر، اور اقبال نمبر کے علاوہ آخر میں تیرہ ۱۳ جلدوں میں رسول نمبر نکالا، اور قرآن نمبر نکالنے کی فکر میں تھے کہ خود وہاں پہونچ گئے جہاں سے یہ مقدس صحیفہ نازل ہوا تھا،

یہ سارے نمبر علمی ادبی اور تاریخی انسائیکلوپیڈیا بن گئے ہیں، اس لحاظ سے وہ خوش نصیب تھے کہ ان کا خاتمہ بالخیر رسول نمبر پر ہوا، اس کی تیرہ ۱۳ جلدیں دینی فیض اور ملی برکات کا سرچشمہ بنی رہیں گی، یہ بیسویں صدی میں اردو زبان کا ایسا شاندار کارنامہ ہے جو مدت مدید تک یاد رکھا جائے گا، وہ اپنی دنیاوی زندگی میں لوگوں کو علمی کوثر، ادبی تسنیم اور دینی سلسبیل کے جام پر جام پلاتے رہے، دعا ہے کہ اب جہاں وہ پہونچ گئے ہیں وہاں برکت اخروی کی کوثر، مغفرت الٰہی کی تسنیم اور رحمت ایزدی کے سلسبیل سے سیراب ہوتے رہیں، آمین، وہ اپنے پیچھے یہ درس چھوڑ گئے ہیں کہ عزم، محنت اور حوصلہ ہو تو سرمایہ کی کمی کے باوجود بڑے سے بڑا علمی کام انجام دیا جا سکتا ہے

جناب محمد طفیل کی وفات کے کچھ ہی روز بعد جناب قدرت اللہ شہاب کی رحلت کی خبر ملی، وہ برطانوی حکومت کے زمانہ کے آئی۔ سی۔ ایس تھے، ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان کے بڑے بڑے عہدوں پر مامور رہے، وہ جب پاکستان کے گورنر جنرل جناب غلام محمد صاحب کے سکریٹری تھے، تو پہلی بار ۱۹۵۵ء میں

ان سے دارالمصنفین کے دفتری کام کے سلسلہ میں ملا، ایک روز گورنر جنرل ہاؤس میں دوپہر کا کھانا ہوا تو وہ بھی شریک ہوئے لیکن خاموش بیٹھے رہے، ان سے کھانا شروع کرنے کے لیے کہا گیا تو بولے آج شعبان کی پندرھویں تاریخ ہے، وہ نفل روزے سے ہیں، ان کی اس مذہبیت کا اثر دسترخوان کے تمام شرکا پر رہا۔

۱۹۵۵ء سے پاکستان کا سفر برابر کرتا رہا، ان سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں، دارالمصنفین کی مطبوعات کا جب باضابطہ حق طباعت واشاعت حکومت پاکستان کو دیا جا رہا تھا تو انھوں نے اس کی دفتری کارروائی کرنے میں بڑی سہولتیں بہم پہنچائیں جس کے لیے دارالمصنفین ان کا بڑا ممنون ہوا، ان میں سرکاری افسر کی رعونت بالکل نہ تھی، ہر موقع پر بڑے متین، سنجیدہ اور بااخلاق نظر آئے، بولتے بہت کم تھے مگر سنتے سب کی تھے، اور حتی الامکان مدد کیا کرتے تھے، ان کو انگریزی اور اردو لکھنے میں بڑی مہارت تھی، اردو ادب کا بڑا عمدہ مذاق رکھتے تھے، لیکن اس کا اظہار اپنی گفتگوؤں میں نہ ہونے دیتے، ادبی حلقوں میں اپنی اردو تحریر کے لیے مقبول تھے، دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ان کی نیکیوں، لوگوں کے ساتھ گرم گستریں اور روزمرہ زندگی میں ان کی خوبیوں کی بدولت ان کو اپنی آغوشِ عفو و کرم میں لے کر وہی جگہ عطا فرمائیں جو نیک بندوں کو اس کی بارگاہ میں ملا کرتی ہے، آمین۔

اگست ۱۹۸۶ء کے شروع میں جناب محمد مسلم صاحب سابق ایڈیٹر روزنامہ دعوت دہلی کی وفات بھی ان کے جاننے والوں کے لیے ایک المناک سانحہ ہے، ان سے تقریباً پون صدی تک برابر ملتا رہا، ہر ملاقات میں ان کی شرافت اخلاق سے متاثر ہوا، ان کا نسبی تعلق سالار مسعود غازی سے تھا، ان کا خاندان دہلی میں آکر آباد ہوا، ۱۸۵۷ء میں ان کے خاندان والے انگریزوں کی نظروں میں معتوب ہوئے، تو وہ بھوپال منتقل ہو گئے، وہیں محمد مسلم صاحب کی پیدائش ہوئی، نوجوانی میں اپنے اسلامی جذبہ کی بنا پر خاکسار تحریک سے متاثر ہوئے، پھر جماعت اسلامی میں شریک ہو گئے، اس حلقہ میں اپنی سوجھ بوجھ کی وجہ سے بڑے قابل قدر سمجھے جانے لگے، جب روزنامہ دعوت کے ایڈیٹر ہوئے تو صحافت نگاری میں اپنی اصابت رائے کی وجہ سے

بڑی شہرت حاصل کی، بیرون ملک کے سفر پر بھی گئے، اور جب ڈاکٹر سید محمود سابق وزیر ملکت امور خارجہ حکومت ہند نے مجلس مشاورت قائم کی تو ان کو جناب محمد مسلم کی سیاسی بصیرت پر بڑا اعتماد رہا، انھوں نے بھی اس میں اپنی مخلصانہ سیاسی سرگرمیوں سے یہ ثابت کر دکھایا کہ وہ سچے مسلمان بھی ہیں اور سچے محب وطن بھی، اس کی تفریق کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ پہلے کیا ہیں، مسلمان یا ہندوستانی، یا ہندوستانی پہلے اور مسلمان بعد میں، سچا مسلمان ہی سچا محب وطن ہو سکتا ہے، ایک طویل علالت کے بعد دہلی میں وفات پائی، انھوں نے جو پاک دل، پاک باطن، اور پاک نفس پایا تھا، ان کی بدولت امید ہے کہ وہ مغفرت الٰہی سے ضرور نوازے جائیں گے، آمین۔

ڈاکٹر سید عبد اللہ ۱۴ر اگست ۱۹۸۶ء کو لاہور میں اس عالم فانی کو چھوڑ کر عالم جاودانی کو سدھارے اس خبر کو سن کر دل کو ویسی ہی چوٹ لگی جیسے اپنے خاندان کے کسی عزیز فرد کی دائمی جدائی سے لگ سکتی تھی، ان کی رحلت سے علم و ادب کی ایک زمردیں مسند خالی ہو گئی، وہ علمی حلقوں میں عربی زبان کے قدر شناس، فارسی شعر و ادب کے رمز شناس، اردو کے عناصر خمسہ اور شعرا کے ادا شناس، علامہ محمد اقبال کے جوہر شناس، اور اپنی نظر و فکر کے نکتہ شناس کی حیثیت سے یاد کیے جائیں گے، پاکستان میں اردو کو قومی زبان بنانے میں شاہین اور عقاب بن کر جس طرح جھپٹے، پلٹے اور پلٹ کر جھپٹے اس کی یادیں بھی لوگوں کے دلوں کو گرماتی رہیں گی، ان کی تصانیف سے یونیورسٹی کے اساتذہ نے اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو سمجھ کر جس طرح طلبہ کو سمجھایا، اس کی عنبریں یادیں بھی زریں حروف سے لکھی جائیں گی، اور پھر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کی تکمیل کر کے لوگوں کی دیرینہ آرزوؤں کے کیگ زار کو جس طرح شاداب مرغزار بنا دیا، اس کی یادوں کے کنول بھی ہمیشہ کھلے رہیں گے، اور کس کو اس سے انکار ہو سکتا ہے کہ وہ علم و فن کے سیاروں میں عطارد بن کر رہے، اور ساٹھ سال کی علمی خدمت کے بعد اسی حیثیت سے رخصت ہوئے۔

میری یادوں کی شبستان میں وہ اس طرح دکھائی دیں گے کہ وہ مجھ سے مل رہے ہیں، گلے لگائے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ میں تو اپنے کو مولانا سید سلیمان ندوی کا فرزند معنوی سمجھتا ہوں ان ہی کی تحریروں سے تحقیق کرنا سیکھا ہے، میں تم سے ملتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ سگے بھائی سے مل رہا ہوں، ان کی یہ باتیں فردوس گوش بنی ہوئی ہیں، ان پر آئندہ ایک مفصل مضمون لکھ کر اپنا غم ہلکا کروں گا، ابھی تو ہر بن مو سے ان کی مغفرت کے لیے دعائیں نکل رہی ہیں۔

مقالات

قرآن اور مستشرقین

از
ڈاکٹر التہامی نقرہ صدر شعبۂ قرآن وحدیث کلیۃ الزیتون ٹیونس یونیورسٹی ٹیونس

ترجمہ:- عبیداللہ کوٹیؒ ندوی رفیق دار المصنفین

۳

حداد جب حضرت عیسیٰؑ کی ان کے رب کے یہاں حیثیت کو ثابت کرنا چاہتا ہے، تو قرآن ہی سے استدلال کرتا ہے، ان لوگوں کی طرح جو قرآن کی کچھ باتوں پر تو ایمان لاتے ہیں اور کچھ دوسری باتوں کا انکار کر دیتے ہیں، مثلاً وہ یہ کہتا ہے کہ مسلمان اگر نفرت وکینہ سے بھری ہوئی تفسیروں سے کنارہ کش ہو جائیں تو وہ یہ دیکھیں گے کہ مسیح، انجیل اور نصرانی کے بارے میں قرآنی بیانات مسلمانوں کے لیے بھی فخر و اعزاز کا سبب ہیں"۔[۱]

حداد نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ان معجزات سے بھی انکار کیا ہے جو گذشتہ نبیوں کو دیے گئے تھے،[۲] اس کے نزدیک انجیل میں حضرت عیسیٰؑ نے احمد اور فارقلیط سے متعلق جو پیشین گوئیاں کی ہیں۔ ان سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مراد لینا درست نہیں ہے،[۳] وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم

---

[۱] الانجیل فی القرآن :- الحداد، ص ۱۸۰۔ [۲] ۔۔۔ [۳] القرآن والکتاب ص ۲،۷

عام لوگوں کی طرح پیدا ہوئے، اور اللہ کی طرف سے تعلیمات کا بوجھ اتارنے اور شرحِ صدر کر دینے کے بعد ہی پاک ہوئے[1]

وہ یہ لکھتا ہے کہ "نبی امیؐ کے دل پر انجیل کا گہرا اثر تھا، ان کے ذوق و وجدان پر مسیح کی شخصیت کے اثرات بڑے دور رس تھے، مسیح کی عظمت ان کے شعور و احساس میں موجزن تھی، چنانچہ انھوں نے قرآن میں مسیح کا تذکرہ، زندۂ جاوید اسلوب میں کیا ہے"[2] لیکن پھر یہی حداد، اس کے برعکس حیرت اور تعجب کے لہجہ میں یہ سوال کرتا ہے کہ "قرآن کا سرچشمہ کیا تھا"، اور اس کے بعد اپنے سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ

> قرآن کا پہلا سرچشمہ ذات الٰہی ہے، اور یہ ایک ایمان کا مسئلہ ہے، جس کو چھیڑا نہیں جا سکتا[3]

حداد کے یہ بیانات علمی اسلوب کے لحاظ سے کس قدر پراگندہ ہیں، اس کے متضاد بیانات اور غیر علمی دعووں کو منطق اور تحقیق سے کیا نسبت ہے۔؟

تدوین قرآن | مستشرقین نے اپنی قرآنی تحقیقات میں جن اعتراضات کا ذکر کیا ہے ان میں سے ایک اعتراض نص قرآنی کے بارہ میں بھی ہے، انھوں نے اس پر اپنے عدم اطمینان کا اظہار کیا ہے، اور اس سے مختلف نتیجے اخذ کئے ہیں۔

اگر نص قرآنی پر سے اعتماد اٹھ جائے، قرآن کی روایت کرنے والوں کی دیانت مشکوک ہو جائے اور یہ شبہ پیدا ہو جائے کہ قرآن اپنی ابتدائی صورت میں، باقی نہیں رہا، تو اس کی ہدایات کی بجاآوری میں جوش، اور تعلیمات قرآنی پر عمل درآمد کا جذبہ ہی رخصت ہو جائے گا۔ اور قرآن پر ایمان و تصدیق، کے احساسات بھی کمزور پڑ جائیں گے۔ مستشرقین کی تحقیقات کا بنیادی نصب العین یہی ہے

---

[1] المسیح فی القرآن ص ۱۱۰ [2] ایضاً ص ۲۲۹ [3] القرآن والکتاب ص ۲۰۸

انھوں نے جو شبہات پیدا کئے ہیں، وہ دو بحثوں میں سمٹ جاتے ہیں، جو یہ ہیں۔

۱۔ قرآن کی کتابت اور تالیف

۲۔ قراءتوں کا فرق۔

نص قرآنی کے سلسلہ میں مستشرقین نے کئی اعتراضات کئے ہیں، قرآن کی حفاظت کے لئے جو طریقے اختیار کئے گئے، دور نبوت میں تدوین قرآن کی راہ میں ان کے خیال میں جو رکاوٹیں پیش آئیں اور پھر دیگر صحابہ کے قرآنی نسخوں سے نسخۂ صدیقی کا اختلاف، حضرت عثمانؓ بن عفان کی طرف سے نسخۂ صدیقی پر اعتماد، اور یہ دعویٰ کہ اس دور کے بعض مذہبی حلقوں نے مصحف عثمانی کو نظر انداز کر دیا تھا، یا مستشرقین کے بقول، عبدالملک بن مروان کے زمانہ میں، قرآن میں چند ترمیمیں کی گئی تھیں، یہ مسائل پہلی بحث سے تعلق رکھتے ہیں، دوسری بحث کا تعلق اختلاف قراءت سے ہے، جس پر ہم بعد میں روشنی ڈالیں گے۔

فرانسیسی مستشرق بلاشیر (Blachere) اپنے اعتدال اور معروضیت میں ممتاز سمجھا جاتا ہے، لیکن اس نے اپنی کتاب "مدخل الی القرآن" میں اپنی قرآنی تحقیقات کے ضمن میں شک و ریب کی فضا پیدا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے۔

اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نزول آیات کے وقت وحی کو تحریر میں لے آنے کی شدید خواہش پر اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا ہے، اس کے نزدیک چونکہ پہلی بار نزول وحی کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سخت خوف و اندیشہ میں مبتلا ہو چکے تھے، اس لیے یہ ممکن نہ تھا کہ آپ وحی کو لکھ لیا کرتے۔ مدینہ کے یہود، تحریر و کتابت کے وسائل پر قابض تھے، اور ان سے مسلمانوں کی کشمکش جاری رہی جس سے بلاشیر نے یہ نتیجہ نکالا ہے، کہ دور نبوت میں پورے قرآن کی کتابت نہیں ہو سکی تھی، اور حافظہ کی مدد سے بھی، قرآن کا تحفظ نہیں ہو سکا تھا، اس کے خیال میں یہ ممکن ہے کہ

قرآنی نص کے ساتھ وہ معمولی اضافے بھی خلط ملط ہو گئے ہوں، جن کو آئندہ زمانوں میں قرآن میں شامل کر دیا گیا ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عہد میں کتابت وحی کے حریص کیوں نہ تھے، یہ دعویٰ اور کتابت وحی کی خواہش نہ ہونے کے جو اسباب بیان کیے گئے ہیں وہ محض فرضی تخیلات ہیں جو درست نہیں، تحریری وسائل میں کمی و دشواری کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو یادداشت کے ذریعہ محفوظ کیا، لیکن وحی کو ضبط تحریر میں لانے پر بھی آپ نے اسی قدر توجہ دی، یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خلفاء راشدینؓ، اور ابیؓ بن کعب، زیدؓ بن ثابت، اور معاویہؓ وغیرہ جیسے نمایاں ترین صحابۂ کرام سے کتابت وحی کا کام لیا، حدیث نبوی سے وحی قرآنی کے اختلاط کے اندیشہ۔ اور تنہا قرآن ہی کے لیے تحریری وسائل کو استعمال کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء میں حدیث نبوی کو ضبط تحریر میں لانے سے منع فرمادیا تھا، چنانچہ صحیح مسلم کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ :۔

لاتکتبوا عنی غیر القرآن ومن کتب عنی غیر القرآن فلیمحہ، وحدثوا عنی ولا حرج۔	”تم لوگ میری طرف سے روایت کرتے ہوئے قرآن کے سوا کچھ اور نہ لکھو کسی نے قرآن کے سوا میری طرف سے اور باتیں لکھ دی ہوں تو وہ انھیں مٹا دے، وہ وہ باتیں میری طرف سے زبانی بیان کرو، اس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے ہی چمڑے کی کھالوں اور کھجور کی ٹہنیوں پر پورے قرآن کی کتابت مکمل ہو چکی تھی، وہ ایک مجموعہ میں یکجا نہیں ہوا تھا، لیکن اس کی وجہ

معمولی تھی، قرآن بیس برس سے زیادہ عرصہ میں، تھوڑا تھوڑا نازل ہوا تھا، اس کی ترتیب
نزول کے اعتبار سے مقرر نہیں ہوئی تھی، آخری آیت جب آپ پر نازل ہوئی تو اس کے بعد آپ
کی زندگی کے چند روز ایک مجموعہ میں قرآن کی کتابت کے لیے کافی نہیں تھے آپ نے قرآن کو سینوں میں
محفوظ کر لینے پر بھی توجہ کی لیکن اس سے قرآن کو ضبط تحریر میں لانے کی خواہش اور کوشش پر کوئی
اثر نہیں پڑا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے پاس موجود قرآن کے تحریری
مواد کو یکجا کیے جانے کا منصوبہ بنایا تو وہ قرآن کی ہر ایک تحریر کا اس قرآن کی نقل اور طریق
تلاوت سے تقابل کرتے جو لوگوں کی یادداشت میں محفوظ تھا۔ اور صرف وہی تحریری مواد قبول کرتے
جس کے بارے میں دو گواہوں نے شہادت دی ہو کہ وہ تحریر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی
میں لکھی گئی تھی۔ (ابوداؤد)

امام بخاری نے اپنی کتاب میں زید بن ثابت کی روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اہل
یمامہ کے قتل کے بعد (جس میں ۷۰ قاری شہید ہوئے تھے) ان کو بلا بھیجا، آپ کے پاس حضرت عمرؓ بن
خطاب موجود تھے، انھوں نے فرمایا کہ میرے پاس عمر حاضر ہوئے ہیں، انھوں نے یہ کہا ہے کہ یمامہ کے
دن قرآن کے قاریوں (حافظوں اور اس کے علوم کے ماہرین) کے قتل کی وجہ سے جنگ تیز ہو گئی ہے،
اور مجھے اندیشہ ہے کہ جنگ قاریوں کو ختم کر دے، اور بسہولت قرآن کو یکجا نہ کیا جا سکے، اس لیے میری
رائے یہ ہے کہ آپ قرآن کو یکجا کرنے کا حکم دیدیں، اس پر میں نے عمرؓ سے یہ کہا کہ یہ کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے نہیں کیا، پھر ہم کیوں کریں، عمر نے کہا کہ واللہ یہ اچھا کام ہے، وہ مسلسل اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ
اس کام کے لیے اللہ نے میرا شرح صدر فرمایا۔ اور اس بارہ میں، اب میں عمرؓ کا ہم خیال ہوں، زید بن
ثابت کہتے ہیں کہ ان سے حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ آپ جوان عاقل اور قابل اعتماد ہیں، رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آپ کتابت وحی بھی کرتے رہے ہیں، اس لیے تحقیق و جستجو سے قرآن مجید کو

یکجا کر دیے، زیدؓ کہتے ہیں کہ اگر لوگ کسی پہاڑ کو ادھر سے ادھر منتقل کرنے کا کام میرے سپرد کر دیتے تو جمع قرآن کی ذمہ داری کے مقابلہ میں وہ میرے لیے زیادہ دشوار نہ تھا، میں نے عرض کیا کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ آپ لوگ کیوں کر رہے ہیں؟ حضرت ابوبکرؓ بار بار مجھ سے وہی بات کہتے رہے۔ یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو جس کام کے لیے انشراح ہو چکا تھا، اس سے میرا دل بھی مطمئن ہو گیا، پھر میں نے کھجور کی شاخوں، سفید پتھروں پر لکھی تحریروں اور لوگوں کی یادداشت سے جمع قرآن کا کام شروع کر دیا۔ سورہ توبہ کا آخری حصہ (لقد جاءکم رسول من انفسکم تا ختم سورہ)، تنہا ابوخزیمہ انصاریؓ ہی کے پاس تھا، قرآن مجید کا یہ نسخہ مختلف اوراق میں ترتیب دیا ہوا، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس تھا، پھر حضرت عمرؓ کے پاس آیا پھر حضرت حفصہؓ کے یہاں۔

بلاشیر نے عہد رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں جمع قرآن نہ ہونے پر اپنے مفروضات کی یہ وجہ بتائی ہے کہ:-

> رسول اللہؐ اور آپ کے صحابہ میں تمام معاملات کو جوں کا توں رکھے جانے کا رجحان پایا جاتا تھا، اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ عربوں کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ مستقبل کی طرف سے بے فکر ہوتے اور صرف اپنے سامنے گزرنے والے زمانہ، حال ہی کے متعلق سوچ بچار کرتے ہیں، چنانچہ دور نبوت میں اسی رجحان طبع کی وجہ سے مسلمانوں نے جمع قرآن کی طرف توجہ نہیں کی کیونکہ اس وقت اس کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی، جیسا کہ انھوں نے قبل از وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین طے کرنے کی بھی فکر نہیں کی۔[1]

بلاشیر کے اس نتیجہ بحث پر جس میں کوئی دلیل نہیں پیش کی گئی ہے، ہم کو سخت حیرت ہوئی

---

[1] Introduction au Coran 16-26 (Paris 1947)

س دعویٰ کی دلیل کیونکر ممکن ہے، کہ ایک پوری قوم صرف اپنے زمانہ حال ہی کے بارے میں سوچتی

ر، ہماری رائے یہ ہے کہ ایک عربی شاعر نے اگر مثال کے طور پر یہ شعر کہا ہے کہ ؎

ما مضیٰ فات والمؤمّل غیب　　ولک الساعۃ التی أنت فیھا

(جس کام کا وقت گزر گیا وہ رہ گیا، اور جس کی توقع ہے وہ ابھی پردۂ غیب میں ہے تمہارے

لئے وہی گھڑی کام کی ہے، جس سے تم گزر رہے ہو)

تو مذکورہ بالا شعر میں ایک متعین حالت سے متعلق انفرادی شعور کا ذکر کیا گیا ہے، جس پر قومی شعور کو قیاس کرنا، یا اس کی روشنی میں پوری قوم پر کوئی حکم لگانا صحیح نہیں ہے، اپنی زندگی میں جانشین مقرر نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ پیغام الٰہی کی تبلیغ ہی آپ کا بنیادی فرض تھا، جس کی نوعیت خالص مذہبی ہے، اس میں آپ کی جانشینی کی کوئی ضرورت نہیں، اس لئے کہ آپکے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا ہے، صرف سیاسی رہنمائی اور جنگی قیادت کا ایک پہلو تھا، جو دعوت اسلامی کی نشر و اشاعت کے بے بھی زندگی کا ایک لازمی تقاضا تھا، جسکی آپنے تاکید فرمائی، یہی وجہ ہے کہ آپنے سیاسی امارت کے تصفیہ کو اپنے بعد والوں کے سپرد کر دیا، ان ہی لوگوں کو اپنے بعد بنیادی سیاسی امور کو انجام دینا تھا، آپ نے شورائی طریقہ کی تعلیم دی، حاکم کے انتخاب میں اور نظام حکومت کی ترتیب و تنظیم میں امانت و دیانت کی نگہداشت کو آپ نے اپنی تربیت کے ذریعہ ان کی زندگیوں میں محترم اور رہنما حیثیت دیدی تھی، چنانچہ قرآن و سنت میں جو نظام حکومت تجویز کیا گیا ہے، اس میں مذکورۂ بالا تمام امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

جانشین کے متعین نہ ہونے کی ایک دوسری وجہ کازانوفا (Casanova) نے اپنی کتاب[1] میں بیان کی ہے۔ لیکن ———— بلاشیر کے مقابلہ میں اس کا دعویٰ اور بھی

---

[1] محمدؐ ونہایۃ العالم Mohamed et la fin du Monde. P. 6-10

دور از کار ہے، اس کے بیان کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ یقین تھا کہ ان کے انتقال کے بعد یہ دنیا ختم ہو جائے گی، ان کے انتقال سے پہلے یا اس کے بعد فوراً ہی قیامت آجائے گی۔ اس لیے آپ نے اپنا جانشین مقرر نہیں کیا، کازانوفا لکھتا ہے کہ :۔

محمدؐ جیسے ایک عام عبقری شخص پر نظر ڈالتے ہوئے ہم غیر مسلموں کو یہ بھی وضاحت کرنی ہوگی کہ انھوں نے ایسے اہم کام (جانشینی کے مسئلہ) کی طرف کیوں توجہ نہیں کی، ہم یہ اعلان کرتے ہیں کہ خلافت کے مسئلہ کو نظر انداز کرنے کی وجہ معمولی تھی، ان کا یہ عقیدہ تھا کہ دنیا جلد ہی ختم ہونے والی ہے، حالانکہ یہ ایک خالص مسیحی عقیدہ ہے، لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے متعلق یہ دعوی تھا کہ وہی نبی آخر الزمان ہیں، جن کے بارہ میں حضرت عیسیٰؑ نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ آئے گا تاکہ ان کے پیغام کی تکمیل کرے۔"

کازانوفا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں بار بار اصرار کرتا ہے کہ آپ کو دنیا کے جلد ہی ختم ہو جانے کا یقین تھا، اس لئے کہ آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ :۔

إنی بعثت فی زمن كنت أنا والساعة كهاتين وأشار الى سبابته ووسطاه	میں ایسے زمانہ میں بھیجا گیا ہوں کہ میرے اور قیامت کے درمیان ایسا ہی فاصلہ ہے جیسے یہ دو انگلیاں، یہ کہکر آپؐ نے انگشت شہادت اور درمیانی دو انگلیوں کی طرف اشارہ فرمایا۔

وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے، کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء نے قرآن مجید میں ایسی تبدیلیاں کر دیں جن سے وہ آپ کی بعثت اور قیامت کے درمیان فاصلہ ثابت کر سکیں حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے

خیال میں جیسا کہ مؤلف کہتا ہے، بعثت نبویؐ اور قیامت دونوں متصل تھے، وہ اس تبدیلی کی ایک مثال یہ دیتا ہے کہ قرآن میں کہا گیا ہے کہ

وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (الرعد-۴۰)	اور جس بات کا ہم ان سے وعدہ کر رہے ہیں اس میں سے کچھ ہم آپ کو دکھلادیں یا اس سے پہلے ہی آپ کو وفات دیدیں، آپ کے ذمہ تو صرف احکام کا پہنچادینا ہے اور دار و گیر کرنا ہمارا کام ہے۔

کازانوفا کا گمان یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے جب دیکھا کہ قیامت نہیں آئی تو انھوں نے قرآن کے یقینی انداز بیان کو شک کے صیغہ میں تبدیل کر دیا۔ وہ یہ کہتا ہے کہ قرآنی آیت یقینی طور پر اس طرح رہی ہوگی کہ وَسَنُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ (ان سے جس چیز کا وعدہ ہے، اس کی چند نشانیاں ہم ان کو جلد ہی دکھادیں گے) مگر کازانوفا .... کا یہ خیال کیا معقول ہو کہ اللہ جو زمان و مکان کا مالک ہے ایک معمولی بات کو ٹھیک سے بیان نہیں کر سکا، وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ نبی کا انتقال جلد ہی ہو جائے گا۔ یا وہ دنیا کے خاتمہ تک زندہ رہیں گے۔ حالانکہ دراصل واقعہ یہ ہے کہ اللہ روز قیامت سے قطعی طور پر باخبر ہے، لیکن اس نے یہ نہیں چاہا کہ انسانوں کو اس کی اطلاع دی جائے۔ کازانوفا نے یہ بھی لکھا ہے۔

"مزید دو آیتیں اور بھی ہیں، جن کے وحی ... ہونے کے بارے میں شک کیا جاسکتا ہے، قرین قیاس بات یہ ہے کہ نبی کی موت کے بعد ابوبکرؓ ہی نے ان دونوں کا اضافہ کیا ہوگا۔ جس کو بعد میں مسلمانوں نے بھی منظوری دیدی، وہ دونوں آیتیں یہ ہیں۔[1] "وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ... (آل عمران ۱۴۴)

[1] اور محمدؐ تو رسول ہی ہیں۔ ان سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں ...

اور إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُم مَّيِّتُونَ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عِندَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُونَ۔ (الزمر ۳۰، ۳۱) کیا ہمیں یہ سمجھنے کا حق نہیں ہے کہ کم از کم دوسری آیت تو پورے طور پر ہی ابوبکرؓ کی ایجاد ہے۔"

مذکورہ بالا اقتباس میں اپنے جی سے .... افسانہ کو گھڑنے اور نمایاں کرنے میں اس مستشرق کو یقیناً زحمت ہوئی ہوگی، مگر ہمارے لیے اس کی وضاحت نہایت آسان ہے۔ اس مسئلہ کی وضاحت سے مؤلف کے تمام قیاسات اور نتائج ہوائی ہو کر رہ جاتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر اپنے انتقال سے پہلے ہی قیامت برپا ہونے کا یقین تھا تو آپؐ نے پرسنل لا، میراث، اجتماعی معاملات اور شخصی قومی و بین اقوامی تعلقات کی تنظیم سے متعلق وسیع طور پر قانون سازی کیونکر فرمائی۔ مدینہ طیبہ میں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اسلام کی آئندہ زندگی کا گہرا جائزہ اور اس کے بارے میں فکر مندی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ آپؐ اسلام کے بقاء اور نمو و ارتقاء پر یقین رکھتے تھے، اور سنت الٰہی کے مطابق فنا و زوال سے پہلے اپنی بصیرت کی وجہ سے مستقبل میں اس کے عروج و ارتقاء کو قطعی جانتے تھے۔

کاز انوفا ہی کی طرح دور نبوت میں بھی مخالفین کا ایک گروہ موجود تھا، جو مخالفت کی آگ سے ہر وقت شعلہ بدہن رہتا تھا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا، اور قیامت نہیں آئی، تو کاز انوفا کا فریب کارانہ جھوٹ انھیں یاد نہیں آیا، حالانکہ وہ اعتراضات کے لیے ہر وقت مستعد رہتے تھے، اور اپنی آتش غضب کو بھڑکانے کے لیے کسی بھی موقع کو کھونا نہیں چاہتے تھے، حضرت ابوبکرؓ نے قرآن میں کچھ ترمیم کی تھی، یا اس میں کچھ اضافہ کیا تھا، تو اس پر صحابۂ کرام نے کیونکر خاموشی

سلہ (ترجمہ)۔ آپ کو بھی مرنا ہے، اور ان کو بھی مرنا ہے، پھر قیامت کے دن تم مقدمات اپنے رب کے سامنے پیش کروگے (اس دن عملی فیصلہ ہو جائے گا)

اختیار کرلی اور کوئی اعتراض نہیں کیا۔ کیا قرآن مجید میں ترمیم اور تحریف کی جرأت وہ شخص کرسکتا ہے،
جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق کا لقب دیا ہو۔ اور جس نے خود اپنے بارے میں یہ کہا ہو کہ

أی سماء تظلنی وأی أرض | مجھے کون سا آسمان سایہ دے گا
تقلنی ان قلت فی القرآن | اور کون سی زمین میرا بوجھ اٹھا سکے
بس أیی ؟ | گی، اگر میں قرآن کی تفسیر میں اپنی
 | ذاتی رائے سے دخل دوں ؟

مؤلف نے جن حیلوں کا ذکر کیا ہے کیا دور اول کے سب ہی مسلمان بالکل ہی سادہ لوح تھے،
کہ وہ ان کا شکار ہو گئے۔[1] کازانوفا نے جو باتیں کہی ہیں، ان کے جواب میں کئی سوالات ابھر کر
سامنے آتے ہیں، اس کے بیان کردہ اوہام کی قلعی کھل جائے گی، اگر ہم اصل واقعات کو ایک
نظر دیکھ لیں، یہ نظریہ کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق دنیا میں انسانی زندگی
کا جلد ہی خاتمہ ہونے والا تھا، لیکن جب ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ زندگی جلد ختم ہونے والی
نہیں ہے تو انھوں نے قرآن کے جمع و تالیف کا کام شروع کر دیا۔ مؤلف نے جس آیت سے
استدلال کیا ہے، وہ مشرکین مکہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی، جس کی تفسیر یہ ہے کہ ہم نے ان سے
جس دنیاوی عذاب کا وعدہ کر رکھا ہے، وہ ہم ان پر آپ کی زندگی ہی میں بھیج دیں یا اس سے
پہلے ہی آپ کا انتقال ہو جائے آپ کو اس سے کچھ غرض نہیں، آپ کی ذمہ داری تو یہ ہے کہ پیغام
پہنچا دیں۔ اور دین کی امانت ان کے سپرد کر دیں، اور بس، ہم ان کے لئے کافی ہیں، ہم نے آپ سے
کامیابی اور نصرت کا جو وعدہ کر رکھا ہے، اس کو ہم پورا کریں گے، اس کی تاخیر چند مصلحتوں کی وجہ
سے ہوسکتی ہے جو اگرچہ نظروں سے اوجھل ہیں لیکن ہم ان کو جانتے ہیں اس لئے آپ تنگ دل نہ ہوں۔[2]

---

[1] نظرات استشراقیہ فی الاسلام از محمد غلاب ص ۹۹ - ۱۱۳ [2] اس آیت کی تشریح کے لیے دیکھئے تفسیر ندوی

مولف نے ایک اور آیت میں "یقین" کے لفظ سے قیامت کو مراد لیا ہے، قرآن مجید میں ہے :-

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ (الحجر ۹۹)	اور موت کے آنے تک اپنے رب کی عبادت کرو۔

اس نے جو معنی لکھے ہیں، اس کی عربی زبان و لغت سے تردید ہوتی ہے، کسی مفسر نے بھی یہ معنی نہیں لکھے ہیں، اس لفظ سے مراد موت ہے۔ حضرت ابن عمرؓ، حسنؓ اور قتادہ سے یہی منقول ہے، موت کو یقین اس لیے کہا گیا ہے، کہ وہ یقینی ہے، ہر متنفس کو اس سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اس کے آنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر جاندار تک پہنچنے کے لیے رواں دواں ہے، اس لیے آیت قرآنی کا مفہوم یہ ہے کہ جب تک زندگی ہے اللہ کی عبادت میں لگے رہو، اس میں کوتاہی نہ ہو۔

سورۃ آل عمران کی آیت (وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ) اس وقت نازل ہوئی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کی خبر پھیل گئی، اور یہ مشہور ہو گیا کہ آپ کا قتل ہو گیا ہے، اس موقع پر منافقوں نے مسلمانوں سے یہ کہا کہ اگر محمدؐ کا قتل ہو گیا ہو تو تم اپنے پہلے دین کی طرف واپس آجاؤ، اس پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی۔

آیت (اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ....) کے معنی یہ ہیں کہ شرک کے علمبرداروں نے دنیوی حرص و حسد کی وجہ سے اگرچہ واضح دلیلوں کی طرف توجہ نہیں کی، لیکن اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ اس بات پر فکرمند نہ ہوں، کیونکہ آپ کا بھی انتقال ہوگا۔ اور ان پر بھی موت آئے گی، پھر قیامت کے دن سب کو یکجا کیا جائے گا، جہاں اللہ کی بارگاہ میں پیشی ہوگی، اور وہ فیصلہ کرے گا۔ تب باطل کے درمیان حق کا چہرہ نمایاں ہو جائے گا۔ ان دونوں آیتوں سے کسی ترمیم یا صورت حال میں تبدیلی یا کسی نئے مفہوم کے اضافہ کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا ہے کہ جس کی وجہ

بے سروپا اندیشوں اور بے بنیاد اندازوں کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ حضرت ابوبکرؓ نے ان دونوں آیتوں کو اپنی طرف سے شامل کر دیا ہے، قرآن مجید میں قیامت کی ہولناکیوں کا جو تذکرہ ہے اس میں قیامت کے روز پیش آنے والے واقعات کی ایسی منظر کشی کی گئی ہے، جس سے قرآن کے حسن بیان اور اس کے معجزانہ اسلوب کی جلوہ گری ہوتی ہے، یہ اسلوب خاص طور پر مکی سورتوں میں اختیار کیا گیا ہے، جن میں مشرکین کو آگاہی دی گئی ہے، اور سرکشوں کو اس وقت سے ڈرایا گیا ہے جو گویا ان ہی کے انتظار میں ہے، اور جس کو دیکھ کر خوف اور دہشت کی وجہ سے جوانوں پر بھی بڑھاپا طاری ہو جائے گا۔

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ وَ
أُمِّهِ وَأَبِيهِ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ
لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ
شَأْنٌ يُغْنِيهِ (عبس ۸۰: ۳۴-۳۷)

جس دن دور ہوگا آدمی اپنے بھائی سے
اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے اور
اپنی بیوی سے اور اپنی اولاد سے بھاگے گا،
اس دن ہر شخص کو اپنا ہی کام ہوگا جو اس کو
دوسری طرف متوجہ نہ ہونے دے گا۔

قرآن کا ایک خاص اسلوب یہ ہے کہ وہ دنیا کے بارے میں اس طرح گفتگو کرتا ہے، گویا کہ وہ گزر چکی ہو، اور آخرت کی منظر کشی اس انداز میں کرتا ہے گویا وہ زمانہ حال کی چیز ہے، اور اس کے مناظر نگاہوں کے سامنے سے گزر رہے ہیں، اس اسلوب بیان سے دل و دماغ پر نہایت ہی گہرا اثر پڑتا ہے۔ مثلاً درج ذیل آیتیں:۔

وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ
زُمَرًا حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا فُتِحَتْ
أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا

اور جو کافر ہیں وہ جہنم کی طرف گروہ گروہ
بنا کر ہانکے جائیں گے یہاں تک کہ جب
دوزخ کے پاس پہنچیں گے تو اس کے

أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَتْلُونَ	اس کے دروازے کھول دیے جائیں گے
عَلَيْكُمْ آيَاتِ رَبِّكُمْ وَيُنذِرُونَكُمْ	اور ان سے دوزخ کے محافظ کہیں گے
لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا قَالُوا بَلَىٰ	کہ کیا تم لوگوں کے پاس تم ہی لوگوں
وَلَٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ	میں سے پیغمبر نہیں آئے تھے، جو تم کو تمہا
عَلَى الْكَافِرِينَ۔	رے رب کی آیتیں پڑھ کر سنایا کرتے تھے اور
(الزمر - ۷۱)	تم کو اس دن کے پیش آنے سے ڈرایا
	کرتے تھے کافر کہیں گے کہ ہاں لیکن عذاب کا"

قرآن دنیا و آخرت کو اس طرح پیش کرتا ہے گویا کہ وہ ہمارے سامنے موجود ہیں، کبھی گفتگو کا انداز اختیار کرتا ہے۔ تو کہیں بیان واقعہ کا۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ واقعات پیش آ رہے ہیں اور دونوں کی مناسبت سے موقع و محل کے مطابق اللہ تعالیٰ اپنے احکام جاری فرماتا جاتا ہے۔ قرآن میں ہر موقع کی مثالیں موجود ہیں جن کو استاد سید قطب کی کتاب مشاہد القیامہ فی القرآن میں تفصیل سے دیکھا جا سکتا ہے۔[1]

قرآن کے معجزانہ اسلوب، اس کی منظر نگاری اور واقعات کی سچی تصویر میں جو فنی حسن اور غیر معمولی اثر ہے، کا ادراک اس کے ادراک سے عاجز ہے، قرآن میں ایک جگہ یہ کہا گیا ہے کہ

إِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيدًا وَنَرَاهُ	یہ لوگ اس دن کو دور سمجھتے ہیں اور
قَرِيبًا يَوْمَ تَكُونُ السَّمَاءُ كَالْمُهْلِ	ہم اس کو قریب جانتے ہیں، وہ عذاب
وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ وَلَا	اس دن آئے گا جب کہ آسمان پگھلے
يَسْأَلُ حَمِيمٌ حَمِيمًا يُبَصَّرُونَهُمْ	کی طرح ہو جائے گا اور پہاڑ دھنکے ہوئے

---

[1] مشاہد القیامۃ فی القرآن۔ ص ۴۰ - ۴۱۔

يُوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ
يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ
وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيهِ وَمَنْ
فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنْجِيهِ
(المعارج ۱۲-۱۴)

(حالانکہ) وہ ایک دوسرے کو دکھا بھی دیئے جائیں گے۔ اس دن مجرم اس بات کی تمنا کرے گا کہ اس دن کے عذاب سے چھوٹنے کے لیے اپنے بیٹوں کو، بیوی کو، بھائی کو اور کنبہ کو جن میں وہ رہتا تھا، اور تمام اہل زمین کو اپنے فدیہ میں دیدے، پھر یہ فدیہ اس کو (عذاب سے) بچالے۔

(پہلی سطر: ...بھی اور ان کی طرح ہو جائیں گے، کوئی دوست کسی دوست کو نہ پوچھے گا،)

کاززانوفا نے مذکورۂ بالا آیتوں سے جو نتیجہ نکالا ہے وہ دراصل خود اس کی عقل کی پیداوار ہے، اس کے خیال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن کو اپنی بعثت سے وابستہ سمجھتے تھے، جب کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آثار قیامت کی بھی اپنی احادیث میں کثرت سے خبر دی ہے، مثلاً مہدی کا ظہور، دجال کا خروج، حضرت عیسیٰ کی دوبارہ آمد، یاجوج وماجوج کا خروج، دابۃ الارض کا نکلنا، اور مغرب سے سورج کا طلوع وغیرہ، ان احادیث کے سرسری مطالعہ ہی سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قیامت کے بارہ میں وہ خیال نہیں تھا، جو کاززانوفا نے بیان کیا ہے، بلاشیر کو بھی اس بات کا احساس ہے کہ کاززانوفا اپنے حق میں مضبوط دلیلیں پیش نہیں کرسکا جس کی وجہ سے اسے مسلمان محققین کی حمایت حاصل نہیں ہوئی اس کے برخلاف یہ حقیقت زیادہ واضح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں اگرچہ قیامت اور جنت و دوزخ کا زیادہ تذکرہ کیا ہے، لیکن مدینہ میں مسلمانوں کی حالت جب زیادہ مستحکم ہو گئی تو آپ نے عبادات

معاملات اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات کی تنظیم نو کی دعوت دی جو بیسویں صدی میں اشاعت اسلام کی وجہ سے بھی مسلمانوں پر یہ ذمہ داری عائد ہو گئی تھی کہ وہ اخلاقیات کے بارے میں غور و فکر کرنے کے ساتھ ہی دنیوی زندگی کی طرف بھی توجہ کریں لیکن یہ واضح رہے کہ جو آدمی آخرت کے لیے فکر مند ہوگا۔ اس کی فکر کا دائرہ عمل (دنیا) ہی تک محدود نہیں ہوگا۔

بلاشیر نے اپنی کتاب "القرآن" میں شعوری یا غیر شعوری طور پر کازانوفا کی ہمنوائی کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ

"نئے نبی کے پہلے ہی تجربہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ نذر الہٰی کا اللہ پر براہ راست ان کے تخیل پر زمینی حادثہ (قیامت) کا تصور غالب تھا، دنیا کے خاتمہ اور آخری محاسبہ کا تصور، اور یہ احساس کہ قیامت کا زمانہ بہت زیادہ قریب ہے اور انسانوں پر اس کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں، بس ایک زبردست دھماکہ ہوگا جو گنہگاروں کو اپنی گرفت میں لے لیگا۔"

بلاشیر کے یہ خیالات کازانوفا کے ماخوذ ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مستشرقین مقام نبوت سے بے خبر ہیں، وہ قرآن کو بھی دوسری آسمانی کتابوں کی طرح انسانی دستاویز قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ درست نہیں، بائبل کی کتابت حضرت موسیٰؑ و حضرت عیسیٰؑ کے دور میں نہیں ہوئی، انجیل کو حضرت عیسیٰؑ کے بعد حواریوں نے لکھا تھا اسکے لیے مستشرقین ان کتابوں پر نقد و تبصرہ کرتے رہتے ہیں، لیکن قرآن اپنے لفظ و معنیٰ کے لحاظ سے کلام الہٰی ہے اس کا حکم شدہ ہے ۔ . . . . جب کہ بائبل کے صرف ترجمے پائے جاتے ہیں اور اسی پر وہ قرآن کو بھی نعوذ باللہ من ذالک قیاس کرتے ہیں، اور یہی سبب ہے کہ وہ ظنون و اوہام کی وادیوں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔

(باقی)

سیرۃ النبیؐ جلد سوم

پر

کچھ اعتراضات اور ان کے جوابات

از ضیاء الدین اصلاحی

(۲)

سید صاحبؒ نبوت کے اصل آثار و علامات کی اہمیت واضح کرنے کے لئے متعدد مثالیں بھی پیش کرتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں کہ

"گو پیغمبر کا اصل معجزہ اور اس کے منجانب اللہ ہونے کی مکمل نشانی خود اس کا سرتاپا وجود ہوتا ہے، دیکھنے والوں کے لئے اس کے چشم و ابرو میں اور سننے والوں کے لئے اس کے لب و لہجہ میں اور سمجھنے والوں کے لیے اس کے پیام و دعوت میں، اعجاز ہوتا ہے۔ ... انبیاءؑ کے تبعین میں سے سابقین اولین اور صدیقین و صالحین نے اپنے پیغمبروں سے معجزہ طلب نہیں کیا، حضرت ہارونؑ و یوشعؑ نے حضرت موسیٰؑ کا معجزہ دیکھکر ان کو پیغمبر نہیں تسلیم کیا تھا، حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں نے انکا معجزہ دیکھکر آسمانی ذات کا مزہ نہیں پایا تھا، حضرت خدیجہؓ سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں، مگر چاند کے دو ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھکر نہیں، بلکہ یہ جان کر کہ آپ عزیزوں کے دستِ بازو ہیں، قرضداروں کی تسکین اور سہارا ہیں، مسافروں کے ملجا و ماویٰ ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ اور دیگر اصحابِ کبار رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک نے بھی آپ کی صداقت

اور راستی کی حقیقت کو ظاہری آیات و معجزات کی روشنی میں تلاش نہیں کیا، ان کے لئے آپ کا سرتاپا وجود، نفس دعوت حق اور پیام اخلاص ہی معجزہ تھا۔ انھوں نے اس کو دیکھا اور اسی سے ایمان کی دولت پائی، مگر نمرود و فرعون اور ابوجہل و ابولہب جو آتش خلیلؑ، طوفان نیل، قحط مکہ اور انشقاق قمر کے معجزوں کے طالب تھے۔ پھر بھی ایمان کی دولت عظمیٰ سے محروم رہے۔" (سیرۃ النبیؐ جلد سوم۔ ص ۵۰۰)

سید صاحبؒ مزید واقعات کی روشنی میں بتاتے ہیں کہ عہد نبویؐ میں جو لوگ اہل نظر تھے وہ انہی علامات کی تلاش کرتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں۔

"بنی اسرائیل سے بڑھکر عرب میں علامات الٰہی کا راز داں کوئی اور نہ تھا، سیکڑوں یہودی متشککانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، امتحانات لئے، تجربات کئے مگر ان کا امتحان و تجربہ کیا تھا۔ یہ تھا کہ وہ آپؐ کے اخلاق کی آزمائش کرتے تھے، ان میں سے کسی نے آکر آپ سے خارق عادت معجزہ کا مطالبہ نہیں کیا، کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ یہ تماشے بظاہر اور لوگ بھی دکھا سکتے ہیں، اور یہ خوارق نبوت کی باطنی اور اندرونی علامات نہیں ہیں، آنے والے نبیؐ کی بشارتیں اور صفتیں توراۃ اور انجیل دونوں میں مذکور تھیں لیکن ان میں سے کسی میں بھی صاحب خوارق ہونا اور ظاہری معجزات دکھانا اس کی صفت نہیں بتائی گئی تھی۔ بلکہ توراۃ میں اس کے اوصاف یہ بتائے گئے تھے، کہ وہ فاران سے طلوع ہوگا، دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آئے گا، اس کے ہاتھ میں آتشیں شریعت ہوگی۔ وہ غریبوں اور مسکینوں کا مددگار ہوگا اور بدکاروں کو جنگی مرد کے مانند ہلاک کرے گا۔ وہ عبادت گذار اور خدا کے احکام کا مطیع ہوگا، مختون قوم (عرب) میں پیدا ہوگا، انجیل نے بتایا تھا، کہ وہ تسلی کی روح ہوگا، وہ مسیحؑ کی نامکمل تعلیم کی تکمیل کرے گا، خدا کی زبان اس کے منھ میں ہوگی، سیکڑوں یہود و نصاریٰ

آپؐ کی خدمت میں آئے اور انھوں نے آپ کی نبوت کا امتحان لیا مگر امتحان کے پرچہ میں مادی معجزات کا سوال شامل نہ تھا۔ بلکہ عام علمی اور مذہبی باتوں کی نسبت استفسار تھا۔

قرآن مجید میں اہل کتاب کے متعدد اعتراضات اور سوالات مذکور ہیں، مگر ان میں سے ایک میں بھی یہ نہیں کہ ہم کو اپنی نبوت کی صداقت کے ثبوت میں کوئی خارق عادت تماشا دکھاؤ بلکہ وہی سوالات کرتے تھے۔ جن کو پیغمبر کے علم و عمل یا تعلیم و تزکیہ سے تعلق تھا"

(سیرۃ النبیؐ جلد سوم صفحہ ۲۲۲ تا ۲۲۴)

مصنف سیرت نے قیصر روم اور ابوسفیان کا مکالمہ نقل کرکے دکھایا ہے کہ قیصر کے تمام سوالات صرف پیغمبر کے حقیقی آثار و علامات سے متعلق تھے، ان میں سے ایک سوال بھی ایسا نہ تھا۔ جس میں یہ مذکور ہو کہ یہ مکہ کا مدعی نبوت کوئی معجزہ بھی پیش کرتا ہے، حالانکہ اگر نبوت کی حقیقی علامت خوارق عادت ہوتے تو سب سے پہلے عیسائی قیصر کو یہی سوال پوچھنا چاہئے تھا۔

نجاشی کے دربار میں حضرت جعفرؓ کی تقریر کا حوالہ دیکر بتایا ہے کہ اس میں آپؐ کی مقدس تعلیم و ہدایت کا تو ذکر ہے۔ مگر آپ کے خوارق عادت کا کوئی تذکرہ نہیں۔

کیا ان واقعات اور مثالوں سے ثابت نہیں ہوتا کہ معنوی معجزات زیادہ اہم ہیں، مگر مولانا بدر عالم کو اس سے مغالطہ ہوگیا کہ سید صاحبؒ نے حسی و ظاہری معجزات کی اس طرح اہمیت کم کر دی ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے، سید صاحبؒ کا اصل مقصد نبوت کے اصلی آثار و علامات کی اہمیت دکھانا ہے، اس کو جس مدلل انداز میں واقعات اور مثالوں کے ذریعہ انھوں نے ثابت کیا ہے۔ اس کو غلط قرار دینے کی طرف مولانا بدر عالم کی توجہ نہیں گئی، لیکن انھوں نے یہ اعتراض کر دیا کہ معنوی معجزات کی اہمیت بڑھا دینے سے ظاہری معجزات کی اہمیت کم ہوگئی، معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سیرت کا بغور مطالعہ نہیں کیا اور نہ سید صاحبؒ نے ظاہری اور حسی معجزات کی اہمیت پوری طرح تسلیم کی ہے

چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ ان سے ظاہر ہو گا کہ سید صاحبؒ نے معنوی آثار و علامات کو اہم قرار دیا ہے، مگر حسی معجزات کی نہ جو ملکو کھلی کی ہے۔ اور نہ انھیں غیر اہم قرار دیکر اعجاز کو خالی بتایا ہے، اور نہ ان کے انکار و تحریف کے مرتکب ہوئے ہیں، حسی اور مادی معجزات کی اہمیت ظاہر کرتے ہوئے سید صاحبؒ رقمطراز ہیں۔

انبیاء ورسل اپنے اپنے وقت میں مبعوث ہو کر قوموں کو دعوت دیتے ہیں، قومیں ان کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہیں، منکرین ہلاک اور مومنین کامیاب ہوتے ہیں، اس روحانی جہاد میں انبیاء ورسل سے ہمارے علم و دانش سے بالاتر اعمال صادر ہوتے ہیں، اور ان سے عجیب عجیب خوارق ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ (ص) نبوت کی روح اعظم اذن الٰہی سے سارے عالم جسمانی پر حکمراں ہو جاتی ہے، اور روحانی دنیا کے سنن و اصول عالم جسمانی کے قوانین پر غالب آجاتے ہیں، اس لئے وہ چشم زدن میں فرش زمین سے عرش بریں تک عروج کر جاتی ہیں، سمندر اس کی ضرب سے تھم جاتا ہے، چاند اس کے اشارہ سے دو ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ اس کے ہاتھوں کی دی ہوئی چند خشک روٹیاں ایک عالم کو سیر کر دیتی ہیں۔ اس کی انگلیوں سے پانی کی نہریں بہتی ہیں۔ اس کے نفس پاک سے بیمار تندرست ہو جاتے ہیں، اور مُردے جی اٹھتے ہیں، وہ تنہا مٹھی بھر خاک سے پوری فوج کو تہہ و بالا کر دیتا ہے، کوہ و صحرا، بحر و بر، جاندار و بے جان بحکم الٰہی اس کے آگے سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ (ص)

سید صاحبؒ کے نزدیک حقیقت شناس مومنین صادقین کے لیے اگرچہ مادی معجزہ کی ضرورت نہیں ہوتی اور معاندین معجزہ طلب کرنے کے باوجود بھی ایمان کی دولت سے محروم رہتے ہیں تاہم قدرت الٰہی آخری حجت کے طور پر ان کے سامنے معجزات اور خوارق عادات بھی پیش کر دیتی ہے، علاوہ ازیں ان دونوں کے درمیان ایک اور طبقہ بھی ہوتا ہے جس کے لیے معجزات

دخوارق کی ضرورت واہمیت مسلّم ہے مصنف سیرت لکھتے ہیں۔

"جو لوگ احساس حقیقت میں فروتر ہوتے ہیں، ان کو اس سے (نبی کے معجزانہ پیام و دعوت سے) تسکین نہیں ہوتی اور وہ مادی اور محسوس نشانیوں کے طلب گار ہوتے ہیں۔ جو بالآخر ان کو دی جاتی ہیں" (صہ ۲)، ایک درمیانی طبقہ بھی دنیا میں موجود رہا ہے جس کی بصیرت کے آئینہ پر غفلت کے زنگ کی کچھ کچھ جھائیں پڑی ہوتی ہیں جب حقیقت کا آفتاب طلوع ہوتا ہے، اور اس کی معجزانہ کرنیں ان آئینوں پر پڑتی ہیں تو وہ چمک اٹھتے ہیں، اور اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى (طٰہٰ - ۳) پکار اٹھتے ہیں۔ فرعون کے ساحروں نے حضرت موسیٰؑ کے معجزہ کو دیکھا تو موسیٰ و ہارون کے خدا کے آگے سجدہ میں گر پڑے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فتح روم کی پیشین گوئی پوری ہوئی، تو قریش کے نیک طبع لوگوں کی چشم باطن کھل گئی۔ اور حقیقت کا جلوہ ان کے سامنے جلوہ نما ہوگیا۔ یہی طبقہ ہے جس کو معجزات کی ظاہری نشانیوں سے بقدر استعداد حصہ پہنچتا ہے۔" (صہ ۵)

مادی اور حسی معجزات کی اہمیت سید صاحبؒ کے نزدیک اس لحاظ سے بھی ہے کہ

"اس کے علاوہ معجزات کا بڑا حصہ موید ات یعنی تائید حق کے لیے غیر منتظر اور غیر متوقع حالات کا رونما ہونا ہے، مومنین صادقین کو مشکلات کے عالم اور اضطراب کی گھڑیوں میں ان کے ذریعہ سے تسکین دی جاتی ہے۔ اور رسوخ ایمان اور ثبات قدم مرحمت ہوتا ہے، ان کی بے سروسامانیوں اور بے نوائیوں کی مکافات کی جاتی ہے اور اس سے ان کی دولت ایمانی کا سرمایہ ترقی کرتا ہے۔" (صہ ۷)

"اپنا مقدس فرض ادا کرنے میں اگرچہ کبھی کبھی انبیاء علیہم السّلام کو مادی آلات سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ لیکن وہ لوگ اکثر اپنی روحانی طاقت سے اس مقصد میں کامیاب

ہوتے ہیں۔ اور مادی آلات کے استعمال میں بھی ان کے جسمانی دست وبازو سے زیادہ ان کے روحانی دست بازو کام کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے انبیاء علیہم السلام کے واقعات زندگی میں ان دلائل وآیات کو نہایت اہمیت دی ہے۔" (صفحہ ۸۰)

آپ کے اخلاق وعادات معجزہ تھے۔ آپ کی شریعت معجزہ تھی، آپ پر جو کتاب نازل ہوئی اس سے بڑا کوئی معجزہ نہیں ہوسکتا تھا۔ ان کے علاوہ آپ کی روحانی طاقت نے جسم و روح دونوں کی کائنات میں بہت کچھ اثر ڈالا، اس نے کبھی طوبیٰ کے سایہ میں آپ کے لیے بستر لگایا، کبھی سدرۃ المنتہیٰ کے حدود میں رفرف کی سواری کھڑی کی، کبھی ماکذب الفواد کے نور سے قلب مبارک کو منور کیا، اور کبھی مازاغ البصر کے سرمہ سے آپ کی آنکھوں کو روشن کیا، کبھی نزول رحمت الٰہی کے لیے آسمان کے دروازے کھولے، کبھی وادی حق کے پیاسوں کے لیے زمین کی تہہ سے پانی کے چشمے ابالے، کبھی سنگ خارا کے شراروں کی روشنی میں قیصر وکسریٰ کے خزانے دکھائے، کبھی انبیائے سابقین علیہم السلام کی زبان الہام سے اپنی کامیابی کے نغمہ ہائے بشارت سنائے۔ اور آیندہ دنیا کے واقعاتِ غیب بتا کر رہروان عالم کو منزل حقیقت کے نشان دکھائے۔" (ص ۹) جہاد کے میدان میں آپ کو جو فتوحات عظیم حاصل ہوئیں۔ ان میں انسانوں کے لشکر اور سپاہیوں کے تیغ وخنجر سے زیادہ فرشتوں کے پرے، دعاؤں کے تیر، توکل علی اللہ کے سپر، اعتماد علی الحق کی تلوار کام کرتی نظر آتی تھی، آپ کی زندگی کا سب سے بڑا فرض اسلام کی اشاعت ہے، اور روئے انور نے، نگاہ کیمیا اثر نے، تقریر دلپذیر نے، اخلاق اعجاز نما نے آیات ودلائل بن کر بہت سے لوگوں کو مشرف بہ اسلام کیا ہے، غرض آپ کی پیغمبرانہ زندگی کے ہر منظر میں یہ براہین، یہ آیات، یہ معجزات، اسباب ظاہری کے پہلو بہ پہلو اسباب حقیقی بن کر رونما

ہوتے رہے ہیں" (صلا)

معنوی معجزات کی اہمیت بیان کرتے ہوئے وہ ظاہری حسی معجزات کی اہمیت بھی بیان کرتے ہیں۔ اور انھیں انبیاء کے سوانح کا جز ثابت کرتے ہیں۔

لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انبیاء ظاہری آیات اور مادی نشانات سے خالی ہوتے ہیں، تمام انبیاے کرام کی سیرتیں بیک زبان اس کی تصدیق کرتی ہیں کہ باطنی آیتوں کے ساتھ ان کو ظاہری حصہ بھی ملتا ہے، قرآن مجید نے اکثر انبیاء کے سوانح و واقعات کے ضمن میں ان کے ظاہری آثار و دلائل کو بھی بہ تفصیل بیان کیا ہے۔" (صلا۲۴۲)

ایک اور بحث کے ضمن میں سید صاحبؒ ارشاد فرماتے ہیں۔

" انبیاء کے بعض معجزات کا اثر صرف علم و یقین پر پڑتا ہے۔ ان سے کوئی عملی نتیجہ مترتب نہیں ہوتا، ہاتھ کا چمک اٹھنا، عصا کا سانپ بنجانا، چاند کا شق ہو جانا۔ گرچہ نہایت عظیم الشان معجزے ہیں، لیکن اس کا نتیجہ صرف اس قدر ہے کہ ایک گروہ ایمان لایا، اور دوسرے نے انکار کیا۔ لیکن انبیاؑ کے بہت سے معجزات ایسے ہوتے ہیں، جن سے نہایت عظیم الشان عملی نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً عصا کے سانپ بن جانے سے بنو اسرائیل کو کوئی عملی فائدہ نہ پہنچ سکا، لیکن اس کے ذریعہ سے پانی کا جو چشمہ ابلا وہ ان کے لئے حیات بخش ثابت ہوا، پہلی قسم کے معجزات کو قرآن میں حجت، برہان اور سلطان کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہو۔ کہ ان سے علم و یقین کو ترقی ہوتی ہے، اور دوسری قسم کے معجزات کو اس نے تائید اور نصر آلہی کہا ہے، پہلی قسم کے معجزات طلب اور سوال کے محتاج ہوتے ہیں، لیکن تائید اور نصر آلہی اس کی پابند نہیں ہوتی۔"

آغاز نبوت میں چونکہ انبیاء صرف عقائد کی تعلیم دیتے ہیں۔ اور کفار کی طرف سے

ان ہی عقائد کا انکار کیا جاتا ہے، اور ان ہی کے اثبات پر دلیل طلب کی جاتی ہے اس لئے اول اول انبیاء سے اسی قسم کے معجزات کا ظہور ہوتا ہے، جن کا اثر صرف علم و یقین پر پڑ سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کو اسی قسم کے دو معجزے دیکر فرعون کے پاس بھیجا اور اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار قریش کو معجزۂ شق القمر دکھایا، لیکن اس کے بعد انبیاء کی تعلیم و ہدایت سے مومنین مخلصین کا ایک گروہ پیدا ہو جاتا ہے جو عموماً مفلوک الحال، خانہ بدوش، بے سروسامان اور بے یار و مددگار ہوتا ہے، یہ گروہ اگرچہ صفائے باطن، خلوص نیت اور شدت ایمان کی بنا پر کسی معجزہ کا خواستگار نہیں ہوتا. تاہم تائید الٰہی خود اس کی طلب گار ہوتی ہے۔ اور ہر موقع پر اس کی حفاظت و حمایت کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ تائیدات الٰہیہ کا ظہور اکثر بغیر طلب و سوال کے ہوتا ہے، مسلمانوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی معجزہ کا سوال نہیں کیا، لیکن آپ سے اکثر معجزات کا ظہور ان ہی کے درمیان ہوا، بالخصوص غزوات میں اکثر تائید الٰہی نے مسلمانوں کی کی ہے، غزوۂ بدر و حنین میں فرشتوں کا آسمان سے نازل ہونا، تھوڑے سے زاد راہ کا تمام فوج کے لیے کافی ہونا، آپ کی انگلیوں سے پانی کا نکلنا، یہ اور اس قسم کے بہت سے معجزات، غزوات ہی کے زمانہ میں آپ سے ظہور پذیر ہوئے۔ اور ان سے تمام مسلمانوں نے ایسی حالت میں فائدہ اٹھایا۔ جب کہ تمام دنیوی اسباب و وسائل منقطع ہو چکے تھے۔

(سیرۃ النبیؐ جلد ۳۔ صـ ۲۹۶)

غرض سید صاحبؒ کے نزدیک مادی نشانات کی اہمیت مسلم ہے۔ اور وہ ان کے بارے میں کسی شک و شبہ میں مبتلا نہ تھے، معجزۂ شق القمر کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"ہدایت کی ان نشانیوں میں کفار مکہ کے لیے سب سے آخری اور فیصلہ کن نشان

شق قمر تھا، جس کے بعد آیات ہلاکت کا آغاز ہونے والا تھا، احادیث بتاتی ہیں کہ کفار مکہ آپ سے معجزہ کے طالب تھے تو آپؐ نے ان کو شق قمر کا معجزہ دکھایا، چاند دو ٹکڑے ہو کر نظر آیا۔" (سیرۃ النبیؐ جلد سوم۔ صہ ۲۹۵)

اوپر کے اقتباس کو ملاحظہ کرنے کے بعد ناظرین خود فیصلہ کریں کہ کیا معترض نے جو یہ اعتراض کیا ہے کہ سید صاحبؒ نے معجزے کی اہمیت گرائی اور اس کی بوقلمونی اور اعجاز کا انکار کیا ہے، وہ کس حد تک صحیح ہے۔

سیرۃ النبیؐ اور معجزات کی تقلیل | مولانا بدر عالم صاحب کا خیال ہے کہ سیرۃ النبیؐ میں معجزات کی تعداد کم سے کم بتائی گئی ہے لکھتے ہیں :۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات سے ذوق نہ رکھنے والے اصحاب پر یہ عدد (ایک ہزار سے تین ہزار تک) بھی گراں ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ آپ کے معجزات میں صرف آپ کے اخلاق و شمائل ہی کا ایک باب نظر آئے۔ اور دوسرے عجائبات جو ہر نبی کی زندگی میں ثابت ہوتے ہیں وہ یہاں سے قلم زد کر دیے جائیں ورنہ کم از کم ان کو پھیکا ضرور کر دیا جائے انا للہ (ترجمان السنہ۔ جلد چہارم۔ صہ ۹) افسوس ہے کہ آج مذکورۂ بالا عدد بھی ہماری نظروں میں کھٹکتا ہے۔ اور خرق عادت کا تو سر پر اس طرح سوار ہے کہ مستند سے مستند معجزات میں بھی ہمارا قلم کتر بیونت کی مقراض لگائے بغیر نہیں رکتا۔ (صہ ۶) معجزات کی تعداد و شمار پر حیرت کرنے والوں نے ایک طرف تو معجزات کا مفہوم ہی اپنے ذہنوں میں بہت محدود قرار دے لیا ہے، دوسری طرف اکثر اخبار غیب کو اس فہرست سے عمداً یا سہواً خارج سمجھ لیا ہے۔" (صہ ۶)

معجزات کو محدود اور ان کی تعداد کو کم کرنے کا اعتراض سید صاحبؒ کی ان تحریروں کی وجہ سے

عائد کیا گیا ہے۔

"کتب دلائل کے ان مصنفین کا مقصد معجزات کی صحیح روایات کو یکجا کرنا نہیں بلکہ کثرت سے عجیب و حیرت انگیز واقعات کا مواد فراہم کرنا تھا۔ تاکہ خاتم المرسلینؐ کی فضائل و مناقب کے ابواب میں معتد بہ اضافہ ہو سکے۔ (سیرۃ النبیؐ جلد سوم ص۲۱) یا یوں کہو کہ عشق نبویؐ نے فضائل و مناقب کی کثرت کے شوق میں ہر قسم کی روایتوں کے قبول کرنے پر ان کو آمادہ کر دیا۔" (ص۲۲) "مسلمانوں کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم افضل الانبیا ہیں۔ آپؐ کامل ترین شریعت لے کر مبعوث ہوئے ہیں، آپ تمام محاسن کے جامع ہیں، یہ اعتقاد بالکل صحیح ہے، لیکن اس کو لوگوں نے غلط طور پر وسعت دیدی اور انبیائے سابقین کے تمام معجزات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں جمع کر دیا اور اس اعتقاد کی بدولت تمام مسلمانوں میں پھیل گئے بیہقی اور ابونعیم نے دلائل میں اور سیوطی نے خصائص میں علانیہ دوسرے انبیا کے معجزات کے مقابل میں ان ہی کے مثل آپؐ کے معجزات بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے ہیں۔ اور ثابت کرنا چاہا ہے کہ جس طرح آپؐ کی تعلیم تمام انبیا کی تعلیمات کا عطر، خلاصہ اور مجموعہ ہے۔ اسی طرح آپؐ کے معجزات بھی تمام دیگر انبیاء کے معجزات کا مجموعہ ہے، اور جو کچھ عام انبیا سے متفرق طور پر صادر ہوا وہ تمام کا تمام مجموعاً آپ سے صادر ہوا، ظاہر ہے کہ اس مماثلت اور مقابلہ کے لئے تمامتر صحیح روایتیں دستیاب نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے لوگوں نے ان ہی ضعیف اور موضوع روایتوں کے دامن میں پناہ لی۔ کہیں شاعرانہ تخیل کی بلند پروازی اور نکتہ آفرینی سے کام لیا۔" (سیرۃ النبیؐ جلد سوم۔ صفحہ ۳۰، ۳۱)

سید صاحبؒ دوسرے انبیاء کے معجزات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کی

مماثلت و مقابلہ کی متعدد مثالیں پیش کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں۔

"قرآن مجید اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ انبیاءؑ کے گذشتہ صحیفوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی پیشین گوئیاں ہیں، اور ان کے مطابق یہود و نصاریٰ کو ایک آنے والے پیغمبر کا انتظار تھا۔ اس واقعہ کو دروغگو راویوں نے یہاں تک وسعت دی کہ یہودیوں کو دن، تاریخ، سال، وقت اور مقام سب کچھ معلوم تھا، چنانچہ ولادتِ نبویؐ سے قبل علمائے یہود ان سب کا پتہ بتایا کرتے تھے۔ اور عیسائی راہبوں کو تو ایک ایک خط و خال معلوم تھا۔ بلکہ پرانے گھرانوں اور دیروں اور کنیسوں میں ایسی مخفی کتابیں موجود تھیں جن میں آپ کا تمام حلیہ لکھا تھا۔ اور اگلے لوگ ان کو بہت چھپا چھپا کر رکھتے تھے بلکہ بعض دیروں میں تو آپ کی تصویر تک موجود تھی، تورات و انجیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بعض پیشین گوئیاں حقیقت میں موجود تھیں۔ اور وہ آج بھی ہیں، لیکن وہ استعارات و کنایات اور مجمل عبارتوں میں ہیں۔ ان کو ضعیف و موضوع روایتوں میں صاف صاف آپؐ کے نام و مقام کی تخصیص و تعیین کے ساتھ پھیلا دیا گیا ہے۔" (۴۴۴۔۵۳۳)

سید صاحبؒ نے تکثیر معجزات کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے :

"بعض واقعات ایسے ہیں جن کو کسی حیثیت سے معجزہ نہیں کہا جا سکتا، لیکن تکثیر معجزات کے شوق میں ذرا سا بھی کسی بات میں انوکھا پن ان کو نظر آیا تو اس کو مستقل معجزہ بنا لیا۔ مثلاً حضرت عائشہؓ سے ایک روایت ہے اور وہ مسند امام احمد بن حنبل میں بھی مذکور ہے کہ آپ کے گھر میں کوئی پالو جانور تھا، جب آپؐ اندر تشریف لاتے تو وہ نہایت سکون واطمینان کے ساتھ ایک جگہ بیٹھا رہتا تھا۔ جب آپؐ باہر چلے جاتے تو وہ ادھر ادھر دوڑنے لگتا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حیوانات کو بھی آپ کی جلالتِ قدر اور حفظ مراتب کا پاس تھا۔

اور آپ کی عظمت و شان سے واقف تھے، لیکن درحقیقت یہ کوئی معجزہ نہیں، بلکہ عام لوگوں سے بھی بعض جانور اسی طرح ہل مل جاتے ہیں۔" (صـ۱۳۵)

حضرت سید صاحبؒ نے اس طرح کی اور مثالیں تحریر کرنے کے بعد معجزات کی تعداد بڑھانے کی ایک وجہ یہ بھی لکھی ہے۔

"معجزات کی تعداد بڑھانے کے شوق میں کتب دلائل کے مصنفین نے یہ بھی کیا کہ ایک ہی واقعہ کی روایت میں اگر مختلف سلسلہ سند کے راویوں میں باہم موقع، مقام یا کسی اور بات میں ذرا سا بھی اختلاف نظر آیا تو اس کو چند واقعہ قرار دیدیا۔ مثلاً ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک اونٹ جو دیوانہ ہوگیا تھا۔ یا بگڑ گیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب اس کے پاس گئے تو اس نے مطیعانہ سر ڈال دیا۔ صحابہ نے کہا یا رسول اللہؐ جب جانور آپؐ کے سامنے سر جھکاتے ہیں تو ہم کو انسان ہو کر تو ضرور آپؐ کے سامنے سربسجود ہونا چاہئے۔ آپؐ نے فرمایا" اگر میں کسی انسان کو سجدہ کرنا روا رکھتا تو بیوی کو کہتا کہ وہ شوہر کو سجدہ کرے"۔ یہ ایک ہی واقعہ ہے جو ذرا ذرا سے اختلاف بیان کی بناء پر چودہ پندرہ واقعہ بن گیا ہے۔" (جلد سوم صـ۱۳۶)

سید صاحبؒ کی ان ہی تحریروں کی وجہ سے مولانا بدر عالم صاحب نے ان پر یہ اعتراض کیا ہے کہ انھوں نے معجزات کی تعداد کم کر دی ہے۔ لیکن سید صاحب نے معجزات کی کثرت پر نہایت قوی دلائل سے جو اعتراضات کئے ہیں، مولانا نے ان کی کوئی تردید نہیں فرمائی ان کو یہ تو بتانا ہی چاہئے تھا کہ یہ اعتراضات صحیح ہیں یا غلط۔

معجزات کی کثرت پر اعتراضات سے یہ نتیجہ نکالنا کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ سیرت کے مصنف پر خرق عادات کا ہوا سوار ہے۔ اس لئے مستند سے مستند معجزات میں بھی ان کا قلم

کتر یونت کی معترض ٹھگاسے بغیر نہیں رہا۔ اور انھوں نے معجزات کی تعداد محدود اور قلیل کردی۔

خوارق و معجزات کے باب میں سیرۃ النبی کا جو موقف و نظریہ پہلے تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ سید صاحب پر نہ خرق عادت کا ہوا سوار تھا۔ اور نہ انھوں نے مستند روایات سے ثابت معجزات کا انکار کیا ہے۔ ان کا سارا اعتراض ضعیف و موضوع روایات میں مذکور معجزات پر ہے۔ اگر معترض کے طعن و طنز کو نظر انداز کر کے دیکھا جائے۔ تو ان کے اعتراض کا حاصل صرف یہ نکلتا ہے کہ

(الف) معجزات کو صرف اخلاق و شمائل تک محدود کر دیا ہے۔

(ب) آپؐ کی زندگی کے عجائبات کو قلم زد کر دیا ہے۔

(ج) اخبار غیب کو معجزات کی فہرست سے عمداً یا سہواً خارج کر دیا ہے۔

مگر ان میں سے کوئی بات بھی درست نہیں ہے، سید صاحبؒ معجزات و خوارق کو تسلیم کرتے تھے اس لئے اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ انھوں نے ان کو اخلاق و شمائل تک محدود کر دیا ہے اوپر اس کی تفصیل گذر چکی ہے۔ اگر ناظرین کے ذوق پر بار نہ ہو تو وہ سید صاحب کے ان الفاظ کو پھر پڑھنے کی زحمت گوارا کریں۔

"اس روحانی جہاد میں انبیاء و رسل سے ہمارے علم و دانش سے بالاتر اعمال صادر ہوتے ہیں اور ان سے عجیب عجیب خوارق ظہور پذیر ہوتے ہیں۔" (سیرۃ النبیؐ ص ۲ ج ۳)

"وہ وہ کچھ دیکھتے تھے، جو ہم نہیں دیکھ سکتے، وہ وہ کچھ سنتے تھے، جو ہم نہیں سن سکتے وہ وہ کچھ جانتے تھے، جو ہم نہیں جان سکتے۔ اور ان سے وہ اعمال بھی صادر ہوتے تھے۔ جو کسی اور سے نہیں ہو سکتے۔" (ص ۳) "لیکن جو لوگ احساس حقیقت میں فروتر ہوتے ہیں۔ ان کو اس سے تسکین نہیں ہوتی اور وہ مادی و محسوس نشانیوں کے طلبگار

ہوتے ہی۔ جو بالآخر ان کو دی جاتی ہیں جو قرآن مجید نے انبیاء علیہم السلام کے واقعات زندگی میں ان دلائل و آیات کو نہایت اہمیت دی ہے" (صـ) "اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو ان تمام معجزات کا مجموعہ بنا دیا۔ جو علی قدر مراتب ہر طبقہ، ہر فرقہ اور ہر گروہ کے لیے ضروری تھے۔ آپ کے اخلاق و عادات معجزہ تھے۔ آپ کی شریعت معجزہ تھی۔ آپ پر جو کتاب نازل ہوئی اس سے بڑا کوئی معجزہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کے علاوہ آپ کی روحانی طاقت نے جسم و روح دونوں کی کائنات میں بہت کچھ اثر ڈالا، اس نے کبھی طوبیٰ کے سایہ میں آپ کے لیے بستر لگایا، کبھی سدرۃ المنتہیٰ کے حدود میں رفرف کی سواری کھڑی کی۔ کبھی ماکذب الفواد کے نور سے قلب مبارک کو منور کیا اور کبھی مازاغ البصر کے سرمہ سے آپ کی آنکھوں کو روشن کیا، کبھی نزول رحمت کے لئے آسمان کے دروازے کھولے، کبھی وادی حق کے پیاسوں کے لیے زمین کی تہہ سے پانی کے چشمے ابالے، کبھی سنگ خارا کے شرارہ کی روشنی میں قیصر و کسریٰ کے خزانے دکھائے۔ کبھی انبیائے سابقین علیہم السلام کی زبانِ الہام سے اپنی کامیابی کے نغمہ ہائے بشارت سنائے۔ اور آئندہ دنیا کے واقعات غیب بتا کر رہروانِ عالم کو منزل حقیقت کے نشان دکھائے۔ (صـ)

"تمام انبیائے کرام کی سیرتیں بیک زبان اس کی تصدیق کرتی ہیں کہ باطنی آیتوں کے ساتھ ان کو ظاہری حصہ بھی ملتا ہے، قرآن مجید نے اکثر انبیاء کے سوانح و واقعات کے ضمن میں ان کے ظاہری آثار و دلائل کو بھی بہ تفصیل بیان کیا ہے" (ص ۲۳۲)

یہ اور اسی قسم کے دوسرے اقتباسات اوپر گذر چکے ہیں۔ جن سے نہایت قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ سیرۃ النبیؐ کے مصنف کے نزدیک حسی معجزات کی بھی اہمیت ہے، اور انھوں نے آپؐ کے معجزات کو صرف اخلاق و شمائل تک محدود نہیں کیا ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے تو سمجھے۔ مگر اس کے سمجھنے سے حقائق

نہیں بدل سکتے۔

عجائبات کو قلمزد کرنے کی بات بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن و احادیث صحیحہ سے ثابت جو معجزات سیرۃ النبیؐ میں مذکور ہیں کیا وہ عجائب سے خالی ہیں۔ اگر نہیں خالی ہیں تو یہ کہنا کہاں تک درست ہوگا کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے عجائب کو قلمزد کر دیا گیا ہے، ناظرین اس موقع پر سیرۃ النبیؐ جلد سوم کے مباحث و مندرجات پر ایک نظر ڈال لیں تو ان کو خود اندازہ ہوگا۔ کہ یہ اعتراض صحیح نہیں ہے۔ اس مقصد سے ہم اس کے مشمولات کا یہاں مختصر جائزہ پیش کرتے ہیں:۔

سیرت میں آیات و دلائل نبوی کی تفصیل کے زیر عنوان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مافوق فہم بشری سوانح و واقعات کی تفصیل قلمبند کی گئی ہے، جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں نبوت کے لوازم وخصائص کا ذکر ہے۔ اور اس میں مندرجہ ذیل امور کا تذکرہ ہے۔ وحی، نزول ملائکہ (آپ کی خدمت میں حضرت جبریل ومیکائیل اور دوسرے فرشتوں کا آنا) عالم رویا (اس میں پہلے آپ کے رویائے تمثیلی کا مفصل ذکر ہے، پھر مشاہدات و مسموعات کے زیر عنوان، عالم بیداری، اسرا یا معراج اور شق صدر یا شرح صدر کے زیر عنوان جو کچھ لکھا گیا ہے کیا وہ عجائبات سے خالی ہے؟ اگر نہیں تو پھر یہ اعتراض کیسے درست ہو سکتا ہے کہ سیرۃ النبیؐ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عجائبات کو قلمزد کر دیا گیا ہے۔

خصائص ولوازم نبوت کے بعد قرآن مجید میں مذکور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دلائل ومعجزات کو ان تین حصوں میں بیان کیا ہے، (۱) کفار کی ہدایت و دعوت اور مسلمانوں کی مزید ایمانی تسلی کے لیے معجزانہ نشانیاں (۲) مصیبتوں کی گھڑیوں میں تائیدات غیبی کا ظہور، (۳) وہ پیشین گوئیاں جن کا لفظ لفظ صداقت کے معیار پر صحیح اترا۔

مصنف سیرت نے سب سے پہلے معجزہ قرآن کا ذکر کیا ہے۔ اس میں قرآن کے اعجاز کا ذکر جس طور پر کیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ نہ تو وہ خرق عادت کی تردید کرتے ہیں۔ اور نہ انھوں نے

ہوتے ہیں۔ جو بالآخر ان کو دی جاتی ہیں۔ قرآن مجید نے انبیاء علیہم السلام کے واقعات زندگی میں ان دلائل و آیات کو نہایت اہمیت دی ہے " (ص ۸) "اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو ان تمام معجزات کا مجموعہ بنا دیا۔ جو علی قدر مراتب ہر طبقہ، ہر فرقہ اور ہر گروہ کے لیے ضروری تھے۔ آپ کے اخلاق و عادات معجزہ تھے۔ آپ کی شریعت معجزہ تھی۔ آپ پر جو کتاب نازل ہوئی اس سے بڑا کوئی معجزہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کے علاوہ آپ کی روحانی طاقت نے جسم و روح دونوں کی کائنات میں بہت کچھ اثر ڈالا، اس نے کبھی طوبیٰ کے سایہ میں آپ کے لیے بستر [illegible] یا، کبھی سدرۃ المنتہیٰ کے حدود میں رفرف کی سواری کھڑی کی۔ کبھی ماکذب الفواد کے نور سے قلب مبارک کو منور کیا اور کبھی مازاغ البصر کے سرمہ سے آپ کی آنکھوں کو روشن کیا، کبھی نزول رحمت کے لئے آسمان کے دروازے کھولے، کبھی وادی حق کے پیاسوں کے لیے زمین کی تہ سے پانی کے چشمے ابالے، کبھی سنگ خارا کے شراروں کی روشنی میں قیصر و کسریٰ کے خزانے دکھائے، کبھی انبیائے سابقین علیہم السلام کی زبان الہام سے اپنی کامیابی کے نغمہ ہائے بشارت سنائے۔ اور آئندہ دنیا کے واقعات غیب بتا کر رہروان عالم کو منزل حقیقت کے نشان دکھائے۔ (ص ۹)

"تمام انبیائے کرام کی سیرتیں بیک زبان اس کی تصدیق کرتی ہیں کہ باطنی آیتوں کے ساتھ ان کو ظاہری حصہ بھی ملتا ہے، قرآن مجید نے اکثر انبیاء کے سوانح و واقعات کے ضمن میں ان کے ظاہری آثار و دلائل کو بھی بہ تفصیل بیان کیا ہے " (ص ۲۳۲)

یہ اور اسی قسم کے دوسرے اقتباسات اوپر گذر چکے ہیں۔ جن سے نہایت قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے سیرۃ النبی کے مصنف کے نزدیک حسی معجزات کی بھی اہمیت ہے، اور انھوں نے آپ کے معجزات صرف اخلاق و شمائل تک محدود نہیں کیا ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے تو سمجھے۔ مگر اس کے سمجھنے سے حقائق

نہیں بدل سکتے۔

عجائبات کو قلم زد کرنے کی بات بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن و احادیث صحیحہ سے ثابت جو معجزات سیرۃ النبیؐ میں مذکور ہیں کیا وہ عجائب سے خالی ہیں۔ اگر نہیں خالی ہیں تو یہ کہنا کہاں تک درست ہوگا کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے عجائب کو قلم زد کر دیا گیا ہے، ناظرین اس موقع پر سیرۃ النبیؐ جلد سوم کے مباحث و مندرجات پر ایک نظر ڈال لیں تو ان کو خود اندازہ ہوگا۔ کہ یہ اعتراض صحیح نہیں ہے۔ اس مقصد سے ہم اس کے مشمولات کا یہاں مختصر جائزہ پیش کرتے ہیں:۔

سیرت میں آیات و دلائل نبوی کی تفصیل کے زیر عنوان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مافوق فہم بشری سوانح و واقعات کی تفصیل قلمبند کی گئی ہے، جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں نبوت کے لوازم و خصائص کا ذکر ہے۔ اور اس میں مندرجہ ذیل امور کا تذکرہ ہے، وحی، نزول ملائکہ (آپ کی خدمت میں حضرت جبریل و میکائیل اور دوسرے فرشتوں کا آنا) عالم رویا (اس میں پہلے آپ کے رویائے تمثیلی کا مفصل ذکر ہے۔ پھر مشاہدات و مسموعات کے زیر عنوان، عالم بیداری، اسرا یا معراج اور شق صدر یا شرح صدر کے زیر عنوان جو کچھ لکھا گیا ہے کیا وہ عجائبات سے خالی ہے؟ اگر نہیں تو پھر یہ اعتراض کیسے درست ہوسکتا ہے کہ سیرۃ النبیؐ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عجائبات کو قلم زد کر دیا گیا ہے۔

خصائص و لوازم نبوت کے بعد قرآن مجید میں مذکور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دلائل و معجزات کو ان تین حصوں میں بیان کیا ہے، (۱) کفار کی ہدایت و دعوت اور مسلمانوں کی مزید ایمانی تسلی کے لیے معجزانہ نشانیاں (۲) مصیبتوں کی گھڑیوں میں تائیدات غیبی کا ظہور، (۳) وہ پیشین گوئیاں جن کا لفظ لفظ صداقت کے معیار پر صحیح اترا۔

مصنف سیرت نے سب سے پہلے معجزۂ قرآن کا ذکر کیا ہے۔ اس میں قرآن کے اعجاز کا ذکر جس طور پر کیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ نہ تو وہ خرق عادت کی تردید کرتے ہیں۔ اور نہ انھوں نے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے عجائب کو نظر انداز کرنا پسند کیا ہے۔ اس میں آپ کی امیت، آپ کی حفاظت وعصمت اور دشمنوں کے مقابلہ میں آپ کی منجانب اللہ نگہبانی و نگرانی، لیلۃ الجن (آپ کے پاس جنوں کے آنے اور مشرف بہ اسلام ہونے)، شق قمر اور آخر میں غلبہ روم کی پیشین گوئی کا ذکر ہے۔ یہ سارے مباحث عجائب وخوارق کا مجموعہ ہیں جن کو سید صاحب نے قلم بند کیا ہے۔ پھر مولانا بدر عالم صاحب نے یہ کیسے اعتراض کر دیا کہ انھوں نے عجائب کو نظر انداز کر دیا ہے۔

اس کے بعد قرآن مجید میں مذکور ان عجائب کا تذکرہ ہے۔ طیر ابابیل کی نشانی، شہب ثاقب کی کثرت، شرح صدر، مکہ سے بیت المقدس تک ایک شب میں سفر، قریش پر قحط سالی کا عذاب، موقع ہجرت کی نشانیاں، خواب میں کفار کا کم دیکھنا، مسلمانوں کا کافروں کی نظر میں اور کافروں کا مسلمانوں کی نظر میں کم کر کے دکھانا، پھر کافروں کی آنکھوں میں مسلمانوں کا دوگنا نظر آنا۔ فرشتوں کی آمد، میدان جنگ میں پانی برسانا، لڑائیوں میں نیند کا طاری ہونا، کنکری پھینکنا، غزوہ بدر میں دو میں سے ایک کا وعدہ، غزوہ احزاب کی خبر، غزوہ احزاب میں آندھی، غزوہ حنین میں نصرت، غیب پر اطلاع، بنو نضیر کی سازش، مہاجرین حبش کو بشارت، ہجرت کے بعد قریش کو مہلت نہ ملے گی، یہود میں بڑے بڑے مصائب کا سامنا ہو گا، دینی و دنیاوی شہنشاہی کا وعدہ، قبائل عرب کو شکست ہوگی، قریش کی شکست اور بربادی کے وعدے، فتح کی پیشین گوئیاں خیبر اور حنین کی پیشین گوئی، یہود کو اعلان، روم کی قوت ٹوٹ جائیگی، خلفائے راشدین کے زمانہ کی لڑائیاں، وفات نبوی کی پیشین گوئی۔

ان میں سے کوئی مبحث ایسا نہیں ہے، جو عجائب و غرائب سے خالی ہو مگر اس کے بعد بھی سیرۃ النبی کی اس جلد پر اعتراض ہے کہ اس میں عجائب کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

صحیح اور معتبر حدیثوں سے ثابت جو آیات و دلائل نبوی سیرۃ النبی کی اس جلد میں تحریر ہیں ان کی فہرست بھی ملاحظہ کیجئے اور بتایئے کہ کیا اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عجائب قلم انداز کیے گیے ہیں:

سیرت کے اس حصہ میں مختلف ذیلی عنوانات قائم کر کے آپ کی زندگی کے متعدد عجائب بیان کیے گئے ہیں، پہلے عنوان "علاماتِ نبوت قبل بعثت" کے تحت ان امور کا ذکر ہے۔

حضرت آمنہ کا خواب، ولادت نبوی کی پیشین گوئیاں یہود ونصاری میں، بتخانوں میں غیبی آوازیں شق صدر، مبارک قدم ہونا۔ بے ستری میں آپ کا غش کھا کر گرنا۔ نیند طاری ہونا۔ صدائے غیب۔ پتھروں سے سلام کی آواز، خواب میں فرشتوں کی آمد۔

"اشیا میں اثر" کے عنوان سے یہ خوارق بیان ہوئے ہیں۔

ستون کا رونا۔ منبر کا ہلنا، چٹان کا پارہ پارہ ہو جانا، درختوں اور پہاڑوں سے سلام کی آواز آنا، پہاڑ کا ہلنا۔ آپ کے اشارہ سے بتوں کا گر جانا۔ کھانوں سے تسبیح کی آواز، زمین کا ایک مرتد کو قبول نہ کرنا۔ درختوں کا چلنا۔ خوشۂ خرما کا چلنا۔ درخت کا چلنا اور اس سے آواز آنا۔ بے دودھ کی بکری کا دودھ دینا۔ سست گھوڑے کا تیز رفتار ہو جانا۔ اندھیرے میں روشنی ہونا۔ جانور کا سجدہ کرنا۔ جانور کا آپ کے مرتبہ کو پہچاننا۔ حافظہ بڑھ جانا۔

"شفائے امراض" کے زیر عنوان یہ معجزات درج ہیں۔

حضرت علیؓ کی آنکھوں کا اچھا ہونا۔ ٹوٹی ہوئی ٹانگ کا درست ہو جانا۔ تلوار کے زخم کا اچھا ہونا، اندھے کا اچھا ہونا۔ بلا دور ہونا۔ گونگے کا بولنا۔ مرض نسیان کا دور ہونا۔ بیمار کا تندرست ہونا، ایک جلے ہوئے بچے کا اچھا ہونا۔ جنون کا دور ہونا۔

"استجابت دعا" میں ان معجزات وخوارق کا تذکرہ ہے۔

قریش پر عذاب آنا اور اس کا دور ہونا، رؤسائے قریش کے حق میں بددعا، حضرت عمرؓ کا اسلام، سراقہ کے گھوڑے کا پاؤں دھنس جانا۔ مدینہ کی آب وہوا کے لیے دعا۔ قحط کا دور ہونا۔ اور پانی کا برسنا، حضرت انسؓ کے حق میں دعائے برکت، حضرت ابن عباسؓ کے حق میں دعائے علم، حضرت ام حرامؓ کے

حق میں دعائے شہادت۔ ایک نوجوان کی ہدایت کے لیے دعا، حضرت سعد بن ابی وقاص کے مستجاب الدعوات ہونے کی دعا۔ حضرت عروہؓ کے حق میں دعائے برکت۔ حضرت ابوامامہؓ باہلی کے حق میں دعائے سلامتی۔ حضرت طلحہؓ کے حق میں برکت اولاد کی دعا۔ حضرت ابوہریرہؓ کی والدہ کے حق میں دعائے ہدایت، اونٹ کا تیز ہو جانا، بیماری کا اچھا ہونا۔ سواری کی قوت آجانا۔ ایک مغرور کا ہاتھ شل ہو جانا۔ قبیلۂ دوس کا مسلمان ہونا۔ رفع بے پردگی کے لیے دعا، سلطنت کسریٰ کی تباہی۔ دعائے برکت کا اثر۔ طولِ عمر کی دعا۔ ایک بچہ کی ہدایت کے لیے دعا۔

"اشیا میں اضافہ" کے عنوان کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ان عجائب کی تفصیل قلمبند کی گئی ہے۔

تھوڑے سے کھانے میں ستر اسی آدمیوں کا سیر ہو جانا، چھوہارے کے ڈھیر کا بڑھ جانا، کھانے میں حیرت انگیز برکت، گھی کی مقدار میں برکت، جو کی مقدار میں برکت، کھانے میں حیرت انگیز اضافہ۔ تھوڑے سے زادِ راہ میں غیر معمولی برکت، تھوڑے سے زادِ راہ میں عظیم برکت، آدھ سیر آٹے اور ایک بکری میں برکت، قلیل تعداد میں کثیر برکت، ایک پیالہ میں حیرت انگیز برکت، دودھ کے ایک پیالہ کی برکت، بکری کے دست میں برکت، بکری کے تھنوں میں برکت، تھوڑے سے کھانے میں ایک وسق جو کی برکت، توشہ دان کا ہمیشہ بھرا رہنا، تھوڑی کھجوروں میں برکت۔

"پانی جاری ہونا" میں ان عجائب و خوارق کا ذکر ہے۔

مشکیزہ سے پانی ابلنا، انگلیوں سے پانی جاری ہونا، پانی کا بڑھ جانا، انگلیوں کی برکت، انگلیوں سے پانی کا چشمہ بہنا۔ کلی سے پانی بڑھ جانا، ہاتھ منہ دھونے کی برکت، انگلیوں سے پانی کا جوش مارنا، تھوڑے پانی میں کثیر برکت، انگلیوں سے پانی ابلنا۔

اس فہرست کو نقل کرنے کا مقصد یہ دکھانا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خوارق و

معجزات کی پوری تفصیل سیرۃ النبیؐ میں موجود ہے، اس لئے یہ اعتراض کسی طرح درست نہیں ہے کہ اس میں عجائب کو نظرانداز کر دیا گیا ہے یا انھیں پھیکا کر دیا گیا ہے۔ اور اخلاق و شمائل کی حد تک ہی معجزات کو محدود دکھایا گیا ہے۔ معترض کی یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ مستند سے مستند معجزات میں سید صاحبؒ کا قلم کتر بیونت کی مقراض لگائے بغیر نہیں رہا۔ البتہ ان کے قلم کی مقراض نے ضعیف اور موضوع روایات میں مذکور معجزات میں کتر بیونت ضرور کی ہے جس کی بنا پر مولانا بدر عالم کو اس قدر برہمی ہے، اور وہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ سیرت میں کم سے کم معجزات کا ذکر ہے، ظاہر ہے کہ حقیقت شناس لوگوں کی نظر میں ان کے اس شکوۂ بیجا کی کوئی اہمیت نہیں ہو سکتی۔

مولانا بدر عالم نے اس کی بھی شکایت کی ہے کہ معجزات کا مفہوم اپنے ذہنوں میں بہت محدود قرار دینے والوں نے اکثر اخبار غیب کو اس فہرست سے عمداً یا سہواً خارج سمجھ لیا ہے، مگر یہ اعتراض بھی پہلے اعتراضات ہی کی طرح کوئی وزن نہیں رکھتا، سارا جھگڑا موضوع اور ضعیف روایات میں مذکور معجزات اور اخبار غیب کا ہے۔ سید صاحبؒ نے اپنی کتاب کا اصول یہ بنایا ہے کہ وہ روایات صحیحہ سے ثابت معجزات و خوارق ہی کو اس میں جگہ دیں گے اور معجزات کی تعداد بڑھانے کے شوق میں ضعیف و موضوع روایات میں بیان کیے گئے معجزات، عجائب اور اخبار غیب سے سیرۃ النبیؐ جیسی مستند و معیاری کتاب کو آلودہ نہ کریں گے لیکن مولانا بدر عالم صاحب کا اصرار ہے کہ ان کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و مناقب میں معتدبہ اضافہ کیلئے سیرت میں شامل کیا جانا چاہیے تھا۔ ارباب نظر خود فیصلہ کریں کہ کس کا نقطۂ نظر حق و انصاف پر مبنی اور صحیح ہے۔

سیرۃ النبیؐ جلد سوم میں اخبار غیب یا پیشین گوئی کا ایک مستقل باب قائم کیا گیا ہے، اس میں سید صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:۔

"فطرت بشری کے عجز اور بیچارگی کا سب سے بڑا دردناک نظارہ مستقبل ہے

ناواقفیت اور جہالت ہے۔ انسان کی مضطرب اور بے چین فطرت مستقبل کے بحر ظلمات میں ہاتھ پاؤں مارتی ہے اور تھک کر اپنی نادانی اور جہالت کا اعتراف کر لیتی ہے اور اسی لیے وہ اس بات پر مجبور ہے کہ جو انسانیت سے مافوق کسی دعویٰ کا مدعی ہو، اس کی آزمایش اور امتحان کے لیے اسی بحر بیکراں کی شناوری کو معیار اور سند قرار دیدے، چنانچہ یہی اخبار غیب اور پیشین گوئی کی قدرت نبوت اور رسالت بلکہ عام بزرگی اور ولایت کے ثبوت پر نوع انسانی کے عام افراد کے نزدیک ایک دلیل اور حجت قائمہ ہے۔ بنی اسرائیل کے نزدیک یہ صفت نبوت کا اس درجہ لازمہ تھا کہ ان کی زبان میں پیغمبر کا نام ہی "پیشین گو" ہے، عربی عبرانی اور دوسری سامی زبانوں میں "نبی" یا "نابی" جو پیغمبر کے معنی میں مستعمل ہے، اس کے لغوی معنی مخبر اور پیشین گو کے ہیں۔ اور نبوت کے معنی مخبری اور پیشین گوئی کے ہیں، اسی لیے بنی اسرائیل کے نزدیک نبی اور پیغمبر کی صرف اسیقدر حقیقت ہے کہ وہ غیب کا قاصد اور جہان نادیدہ کا مخبر ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب کی یہ کیفیت تھی کہ تمام عرب کاہنوں کے جال میں گرفتار تھا۔ عرب کے تمام مشرکانہ معابد کاہنوں کے دارالسلطنت تھے جن میں بیٹھکر وہ عرب کے دل و دماغ پر حکومت کر رہے تھے۔ مشہور کاہنوں کے پاس لوگ دور دور سے سفر کر کے آتے تھے، اور ان سے مستقبل اور غیب کی باتیں دریافت کرتے تھے۔ وہ ایک خاص قسم کی مقفیٰ اور مسجع عبارتوں میں ان کو غیب کی اور مستقبل کی باتیں بتاتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب پیغمبر بنا کر عربوں کے درمیان بھیجے گئے۔ تو ان کے لیے ثبوتِ نبوت کی سب سے بڑی دلیل یہی اخبار غیب اور پیشین گوئی ہو سکتی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیسیوں پیشین گوئیاں کیں اللہ مستقبل کے واقعات کو باتوں کو رای العین کی طرح پیش فرمایا، اور وہ سب کے سب بے کم و کاست پوری اتریں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان پیشین گوئیوں کا صدور مختلف حالتوں میں ہوا اور

آپ کو ان کی اطلاع مختلف صورتوں میں دی گئی مثلاً کبھی قرآن مجید کی وحی کی صورت میں،
کبھی عالم خواب میں، اور کبھی زبان صداقت نشان کے عام الفاظ میں جن میں طریقہ اطلاع
کا اظہار نہیں ہے، قرآن مجید کی پیشین گوئیوں کی تفصیل اس سے پہلے گذر چکی ہے، خواب کی
پیشین گوئیوں کا تذکرہ کچھ عالم رویا کے بیان میں آچکا ہے، باقی پیشین گوئیاں سطور ذیل
میں تحریر ہیں۔" (سیرۃ النبیؐ ج ۳ ص ۲۸۱ تا ۲۰۰)

طوالت مانع ہوتی تو ہم ان سب اخبار غیب کی فہرست درج کرتے جو تقریباً ۲۰۔۲۵ صفحات میں بیان کیے گئے ہیں اور جن کی تعداد ۵۴ ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ جب سید صاحبؒ کے نزدیک اخبار غیب اور پیشین گوئیوں کی اس قدر
اہمیت ہے اور وہ اسے نبوت کی دلیل اور حجت قائمہ مانتے ہیں اور اسی حیثیت سے انھوں نے متعدد
پیشین گوئیوں کا ذکر بھی سیرۃ النبیؐ میں کیا ہے تو کیا وہ انھیں عمداً یا سہواً معجزات کی فہرست سے خارج
قرار دے سکتے تھے، اوپر جو اقتباس نقل کیا گیا ہے کیا اس کے بعد بھی یہ کہنا درست ہوگا کہ سید صاحبؒ
کو معجزات کا کوئی ذوق نہ تھا۔ اور ان پر معجزات کی کثرت گراں تھی۔ اور انھوں نے صرف اخلاق
وشمائل ہی تک معجزات کا دائرہ محدود کر دیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ایک طبقہ کو تو یہ شکوہ ہے
کہ سید صاحبؒ نے ان سب چیزوں کو بھی معجزہ قرار دیا ہے۔ جن میں ذرا سا بھی اعجوبہ پن ہے اور
مولانا بدر عالم صاحب فرماتے ہیں کہ سید صاحبؒ نے عجائب پر مقراض چلادی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت سید صاحبؒ کو نہ معجزات کی کثرت سے کوئی گھبراہٹ تھی،
اور نہ انھوں نے آپ کی زندگی کے عجائب کو قلم زد اور پھیکا کیا ہے، بلکہ اپنی بالغ نظری، عالمانہ
شان، روح دین سے واقفیت اور قرآن وحدیث کا نکتہ شناس ہونے کی بنا پر ان ہی حسی
معجزات، عجائب اور پیشین گوئیوں کو سیرۃ النبیؐ میں جگہ دی ہے، جو قرآن مجید اور احادیث
صحیحہ میں مذکور ہیں، انھیں کیا پتہ تھا کہ ان کا یہ کمال ان لوگوں کی نظر میں عیب بن جائے گا۔

جو اپنے اور اپنے حلقہ کے علاوہ کسی کو عالم اور محدث ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔

فن حدیث سے ناواقفیت | ترجمان السنۃ کے مصنف کے نزدیک مولانا سید سلیمان ندوی کا شمار اصطلاحی لحاظ سے ایک لمحہ کے لیے بھی محدث کی فہرست میں نہیں ہو سکتا۔ وہ فن حدیث سے بالکل ناواقف اور بے بہرہ تھے، اس سلسلہ میں مولانا بدر عالم نے طعن و تشنیع ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ایسا نارو اور غیر مناسب لب ولہجہ اختیار کیا ہے جس کی توقع ایک عام آدمی سے بھی نہیں کی جاسکتی تھی، چہ جائیکہ ان جیسے استاذ حدیث اور اصطلاحی محدث سے، یہ بھی واضح رہے کہ یہ نارو اور نامناسب انداز اس شخص کے لیے اختیار کیا گیا ہے جس کو اس عہد کا غزالی و رازی اور ابن تیمیہ و ابن قیم کہنا مبالغہ نہیں ہے۔

مصنف ترجمان السنۃ کے اعتراضات جابجا اس کثرت سے ہیں کہ ان کو سمیٹنا مشکل ہے اس لئے ان کا صرف خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ سیرت کے مصنف فن حدیث کے عام اصول اور ان مبادی سے بھی ناواقف اور ناآشنا تھے۔ جن سے حدیث کی ابتدائی کتابیں پڑھنے والے طلبہ بھی واقف ہوتے ہیں، اسی لیے مولانا بدر عالم نے یہ کرم کیا ہے، کہ حدیث کی تصانیف میں محدثین کے مختلف اسالیب بتائے ہیں، سنن ہدیٰ و سنن زوائد کی تقسیم و تعریف بیان کرنے کی زحمت کی ہے۔ معجزات پر تصنیفات اور ان کے مصنفین کے نام لکھے ہیں۔ ضعیف حدیث کی تعریف کرکے اس کی دو قسموں مقبول و مردود کا ذکر کیا ہے، محدثین کی اصطلاح "لایصح" "ولایثبت" کا فرق واضح کیا ہے، اور سب سے بڑا کرم یہ کیا ہے کہ صحیح و ضعیف کے معنی میں محدثین کی اصطلاح اور اردو کے استعمال میں جو فرق ہے اسے ظاہر کر دیا ہے۔

۲۔ سیرۃ النبیؐ جلد سوم میں احکام و عقائد اور اعمال و فضائل کی حدیثوں میں کوئی تفریق نہیں کی گئی ہے، بلکہ دونوں طرح کی روایتوں کے رد و قبول میں مشہور حدیث من کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار کے اقتضا کے مطابق یکساں شدت اختیار کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ اور یہ

کہ ذرا دیکھا ہے کہ معجزات ہوں یا فضائل، ضروری ہے کہ آپؐ کی طرف جس چیز کی بھی نسبت کی جائے وہ شک وشبہ سے پاک ہو۔"

۳۔ من کذب علیّ الخ کا تعلق صرف جھوٹی اور موضوع روایتوں سے ہے سید صاحبؒ کا ضعیف حدیثوں کو بھی اسی لپیٹ میں لے لینا جن کا ایک ایک راوی بیان کر دیا جائے بالکل خلافِ تحقیق اور مذہب جمہور کے خلاف ہے۔

۴۔ سیرت کے مصنف نے محدثین کبار سے بد اعتقادی پیدا کی ہے۔ مثلاً حافظ ابن عساکر جیسے شخص کو ضعیف روایتوں کا سرپرست یا مثلاً حافظ ابن حجر کو جس کو محدثین نے حافظ الدنیا کا لقب دیا ہے۔ کمزور روایتوں کا سہارا اور پشت پناہ کہا ہے اور محدثین کبار کی شان میں آزادانہ کلمات استعمال کئے ہیں۔

یہ اور اس قسم کے اور بھی متعدد اعتراضات ہیں جن کا ذکر آگے ضمناً آئے گا۔ اب ہم نمبروار ان کا جائزہ لیتے ہیں۔ معترض کے خیال میں سید صاحبؒ اصطلاحی معنی میں ایک لمحہ کے لئے بھی محدث نہ تھے۔ ممکن ہے ان کی اپنی کوئی مخصوص اصطلاح ہو۔ جس کی رو سے سید صاحبؒ ایک لمحہ کے لیے بھی محدث نہ قرار پائیں۔ لیکن انھیں حدیث سے بے بہرہ اور اس کے اصول و مبادی سے ناواقف قرار دینا کسی طرح صحیح نہیں ہے، اس کی مختصر تفصیل یہ ہے۔

سید صاحبؒ کو ابتدا ہی سے فن حدیث سے خاص مناسبت رہی ہے، اپنے اسی ذوق کی بنا پر انھوں نے اوائل عمر اور اپنی مضمون نگاری اور تصنیفی زندگی کی ابتدا ہی میں امام بخاریؒ اور امام مالکؒ جیسے اساطین حدیث پر مضامین اور کتابیں لکھیں۔ معارف کے صفحات بھی علم حدیث سے ان کے شغف وانہماک پر شاہد ہیں، ان کی اکثر تصنیفات بھی حدیثی مسائل کی بحث و تحقیق کا شاہکار ہیں، خصوصاً سیرۃ النبیؐ کی جلدوں میں وہ حدیث سے واقفیت اور اس میں تبحر کی ایسی

یادگاریں چھوڑ گئے ہیں جن کی مثال اپنے آپ کو محدث کہلانے والوں کے یہاں بھی نہیں ملے گی۔ اور جلدوں سے قطع نظر صرف تیسری جلد ہی پر اس حیثیت سے ایک نگاہ ڈالی جائے تو اس اعتراض میں کوئی وزن نظر نہ آئے گا کہ نہ سید صاحب محدث تھے، اور نہ اس فن سے واقف۔

سب سے پہلے حدیث و شروح حدیث، دلائل، سیر طبقات، رجال، تاریخ اور تفسیر کی ان کتابوں کی فہرست پیش کی جاتی ہے۔ جن کو کھنگالنے کے بعد یہ جلد مرتب کی گئی ہے۔

صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، مسند احمد بن حنبل، مسند اسحاق بن راہویہ، سنن دارمی، مسند ابوداؤد طیالسی، مسند بزار، مسند حارث، مسند ابویعلی، مسند ابوعوانہ، مسند عبد بن حمید، مسند الفردوس دیلمی، معجم طبرانی، سنن دارقطنی، مستدرک حاکم، تلخیص مستدرک ذہبی، شعب الایمان بیہقی، ادب المفرد امام بخاری، شمائل ترمذی، تاویل مختلف الحدیث ابن قتیبہ، مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ، زوائد احمد، صحیح ابن خزیمہ، مختارہ ضیا، صحیح ابن حبان، کتاب المائتین صابونی، مشکوٰۃ المصابیح، کنزالعمال، موضوعات ملا علی قاری، امام بغوی، امام ابن السکن، ابن مندہ، ابن شاہین، ابن ابی النجار اور ابن ابی الدنیا کی کتابیں، امام خطابی و امام نووی اور قسطلانی و زرقانی کی شرحیں نیز فتح الباری ابن حجر، امام بیہقی و امام ابونعیم کی دلائل النبوۃ، خصائص کبری سیوطی، شرف المصطفی، سیرت ابن اسحاق، سیرت ابن ہشام، کتاب المغازی واقدی، روض الانف امام سہیلی، طبقات ابن سعد، شرح مواہب، شفا قاضی عیاض، شرح شفا خفاجی، زاد المعاد ابن قیم، استیعاب ابن عبدالبر، اسدالغابہ ابن اثیر، اصابہ ابن حجر، تاریخ ابن جریر، تاریخ ابن اثیر، تاریخ خطیب بغدادی، تاریخ ابن عساکر، تاریخ نیشاپور حاکم، تاریخ ابن کثیر، مختصر تاریخ اسلام ذہبی، تاریخ ابوشامہ، تاریخ الخلفا سیوطی، حلیۃ الاولیا ابونعیم، تاریخ کبیر و صغیر امام بخاری، تفسیر ابن جریر، تفسیر ابوحیان، تفسیر امام رازی، محب طبری و قرطبی، تہذیب التہذیب ابن حجر، میزان الاعتدال ذہبی، لسان المیزان ابن حجر۔

اس فہرست میں بعض ایسی کتابوں کے نام بھی ہیں، جو ابھی تک چھپی نہیں ہیں، سید صاحب نے ان کے مخطوطہ نسخے دیکھے ہوں گے یا دوسری مطبوعہ کتابوں سے ان کے حوالے دیئے ہوں گے۔ (باقی)

روس کے ایک ممتاز عالم

قاضی عبدالرشید ابراہیم

از - جناب ثروت صولت صاحب، کراچی

تمہید روس میں جو ممتاز مسلمان ہوئے ہیں۔ ان میں قاضی عبدالرشید ابراہیم کا نام صفِ اول میں لکھے جانے کے لائق ہے، ایک صحافی، مصنف، ماہرِ تعلیم، محبِ وطن، سیاسی رہنما اور مبلغِ اسلام کی حیثیت سے انھوں نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ان کا دائرۂ کار جاپان سے طرابلس اور سوئیڈن تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک سیاح کی حیثیت سے بھی وہ عالمِ اسلام کے ممتاز سیاحوں میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔ بلکہ ترکی میں وہ "سیاحِ شہیر" کے نام سے زیادہ معروف تھے، لیکن تعجب ہے کہ اس شہرت اور عظمت کے باوجود، دوسری زبانوں کو چھوڑ دیجیے خود ترکی زبان میں، میری معلومات کی حد تک ان کی کوئی سوانح عمری دستیاب نہیں۔ حوالے کی بعض کتابوں میں جیسے اشرف ادیب کی "اسلام ترک انسائیکلوپیڈیا" ابراہیم علاء الدین کی "ترک مشہور لری"۔ اور درگاہ یاینلری کی "ترک دیل و ادبیاتی انسائیکلوپیڈیاسی"، ان کے جو حالات ملتے ہیں وہ بہت ہی مختصر ہیں۔ اور ان کی بعض باتیں خصوصاً سنین کے حوالے ناقابلِ اعتبار معلوم ہوتے ہیں، میں نے ذیل کے مضمون میں ان کے زیادہ سے زیادہ حالات کو جو مجھے پاکستان میں حاصل ہو سکے ہیں ایک مربوط اور مستند شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ یہ کوشش بھی

قاضی عبدالرشید کے کارناموں اور حالات کو دیکھتے ہوئے ناقص ہی ہے لیکن پھر بھی قارئین اس کے ذریعے سے اس عظیم شخص کی خدمات سے بہت کچھ واقف ہو سکیں گے۔

حالات: قاضی عبدالرشید نسلاً ازبک تھے۔ اور ان کے اجداد خوقند (فرغانہ) کے رہنے والے تھے بعد میں یہ خاندان سائبیریا کے قصبے تارا[۵] میں آباد ہو گیا۔ جو شہر تو بولسک کے جنوب مشرق میں اور اومسک کے شمال میں دریائے ارتش کے کنارے واقع ہے۔ ان کے دادا ابراہیم تارا میں اخوند ابراہیم کہے جاتے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عالم کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ عبدالرشید ابراہیم کے والد کا نام عمر آفندی تھا۔ قاضی عبدالرشید تارا میں ۱۸۵۰ء یا ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۰ء کی روایت اشرف ادیب کی ہے۔ ابراہیم علاء الدین نے سال پیدائش ۱۸۵۳ء بیان کیا ہے۔ اور ترک دیل دادبیاتی انسی کلوپیدیسی نے بھی اسی کی پیروی کی ہے۔ لیکن ممتاز محقق ذکی ولیدی طوغان نے ان کی عمر ۹۴ سال لکھی ہے جس سے اشرف ادیب کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔[۶]

عبدالرشید ابراہیم نے بیس سال کی عمر تک کشکار (Kishkar) میں ایک مدرسہ میں دینی تعلیم حاصل کی۔ ارطغرل دزداغ نے غالباً اشرف ادیب کے حوالے سے لکھا ہے کہ انھوں نے ایک مدت کرغیز کے صحرائی میدانوں (اسٹیپ کے میدان) میں گشت کر کے تدریس و ارشاد کے فرائض انجام دیے۔ اس کے بعد ۱۸۷۹ء میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لیے[۷]

---

[۵] ابراہیم علاء الدین گودسا (Gorsa)، ترک مشہور لری ص ۱۲ (پہلا ایڈیشن استنبول) نیز اسلام ترک انسی کلوپیدیسی مجموعہ سی ج ۲ شمارہ ۵۳ ۔ ص ۳ ۔ ۴ بحوالہ ارطغرل دزداغ۔ صفحات تدقیقلری۔ ص ۱۹ ۔ ۲۰ (استنبول ۱۹۷۹ء)۔ [۶] ارطغرل دزداغ صفحات تدقیقلری ص ۱۹ (استنبول ۱۹۷۹ء)

استنبول گئے۔ وہاں سے وہ مکہ اور مدینہ گئے۔ مکہ میں ان کی ملاقات قفقاز کے عظیم مجاہد شیخ شامل سے ہوئی اور عبدالرشید ان سے متاثر ہوئے۔ اشرف ادیب کے خیال میں قاضی عبدالرشید کو ایک بے باک مجاہد بنانے میں اس ملاقات کا بڑا اثر ہے۔[۱] لیکن اشرف ادیب کا یہ بیان محل نظر ہے۔ کیونکہ امام شامل سنہ ۱۸۷۰ء میں حج کرنے کے بعد اور مدینہ میں چھ ماہ قیام کے بعد فروری سنہ ۱۸۷۱ء میں وفات پا چکے تھے۔[۲] اب یا تو یہ ملاقات نہیں ہوئی۔ اور اگر ہوئی تو سنہ ۱۸۷۰ء میں حج کے دوران ہوئی ہوگی۔ اور عبدالرشید کشکار میں تعلیم مکمل کرکے اس سال حج کو گئے ہوں گے۔ امام شامل سے ملاقات کے بعد وطن واپس آگئے ہوں گے، اور چند سال اسٹیپ کے میدانوں میں درس و ارشاد میں مصروف رہنے کے بعد سنہ ۱۸۸۵ء میں استنبول گئے ہوں گے۔ اشرف ادیب قاضی صاحب کے دوستوں میں سے تھے۔ اس لئے انھوں نے امام شامل سے ملاقات کا ذکر کرنے میں غلط بیانی نہیں کی ہوگی۔ ہاں سال ملاقات بیان کرنے میں غلطی ہو سکتی ہے۔

ابراہیم علاء الدین نے لکھا ہے کہ استنبول میں قیام کے دوران ان کی نامق کمال (سنہ ۱۸۴۰ء تا سنہ ۱۸۸۸ء) اور احمد وافق پاشا (سنہ ۱۸۲۳ء تا سنہ ۱۸۹۱ء) جیسے بیدار مغز دانشوروں سے ملاقات ہوئی۔ اشرف ادیب نے ممتاز ادیب معلم ناجی (سنہ ۱۸۵۰ء تا سنہ ۱۸۹۳ء) اور احمد حیت توں (سنہ ۱۸۴۴ء تا سنہ ۱۹۱۲ء) کے علاوہ جمال الدین افغانی سے بھی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ ان ملاقا کے نتیجے میں قاضی عبدالرشید کو روس میں مسلمانوں کے نظام تعلیم کی کمزوریوں کا احساس ہوا اور انھوں نے استنبول کے اخبار بصیرت میں اس سلسلے میں ایک مضمون لکھا جس کا عنوان "اسلامی مکتبوں میں تدریس و تعلیم کا پروگرام" تھا۔

۱؎ زکی ولیدی طوغان: خاطرہ لر، ص ۳۰۲ (استنبول سنہ ۱۹۶۹ء) ۲؎ جزال او غلو مصطفیٰ ذہنی: شیخ شامل۔ ص ۹۴ (انقرہ۔ سنہ ۱۹۵۵ء)

بصیرت ترکی کا ممتاز روزنامہ تھا۔ ۱۸۶۹ء سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ اور ۱۳ اپریل ۱۸۷۸ء تک جاری رہا۔ اس لئے اس کا امکان ہے، کہ قاضی عبدالرشید نے یہ مضمون ۱۸۷۰ء میں استنبول میں قیام کے اسی زمانے میں لکھا ہو۔ لیکن جمال الدین افغانی سے ان کی ملاقات اس زمانے میں ثابت نہیں ہوتی۔ جمال الدین پہلی مرتبہ ۱۸۷۰ء میں ترکی آئے تھے۔ اور ۱۸۷۱ء میں شیخ الاسلام کی مخالفت کی وجہ سے چلے گئے تھے، اس کے بعد وہ ۱۸۹۲ء میں ترکی آئے، اور ۱۸۹۷ء میں اپنی وفات تک ترکی میں رہے، اب یا تو ۱۸۷۰ء میں حج[1] کے لیے جاتے وقت قاضی عبدالرشید کی جمال الدین افغانی سے ملاقات ہوئی ہوگی یا پھر ۱۸۹۲ء اور ۱۸۹۷ء کے درمیان۔ اشرف ادیب نے لکھا ہے کہ عبدالرشید ابراہیم ۱۸۹۵ء میں روس چھوڑ کر استنبول آنے پر مجبور ہوئے تھے۔

ابراہیم علاء الدین نے لکھا ہے کہ قاضی عبدالرشید نے وطن واپس جا کر مسلمان ترکوں کے لیے استنبول کے مدرسوں کے اصول پر مدرسہ قائم کیا۔ اشرف ادیب نے لکھا ہے کہ ترکی سے سائبیریا[2] واپس جانے کے بعد قاضی رشید نے وہاں اسلامی خدمات انجام دیں، وہ اوفا میں روسی مسلمانوں کی مرکزی تنظیم[3] کی علاقائی شاخ کے صدر ہوئے، اس کے بعد مرکزی سربراہ کے دفتر کے رکن منتخب ہوئے غالباً اسی زمانے میں ان کے نام کے ساتھ قاضی کے لفظ کا اضافہ ہوا ہوگا۔

قیام ترکی | قاضی عبدالرشید علاوہ کی زندگی پر ہجرت کو ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے استنبول میں قیام کے زمانے میں "لوا الحمد" کے نام سے رسالے لکھے۔ اور ان کو چھاپ کر خفیہ طور پر روس پہنچایا ان کی

---

[1] اس زمانے میں روس کے مسلمان استنبول کے راستے حج کو جایا کرتے تھے۔ [2] ترک مصنف یورال اور والگا کے علاقے کو جس میں کازان اور بشکیریا کی ریاستیں ہیں۔ اکثر سائبیریا۔ اور مغربی سائبیریا لکھتے تھے [3] اس سے مراد روسی مسلمانوں کی وہ مرکزی تنظیم ہے جسے ۱۷۸۸ء میں دینی معاملات کی دیکھ بھال کے لیے ملکہ کیتھرائن دوم کے حکم سے قائم کیا گیا تھا۔ آج کل اسے مذہبی نظامت کہا جاتا ہے۔

ترغیب و تحریص سے ستر ہزار[1] روسی مسلمان ہجرت کر کے ترکی چلے آئے، اس کثرت سے لوگوں کے ترکی پہنچنے کی وجہ سے بڑا مسئلہ پیدا ہوگیا، اور مہاجرین کی ایک تعداد کو واپس روس جانا پڑا۔

ہمیں نہ تو قاضی عبدالرشید کے اوفا کی مذہبی نظامت کی رکنیت کے زمانے کی تاریخ و سال معلوم ہیں، اور نہ لواء الحمد کی طباعت اور روسی مسلمانوں کی ہجرت کی تاریخ معلوم ہے غالباً یہ واقعات ۱۸۹۵ء کے بعد کے ہیں کیونکہ اشرف ادیب کی تصریح کے مطابق قاضی عبدالرشید ۱۸۹۵ء میں روس چھوڑ کر استنبول آنے پر مجبور ہوئے تھے، اسی زمانے میں انھوں نے چولپان یلدزی (ستارۂ زہرہ) کے نام سے ایک کتاب لکھ کر شائع کی

روس میں واپسی | ۱۸۹۵ء کے بعد وہ کتنے عرصے ترکی میں رہے یہ نہیں معلوم لیکن ۱۹۰۲ء میں وہ ہمیں پھر روس میں نظر آتے ہیں۔ روس میں مسلمانوں کو اخبار اور رسالے نکالنے کی اجازت نہیں تھی، پوری سلطنت میں مسلمانوں کا صرف ایک اخبار ترجمان تھا، جسے مشہور مسلمان رہنما اسماعیل گسپرالی ۱۸۸۳ء سے کریمیا سے شائع کر رہے تھے، مسلمان اس کمی کو ایسے رسالے شائع کر کے پوری کرتے تھے، جو کسی مقررہ میعاد پر نہیں نکلتے تھے، اس قسم کے رسالوں میں قیوم ناصری کا "سالنامہ" خاص اہمیت رکھتا تھا۔ ۱۹۰۲ء میں عبدالرشید ابراہیم نے اسی قسم کا ایک رسالہ "مراۃ" کے نام سے پیٹرسبرگ سے شائع کرنا شروع کیا، یہ رسالہ ۱۹۰۳ء تک جاری رہا اور چونکہ سال میں کئی مرتبہ شائع ہوتا تھا، اس لئے عبداللہ بطال کے خیال میں قیوم ناصری کے سالنامے سے زیادہ مفید ثابت ہوا[2]

فروری ۱۹۰۵ء میں روس میں مشروطی انقلاب آگیا، زار کی استبدادی حکومت

---

[1] ابراہیم علاء الدین نے مہاجرین کی تعداد ایک لاکھ لکھی ہے، [2] عبداللہ بطال۔ کازان تورکلبری۔ ص ۱۲۷ - ۱۲۸۔

ختم ہوئی، اور ایک پارلیمنٹ قائم کردی گئی جسے دوما کہا جاتا تھا، سیاسی پارٹیوں کے قیام اور اخبار و رسالے نکالنے کی اجازت بھی مل گئی، مسلمانوں نے بھی ۱۹۰۵ء میں پانچ، ۱۹۰۶ء میں چودہ اور ۱۹۰۷ء میں بارہ اخبارات ترکی زبان میں نکالے۔[۱] قاضی عبدالرشید نے کازان سے "الفت" نامی اخبار ۱۹۰۵ء میں نکالا جو ۱۹۰۷ء تک جاری رہا،[۲] ممتاز عالم اور سیاسی رہنما موسیٰ جاراللہ نے اپنی مضمون نگاری کا آغاز اسی اخبار سے کیا تھا۔[۳]

سیاسی سرگرمیاں قاضی عبدالرشید نے اپنے اخبار کے ذریعے قومی امنگوں کی ترجمانی کرنے کے علاوہ سیاسی زندگی میں بھی عملی حصہ لیا۔ روس کے مسلمانوں نے اپنے مطالبات مرتب کرنے کے لیے تین کل روس مسلمان کانگریس منعقد کی تھیں، پہلی مئی ۱۹۰۵ء میں ہوئی تھی، دوسری جنوری ۱۹۰۶ء میں اور تیسری ۱۶ - ۲۱ اگست ۱۹۰۶ء میں ہوئی تھی، یہ تیسرا اجتماع شہر نجنی نووگورود میں قاضی عبدالرشید ابراہیم کی کوششوں سے ہوا تھا۔[۴] اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے عبدالرشید ابراہیم نے کہا

"اس صدی میں مسلمانوں اور اسلام کے خلاف ہر میدان میں مسیحی مبلغوں کی سرگرمیاں بڑھ گئی ہیں۔ انھوں نے مدرسوں، مسجدوں اور بستیوں میں انتہائی ظالمانہ طریقہ اختیار کر رکھا ہے، اور حکومت ان کی حمایت کرتی ہے مسلمانوں کی دینی حالت کی طرف سے بہت غفلت برتی جا رہی ہے، لہٰذا اس اجتماع میں اس خرابی پر بحث کرنا اور اس کا علاج تلاش کرنا ضروری ہے ہمیں اپنے دین کو اور اپنی قوم کو مسیحی مبلغوں کی یلغار سے بچانا چاہیے۔"[۵]

اس اجتماع کی ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اس میں عبدالرشید ابراہیم نے پہلی مرتبہ سوشلزم کی

---

[۱] عبداللہ بطال - کازان ترکلیری، ص ۱۰۰-۱۰۱ [۲] ارطغرل ذزداغ - صفحات تدقیقلری ص ۱۹ (استنبول ۱۹۶۹ء) [۳] حلمی ضیا - ترکی میں جدید افکار کی تاریخ (ترکی زبان)

[۴] بارہ مرزا حافظ - ترکستان روس اور چین کے درمیان (ترکی زبان) ص ۲۰۰ (استنبول ۱۹۴۵ء)

[۵] ایضاً

حمایت کی، اور کہا کہ سوشلزم ہمارے دین کی بنیاد ہے۔ اور ہمارے رسولؐ کے صحابہؓ نے ہر فیصلہ باہمی اشتراک سے کیا۔ بائے مرزا حائتا (HAYIT) عبدالرشید ابراہیم کے اس خیال پر تعجب کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انھوں نے سوشلزم کی اصطلاح کس وجہ سے استعمال کی اور اس کو صحابہ کی طرف کس طرح منسوب کیا، یہ بات میں سمجھ نہیں سکا لیکن حاضرین میں سے کسی نے اس بات کے خلاف آواز بلند نہیں کی۔[1]

یہ بات واقعی تعجب انگیز اور تحقیق طلب ہے، کیونکہ قاضی عبدالرشید کی اگلی اور پچھلی سرگرمیاں سوشلزم کی تائید نہیں کرتیں ممکن ہے، انھوں نے سوشلزم کو مساوات کے معنوں میں استعمال کیا ہو جیسا کہ بعض لوگ جن کا مارکسزم سے تعلق نہیں ہوتا، اب بھی اس اصطلاح کو عدل اجتماعی کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔

روسی مسلمانوں کی یونین کی سربراہی

مسلمانوں کا مذکورۂ بالا اجتماع اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں "روسیا مسلمانلری اتفاق" یعنی روسی مسلمانوں کی یونین کے نام سے ایک تنظیم قائم کی گئی، اور اس کے لیے ۲۰ دفعات پر مشتمل ایک پروگرام تیار کیا گیا، جو مسلمانان روس کے سیاسی، اقتصادی، اجتماعی اور دینی مطالبوں پر مشتمل تھا، اس پروگرام میں مسلمانوں کے لیے بنیادی حقوق اور خودمختاری کا مطالبہ بھی کیا گیا تھا، کانگریس نے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پندرہ افراد پر مشتمل ایک مجلس عاملہ کا دوسو نیس دوٹوں سے انتخاب بھی کیا، اور قاضی عبدالرشید کو اس کی سربراہی سپرد کی، مجلس عاملہ میں یوسف آقچورہ، اسماعیل گسپرالی، مفتی عالم جانؒ بارودی، صدری مقصودی اور موسیٰ جاراللہ جیسی عظیم شخصیتیں شامل تھیں، جو بلاشبہ روس کے مسلمانوں کی ممتاز ترین شخصیتیں تھیں۔ ان کی موجودگی میں مجلس عاملہ کی سربراہی قاضی عبدالرشید

---

[1] بائے مرزا حائتا۔ ترکستان روس اور چین کے درمیان ص ۲۰۰ (استنبول ۱۹۷۵ء)

کے سپرد کیا جانا ان کی غیر معمولی صلاحیت اور خدمات کا ثبوت ہے [1]

۱۰ مئی ۱۹۰۶ء کو پہلی دوما کے انتخاب میں مسلمانوں کے پچیس نمائندے منتخب ہوئے، لیکن زار نے گیارہ دن بعد ۲۱ مئی کو دوما توڑ دی۔ دوسری دوما کا انتخاب ۵ مارچ ۱۹۰۷ء کو ہوا، اور اس میں مسلمانوں کے ۳۵ نمائندے منتخب ہوئے، لیکن زار نے ۱۶ جون ۱۹۰۷ء کو یہ دوما بھی توڑ دی، روس حکومت نے اس پر ہی بس نہیں کیا، بلکہ سیاسی سرگرمیوں پر بھی پابندیاں لگا دیں اور اخبارات بھی بڑی تعداد میں بند کر دیے گئے ۱۹۰۷ء کے آخر میں جو تیسری دوما منتخب ہوئی اور جو ۱۹۱۲ء تک قائم رہی نئے انتخابی قوانین کے تحت منتخب ہوئی تھی، جن کے تحت ترکستان اور قفقاز کو نمائندگی سے محروم کر دیا گیا تھا کیونکہ یہ نوآبادیاں تھیں، صرف کازان اور یورال کے تاتاریوں کو انتخاب میں حصہ لینے کا حق دیا گیا، ۱۹۰۸ء میں "الفت" اخبار بھی بند ہو گیا، ان پابندیوں کی وجہ سے کئی مسلمان رہنما دل برداشتہ ہو کر ہجرت کر کے ترکی چلے گئے، ان میں یوسف آقچورہ، عیاض اسحاقی، اور علی حسین زادہ کے نام قابل ذکر ہیں، قاضی عبدالرشید بھی کچھ مدت کے لیے باہر چلے گئے، اور اشرف ادیب کے بیان کے مطابق ممالک اسلامیہ کی سیر کرتے ہوئے جاپان تک گئے، اپنی اس سیاحت کے تاثرات وہ کازان سے نکلنے والے اخبار "بیان الحق" میں اشاعت کے لئے بھیجتے رہے، اور جب ترکی میں ۲۴ جولائی ۱۹۰۸ء کو مشروطیت کا اعلان ہو گیا تو استنبول کے اخباروں میں مضامین بھیجتے رہے۔ [2]

قاضی عبدالرشید کی جلاوطنی | کتاب "بدیع الزماں سعید نورسی" کے ترک مصنف نجم الدین شاہینر (Shahiner) نے لکھا ہے کہ:

"عبدالرشید ابراہیم کو روسیوں نے اپنے لیے خطرناک جان کر ۱۹۰۸ء میں موسیٰ جاراللہ کے ساتھ جلاوطن کر دیا تھا، دونوں نے جاپان میں پناہ لی اور وہاں اسلام کی

---

[1] اس کانگریس کی تمام روئیداد اور پروگرام کا متن موسیٰ جاراللہ نے ۱۹۰۶ء میں کازان سے شائع کر دیا تھا پروگرام کے خلاصے کے لیے دیکھیے مرزا احمد اشرف کی مذکورہ بالا کتاب کا ص ۱۰۲ نیز ذینکوفسکی Zenkovsky کی کتاب "پان ترکزم" ص ۴۱-۴۴ [2] از طول و زد اغ (؟)۔ صفحات تدقیقلری۔ ص ۱۹۸

اشاعت کے سلسلے میں عظیم خدمات انجام دیں۔ عبدالرشید ابراہیم نے پورے جاپان اور
چین کی سیر کی اور چینی مسلمانوں کے حالات کا مشاہدہ کیا جن کی تعداد اس وقت چار کروڑ
تھی، عبدالرشید نے محسوس کیا کہ ان مسلمانوں کو تعلیم و تربیت کی سخت ضرورت ہے چنانچہ
اس کام میں مدد لینے کے لیے، اور علماء کی ایک تعداد چین بھیجنے کے لیے وہ استنبول آئے
اور سلطان عبدالحمید سے مدد کی درخواست کی، سلطان نے اس درخواست پر مثبت
ردعمل کا اظہار کیا، اور شیخ الاسلام جمال الدین کو حکم دیا کہ وہ قاضی عبدالرشید کی ہر ممکن
مدد کریں۔[1]

اس روایت کا یہ حصہ غلط ہے۔ کہ عبدالرشید کو موسیٰ جار اللہ کے ساتھ جلاوطن کیا گیا تھا۔
موسیٰ جار اللہ کئی سال مصر میں تعلیم پانے کے بعد حجاز اور ہندوستان ہوتے ہوئے سنہ ۱۹۰۴ء میں
اپنے وطن روستوف پہنچے تھے، اور سنہ ۱۹۰۸ء میں اپنی والدہ کے انتقال تک وہیں رہے، اس کے بعد
انھوں نے پیٹرسبرگ جاکر قاضی عبدالرشید کے ساتھ مل کر اخبار "تلمیذ" نکالا[2]، لیکن غالباً یہ اخبار
چند ہفتوں کے بعد ہی بند ہو گیا یا حکومت نے بند کر دیا۔ اشرف ادیب نے قاضی عبدالرشید کے
ممالک اسلامیہ کی سیر پر روانہ ہونے کا جو ذکر کیا ہے وہ شاید اسی زمانے سے تعلق رکھتا ہے، معلوم
ایسا ہوتا ہے کہ قاضی عبدالرشید کو روس سے نکال دیا گیا تھا، وہ چین کا سفر ہوتے ہوئے جاپان پہنچے،
ناکف کے مجموعہ کلام صفحات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ترکی میں ۲۴ جولائی سنہ ۱۹۰۸ء کو مشروطیت
کی بحالی کا اعلان کیا گیا تو قاضی عبدالرشید حیدرآباد (دکن) میں تھے، اور یہ اعلان سننے کے فوراً بعد

---

[1] نجم الدین شاہین ار: بدیع الزمان سعید نورسی، ص ۴، (استنبول سنہ ۱۹۷۰ء) یہ واقعہ نجم الدین نے ~~سنہ ۱۹۰۹ء~~ مورخ جمال قوتائے کی کتاب تاریخ صحبتلری، جلد ۵ ص ۲۰۴ سے نقل کیا ہے، جمال الدین آفندی کلاہ سنہ ۱۹۰۹ء سے فروری سنہ ۱۹۱۳ء تک شیخ الاسلام رہے تھے۔ [2] علی ضیا الکین: ترکی میں جدید افکار کی تاریخ (ترکی زبان)، ص ۴۴۴ (استنبول ۱۹۔)

استنبول چلے گئے، جاپان سے واپسی کا یہ سفر تھا، جس کے بعد انھوں نے سلطان عبدالحمید سے اسلام کی اشاعت میں مدد دینے کی درخواست کی۔

جاپان میں قیام: معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد قاضی عبدالرشید جلد ہی پھر جاپان چلے گئے، اشرف ادیب لکھتے ہیں "جاپان میں انھوں نے وسیع تعلقات قائم کئے، دانشوروں سے ملاقاتیں کیں۔"

"آسیا گی کائے" یعنی عظیم ایشیا کی جمعیت کے نام سے ایک جماعت قائم کی، کئی جاپانی ان کے ارشاد و تلقین سے مسلمان ہوئے، اور ترکی میں مشروطیت کی بحالی کے بعد عمر یاما اوکا کے ساتھ جو جاپان کے اولین مسلمانوں میں سے تھے، استنبول آئے۔"[1]

مذکورہ بالا بیان کی تائید خود ایک جاپانی دانشور عبدالکریم سائیتوہ[2] کے ایک مضمون سے ہوتی ہے جو انھوں نے مسلمان اقلیتوں کے انسٹی ٹیوٹ آف جدہ کے مجلہ "جرنل" میں لکھا ہے، وہ کہتے ہیں

"۱۹۰۸ء میں ایک ترک عبدالرشید ابراہیم جو روس میں پیدا ہوئے تھے، جاپان آئے، تاتاریوں کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنے کی وجہ سے ان کو روس سے جلا وطن کر دیا گیا تھا، جاپان آنے سے پہلے وہ کاشغر گئے تھے تاکہ اپنی تحریک کے لیے تائید حاصل کریں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے انور پاشا کے ساتھ مل کر جنگ میں حصہ لیا تھا، عبدالرشید ابراہیم جاپانی سپہ سالار جنرل اکاشی (Akashi) کے اچھے دوست تھے، اور جنرل موصوف نے جاپان آنے میں ان کی مدد کی تھی۔ وہ ایک پارسا اور نیک مسلمان تھے"

---

[1] اردو طرز و زر داغ: صفحات ندیم عثمری۔ ص ۱۹۰ [2] عبدالکریم سائیتوہ (Saito) ٹوکیو کی تاکوشوکو یونیورسٹی میں تاریخ اور فارسی کے پروفیسر رہے ہیں وہ جاپانی مسلمانوں کی پہلی تنظیم جاپان مسلم ایسوسی ایشن کے صدر بھی رہ چکے ہیں، اور اب نو تشکیل یافتہ اسلامی تنظیموں کی کونسل کی رابطہ کمیٹی کے صدر ہیں، جو المرکز الاسلامی جاپان کے نام سے کام کر رہی ہے۔

اور شاید جاپان میں پہلے مسلمان مبلغ اسلام تھے، ان کی وجہ سے کئی جاپانیوں نے اسلام قبول کیا۔ سنہ ۱۹۴۴ء میں جاپان میں ان کا انتقال ہوا، جن لوگوں نے عبدالرشید ابراہیم کی بدولت اسلام قبول کیا، ان میں سب سے ممتاز کوتارو یاماوکا (Kotaro Yamaoka) کی شخصیت ہے جو ۱۸۸۰ء میں ہیروشیما میں پیدا ہوئے تھے، ٹوکیو میں واقع بیرونی زبانوں کے مدرسے کے فارغ التحصیل تھے، اور سنہ ۱۹۰۴ء تا ۱۹۰۵ء کی روسی جاپانی جنگ میں حصہ لیا تھا، جنگ کے بعد عبدالرشید ابراہیم سے ان کی ملاقات ہوئی، اور ان کے ساتھ انھوں نے ۱۹۰۹ء میں حج کیا، وہ اتحاد ایشیا اور اتحاد اسلام کے بڑے علمبردار تھے۔[1]

ایک اور ممتاز جاپانی دانشور الحاج ابوبکر موری موتو نے جنھوں نے ۱۹۶۵ء میں اسلام قبول کیا تھا، ٹوکیو کے انگریزی رسالے "اسلامک کلچر فورم" کی اپریل ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں وضاحت کی ہے کہ عمر متسوتارو یاماوکا پہلے جاپانی مسلمان تھے، جنھوں نے فریضۂ حج ادا کیا، اور ان کی اپنی لکھی ہوئی کتاب کے مطابق انھوں نے یہ حج ۱۹۰۹ء میں کیا تھا۔[2]

اشرف ادیب نے قاضی عبدالرشید اور عمر یاماوکا کے استنبول آنے کا ذکر کیا ہے، لیکن حج کا ذکر نہیں کیا۔ یہ بات جیسی عبدالکریم سائیتو اور ابوبکر موری موتو کے بیان سے معلوم ہوتی ہے لیکن اس جگہ مشکل یہ ہے کہ ۱۹۰۹ء میں دو حج ہوئے تھے، ایک ۳ جنوری ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۲۶ھ کو

---

[1] Journal (جدہ) جلد اول شمارہ اول ۱۹۶۹ء۔ عبدالکریم سائیتو کے اس مضمون کا اردو ترجمہ ستمبر ۱۹۷۰ء کے فکر و نظر (اسلام آباد) میں شائع ہو چکا ہے، یہ ترجمہ میری زیر طبع کتاب تاریخ اسلام کا مطالعہ" حصہ دوم میں بھی شامل ہے۔ [2] ابوبکر موری موتو کے اس مضمون کے ترجمہ کے لیے ملاحظہ کیجیے روزنامہ جسارت، کراچی ۲۲ر-۵ر- اور ۲۶ر۵ر ۱۹۷۲ء نیز تاریخ اسلام کا مطالعہ جلد دوم۔

اور دوسرا ۲۳ر دسمبر ۱۰ر ذی الحجہ ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱ء کو اب یہ معلوم نہیں کہ عمر یا ماہو کا نے قاضی عبدالرشید کے ساتھ کونسا حج کیا، قاضی صاحب کے حالات کی مذکورہ بالا ترتیب سے گمان یہی ہے کہ یہ ۱۹۱۰ء کا دوسرا حج ہوگا، اگر کوئی محقق عمر یاماہو کا کی کتاب سے مدد لے تو یہ مسئلہ قطعی طور پر حل ہوسکتا ہے، اور ان کے سفر استنبول پر بھی روشنی پڑ سکتی ہے۔

قاضی عبدالرشید استنبول میں | معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد قاضی عبدالرشید، استنبول میں رہ گئے، کیونکہ ان کے سفرنامہ کی پہلی جلد مطبع احمد ساقی بے استنبول سے اگلے سال، اور دوسری جلد قدر مطبعسی سے ۱۳۲۹ھ میں شائع ہوئی، اس سفر ترکی پر ہفت روزہ صراط مستقیم ۷ یکم جولائی ۱۹۱۰ء شمارہ ۹۷ کی اشاعت میں کے شاعر اسلام محمد عاکف نے تبصرہ کرتے ہوئے اسکو انتہائی اہم کتاب قرار دیا۔ طغرل وزداغ لکھتے ہیں اپنے سفرنامہ کی اشاعت کے بعد وہ صراط مستقیم کے حلقے میں شامل ہوگئے، جو استنبول میں اسلامی فکر رکھنے والے مفکروں اور مصنفوں اور جس کے ناشر اشرف ادیب اور ایڈیٹر محمد عاکف تھے، اب قاضی عبدالرشید کی تقریریں وعظ اور مضامین بھی اس رسالے میں شائع ہونے لگے [1]

عاکف اور قاضی عبدالرشید | عاکف اور قاضی عبدالرشید میں جلد ہی گہرے تعلقات قائم ہوگئے، دونوں ایک دوسرے کی صلاحیتوں کے مداح تھے، ایک مرتبہ قاضی عبدالرشید نے عاکف سے کہا "عاکف تمہارے اشعار دلوں میں آگ لگا دیتے ہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں، بوڑھا ہوگیا ہوں اور جان قربان کر دینے کا زمانہ گزر گیا، اگر یہ اشعار تم نے بیس سال پہلے لکھے ہوتے تو میرے لیے بڑی قوت کا باعث ہوتے میں نے سارے ایشیا اور افریقہ کی سیر کی ہے لیکن تمہاری طرح کا شاعر کہیں نہیں دیکھا۔" [2]

---

[1] ارطغرل وزداوغلو۔ صفحات سے تیقنکر یلہ۔ ص ۱۹۹۔ [2] ارطغرل صندوغلو بہ صفحات تیقنر ص ۱۹۹ - ۲۰۰ بحوالہ کتاب محمد عاکف مرتبہ اشرف ادیب۔ ص ۲۳۰ (استنبول ۱۹۳۸ء)

عاکف بھی اسی طرح قاضی عبدالرشید کے مداح تھے۔ ان کے مجموعۂ کلام "صفحات" کی دوسری دوسری نظم "سلیمانیہ کرسی سندہ" (جامع سلیمانیہ کے منبر پر) میں عاکف نے جس واعظ کا ذکر کیا ہے، وہ قاضی عبدالرشید ابراہیم ہی ہیں۔ اس نظم میں عاکف نام لیے بغیر ان کا تعارف اس طرح کراتے ہیں۔

"منبر پر کون تھا؟ ایک بوڑھا تھا جس کو میں جانتا نہیں تھا لیکن چہرے بشرے میں ایک جاذبیت تھی، کہ وہ دل کو اجنبی نہیں لگتا تھا۔ سفید داڑھی، سفید دستار، کشادہ پیشانی اور محبت بھری نظریں۔ لوگوں نے اس کو اس طرح گھیرے میں لے رکھا تھا، جیسے چاند کے گرد ہالہ ہوتا ہے۔ اس کے چہرے سے کیسا جلال و جمال نمایاں تھا۔"

عاکف نے اس نظم میں جو جنگ طرابلس کے بعد ۱۹۱۲ء میں لکھی تھی، دنیائے اسلام کا جو نقشہ کھینچا ہے، اور اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ اسی واعظ یعنی قاضی عبدالرشید کی زبان سے کیا ہے۔ عاکف پر ان کی کتاب "دنیائے اسلام" نے گہرا اثر ڈالا تھا، اور وہ بعض اوقات قاضی عبدالرشید سے افطار کے وقت سے سحری کا وقت ہونے تک دنیائے اسلام اور مسلمانوں کی زبوں حالی کے حالات اور مسائل پر گفتگو کرتے رہتے تھے۔[۱]

قاضی عبدالرشید ترکی میں | ابراہیم علاءالدین نے اس زمانے کی سرگرمیوں پر صرف ایک جملہ لکھا ہے کہ قاضی عبدالرشید ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد ترکی آکر اتحاد اسلام اور اتحاد ترک کا پروپیگنڈہ کیا۔[۲] ارطغرل وزداغ نے اس میں مزید اضافہ کرتے ہوئے یہ بھی بتایا ہے کہ عبدالرشید طرابلس پر

---

[۱] اکمرت ادیب۔ محمد عاکف ص ۲۳۹ - ۲۳۹ (بحوالہ صفحات: تمہیدی ص ۱۰)

[۲] علاءالدین ابراہیم۔ ترک مشہور لری انسی کلوپیدیسی۔ ص ۱۳۵۔

اٹلی کے حملے کے موقع پر (سنہ ۱۹۱۱ء) طرابلس گئے تھے، اور وہاں افریقہ کی اسلامی تحریک میں شرکت کی، پھر پہلی عالمی جنگ اور بالشویک انقلاب کے بعد مشرقی ترکستان جاکر انھوں نے وہاں کی سرگرمیوں میں حصہ لیا، کاشغر جانے اور انور پاشا کے ساتھ ملکر جنگ کرنے کا اشارہ ڈاکٹر عبدالکریم سائیتو نے بھی کیا ہے، جس کا تذکرہ اوپر کیا جاچکا ہے۔

لیکن ڈاکٹر بائے مرزا حائط نے جو معلومات اس سلسلے میں فراہم کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ عظیم کے زمانے میں اور اس کے فوراً بعد قاضی عبدالرشید اپنے وطن کی آزادی کے سلسلے میں یورپ میں زیادہ مصروف رہے اور اگر وہ ترکستان گئے تو جنگ کے بعد گئے، بائے مرزا حائط سنہ ۱۹۰۶ء کی تیسری کل روسی مسلم کانگریس کی قرار دادوں اور پروگرام کے تذکرے کے بعد لکھتے ہیں کہ جب کانگریس کے تحت قائم کردہ مجلس عاملہ جس کے صدر عبدالرشید ابراہیم تھے، روسی حکومت سے اپنے مطالبات دمنوا سکی تو مسلمان روسی حکومت کی طرف سے مایوس ہوگئے، لیکن جب جنگ عظیم شروع ہوئی تو اس مجلس کے دو ارکان یوسف اکچورہ اور عبدالرشید ابراہیم نے یورپ جاکر اپنے مطالبات کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے کی کوشش کی، یوسف اکچورہ نے برلن میں سنہ ۱۹۱۶ء میں ایک انجمن قائم کی جس کا نام "جمعیت تحفظ حقوق اقوام ترک دتاتار" تھا۔ اور عبدالرشید ابراہیم نے اسٹاک ہالم (سویڈن) میں ایک کانفرنس میں روسی مسلمانوں کی نمائندگی کی۔ یہ کانفرنس سلطنت روس کے غیر روسی باشندوں کی ایک جمعیت نے طلب کی تھی۔ اس جمعیت نے ۹ مئی سنہ ۱۹۱۶ء کو ایک یادداشت امریکہ کے صدر ولسن کو پیش کی جس میں روسی مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کا تذکرہ کیا گیا تھا۔[1]

---

[1] ارطغرل دوزداغ، صفحات تیقظری، ص ۲۰، ارطغرل دوزداغ کی اس معلومات کا ماخذ غالباً شرف ادیب کا وہ مضمون ہے جو انھوں نے سلام ترک مشہ کو پیدیسی مجموعہ سی جلد ۲ شمارہ ۴۳-۵۲ میں صفحہ ۲۰۳ پر لکھا تھا اور جس کا حوالہ خود ارطغرل دوزداغ نے صفحات تیقظری میں دیا ہے۔ [2] بائے مرزا حائط، ترکستان روس اور چین کے درمیان (ترکی زبان) ص ۲۰۲ (استنبول سنہ ۱۹۷۵ء)

اشتراکی انقلاب | روس میں اکتوبر ۱۹۱۷ء میں اشتراکی انقلاب آجاتا ہے، اور زار کی حکومت ختم کردی جاتی ہے، روس کی محکوم قومیں موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی اپنی آزادی کا اعلان کر دیتی ہیں۔ مسلمان بھی حالات سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اور اشتراکی رہنما بھی ان کو آزادی دینے کا اعلان کر دیتے ہیں کل روس مسلم اجتماعات کا سلسلہ جو ۱۹۰۶ء کی تیسری مسلم کانگریس کے بعد بند ہو گیا تھا، پھر شروع ہو جاتا ہے۔ فروری ۱۹۱۸ء میں کریمیا کے مسلمان آزادی کا اعلان کر دیتے ہیں، ۲۲ جنوری ۱۹۱۸ء کو ایدل یورال کے مسلمان، ۱۰ نومبر ۱۹۱۷ء کو باشقردستان، ۱۱ دسمبر ۱۹۱۷ء کو قازقستان کے مسلمان ۱۱ مئی ۱۹۱۸ء کو داغستان کے مسلمان، اور ۲۸ مئی ۱۹۱۸ء کو آذربائیجان کے مسلمان بھی آزادی کا اعلان کر دیتے ہیں۔ ترکی میں "لشکر اسلام" منظم کیا جاتا ہے، اور عثمانی ترکوں کی فوجیں اپنے بھائی ترک مسلمانوں کی آزادی میں مدد دینے کے لیے قفقاز کے علاقے میں پیش قدمی کرتی ہیں، اور ستمبر ۱۹۱۸ء میں باکو پر قابض ہو جاتی ہیں، اور داغستان کے شہر دربند تک پہنچ جاتی ہیں، لیکن اس کے بعد جنگ کا پانسہ پلٹ جاتا ہے، اور ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو ترکی اتحادیوں کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے، اور اپنی فوجوں کو قفقاز سے واپس بلا لیتا ہے، روسی اشتراکی بھی اپنے اعلان سے پھر جاتے ہیں، روسی مسلمانوں کی امیدیں خاک میں مل جاتی ہیں، تمام مسلمان ریاستوں کی آزادی بزور قوت ختم کر دی جاتی ہے، یہاں تک کہ اگست ۱۹۲۲ء میں تاجکستان کے پہاڑوں میں انور پاشا کی شہادت کے ساتھ روسی مسلمانوں کی آزادی کی جدوجہد کا یہ باب بند ہو جاتا ہے۔

تاریخ دولت عثمانیہ

سلطنت عثمانیہ خداداد کے عروج و زوال، عثمان اول سے پہلی جنگ عظیم تک کی مفصل تاریخ اور موجودہ جمہوریہ ترکیہ کے کارناموں کا مرقع۔ مرتبہ ڈاکٹر محمد عزیز صاحب ایم اے سابق رفیق دارالمصنفین۔ قیمت جلد اول ۔۔۔ روپیہ، قیمت جلد دوم ۔۔۔ روپیہ

آثارِ علمیہ و ادبیہ

مولانا حمید الدین فراہی کا ایک غیر مطبوعہ خط

از شرف الدین اصلاحی

حضرت قبلہ و کعبہ جناب والد ماجد مدظلہم

پس از تسلیم معروض ہے، خدائے پاک کا شکر ہے کہ اچھی طرح ہوں، اب مجھے ہر طرح سے اطمینان حاصل ہو گیا انشاء اللہ بہت جلد عریضہ ارسال خدمت کیا کروں گا، اس سے پہلے جو کچھ ارسال عریضہ میں تقصیر ہوئی ہے اس کی معافی کی امید رکھتا ہوں، جناب مولانا کے مکان کے اوپر ایک کوٹھا ہے، جس میں مولوی محمد شبلی صاحب رہا کرتے تھے، میں نے ایک روپیہ آٹھ آنے کرایہ پر لے لیا ہے، دن بھر حضرت مولانا ہی کی خدمت میں رہتا ہوں، اور اس لیے میں نے اس مکان کو لیا کہ مولانا سے قرب رہے، عنقریب مولوی عبد اللہ ایک شخص اسی کوٹھے پر آئیں گے جب کرایہ میں مجھے تخفیف ہو جائے گی، ابھی مجھے کوئی ضرورت نوکری کی نہیں معلوم ہوتی، مقدمہ کی کیا حالت ہے، عزیزی عبد الرشید و صدر الدین کیا پڑھتے ہیں، حسب ارشاد میں نے ایک انٹرنس پاس لڑکے سے جو مجھ پر نہایت مہربان ہے انگریزی شروع کر لی، پرسوں انشاء اللہ صدر اور پانچ چھ روز میں اگر خدائے پاک نے چاہا تو حماسہ شروع ہو جائے گی، اس بات سے مجھے بڑی ندامت معلوم ہوتی ہے کہ جواب عریضہ جلد آتا ہے، اور مجھ سے دیر ہو جاتی ہے مگر اب انشاء اللہ ہرگز دیر نہ ہوگی۔ فقط

زیادہ حد ادب

بخدمت جناب والدہ صاحبہ و ہمشیرہ صاحبہ و والدہ شان تسلیم قبول باد و ہمہ عزیزان علاوہ سلام

۱۲ عبدالحمید

محررہ بالا خط ہمیں محترم مولوی ابوسفیان صاحب اصلاحی نے موضع ہمئی پور ضلع اعظم گڑھ یوپی۔ انڈیا سے بھیجا ہے، ابوسفیان صاحب پرانے اصلاحیوں میں سے ہیں اور عمر کی اس منزل میں ہیں کہ انیس کی طرح زبان قال سے نہیں تو زبان حال سے کہہ سکتے ہیں۔

انیس دم کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ   چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

جس خط کو انھوں نے زندگی کی متاع عزیز سمجھ کر مدت مدید سے چھپا کے رکھا تھا اسے اب یہ سمجھ کر میرے حوالہ کر دیا ہے کہ شاید میرے ذریعہ اس کی حفاظت کا کوئی معقول انتظام ہو جائے، میں نے مولانا فراہی کے متعلق اس طرح کے بہت سے نوادرات جمع کیے ہیں اور ارادہ ہے کہ ان کو ایک مجموعے کی صورت میں چھپوا کر محفوظ کر دیا جائے، یہ ارادہ کب اور کیسے پورا ہوتا ہے اس کا جواب مستقبل کے پردۂ غیب میں مستور ہے لیکن خاص اس خط کے بارے میں اس کی اہمیت کے پیش نظر میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اسے ابھی شائع کر دیا جائے اور مجموعے کی اشاعت کے انتظار میں اسے دوسرے خطوط کی طرح معرض التوا میں نہ رکھا جائے۔
اس خط کی اہمیت مجرد اس کے مضمون سے شاید واضح نہ ہو، جب تک کہ اس کا پس منظر معلوم نہ ہو، پھر خط اتنا خود وضاحتی ہے بھی نہیں، نفس خط کے متعلق بہت سی باتیں وضاحت طلب اور استفہامی نیچر کی ہیں، سب سے پہلا ایک بنیادی سوال تو یہی پیدا ہوتا ہے کہ اس خط کی نسبت مولانا فراہی کی طرف مسلمہ اور ناقابل تردید ہے، یا متنازعہ فیہ بھی ہو سکتی ہے، خط میں مکتوب نگار کا نام عبدالحمید ہے، مکتوب الیہ کا نام پتہ سرے سے موجود نہیں۔

سلہ ۱۲ کا عدد لفظ فقط کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔

تاریخ اور مقام یعنی کب اور کہاں سے لکھا گیا یہ بھی مذکور نہیں۔ خط کے مضمون کا ان امور سے گہرا تعلق ہے۔ میرے لیے اس خط کی اہمیت اس لحاظ سے ہے کہ میں مولانا فراہی کی سوانح عمری لکھ رہا ہوں۔ مولانا فراہی کے متعلق اتنا تو معلوم ہے کہ وہ عربی تعلیم کی تکمیل کے لیے کچھ عرصہ آکر لاہور میں رہے۔ مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے جو اورینٹل کالج لاہور میں عربی ادب کے استاد تھے، کالج میں داخل ہو کر نہیں خارج میں بھی طور پر ان سے تحصیل کی۔

اس حد تک تو ثابت اور مسلّم ہے، لیکن ظاہر ہے اتنی مختصر معلومات سے سوانح حیات کے تقاضے پورے نہیں ہوتے۔ میں نے تفصیلات کی تلاش میں بہت زور مارا، کیا کیا جتن کیے مگر اس عنوان سے کہیں سے کوئی مواد حاصل کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اگر یہ خط مولانا فراہی کا ہے، اور اس کا تعلق ان کے قیام لاہور سے ہے تو اہل علم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مولانا فراہی کے سوانح نگار کی حیثیت سے میری نظر میں اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کیا ہو سکتی ہے۔ ابوسفیان اصلاحی کو مولانا فراہی سے جو بھی عقیدت اور محبت ہو وہ مولانا کے حالات زندگی سے اتنے باخبر نہیں ہو سکتے جتنا میں ہوں۔ میں برسوں سے ان پر کام کر رہا ہوں۔ ان کی سوانح حیات میرا ریسرچ پروجیکٹ ہے۔ اس ناطے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ فراہی شناسی میں مجھے مہارت تامہ یا مہارت نہیں تو شدبد اور ابجد خوانی کا درجہ ضرور حاصل ہے۔ میں نے خط پڑھا تو پڑھتے ہی اول وہلہ جو خیال میرے ذہن میں بجلی بن کر کوندا اور جس نے میرے دل کو سرور و بہجت سے معمور کر کے سرشار کیا، یہ تھا کہ خط مولانا فراہی کا ہے۔ اور اس کا تعلق ان کے قیام لاہور سے ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس خط میں مذکور ہر بات کا محل بھی متعین ہو کر میرے ذہن میں آگیا۔ یہ خط میں نے بار بار پڑھا اور ہر بار قدم قدم پر تشنگی اور ناتمامی کا احساس ہوا اور حسرت پیدا ہوئی کہ کاش مولانا یہ بھی لکھ جاتے، وہ بھی لکھ جاتے۔ لیکن ظاہر ہے انھوں نے یہ خط میرے منصوبے کی تکمیل کے لیے تو لکھا نہیں۔ معمولی خیر و عافیت اور دیگر حالات کی اطلاع کیلئے لکھا

مولانا کا خط پڑھنے کے بعد میں نے ابو سفیان صاحب کا خط پڑھا مجھے یہ دیکھ کر خوشی اور طمانیت حاصل ہوئی کہ انھوں نے اس خط کے بارے میں جو الفاظ لکھے ہیں ان سے میرے خیال کی تائید ہوتی ہے، میں چاہتا ہوں کہ ان کے الفاظ یہاں نقل کر دوں۔

"مولانا فراہی کا خط اپنے والد محترم کے نام جب کہ وہ لاہور مولانا فیض الحسن صاحب کے یہاں پڑھنے گئے تھے"[1]

ابو سفیان صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ انھیں یہ خط کہاں سے کب ملا۔

اب ہم اصل خط، اس کے مندرجات اور بعض ان نکات اور سوالات کا جائزہ لیں گے جن میں ابہام ہے یا جو وضاحت طلب ہیں، خط میں مکتوب نگار کا نام عبدالحمید ہے، یہ معلوم ہے کہ مولانا فراہی کے دو نام تھے حمید الدین اور عبدالحمید اگرچہ وقت اور حالات کے ساتھ ان کے استعمال میں فرق اور تبدیلی واقع ہوتی رہی، لیکن ان کی زندگی میں ان دونوں ہی ناموں کا ذکر کثرت سے ملتا ہے، ابتدائی زندگی میں صرف عبدالحمید، اور بعد کے ادوار میں عبدالحمید اور حمید الدین دونوں کا ثبوت دستاویزات سے ملتا ہے، ہم نے اپنی کتاب میں نام کے مسئلے پر تفصیل سے بحث کی ہے، ہم نے اس سے پہلے تک کے دریافت شدہ خطوط کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ مولانا کے اپنے خطوط میں ان کا نام بلا استثنا حمید الدین لکھا ہوا، ملتا ہے، مگر اس خط کی دریافت کے بعد ہمیں اپنے اس بیان پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔ یہ مولانا کا سب سے قدیم خط ہے، جو ہمیں اب تک مل سکا ہے، اس خط سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے لکھنے کے زمانے تک دونوں بھائیوں کے نام عبدالحمید اور عبدالرشید تھے جو بعد میں حمید الدین اور رشید الدین ہو گئے۔ اس کے اسباب سے بھی ہم نے اپنے مقالے میں بحث کی ہے۔" نام کی بحث میں یہ خط غیر معمولی طور پر اس لحاظ سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ

---

[1] ابو سفیان اصلاحی، خط مورخہ نومبر ۲۰۰۵ء، قلمی۔

مولانا کے اپنے خط میں ان کے اپنے قلم سے ان کا نام عبدالحمید اور چھوٹے بھائی کا نام عبدالرشید لکھا گیا ہے،
جب کہ اس زمانے تک حمید الدین اور رشید الدین کا ذکر بھولے سے کہیں ایک جگہ بھی نظر نہیں آیا۔
نام کے علاوہ خط کے مضمون میں اور بھی جتنی باتیں ہیں وہ سب کی سب مولانا فراہی پر منطبق ہوتی ہیں۔
مثلاً یہ کہ خط میں جن تین اشخاص کا ذکر نام کی صراحت کے ساتھ ہے، وہ تینوں مولانا کے عزیز اور رشتہ دار
ہیں، عبدالرشید مولانا کے بھائی ہیں، صدر الدین ان کی پھوپھی زاد بہن کے لڑکے ہیں، مرزا صدر الدین
اور پھوپھی زاد بہن کا ذکر مولانا کے حالات میں اکثر آتا ہے، مولانا کے اپنی کوئی بہن نہیں تھیں، مولانا
ان ہی کو بہن سمجھتے تھے، ان ہی کی وفات پر ایک پر درد اور اثر انگیز مرثیہ لکھا تھا، جو موجودہ دیوان
میں ہے، جس سے اکثر لوگ یہ سمجھنے لگے کہ مولانا کے کوئی بہن بھی تھیں، اس خط کے آخر میں "ہمشیرہ صاحبہ"
سے وہی مراد ہیں اور چونکہ وہ حقیقی بہن نہیں تھیں، اس لیے ان کی والدہ کا ذکر "والدہ شان" کے الفاظ سے
کیا، مرزا صدر الدین اور مولانا کے والد کے درمیان جائداد کا مقدمہ چلا تھا، جس میں مولانا نے ثالث
کا فریضہ انجام دیا، اور فیصلہ اپنے والد کے خلاف دے دیا۔ یہ وہی صدر الدین ہیں، مولوی محمد شبلی
سے مراد علامہ شبلی نعمانیؒ ہیں، جو ایک نہیں متعدد واسطوں سے مولانا کے رشتہ دار بھی تھے، اور مولانا
نے ان سے پڑھا بھی تھا۔

اس خط سے مولانا کے قیام لاہور سے متعلق کئی مفید باتوں کا پہلی بار علم ہوتا ہے، لاہور میں مولانا
کی رہائش مولانا فیض الحسن صاحب کے مکان کے اوپر والے حصے میں تھی جس میں مولانا شبلیؒ بھی جب لاہور آئے
تھے، کچھ عرصہ رہے تھے، مولانا اس کا کرایہ [illegible] روپیہ ماہوار ادا کرتے تھے، یہ نہیں معلوم کہ مولانا سہارنپوری
خود بھی کرایہ دار کی حیثیت سے رہتے تھے، یا یہ مکان ان ہی کا تھا، سہارنپوری صاحب کے بارے میں
بعض دوسرے ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھاٹی گیٹ میں رہتے تھے۔ مولانا فراہی نے استاد الادب سے
جو کتابیں پڑھیں ان میں سے دو کا ذکر اس خط میں آیا ہے [illegible] خط کے مضمون سے مترشح

ہوتا ہے کہ ان کتابوں سے شروعات نہیں ہوئی، ان سے پہلے بھی کچھ کتابیں پڑھی ہوں گی۔ اور ان کے بعد بھی، ادب جاہلی مولانا سہارنپوری کا خاص میدان تھا، مولانا فراہی کے ہاں کلام جاہلیت کے ساتھ جو اعتنا اور شغف نظر آتا ہے، اس میں استاد کے فیض کا حصہ یقیناً نمایاں رہا ہوگا۔ اس خط سے ایک نئی بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ مولانا فراہی نے انگریزی کا آغاز لاہور میں کیا تھا اپنے والد کے حسب ہدایت، اس لحاظ سے لاہور ایک طرف مولانا کی عربی تعلیم کی حد اختتام ہے، تو دوسری طرف انگریزی تعلیم کا نقطۂ آغاز بھی، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے مولانا کے حالات میں لکھا ہے کہ انھوں نے نجی طور پر انگریزی پڑھ کر کرنل گنج ہائی اسکول الہ آباد میں داخلہ لیا۔[1] اس خط سے معلوم ہوا کہ اس نجی تعلیم کا پہلا مرحلہ لاہور میں طے ہوا، اس خط میں تاریخ کا ذکر نہیں لیکن اندازاً مولانا ۸۲ - ۱۸۸۰ میں لاہور گئے ہوں گے۔ ۱۸۸۰ غالباً مولانا سہارنپوری کا سال وفات ہے۔ اس لحاظ سے یہ خط سو سال پرانا ہو چکا ہے۔ اس خط کی ظاہری حالت ہر اعتبار سے اس کی قدامت کی غماز ہے، اس خط کا خط البتہ اس کے خلاف شہادت دیتا ہے کہ یہ مولانا فراہی کا لکھا ہوا ہے، اس میں وہ پختگی اور خوبصورتی نہیں جو مولانا کی تحریر کا خاصہ ہے۔ اس کی ...وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ہماری نگاہیں جس خط کی عادی ہیں، اس کا تعلق بہت بعد کی زندگی سے ہے، اور اس خط کا تعلق ابتدائی زندگی سے ہے جو صحیح معنوں میں طالب علمی کا زمانہ تھا۔ لیکن خط اتنا خراب بھی نہیں، نقش اول میں نقش ثانی کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔

---

[1] یادرفتگان۔ ص ۱۳۱۔

وفیات

آہ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ

از جناب شیخ نذیر حسین صاحب مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام پنجاب یونیورسٹی لاہور

پاکستان کے ممتاز عالم، نامور ادیب اور معروف نقاد اور اردو زبان کے محسن ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے ۱۴ اگست ۱۹۸۶ء کو اسّی برس کی عمر میں اس عالم فانی کو الوداع کہا۔ ان کی وفات سے پنجاب یونیورسٹی اور اورینٹل کالج کی وہ علمی روایت اختتام کو پہنچی جس کا آغاز مولوی فیض الحسن[1] سہارنپوری اور مفتی محمد عبداللہ ٹونکی[2] کی علم پرور مساعی سے ہوا تھا اور اس کو مولوی محمد شفیع، سید اولاد حسین شادان بلگرامی رام پوری، مولوی عبدالعزیز میمن اور حافظ محمود شیرانی مرحومین نے پروان چڑھایا تھا۔

ڈاکٹر سید عبداللہ ۱۹۰۶ء میں قصبہ منگلور، تحصیل و ضلع مانسہرہ صوبہ سرحد میں پیدا ہوئے وہ گورنمنٹ ہائی اسکول ایبٹ آباد کی نویں جماعت میں زیر تعلیم تھے کہ تحریک خلافت کا غلغلہ بلند ہوا۔ اور وہ علی گڑھ جاکر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخل ہوگئے، علی گڑھ میں ان کا دل نہ لگا تو وہ چند ماہ کے بعد لاہور چلے آئے اور اہل حدیث کے مشہور مدرسہ مسجد چینیاں

---

[1] مولوی فیض الحسن سہارنپوری (م ۱۸۸۷ء)، عربی زبان کے مشہور ادیب و شاعر، دیوان الحماسہ اور سبعہ معلقہ کے نامور شارح [2] مفتی محمد عبداللہ ٹونکی (م ۱۹۲۰ء) اورینٹل کالج سے ریٹائر ہوکر پہلے دارالعلوم ندوۃ العلماء اور پھر کلکتہ مدرسہ میں مدرس رہے، اردو میں اقلیدس کا ترجمہ اور دیوان ابوالعتاہیہ کی شرح ان کی علمی یادگاریں ہیں۔

والی میں درس نظامی کی تحصیل میں مصروف ہو گئے، اور کافیہ اور مشکوٰۃ تک یہیں تعلیم پائی۔ اس اثنا میں وہ قید بھی ہوئے، پھر اورینٹل کالج کی مولوی عالم کلاس میں جا شامل ہوئے، جہاں ان کے مشہور استاد مولوی عبد العزیز میمن سبعہ معلقہ اور ادب کی دوسری کتابیں پڑھاتے تھے، ساتھ ہی وہ مولوی احمد علی صاحب (انجمن خدام الدین، لاہور) کے درس قرآن میں شریک رہتے تھے، مرحوم سے انھوں نے حجۃ اللہ البالغہ پڑھی، اور غالباً صحیح مسلم بھی۔ مولوی احمد علی صاحب کی دینی خدمات اور ان کی زاہدانہ زندگی کا اثر ان پر آخر آخر تک رہا۔ فرماتے تھے کہ ایک دفعہ مولوی صاحب نے اپنا ہاتھ میرے سینے پر رکھا تھا، اور اس کی ٹھنڈک آج تک محسوس ہو رہی ہے، ۱۹۲۳ء میں منشی فاضل، ۱۹۲۵ء میں ایم۔ اے (فارسی)، ۱۹۳۲ء میں ایم۔ اے (عربی)، کے امتحانات پرائیوٹ طور پر پاس کئے اور ۱۹۳۵ء میں ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔

سید صاحب نے مختلف حیثیتوں میں ساٹھ برس تک پنجاب یونیورسٹی کی لگاتار خدمت کی جو ایک شاندار ریکارڈ ہے، وہ ۱۹۲۶ء میں عربی فارسی مخطوطات کے فہرست نگار مقرر ہوئے، ۱۹۳۲ء میں شعبۂ عربی پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے نگراں ہوئے، جہاں پانچ برس تک کام کرتے رہے۔ اس زمانے میں یونیورسٹی لائبریری کے بیشتر فارسی اور عربی مخطوطات ان کے مطالعے میں آئے، جن پر ان کے حواشی ثبت ہیں، ۱۹۳۹ء میں وہ جونیر لیکچرار فارسی اورینٹل کالج مقرر ہوئے۔ تقسیم ہند کے پرآشوب زمانے میں انھوں نے جس طرح پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی حفاظت کی وہ ان کے احساس ذمہ داری کی بہترین مثال ہے۔ ۱۹۵۳ء میں یونیورسٹی پروفیسر اردو ہوئے اور ۱۹۵۴-۱۹۶۶ء پرنسپل رہے، اور ۱۹۶۶ء میں اردو دائرۂ معارف اسلامیہ کے صدر شعبہ متعین ہوئے، اور اپنی وفات اگست ۱۹۸۶ء تک فائز رہے۔

۲۲ مارچ ۱۹۸۶ء کو دفتر میں کام کر رہے تھے، کہ ان پر اچانک فالج کا حملہ ہوا اور

وہ ہسپتال پہنچائے گئے تین ہفتوں کے بعد تھوڑا افاقہ ہوا تو وہ ۱۰ اپریل ۱۹۸۶ء کو گھر آگئے،
علالت کے ایام میں گورنر پنجاب مخدوم محمد سید سجاد حسین قریشی وہ دفعہ ان کی عیادت کو آئے۔
اور علاج معالجہ کے اخراجات کے لیے ایک لاکھ روپیہ کا چیک پیش کیا۔ صدر پاکستان جناب
جنرل ضیاء الحق صاحب نے اپنا خصوصی معالج بھیجا، لیکن وہ بہترین طبی امداد کے باوجود ۱۸ اگست
۱۹۸۶ء کو حج بیت اللہ کے دن اپنے خالق حقیقی سے جا ملے، جب میدان عرفات لبیک اللّٰھم
لبیک کی صداؤں سے گونج رہا تھا،

ڈاکٹر عبداللہ کی زندگی مسلسل جدوجہد اور عمل پیہم سے عبارت تھی، پڑھنا اور لکھنا ان کا
اوڑھنا اور بچھونا تھا۔ انھوں نے جس کام میں ہاتھ ڈالا اس کو پورا کرکے دکھایا، مخالفوں کی
مخالفت کی انھوں نے کبھی پروا نہیں کی۔ وہ صبر و سکون سے اپنے کام میں لگے رہتے تھے اور
ان کے حریف بالآخر میدان سے بھاگ جاتے، وہ نہ کبھی تھکے نہ مایوس ہوئے۔

سید صاحب وسیع النظر، وسیع الخیال اور وسیع القلب تھے، ان کا حلقۂ احباب
بڑا وسیع تھا، مساجد کے خطیب سے لے کر صحافی، وکیل اور بڑے بڑے نامور ادیب و دانشور
اور اعلیٰ عہدہ دار ان حکومت ان کی بزم ادب میں بلا روک ٹوک اور بلا تکلف آتے رہتے تھے، انکی
مجلسیں بزرگوں کے سبق آموز حالات، قومی تحریکات کے ذکر، سیاسی حالات پر لطیف تبصرے
اور لطائف و ظرائف اور شعر و شاعری کے تذکرے سے معمور رہتی تھیں، سید صاحب کو عربی، فارسی
اور اردو کے ہزاروں اشعار یاد تھے، ان کی کتاب اخلاق کا سنہری باب ان کی بردباری، معتدل
مزاجی، نرم خوئی، اور خندہ روئی ہے، اگرچہ وہ عقائد اور اعمال میں اکابر علمائے دیوبند کے
ہم خیال تھے، لیکن ان کے شیعہ، سنی، اہل حدیث اور بریلوی علماء سے بھی یکساں تعلقات تھے
وہ غلو اور شدت پسندی سے نفور تھے، اور کہا کرتے تھے کہ میرا مسلک، مسلکِ محبت ہے،

بزرگوں کے ادب شناس تھے، اسی حیا داری کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے کسی دینی یا سیاسی رہنما کی تنقیص یا توہین نہیں کی۔ وہ عوام و خواص میں مقبول اور ایوانِ حکومت میں معزز و محترم تھے، حکومت پاکستان نے ان کو کئی اعزازات سے نوازا ہے۔

سید صاحب کی قوت تدریس حیرت انگیز تھی، وہ ایک دن میں مختلف کلاسوں، یعنی ایم۔ اے (عربی)، ایم۔ اے (فارسی)، اور ایم۔ اے (اردو) کو پڑھا دیتے تھے، وہ اپنے شاگردوں سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے، ہونہار اور محنتی طلبہ جلد ہی ان کی توجہ کا مرکز بن جاتے تھے، غریبوں اور ضرورت مندوں کی مدد کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے، ان کی سعی اور سفارش سے پچاسوں بے روزگار نوجوانوں نے ملازمت حاصل کی۔

سید صاحب اردو زبان کے شیدائی و فدائی تھے، انھوں نے اپنے جسم و جان اور صحت کو اردو کی ترویج اور اشاعت کے لیے وقف کر رکھا تھا، فرمایا کرتے تھے کہ پاکستان دو چیزیں متحد رکھ سکتی ہیں، اسلام اور اردو زبان، اردو کو قومی زبان بنانے کے لئے انھوں نے جلسے کئے، جلوس نکالے اور کانفرنسیں منعقد کیں، بازاروں میں جا کر دکانداروں کو اردو میں سائن بورڈ لکھوانے کی تاکید اور چوراہوں میں کھڑے ہو کر کار والوں کو موٹر کے پلیٹ کا نمبر اردو میں لکھوانے کی تلقین کی۔ اردو سے غیر معمولی شغف کی بنا پر انھیں بعض اوقات ارباب اقتدار کی ناراضی اور برہمی کا بھی سامنا کرنا پڑا، لیکن ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی، فرمایا کرتے تھے کہ عربی رسم الخط ایک قسم کا شارٹ ہینڈ اور اللہ تعالٰی کی بڑی نعمت ہے۔ اور اتحاد اسلامی کی اساس ہے، وہ مسلم ممالک جنھوں نے عربی فارسی رسم الخط کو چھوڑ کر کوئی دوسرا رسم الخط اختیار کر لیا ہے۔ اسلام کی عالمگیر برادری سے منقطع اور اسلام کے چودہ سو سالہ علمی ورثے کے فیوض و برکات سے محروم ہو گئے ہیں، اس بارے میں وہ جدید ترکی کی مثال دیا کرتے تھے،

اردو زبان سے غیر معمولی شغف کا دوسرا مظہر مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کا قیام ہے۔ اس کا مقصد سائنسی علوم کو اردو میں منتقل کرنا ہے، چنانچہ سید صاحب کے دورِ نظامت میں اردو اکیڈمی نے مختلف سائنسی موضوعات، جوہری توانائی، نباتیات، حیوانیات، نفسیات اور نظریۂ اضافیت پر ساٹھ کتابیں شائع کرکے اردو زبان کو جدید سائنسی معلومات سے مالا مال کر دیا ہے۔

تصانیف | سید صاحب علمی اور تعلیمی زندگی میں مولوی محمد شفیع اور حافظ محمود شیرانی سے زیادہ متأثر اور عمر بھر ان دونوں کے علمی نظریات اور روایات کے امین اور علمبردار رہے، انھوں نے تیس پینتیس کے قریب کتابیں لکھیں، جن میں اہم ترین یہ ہیں۔

۱۔ تحقیقی کتابیں | (۱) لطائف نامۂ فخری (میر علی شیر کی کتاب مجالس النفائس، (ترکی) کا فارسی ترجمہ، جو فخری بن امیری نے کیا تھا) اور سید صاحب کی تحقیق اور تحشیہ سے اورینٹل کالج میگزین میں شائع ہوتا رہا (۲) تذکرہ مردم دیدہ (فارسی) عبدالحکیم لاہوری نے معاصر شعراء فارسی کا تذکرہ مرتب کیا تھا، جو سید صاحب نے تصحیح کے بعد چھپوایا۔ (۳) نوادر الالفاظ۔ ہندوستان کے آخری دور کے عظیم محقق سراج الدین علی خاں آرزو کی فارسی میں اردو زبان کی لغت جو سید صاحب نے متعدد قلمی نسخوں سے مقابلے کے بعد ایڈیٹ کی اور انجمن ترقی اردو کراچی نے شائع کی۔

۲۔ فکری کتابیں | مباحث (طبع دوم) (مختلف علمی، ادبی اور تاریخی مضامین کا مجموعہ جس کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ (۲) ولی سے اقبال تک (اردو کے نامور شعراء پر مضامین) (۳) نقدِ میر۔ خدائے سخن میر تقی میر کے حالات اور اس کی شاعری پر تبصرہ (۴) دکنی سے عبدالحق تک، (اردو نثر کی تاریخ اور مشہور نثر نگاروں کی تخلیقات کا ناقدانہ جائزہ) کتاب کے

ایک باب بعنوان "ابوالکلام آزاد۔ امامِ عشق و جنون" کے تحت مولانا آزاد کی شخصی اور مزاجی کیفیات کا تجزیہ جس عمدگی سے کیا ہے، اور ان کے علم و فضل کے جلوہ ہائے صد رنگ کی جس چابکدستی اور خوبصورتی سے مصوری کی ہے وہ خاصے کی چیز ہے اور انشائے عالیہ کا بہترین نمونہ ہے (۵) اشارات تنقید (نقد الادب کی تاریخ، یورپ کے تنقید نگاروں اور اسلامی دور کی تنقید کا تذکرہ، تنقید کے دور جدید اور اس کے مختلف تصورات کا بیان) (۶) سرسید احمد خان اور ان کے رفقا کی نثر کا فکری جائزہ طبع چہارم لاہور (سرسید اور ان کے نامور رفقا کی علمی و تصنیفی سرگرمیوں کا جائزہ، اردو ادب پر ان کے اثرات و احسانات کا تذکرہ) (۷) ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، طبع دوم انجمن ترقی ادب، لاہور، (ہندوؤں میں فارسی زبان کی ترویج و اشاعت کی تاریخ، فارسی گو ہندو شاعروں کا تذکرہ، ہندو فضلا کی لکھی ہوئی تاریخیں، تذکرے، کتب نصاب اور قواعد و لغت کی تصانیف کا تفصیلی تعارف) یہ وقیع کتاب ان کے نام اور کام کو ہمیشہ زندہ رکھے گی، یہ کتاب سید صاحب نے سب سے پہلے انگریزی میں لکھی تھی، جس پر پنجاب یونیورسٹی نے انھیں ڈی لٹ کی ڈگری دی تھی، بعد میں اس کا اردو ترجمہ انجمن ترقی اردو دہلی نے شائع کیا۔

(۸) مقامات اقبال (۹) مسائل اقبال (علامہ اقبال کی شاعری کے مختلف موضوعات پر مضامین کا مجموعہ (۱۰) فارسی زبان و ادب (طبع مجلس ترقی ادب، لاہور) فارسی شاعری کے مختلف ادوار کی تاریخ، مشاہیر شعرائے فارسی کا تذکرہ، نئی فارسی شاعری کی خصوصیات، ایران جدید کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا ناقدانہ جائزہ)

۱۱ سید عبداللہ صاحب نے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی عربی، فارسی، اردو وغیرہ کی قلمی کتابوں کی مشرح فہرست بھی مرتب کی جو پہلے انگریزی اور پھر اردو میں منتقل ہوئی، مذکورہ کتابوں کے علاوہ سید صاحب نے دو ڈھائی سو مضامین مختلف ادبی، دینی اور قومی موضوعات پر لکھے ہیں،

ستر کے قریب کتابوں پر ان کے مقدمے اور تبصرے ہیں، انھوں نے کئی کتابوں کے مسودے بھی چھوڑے ہیں۔ جن میں عزیز و محترم قابل ذکر ہے، اس میں بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کے متعلق شخصی تاثرات ہیں۔

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کی علمی و تصنیفی زندگی کا زندۂ جاوید کارنامہ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ کی تکمیل ہے، ان کے پیش رو مولوی محمد شفیع مرحوم کے زمانے میں اگرچہ انگریزی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (لائیڈن) کی تمام جلدوں کا منتخ ترجمہ ہو چکا تھا، اور اس کی دو جلدیں بھی شایع ہو چکی ہیں، لیکن اس کی حقیقی تکمیل کا سہرا ڈاکٹر سید عبداللہ کے سر ہے، انھوں نے اس میں دینی اور قومی روح پھونک دی ہے، خود بھی ایک سو کے قریب مقالات لکھے اور بیرونی فضلا سے بھی سینکڑوں مقالات لکھوا کر اس کو مستقل حیثیت عطا کر دی ہے، اسی زمانے میں عربی، فارسی اور ترکی انسائیکلوپیڈیا کے بعض اجزا بھی اشاعت پذیر ہوئے تھے، لیکن پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکے اور ان کی حکومتوں نے اس بھاری پتھر کو چوم کر رکھ دیا تھا، عربی انسائیکلوپیڈیا، جس میں مصر کے مشہور محقق عالم قاضی احمد محمد شاکر کے مختصر مگر قیمتی حواشی ہیں، حرف "ع" سے آگے نہ بڑھ سکا۔

اس کے مقابلے میں اردو دائرۂ معارف اسلامیہ کی بیس جلدیں شائع ہو چکی ہیں، اور دو زیر طباعت ہیں، جن کے بعد اصل کام دو ڈھائی سالوں میں مکمل ہو جائے گا ان شاء اللہ تعالیٰ، کویت اور جامع ازہر نے اس کو عربی میں منتقل کرنے کی اجازت طلب کی ہے، سید صاحب نے اپنے پیچھے سینکڑوں شاگرد چھوڑے ہیں، جو ان کی فروزاں کی ہوئی شمع علم و عرفان کی روشنی میں اپنا علمی سفر طے کر رہے ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین و ادب کی خدمت کے صدقے میں مرحوم کے درجات بلند کرے، اور انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔

بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

مطبوعاتِ جدیدہ

آداب المریدین :- از حضرت ضیاء الدین سہروردیؒ مترجمہ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت صاف، صفحات ۔ ۔ قیمت تحریر نہیں، ناشر مولانا محمد شمیم صاحب مدرسہ صولتیہ، مکہ معظمہ، سعودی عرب۔

شیخ المشائخ حضرت ضیاء الدین ابو نجیب عبد القاہر بن عبد اللہ سہروردیؒ چھٹی صدی ہجری کے کبار صوفیہ میں تھے، ان ہی کے برادر زادہ اور خلیفہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ تصوف کے مشہور سلسلۂ سہروردیہ کے بانی تھے، شیخ المشائخ کی متعدد تصنیفات میں آداب المریدین زیادہ اہم اور مشہور ہے، جو دراصل طالبین و سالکین کے لیے ایک دستور العمل ہے، اس میں اولیاء کے عقائد، اعمال، اشغال، ظاہری و باطنی آداب، طور طریقے، اطلاقات اور اصطلاحات اس لیے قلمبند کئے گئے ہیں، تاکہ سلوک و تصوف کے طریقہ کو اختیار کرنے والے انھیں مشعل راہ بنائیں، مصنف نے اس راہ کی مضر اور خطرناک باتیں بھی بیان کی ہیں تاکہ طالبین ان سے بچ سکیں، جا بجا اس کی تلقین ہے کہ سالک کو اصلی اور حقیقی صوفیہ سے تعلق پیدا کرنا اور تصوف کے نام پر مکر و فریب کرنے والوں سے متنفر رہنا چاہئے، یہ کتاب کئی فصلوں میں منقسم ہے، پہلے صوفیہ کے عقائد بیان کئے گئے ہیں، فقر، تصوف اور زہد کی حقیقت واضح کی گئی ہے، حلال کمائی اور دین کے احکام و فروع کو معلوم کرنے کی تلقین اور مذہب کے ظاہر و باطن کا تذکرہ کیا ہے، صوفیہ کے اخلاق، احوال، مقامات، بول چال کے آداب الگ الگ فصلوں میں تحریر ہیں، اس کا بھی ذکر ہے کہ طالبین کو

کن لوگوں کی صحبت اختیار کرنی چاہئے اور کن لوگوں کی ہم نشینی ترک کرنی چاہئے، ایک فصل میں لکھا ہے کہ صوفیہ سے حال کے غلبے، سکر کی شدت اور وجد کے جوش میں جو خلاف شرع باتیں منقول ہیں ان کو نہ قبول کرنا چاہئے، پھر ایک ایک فصل میں مشائخ کے لباس، طعام، مقام، سماع، نکاح، سوال مرض، موت اور بقا کے موقع کے آداب بیان کئے ہیں، اور آخر میں رخصتوں پر عمل کرنے میں ان کے اصول وآداب کا ذکر ہے، ان سب امور کے ضمن میں گوناگوں صوفیانہ اسرار، عارفانہ حقائق اور حکیمانہ باتیں بھی مذکور ہیں، ان کے علاوہ بعض آیات واحادیث سے مفید نکات بھی پیش کئے ہیں، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے ایما سے مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ نے تصوف واخلاق کی اس مشہور عربی کتاب کا ۱۲۸۵ھ میں خانہ کعبہ میں اردو ترجمہ کیا تھا، رد عیسائیت میں اپنی مفید تصنیفات اور مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کے بانی ہونے کی وجہ سے خاص شہرت وامتیاز کے حامل ہیں، یہ ترجمہ عرصہ ہوا چھپا تھا، مگر اب نایاب تھا، اس لئے مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کے موجودہ ناظم مولانا محمد شمیم صاحب نے قدیم اڈیشن کا عکس آفسٹ میں شائع کیا ہے، جس طرح ان کی ذات گرامی مدرسہ صولتیہ کی نگرانی کی وجہ سے دینی برکات اور تعلیمی فیوض کا سرچشمہ بنی ہوئی ہے، اسی طرح سے امید ہے کہ ان کی مساعی جمیلہ سے جو یہ کتاب پھر لوگوں کے ہاتھوں میں آگئی ہے، اس سے وہ مستفید ہوں گے اور انکے رفع درجات ومراتب اور مدرسہ کی فلاح وبہبود کے لیے دعاگو ہوں گے۔

داستان حیات سید میر قاسم } مرتبہ جناب عبد الرحمٰن کوندو صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۵۰۰ مجلد، قیمت ساٹھ روپیہ

پتے (۱) کتب خانہ عزیزیہ، اردو بازار جامع مسجد، دہلی، (۲) عظیم بکڈپو، دیوبند۔ یو۔ پی (۳) کالج بک شاپ۔ بارہ مولہ، کشمیر۔

یہ کتاب کشمیر کے سابق وزیر اعلیٰ اور مرکزی وزیر جناب سید میر قاسم کی آپ بیتی ہے، تقسیم کے بعد

...یر کے سیاسی افق پر جو شخصیتیں زیادہ نمایاں ہوئیں اُن میں ایک یہ بھی ہیں، وہ علی گڑھ میں تعلیم مکمل
...کے ۱۹۳۶ء میں کشمیر لوٹے تو اس وقت کشمیر چھوڑ دو تحریک کا زور تھا، اس میں انھوں نے
...ی حصہ لیا، اس کے بعد سیاست سے ان کو غیر معمولی دلچسپی ہو گئی، اور کشمیری سیاست کے ہر موڑ
ہر مرحلہ پر وہ نظر آئے، وہ پہلے نیشنل کانفرنس کے سرگرم ممبر ہوئے پھر جمہوری نیشنل کانفرنس قائم
...ی جس کو بعد میں نیشنل کانفرنس میں ضم کر دیا، کشمیر میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام میں بھی وہ پیش پیش
...ہے، مختلف کشمیری وزارتوں میں شامل ہوئے، اور اختلاف کی وجہ سے ان سے علٰحدہ بھی ہوئے۔
خود ان کی سرکردگی میں بھی یہاں حکومت قائم ہوئی، وہ مرکزی وزارت اور تنظیم میں بھی اعلیٰ منصب
پر فائز ہوئے، جنتا حکومت کے زمانہ میں مسز اندرا گاندھی کے وفادار رہے، مگر ان کے دوبارہ
بر اقتدار آنے کے بعد کانگریس سے الگ ہو گئے، یہ کتاب جناب میر قاسم کی ان سرگرمیوں اور گذشتہ
نصف صدی کی کشمیری سیاست کے نشیب و فراز کی دلچسپ روداد ہے، اس میں پہلے ان کے خاندان
ولادت، وطن اور تعلیم کی تفصیل درج ہے، اس حصہ میں ان کے خاندان و وطن کے بعض ممتاز لوگوں
کے مختصر حالات بھی دیئے گئے ہیں، پھر کشمیر کی سیاست میں ان کی سرگرمی کی داستان شروع ہوتی ہے،
اس کی ابتدا کشمیر کے الحاق، اس پر قبائلی حملہ اور اس کے بعد کی پیدا ہونے والی پیچیدہ سیاسی صورت
حال کے ذکر سے ہوتی ہے، اس کے ضمن میں شیخ عبداللہ کی تشکیل حکومت آئین سازی کے مختلف
مراحل، اس کی مشکلات اور اس میں تعطل کا ذکر بھی ہے، یہ سلسلہ شیخ عبداللہ کے موقف کی
تبدیلی، دلی اور کشمیر کے لیڈروں سے ان کے اختلافات، معاہدہ دلی، جموں ایجی ٹیشن، شیخ کی گرفتاری
اور بخشی غلام محمد کی وزارت کے قیام کے تذکرہ پر ختم ہوا ہے، بخشی غلام محمد کی وزارت میں اپنی اور
خواجہ غلام محمد صادق کی شمولیت اور اس سے علٰحدگی کے ذکر میں ان سے اپنے اور خواجہ صاحب کے
اختلافات کی وضاحت کے علاوہ اس دور کی بدعنوانیوں اور شیخ عبداللہ اور ان کے حامیوں پر

قلمبند کیا ہے، میر صادق صاحب کے زمانہ میں شیخ عبداللہ کی رہائی، پاکستان ۱۹۶۴ء کے ان کے سفر اور چو این لائی سے
ان کی ملاقات، ۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ، حکومت ہند کی جانب سے یو۔ این۔ او میں اپنی نمائندگی اور بعد ازاں ریاست
کے وزیر اعظم ہونے، صادق صاحب سے اپنے اختلاف، مشرق وسطی اور روس کے سفر اور ۱۹۷۱ء کی ہند پاک جنگ
وغیرہ کی سرگذشت بیان کی ہے، اپنے دور حکومت میں ۱۹۷۵ء کے کشمیر سمجھوتہ کے نتیجہ میں شیخ صاحب کو رضاکارانہ اقتدار
منتقل کر دینے اور سمجھوتہ کے شرائط کے متعلق شیخ عبداللہ اور مسز اندرا گاندھی کے اختلاف کا ذکر ہے، پھر مرکزی حکومت میں ان کے
شامل ہونے اور ۱۹۷۷ء کے انتخابات نیز شیخ عبداللہ کی وفات، اور اپنے اور مسز اندرا گاندھی کے اختلاف اور
کانگریس سے اپنے استعفا کی تفصیل درج کی ہے، اور سری نگر اور کلکتہ میں اپوزیشن پارٹیوں کے ...
جلسوں کی روداد، ان میں اپنی شرکت نیز آئندہ کے اپنے عزائم بیان کیے ہیں، سرگذشت کے
خاتمہ کے بعد فاروق عبداللہ کی وزارت کی غیر آئینی برطرفی کے بارہ میں اپنے اور دوسروں کے تاثرات
پیش کیے ہیں، آخر میں تین ضمیمے ہیں، ایک میں میر صاحب کی وہ تقریر درج ہے، جو ۱۹۶۵ء میں
انھوں نے اقوام متحدہ میں اس وقت کے پاکستانی وزیر خارجہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے جواب میں
کی تھی، دوسرے میں اپنے اور مسز اندرا گاندھی کے وہ خطوط درج ہیں جو ان سے اختلاف کے زمانہ میں لکھے گئے تھے،
تیسرے ضمیمہ میں اپنی اہلیہ اور اولاد کا مختصر تذکرہ ہے، اس کتاب میں بعض اور سیاسی رہنماؤں کے
درمیان خط و کتابت کی تفصیل بھی دی گئی ہے، جناب میر قاسم نے اپنے مشاہدات و تاثرات
کی تصدیق و تائید کے لیے اخبار، رسالوں اور کتابوں کے اقتباسات اور بعض قومی رہنماؤں کے
خیالات بھی نقل کیے ہیں، اس طرح یہ کتاب محض میر قاسم کی سرگذشت ہی نہیں ہے، بلکہ گذشتہ
نصف صدی کے واقعات و حالات اور کشمیری سیاست کے اتار چڑھاؤ کی ایک تاریخی دستاویز
بھی ہے، اس لیے مستند ہے کہ وہ ان واقعات کے عینی شاہد اور ان میں عملاً شریک بھی رہے، میر قاسم نے
واقعات کو بے کم و کاست اور رنگ آمیزی کے بغیر بیان کیا ہے۔ اس کتاب میں اکثر اشخاص کے ذریعہ

تبصرہ اور متوازن انداز میں اظہار خیال بھی کیا گیا ہے، مصنف نے بعض حالات و مسائل پر جو بحث
و تبصرہ کیا ہے، اس سے ان کی سیاسی سوجھ بوجھ، معاملہ فہمی، قومی و سیاسی مسائل میں معتدل
طرز فکر اور سلجھے انداز کا پتہ چلتا ہے، ہندوستان سے کشمیر کے الحاق کو وہ اٹل سمجھتے تھے، انھوں نے
یو این۔ او میں اس کی وکالت اور پاکستانی نظریہ کی تردید بھی کی تھی، لیکن اس سلسلے کے بعض امور
خصوصاً شیخ عبد اللہ کے معاملہ میں ہندوستانی لیڈروں کے طریقۂ کار سے ان کو اختلاف تھا، وہ شیخ کے
بدلے ہوئے موقف کا ذمہ دار بھی ان ہی لیڈروں کو بتاتے ہیں، شیخ عبد اللہ کے نقطۂ نظر سے اختلاف
کے باوجود انھیں یہ تسلیم تھا کہ عوامی سطح پر ان کا مقابلہ اور طاقت سے ان کو دبانا ناممکن ہے، اسی لیے
وہ ان کی گرفتاری کے مخالف اور ان سے گفت و شنید اور مفاہمت کے ہمیشہ حامی رہے، ان کی
رہائی اور انھیں دوبارہ برسراقتدار لانے میں میر صاحب کی مساعی کو کافی دخل تھا، ان کے حق میں
اقتدار سے دستبردار ہو کر انھوں نے حیرت انگیز مثال پیش کی، کشمیر سمجھوتہ میں مسز اندرا گاندھی
اور شیخ عبد اللہ کے اختلاف کے بارے میں یہ تاثر دیا ہے کہ شیخ صاحب کو دھوکہ دیا گیا، ایک باوقار
علمی و دینی خانوادے سے تعلق رکھنے کی بنا پر میر صاحب کی شخصیت اور اس آپ بیتی پر مذہب، مذہبی
تعلیم اور اسلامی تہذیب و روایت کے اثرات بھی ثبت ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی
لٹریچر ان کے زیر مطالعہ رہتا ہے، اور وہ علامہ شبلیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا سید ابوالحسن
علی ندوی اور اس عہد کے دوسرے ممتاز اہل قلم کی کتابیں بھی پڑھتے رہتے ہیں، فارسی، اردو اور
کشمیری شاعری کے مطالعہ کے شوقین اور اقبالؔ کے عاشق و شیدائی ہیں، آپ بیتی کے ذاتی و خاندانی
حالات خود انھوں نے قلمبند کیے ہیں، بقیہ حصہ کا انھوں نے املا کرایا ہے، جس کو ٹیپ ریکارڈر
کی مدد سے جناب عبد الرحمٰن کوندو نے مرتب کیا ہے، گو کشمیر کی سیاست پیچیدہ اور متنازعہ فیہ رہی
ہے، لیکن کوندو صاحب کی سعی و محنت سے اردو کے ذخیرہ میں ایک مفید اور پُر از معلومات کتاب کا

اضافہ ہوا ہے۔ امیر صاحب کی زندگی سیاسی ہنگاموں میں گزری ہے انھیں تقریر و خطابت کا جوہر دکھانے کا زیادہ اتفاق ہوا ہے، اسکا اثر اس کتاب میں بھی پایا جاتا ہے، مگر بعض اوقات تحریر میں یہ خطیبانہ انداز زبان کی سلاست و فصاحت کیلئے موزوں نہیں ہوتا، اس میں امیر صاحب کی مختلف موقع کی تصویروں کا عکس بھی دیا گیا ہے جن میں دوسرے رہنماؤں کی تصویریں بھی آگئی ہیں۔ ایک جگہ کچھ صفحات شامل نہیں اور بعض صفحے مکرر ہو گئے ہیں۔

اسلام کا تصور مساوات :۔ از مولوی سلطان احمد صاحب اصلاحی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۴۴، قیمت ۲۰ روپے، پتہ، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی۔

اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ موجودہ زمانہ میں آزادی و مساوات کا نعرہ تو ہر قوم و ملک میں بلند کیا جا رہا ہے لیکن عملاً اس کے بالکل برعکس ہو رہا ہے، مصنف نے تفصیل و وضاحت سے ثابت کیا ہے کہ آزادی و مساوات کی اصلی و حقیقی تعلیم صرف اسلام نے دی ہے، اسی کی تعلیم و ہدایت سے عدم مساوات، طبقہ داریت اور ہر قسم کے فرق و امتیاز کا خاتمہ ہو سکتا ہے، اسلامی مساوات اور اس کے بارہ میں اسلامی تعلیم و ہدایت کی خوبیاں نمایاں کرنے کیلئے ابتدا میں یورپ میں نظریۂ مساوات کے عہد بعہد ارتقاء پر گفتگو کی گئی ہے اسکی اور دنیا کے مشہور مذاہب کے نظریۂ مساوات کی خامیوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے، پھر اسلام نے مساوات کو فروغ دینے کے لیے جو مثبت و منفی اصول بیان کئے ہیں انھیں تفصیل سے بیان کیا ہے اس سلسلہ میں اخلاقی ترغیبات اور قانونی تحفظات کی تفصیل اور اسلام میں تفوق و برتری کے معیار پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے اور اسلامی تصور مساوات پر غلامی، جزیہ اور ازدواج میں کفاءت وغیرہ کے پہلو سے جو اعتراض کیا جاتا ہے، اس کا جواب دیا ہے، کتاب محنت سے لکھی گئی ہے، اور اپنے موضوع پر مفید ہے مگر اس کی بعض بحثیں مزید توضیح و تنقیح کی محتاج تھیں، مثلاً انسانوں کی خاندان و قبیلہ میں تقسیم کی حکمت پر گو لمبی بحث کی گئی ہے مگر یہ پوری طرح واضح نہیں ہو سکی ہے، جزیہ کے سلسلہ میں اگر وہ مولانا شبلی کی تنقیحات کو بھی سامنے رکھتے تو ان کا جواب زیادہ مدلل اور جامع ہوتا، ایک ہی

مفہوم و معنی کی بکثرت آیات و احادیث نقل کرنے کے بجائے ان کی جانب صرف اشارہ کر دینا کافی تھا۔ جس طرح مساوات کے بارہ میں قرآنی آیات و احادیث پیش کی گئی ہیں، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے واقعات اور ان کی عملی زندگی سے مثالیں پیش کرنے کی ضرورت تھی، متن و حواشی میں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ اور مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ وغیرہ کا نام جس احترام سے لکھا گیا ہے، اسی احترام کے مستحق مولانا شبلی بھی تھے۔

مولانا عبد الحیٔ فرنگی محلی: مرتبہ جناب غلام مرسلین صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۰۰، قیمت ۲۰ روپے، پتہ: مصطفےٰ منزل، لال ڈگی، علی گڑھ۔

مولانا عبد الحیٔ فرنگی محلیؒ متبحر علماء میں تھے، انھوں نے بہت کم عمر پائی مگر تصنیفات کا بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑ گئے ہیں جن سے حدیث و فقہ کا کوئی طالب علم بے نیاز نہیں رہ سکتا، مگر ابھی تک ان پر باقاعدہ کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی، زیر نظر کتاب میں مولانا کی زندگی کے حالات اور کارناموں کو چارؔ ابواب میں پیش کیا گیا ہے، پہلے باب میں خاندانی حالات، پیدائش، تعلیم و تربیت، معمولات، سفر، وفات اور اولاد و احفاد کا ذکر ہے، اسی ضمن میں مولانا کا شجرۂ نسب اور خاندان کے کئی اہم بزرگوں کا مختصر تذکرہ بھی دیا ہے، دوسرے باب میں اساتذہ اور مشہور تلامذہ کا مختصر حال تحریر کیا ہے اور غیر مشہور شاگردوں کے صرف نام گنائے ہیں، تیسرا باب زیادہ اہم ہے، اس میں مولانا کے اخلاق و عادات اور افکار و خیالات پر بحث و گفتگو کی ہے، اس سے مولانا کی اخلاقی خوبیوں، مذہبی و فقہی مسائل میں اعتدال و میانہ روی، بحث و تحقیق کے انداز، طریقۂ تصنیف اور بعض امور و مسائل میں ان کے نقطۂ نظر کا پتہ چلتا ہے، اسی باب میں مولانا کی تصانیف کی کثرت و مقبولیت بھی دکھائی ہے، اور ان کے فضل و کمال کے بارہ میں اہل علم کی رائیں نقل کی ہیں اور بعض معاصر علماء سے ان کے اختلافات کا تذکرہ کیا ہے، آخری باب میں فنون وار ان کی تصنیفات کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے، اصل میں یہ ایم فل کا ایک مقالہ ہے، اور اس اعتبار سے اچھا ہے، لیکن اس کو مولانا کی

بھاری بھرکم اور بلند پایہ شخصیت کے شایان شان نہیں کہا جا سکتا ہے بعض حوالے بھی غیر معیاری و غیر مستند کتابوں کے دیئے گئے ہیں، مولانا کے تلامذہ کے تذکرہ میں بعض خلاف واقعہ باتیں درج ہو گئی ہیں، ان کی تصنیفات کے تعارف میں زیر بحث مسئلہ کے متعلق کہیں کہیں مولانا کی رائے کا پتہ نہیں چلتا، اسی طرح مقالہ نگار نے جن کتابوں کے قلمی نسخے دیکھے ہیں ان کے بارہ میں یہ صراحت نہیں کی ہے کہ وہ مطبوعہ ہیں یا غیر مطبوعہ، امام ابوحنیفہؒ اور صاحبینؒ کو ائمہ ثلاثہ کہنا درست نہیں ہے، اس کا اطلاق امام صاحبؒ کے علاوہ تینوں مستقل صاحب مذہب ائمہ پر ہوتا ہے، یعنی امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کو ائمہ ثلاثہ کہا جاتا ہے، اس موضوع پر مصنف کو ابھی اپنی محنت و کاوش جاری رکھنی چاہئے، تاکہ دوسرا اڈیشن زیادہ مستند اور محقق صورت میں چھپ سکے اور وہ موضوع کے شایان شان بھی ہو۔

متاع فکر: از جناب عروج زیدی صاحب متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۱۶۰، مجلد مع گردپوش، قیمت ۲۰ روپئے پتہ (۱) عرفان زیدی محلہ کٹ کوئیاں شہر رامپور (۲) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار، جامع مسجد دہلی (۳) دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ (۴) نظامی بک ایجنسی، محلہ سوتھ بدایوں۔

جناب عروج زیدی کے کلام کے متعدد مجموعے چھپ چکے ہیں، اب انھوں نے اپنی تازہ "متاع فکر" کو صحتمند جذبہ و خیال کے حامل اصحاب ذوق کی نذر کیا ہے، وہ جدیدیت اور ترقی پسندی کے شور و ہنگامہ سے کان بند کر کے شاعری کی قدیم پاکیزہ روایتوں اور اخلاقی و تہذیبی قدروں کو حرز جان بنائے ہوئے ہیں، انھوں نے غزل کو اپنا موضوع فن بنایا ہے، ان کے تغزل میں صداقت پر مبنی جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے، اور ان کا خیال اور طریقۂ بیان ابتذال اور رعدم توازن سے خالی ہے، قدیم و جدید کے امتزاج سے انھوں نے اپنے اسلوب کو تازگی عطا کی ہے، ان کے نزدیک حسن خیال اور حسن بیان کے بغیر حسن کلام تشنۂ تکمیل رہتا ہے، ان کی غزلوں کی کیف آفرینی و دلکشی کا راز فکر و فن کی آرائش میں پنہاں ہے، مسائل حسن و عشق کی طرح ان کی غزلوں میں نئے دور کی تصویر بھی نظر آتی ہے، ان میں آدمی کی عظمت کا تصور اور خودداری و عزم و حوصلہ کی تلقین ملتی ہے، انھیں اسکا دکھ ہے کہ انسان نے اپنی عظمت و حیثیت کو بھلا دیا ہے، وہ خود شناس اور حق نوا نہیں رہا، اور اخلاقی و تہذیبی قدروں سے دامن کش ہو گیا ہے، اور وہ غم کی لذت شناس کم ہو گئے ہیں، ظاہر و باطن میں تضاد، منافقت اور دورخا پن عام ہے، موجودہ بہار میں خزاں کا منظر دکھائی دیتا ہے، عشق و محبت کے لطیف اور بلند جذبات پر ہوا و ہوس اور جنون و سرمستی پر مصلحت اندیشی غالب ہو گئی ہے، عروج صاحب کا کلام اپنی خوبیوں کی وجہ سے قابل مطالعہ ہے۔

"ض"

سلسلۂ مذہبی رواداری

تاریخ ہند کا سلسلہ اب تک اٹھائیس کتابوں تک پہنچ چکا ہے، اسی ضمن میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہے،

جلد اول اس میں مغل دور سے پہلے کے مختلف خاندانوں کے مسلمان حکمرانوں مثلاً محمد بن قاسم، محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، علاء الدین خلجی، محمد بن تغلق وغیرہ کی مذہبی رواداری و وسیع قلبی کے واقعات پیش کئے گئے ہیں، قیمت [illegible]

جلد دوم ۔ اس میں مغل فرماں روا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے حکمراں شیر شاہ، اسلام شاہ، پھر مغل شہنشاہ اکبر، جہانگیر، شاہجہاں کی مذہبی رواداری وغیرہ کے دلچسپ واقعات قلمبند کئے گئے ہیں، قیمت ۹ روپے

جلد سوم ہندوستان کے مغل عہد کے مشہور مورخ سر جدوناتھ سرکار کی کتاب کا جواب خود ان کی کتابوں کے حوالوں سے اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر اور اس کے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری وغیرہ کی تفصیلات آگئی ہیں، مولانا شبلی کی مضامین عالمگیر، اور مولانا سید نجیب اشرف صاحب ندوی مرحوم کی مقدمۂ رقعات عالمگیر کے بعد اورنگ زیب عالمگیر پر دوسری اہم اور پر از معلومات کتاب جس میں اس کے پورے پچاس سالہ عہد حکومت و فرمانروائی کی پوری تاریخ آگئی ہے، قیمت: [illegible] روپے،

اسلام کی مذہبی رواداری۔ اس میں مستند حوالوں سے مذہبی رواداری، غیر مسلم رعایا کے ساتھ حسن سلوک اور ذمیوں کے حقوق کے متعلق مذہب اسلام کی تعلیمات اور ان پر مسلمانوں کے عمل کا نمونہ پیش کیا گیا ہے، (زیر طبع)

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

رجسٹرڈ نمبر ایل ۔ ۴۲ ۔ این پی ۔ ۴۳ اکتوبر ۱۹۸۶ء

معارف

دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

(مرتبہ)

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

قیمت تیس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کتبہ اقبال احمد (پن ۲۷۶۰۰۱)

مجلسِ ادارت

برید فرنگ

۱۹۲۰ء میں علامہ سید سلیمان ندوی نے مولانا محمد علی وغیرہ کے ساتھ وفدِ خلافت کے ایک رکن اور علمائے خصوصاً مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے نمائندہ کی حیثیت سے مسئلۂ خلافت پر اس دور کے برطانوی وزیر اعظم مسٹر لائڈ جارج سے گفتگو کرنے اور ترکوں کے حق میں فیصلہ کے لئے لندن کا سفر کیا تھا، اور اسی ضمن میں وہ فرانس اٹلی وغیرہ بھی آتے جاتے رہے، ان تمام مقامات سے ہندوستان کے جن بزرگوں، دوستوں، اور عزیزوں کے نام انھوں نے جو خطوط لکھے تھے، وہ اس میں جمع کر دیئے گئے ہیں، اس کا پہلا اڈیشن خود سید صاحب کی زندگی میں ان کے پیش لفظ کے ساتھ ان کے اشاعتی ادارہ مکتبۃ الشرق کراچی سے شائع ہوا تھا، ایک عرصہ کے بعد بیس سے اس کا دوسرا اڈیشن مولانا فضل ربی ندوی نے شائع کیا، اسی دوسرے اڈیشن کا عکسی اڈیشن دارالمصنفین نے اپنے مطبع معارف میں چھپوا کر شائع کیا ہے،

اس میں اس دور کی پوری دنیائے اسلام کے سیاسی و اجتماعی حالات، مسلمانوں کے سیاسی مسائل اور ہر اسلامی ملک کے مسلمان اکابر و مشاہیر کی دلچسپ ملاقاتوں کی تفصیل بھی آگئی ہے، اس دور کی اسلامی سیاست کو سمجھنے کے لئے اس کا مطالعہ بہت ضروری ہے،

قیمت :- ۱۶ — ۰۰ روپے،

جلد ۱۳۸ ماہ صفر المظفر ۱۴۰۷ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۸۶ء عدد ۴

مضامین

شذرات

کل ہند انجمن ترقی اردو دہلی کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ سرمایہ کی کمی اور ناسازگار حالات کے باوجود اس کی کارکردگی میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم جب سے اس کے جنرل سکریٹری ہوئے ہیں، انھوں نے اپنے کو اس کا بہت ہی فعال متحرک، ہوشمند اور لائق عہدیدار ثابت کر دکھایا ہے، ۱۹۴۷ء کے بعد بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نے اس کو پاکستان منتقل کیا، تو اس لٹے پٹے ادارہ کو پہلے قاضی عبدالغفار اور پھر پروفیسر آل احمد سرور نے سنبھالا، اس زمانہ میں اس ملک میں اردو کا مستقبل تاریک نظر آرہا تھا، تو اس کے لائحہ عمل سے زیادہ توقع وابستہ نہیں کی جارہی تھی، مگر یہ سخت جان بن کر اچھی طرح چلتی رہی، اور جب ڈاکٹر خلیق انجم نے اس کی باگ اپنے ہاتھوں میں لی تو اس کے بہی خواہوں کا دل دھڑک رہا تھا کہ معلوم نہیں وہ اس کی شاندار روایات کو کس حد تک برقرار رکھ سکیں گے، مگر اس عہدہ پر فائز ہوتے ہی ان کی دبی صلاحیتیں اچھی طرح ابھریں، ان کا سب سے بڑا کارنامہ قلب دہلی میں اردو گھر کی تعمیر ہے، جب سے یہ ادارہ قائم ہوا تھا یہ بے گھر تھا، جس بے سروسامانی اور ہمت شکن فضا میں ڈاکٹر خلیق انجم نے اس کی تعمیر شروع کی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک ناممکن کام کو ممکن بنانے کی کوشش کر رہے ہیں، مگر ان کے یقین محکم اور سعی پیہم کی بدولت دہلی کے سینہ راؤز ایونیو میں اردو گھر کی کئی منزلوں کی تعمیر کیا ہوئی کہ اس پر شیفتہ، میر، غالب، ذوق، مومن، ظفر، داغ اور ناصر نذیر فراق کی اردو، بلکہ اس ملک کے کروڑوں باشندوں کی مادری زبان کا پرچم لہراتا نظر آیا۔

ڈاکٹر خلیق انجم ہر کام کو خوش سلیقگی، ارادے کی پختگی اور ہمت کی بلندی سے انجام دینے کے عادی ہیں، آج کل کے ہنگامہ خیز دور میں وہی کامیاب ہوتا ہے جو جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا اور پلٹ کر جھپٹنا

جاتا ہے، ڈاکٹر خلیق انجم اس وصف سے اچھی طرح واقف ہیں، اس لیے انجمن ترقی اردو کو اپنی علمی سرگرمیوں کی جولان گاہ بنا رکھا ہے، اسی کے ساتھ اپنی خوش ذوقی اور اپنی مجلس انتظامیہ کے حسنِ تعاون سے اس کو علم، فن، شعر اور ادب کا چمنستان بھی بنا دیا ہے۔

انجمن کے پرانے علمی سرمایہ کو چھوڑ کر اس وقت تک اس کی طرف سے تقریباً ڈیڑھ سو کتابیں شایع ہو چکی ہیں جن سے اردو زبان و ادب میں مفید اور قیمتی اضافے ہوئے ہیں، یہاں بعض ایسی کتابیں بھی شایع ہوئی ہیں جن کو لوگ بھول چکے تھے، اس کے پاس کوئی بڑا سرمایہ نہیں لیکن اس کے موجودہ جنرل سکریٹری کی جواں ہمتی اور بلند حوصلگی سے یہاں سے برابر کتابیں شایع ہو رہی ہیں، انگریزی میں آکسفورڈ ڈکشنری کا اردو ترجمہ ڈاکٹر عبدالحق کی نگرانی میں کیا گیا تھا، اب بازار میں بڑی مشکل سے ملتا تھا، لیکن ایک کثیر سرمایہ صرف کرکے اس کی طباعت انجمن کی طرف سے ہو گئی ہے، اسی طرح ایک مستند اردو ہندی ڈکشنری شایع کرکے اردو اور ہندی دونوں زبانوں کی مفید خدمت انجام دی گئی ہے، ان علمی سرگرمیوں کے ساتھ ہفت روزہ اخبار 'ہماری زبان' اور سہ ماہی 'اردو ادب' اپنی پرانی روایات کے ساتھ برابر شایع ہو رہے ہیں۔

دارالمصنفین کو اس ادارہ سے دیرینہ لگاؤ رہا ہے، کیونکہ اس کے ابتدائی دور کے روحِ رواں مولانا شبلی نعمانیؒ تھے، پھر یہاں کے لوگ کسی نہ کسی طرح ہر زمانہ میں وابستہ رہے، اس وقت یہ سطریں لکھنے میں انشراحی کیفیت اس لیے بھی پیدا ہو رہی ہے کہ اس کی طرف سے ابھی حال ہی میں حضرت استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ پر ایک دیدہ زیب اور نظر فریب کتاب شایع ہوئی ہے، مارچ ۱۹۸۰ء میں انجمن کی نگرانی میں ایک باوقار سمینار ہوا تھا جس میں اچھے اچھے مقالے پڑھے گئے تھے، ان ہی کا ایک مجموعہ شایع کرکے اردو میں ایک اہم اور مفید کتاب کا اضافہ کیا گیا ہے، اس کتاب کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ اس کے مضامین اور ان کے لکھنے والوں کے اسمائے گرامی سے ہو جائے گا، جو یہ ہیں: خطبۂ افتتاحیہ از جناب سید مظفر حسین برنی گورنر ہریانہ، ایک جامع صفات شخصیت، از مالک رام، سید صاحبؒ کا سوانحی خاکہ از خلیق انجم، علامہ سید سلیمان ندویؒ بہ حیثیت ادیب از پروفیسر عبدالمغنی،

شذرات

کل ہند انجمن ترقی اردو دہلی کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ سرمایہ کی کمی اور ناسازگار حالات کے باوجود اس کی کارکردگی میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم جب سے اس کے جنرل سکریٹری ہوئے ہیں، انھوں نے اپنے کو اس کا بہت ہی فعال متحرک، ہوشمند اور لائق عہدیدار ثابت کر دکھایا ہے، ۱۹۴۷ء کے بعد بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نے اس کو پاکستان منتقل کیا، تو اس لٹے پٹے ادارہ کو پہلے قاضی عبدالغفار اور پھر پروفیسر آل احمد سرور نے سنبھالا، اس زمانہ میں اس ملک میں اردو کا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا، تو اس کے لائحہ عمل سے زیادہ توقع وابستہ نہیں کی جا رہی تھی، مگر یہ نخت جان بن کر اچھی طرح چلتی رہی، اور جب ڈاکٹر خلیق انجم نے اس کی باگ اپنے ہاتھوں میں لی تو اس کے بہی خواہوں کا دل دھڑک رہا تھا کہ معلوم نہیں وہ اس کی شاندار روایات کو کس حد تک برقرار رکھ سکیں گے، مگر اس عہدہ پر فائز ہوتے ہی ان کی ادبی صلاحیتیں اچھی طرح ابھریں، ان کا سب سے بڑا کارنامہ قلب دہلی میں اردو گھر کی تعمیر ہے، جب سے یہ ادارہ قائم ہوا تھا یہ بے گھر تھا، جس بے سروسامانی اور ہمت شکن فضا میں ڈاکٹر خلیق انجم نے اس کی تعمیر شروع کی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک ناممکن کام کو ممکن بنانے کی کوشش کر رہے ہیں، مگر ان کے یقین محکم اور سعی پیہم کی بدولت دہلی کے سینہ راؤز ایونیو میں اردو گھر کی کئی منزلوں کی تعمیر کیا ہوئی کہ اس پر شیفتہ، میر، غالب، ذوق، مومن، ظفر، داغ اور ناصر نذیر فراق کی اردو، بلکہ اس ملک کے کروڑوں باشندوں کی مادری زبان کا پرچم لہراتا نظر آیا۔

ڈاکٹر خلیق انجم ہر کام کو خوش سلیقگی، ارادے کی پختگی اور ہمت کی بلندی سے انجام دینے کے عادی ہیں، آج کل کے ہنگامہ خیز دور میں وہی کامیاب ہوتا ہے جو جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا اور پلٹ کر جھپٹنا

جاتا ہے، ڈاکٹر خلیق انجم اس وصف سے اچھی طرح واقف ہیں، اس لیے انجمن ترقی اردو کو اپنی علمی سرگرمیوں کی جولان گاہ بنا رکھا ہے، اسی کے ساتھ اپنی خوش ذوقی اور اپنی مجلس انتظامیہ کے حسن تعاون سے اس کو علم، فن، شعر اور ادب کا چمنستان بھی بنا دیا ہے۔

انجمن کے پرانے علمی سرمایہ کو چھوڑ کر اس وقت تک اس کی طرف سے تقریباً ڈیڑھ سو کتابیں شایع ہو چکی ہیں جن سے اردو زبان و ادب میں مفید اور قیمتی اضافے ہوئے ہیں، یہاں بعض ایسی کتابیں بھی شایع ہوئی ہیں جن کو لوگ بھول چکے تھے، اس کے پاس کوئی بڑا سرمایہ نہیں لیکن اس کے موجودہ جنرل سکریٹری کی جواں ہمتی اور بلند حوصلگی سے یہاں سے برابر کتابیں شایع ہو رہی ہیں، انگریزی میں آکسفورڈ ڈکشنری کا اردو ترجمہ ڈاکٹر عبدالحق کی نگرانی میں کیا گیا تھا، اب بازار میں بڑی مشکل سے ملتا تھا، لیکن ایک کثیر سرمایہ صرف کرکے اس کی طباعت انجمن کی طرف سے ہو گئی ہے، اسی طرح ایک مستند اردو ہندی ڈکشنری شایع کرکے اردو اور ہندی دونوں زبانوں کی مفید خدمت انجام دی گئی ہے، ان علمی سرگرمیوں کے ساتھ ہفت روزہ اخبار ہماری زبان، اور رسالہ اردو ادب اپنی پرانی روایات کے ساتھ برابر شایع ہو رہے ہیں۔

دارالمصنفین کو اس ادارہ سے دیرینہ لگاؤ رہا ہے، کیونکہ اس کے ابتدائی دور کے روح رواں مولانا شبلی نعمانیؒ تھے، پھر یہاں کے لوگ کسی نہ کسی طرح ہر زمانہ میں وابستہ رہے، اس وقت یہ سطریں لکھنے میں انشراحی کیفیت اس لیے بھی پیدا ہو رہی ہے کہ اس کی طرف سے ابھی حال ہی میں حضرت استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ پر ایک دیدہ زیب اور نظر فریب کتاب شایع ہوئی ہے، مارچ ۱۹۸۵ء میں انجمن کی نگرانی میں ایک باوقار سمینار ہوا تھا جس میں اچھے اچھے مقالے پڑھے گئے تھے، ان ہی کا ایک مجموعہ شایع کرکے اردو میں ایک اہم اور مفید کتاب کا اضافہ کیا گیا ہے، اس کتاب کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ اس کے مضامین اور ان کے لکھنے والوں کے اسمائے گرامی سے ہو جائے گا، جو یہ ہیں: خطبۂ افتتاحیہ از جناب سید مظفر حسین برنی گورنر ہریانہ، ایک جامع صفات شخصیت از مالک رام، سید صاحبؒ کا سوانحی خاکہ از خلیق انجم، علامہ سید سلیمان ندویؒ بہ حیثیت ادیب، از پروفیسر عبدالمغنی،

حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندویؒ کی خیام پر ایک نظر از سید صباح الدین عبدالرحمٰن، نقوش سلیمانی از رشید حسن خان، مولانا سید سلیمان ندویؒ اور فارسی ادبیات از ڈاکٹر تنویر احمد علوی، مولانا سید سلیمان ندویؒ کے ایک اہم خط پر اظہار خیال، از ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی، سید صاحبؒ کا نظریۂ علم از پروفیسر شیر الحق، دبستان شبلی کے ایک ممتاز ادیب، از ڈاکٹر افتخار بیگم صدیقی، سید سلیمان ندویؒ کا تصور نعت، از پروفیسر عنوان چشتی، آزادی سے قبل ہندستان میں فرقہ پرستی کا مسئلہ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کا نقطۂ نظر، از انوار عالم، مولانا سید سلیمان ندویؒ اور ندوہ، از سید شہاب الدین دسنوی، دار المصنفین شبلی اکیڈمی اور حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ از ابو البقار ندوی، مولانا سید سلیمان ندویؒ کی سیرۃ النبی میں اردو زبان میں مستعمل الفاظ کی تحقیق، از مولوی عبید اللہ کوثی ندوی، سید سلیمان ندویؒ کی تنقید نگاری از ڈاکٹر شارب ردولوی، مکاتیب سلیمان ایک جائزہ، از عبد اللطیف اعظمی، مولانا سید سلیمان ندویؒ کوچۂ شاعری میں، از رفعت سروش، سید سلیمان ندویؒ اور اردو ادب از ارتضیٰ کریم۔

ان مضامین کی خوبی یہ ہے کہ ان میں مرعوبیت کا چراغاں نہیں کیا گیا ہے، بلکہ زیادہ تر مقالہ نگاروں نے حضرت سید صاحبؒ کی رنگا رنگ عظمت کا اعتراف کرکے ان کو اپنی اپنی عقیدت کی گل پوشی کی ہے، بعض مضامین میں ہلکی پھلکی تنقیدیں ضرور ہیں، لیکن یہ شاید سمینار کی محفل میں کچھ گرمی پیدا کرنے کی خاطر قلمبند کی گئی ہیں، یا جس طرح غزل گوئی میں بادہ و ساغر کہے بغیر کوئی بات نہیں بنتی، اسی طرح آج کے مقالہ نگار کچھ اپنے ذہنی تفنن اور کچھ اپنے قارئین کی ضیافت طبع کی خاطر تنقید نگاری کا گلگشت ضروری سمجھتے ہیں، ایسی تنقید نگاری کی حیثیت تفریحی ہو کر رہ جاتی ہے۔

اس مجموعہ کی اشاعت پر ہم دار المصنفین کی طرف سے انجمن ترقی اردو اور اس کے صدر جناب مالک رام اور جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

مقالات

قرآن مجید اور مستشرقین

از
ڈاکٹر التہامی نقرہ صدر شعبۂ قرآن و حدیث کلیۃ الزیتونیہ ٹیونس یونیورسٹی ٹیونس

ترجمہ :- عبید اللہ کوٹی ندوی رفیق دار المصنفین

(۴)

اختلاف قراءت کی بحث | مستشرقین نے قرآن مجید کی مختلف قراءتوں کو بھی نقد و تبصرہ کا موضوع بنایا ہے، چنانچہ گولڈ زیہر لکھتا ہے کہ

" دنیا کی تمام قدیم مذہبی کتابیں جن کو ان کے ماننے والے منزل من اللہ اور وحی آسمانی سمجھتے ہیں، ان میں صرف قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے، جس میں متن کے اتنے اختلافات اور صحیح متن کے متعین کرنے میں اس قدر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے[1]۔

گولڈ زیہر کے مذکورۂ بالا تبصرہ پر کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں، گذشتہ آسمانی مذاہب کی کتابوں کے اصل ابتدائی متون، کیا گولڈ زیہر کی نظر سے گزرے ہیں؟ کیونکہ اس کے بعد ہی قرآن مجید اور گذشتہ کتبِ سماوی کے متون کے درمیان موازنہ کیا جاسکتا ہے، خود گولڈ زیہر ہی یہ لکھتا ہے کہ

" تلمود کا بیان یہ ہے کہ تورات ایک ہی وقت میں کئی زبانوں میں نازل ہوئی تھی،

---

[1] گولڈ زیہر (عربی ترجمہ) مذاہب التفسیر الاسلامی ۔ ص ۴

چنانچہ تورات (اور اس کے علاوہ خود) انجیل کے مختلف نسخے پائے جاتے ہیں، آرتھر جیفرے نے کتاب المصاحف لابن ابی داؤد کے مقدمہ میں یہ ضاحت کی ہے کہ تورات و انجیل کی تاریخ، ان کی نسبت اور صحت متن کو اعتبار و استناد سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔"

اختلاف متن اور صحیح متن کے تعین میں دشواری۔ ۔ ۔ کا مطلب تو یہ ہوا کہ متن کی عبارت کئی طرح سے بلکہ متضاد صورتوں میں نقل کی گئی ہو، اور اس میں اصل صحیح متن کا تعین نہ کیا جاسکتا ہو، قرآن مجید میں ایسے کسی اختلاف متن کی مثال موجود نہیں ہے، قرآن مجید کی متواتر قراءتوں کو تو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح اور مستند قرار دیا ہے، اور پوری طرح یقین اور اطمینان کے ساتھ آپ نے اس کی وضاحت فرمائی ہے، ان مختلف قراءتوں سے لغت و ادب کے ذخیرہ کے فراوانی اور متن کی معنوی جہتوں کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور اس سے اجتہاد و استنباط قوانین کی مختلف سمتوں کے تعین میں مدد ملتی ہے، علماء اسلام نے بڑی تفصیل سے اس کی وضاحت کی ہے، قرآن مجید کی جو قراءتیں مستند اور قطعی ہیں وہ سب نہایت ہی صحت اور تواتر کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں، اختلاف قراءت کا تعلق قرآن مجید کے ہر لفظ اور ہر۔ ۔ ۔ ۔ آیت سے نہیں ہے، اس لیے گولڈ زیہر کا یہ دعویٰ کہ "اختلاف قراءت سے قرآن مجید کی کوئی بھی نص محفوظ نہیں" درست نہیں ہے، قرآن مجید کی یہ مختلف قراءتیں تسلیم شدہ ہیں، اس لئے ان میں تعین متن کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔

سات حرفوں میں نزول قرآن مجید کا مطلب، یہاں ہم اس حقیقت کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں، کہ پہلی بار کتابت قرآن کا کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں ہوا تھا، جس میں تحریف کا کوئی امکان نہیں تھا۔ سات حرفوں میں قرآن مجید کے نازل ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے، کہ

اس کی کتابت بھی مختلف طریقوں سے کی گئی ہو۔ ان سات طریقوں کے مطابق صرف قراءت قرآن ہی ہو سکتی تھی، مختلف عرب قبائل مثلاً مضر، نزار اور ہذیل، اپنے لب و لہجہ اور بعض لفظوں کے تلفظ میں ایک دوسرے سے مختلف تھے، اس لیے دعوت اسلامی کی ضرورتوں کی وجہ سے وقتی رخصت کے طور پر ان کو اپنے لب و لہجہ اور تلفظ میں تلاوت قرآن مجید کی اجازت دیدی گئی تھی تاکہ آہستہ آہستہ وہ قریش کی زبان کے عادی ہو جائیں۔ قریش ہی کی زبان میں قرآن مجید نازل ہوا تھا اس لئے یہ ضروری تھا کہ انہی کے لہجہ اور تلفظ کو اختیار کرنے کی ترغیب دی جائے تاکہ ایک ہی تلفظ کے مطابق قرآن مجید کی تلاوت کی جا سکے، اسی کے مطابق حضرت عثمانؓ نے اپنے نسخہ کی (جس کی نقلیں دوسرے علاقوں میں بھیجی گئیں) کتابت کروائی تھی، یہ نسخہ حضرت حفصہؓ کے نسخہ کے مطابق تھا جو عہد نبویؐ میں لکھی گئی یادداشتوں سے نقل کیا گیا تھا، اسی وجہ سے حضرت عثمانؓ نے دوسرے لوگوں کے (نامکمل اور بے ترتیب) قرآنی نسخوں کو نذر آتش کر دیا تھا، کیونکہ ان نسخوں کی کتابت میں قریش کی زبان اور ان کے تلفظ کی رعایت نہیں کی گئی تھی، حضرت عثمانؓ کا یہ عمل ایسا نہیں تھا جس کی وجہ سے ان پر اعتراض کیا گیا ہو، حضرت حفصہؓ کے نسخہ کو انھوں نے اس شرط پر واپس کر دیا تھا کہ وہ ان کی وفات کے بعد جلا دیا جائے گا، انھیں یہ اندیشہ تھا کہ اگر وہ نسخہ کسی کی نظر سے گزرا تو وہ اسی کے طرز تحریر کو اصل قرار دیکر یہ دعویٰ نہ کر بیٹھے کہ اسی کے مطابق کتابت ہونی چاہیے، حضرت حفصہؓ کا انتقال حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں ہوا ہے، اور ان کے نسخہ کو مروان بن حکم والی مدینہ نے جلوا دیا تھا،

قراءت سبعہ ایک اور مسئلہ قرآن مجید میں قراءت سبعہ کا ہے، یہ قراءتیں براہ راست نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے متواتر طریقہ سے ثابت ہیں، نسخۂ عثمانی میں چونکہ کتابت کی موجودہ شکلیں اور نقطے نہ تھے، اس لیے اس نسخہ سے ساتوں قراءتوں کے مطابق تلاوت ہو سکتی تھی، مثلاً قرآن

چنانچہ تورات اور اس کے علاوہ خود انجیل کے مختلف نسخے پائے جاتے ہیں، آر تھر جیفرے نے کتاب المصاحف لابن ابی داؤد کے مقدمہ میں یہ وضاحت کی ہے کہ تورات وانجیل کی تاریخ، ان کی نسبت اور صحت متن کو اعتبار واستناد سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے "

اختلاف متن اور صحیح متن کے تعین میں دشواری۔ ۔ ۔ کا مطلب تو یہ ہوا کہ متن کی عبارت کئی طرح سے بلکہ متضاد صورتوں میں نقل کی گئی ہو، اور اس میں اصل صحیح متن کا تعین نہ کیا جا سکتا ہو، قرآن مجید میں ایسے کسی اختلاف متن کی مثال موجود نہیں ہے، قرآن مجید کی متواتر قراءتوں کو تو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح اور مستند قرار دیا ہے، اور پوری طرح یقین اور اطمینان کے ساتھ آپ نے اس کی وضاحت فرمائی ہے۔ ان مختلف قراءتوں سے لغت و ادب کے ذخیرہ کے فراوانی اور متن کی معنوی جہتوں کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور اس سے اجتہاد و استنباط قوانین کی مختلف سمتوں کے تعین میں مدد ملتی ہے، علماء اسلام نے بڑی تفصیل سے اس کی وضاحت کی ہے، قرآن مجید کی جو قراءتیں مستند اور قطعی ہیں وہ سب نہایت ہی صحت اور تواتر کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں، اختلاف قراءت کا تعلق قرآن مجید کے ہر لفظ اور ہر ۔ ۔ ۔ ۔ آیت سے نہیں ہے، اس لیے گولڈ زیہر کا یہ دعویٰ کہ "اختلاف قراءت سے قرآن مجید کی کوئی بھی نص محفوظ نہیں" درست نہیں ہے، قرآن مجید کی یہ مختلف قراءتیں تسلیم شدہ ہیں، اس لیے ان میں تعیین متن کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔

سات حرفوں میں نزول قرآن مجید کا مطلب، یہاں ہم اس حقیقت کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں، کہ پہلی بار کتابت قرآن کا کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگرانی میں ہوا تھا، جس میں تحریف کا کوئی امکان نہیں تھا۔ سات حرفوں میں قرآن مجید کے نازل ہونے کا مطلب نہیں ہے، کہ

اس کی کتابت بھی مختلف طریقوں سے کی گئی ہو۔ ان سات طریقوں کے مطابق صرف قراءت قرآن ہی ہو سکتی تھی۔ مختلف عرب قبائل مثلاً مضر، نزار اور ہذیل، اپنے لب ولہجہ اور بعض لفظوں کے تلفظ میں ایک دوسرے سے مختلف تھے، اس لیے دعوت اسلامی کی ضرورتوں کی وجہ سے : تھی رخصت کے طور پر ان کو اپنے لب ولہجہ اور تلفظ میں تلاوت قرآن مجید کی اجازت دیدی گئی تھی، تاکہ آہستہ آہستہ وہ قریش کی زبان کے عادی ہو جائیں۔ قریش ہی کی زبان میں قرآن مجید نازل ہوا تھا اس لئے یہ ضروری تھا کہ انہی کے لہجہ اور تلفظ کو اختیار کرنے کی ترغیب دی جائے تاکہ ایک ہی تلفظ کے مطابق قرآن مجید کی تلاوت کی جا سکے، اسی کے مطابق حضرت عثمانؓ نے اپنے نسخہ کی (جس کی نقلیں دوسرے علاقوں میں بھیجی گئیں) کتابت کروائی تھی، یہ نسخہ حضرت حفصہؓ کے نسخہ کے مطابق تھا جو عہد نبویؐ میں لکھی گئی یادداشتوں سے نقل کیا گیا تھا، اسی وجہ سے حضرت عثمانؓ نے دوسرے لوگوں کے (نامکمل اور بے ترتیب) قرآنی نسخوں کو نذر آتش کر دیا تھا، کیونکہ ان نسخوں کی کتابت میں قریش کی زبان اور ان کے تلفظ کی رعایت نہیں کی گئی تھی، حضرت عثمانؓ کا یہ عمل ایسا نہیں تھا جس کی وجہ سے ان پر اعتراض کیا گیا ہو۔ حضرت حفصہؓ کے نسخہ کو انھوں نے اس شرط پر واپس کر دیا تھا کہ وہ ان کی وفات کے بعد جلا دیا جائے گا، انھیں یہ اندیشہ تھا کہ اگر وہ نسخہ کسی کی نظر سے گزرا تو وہ اسی کے طرز تحریر کو اصل قرار دیکر یہ دعویٰ نہ کر بیٹھے کہ اسی کے مطابق کتابت ہونی چاہیے، حضرت حفصہؓ کا انتقال حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں ہوا ہے، اور ان کے نسخہ کو مروان بن حکم والی مدینہ نے جلوا دیا تھا۔

قراءت سبعہ ایک اور مسئلہ قرآن مجید میں قراءات سبعہ کا ہے، یہ قرائتیں براہ راست نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے متواتر طریقہ سے ثابت ہیں، نسخہ عثمانی میں چونکہ کتابت کی موجودہ شکلیں اور نقطے نہ تھے، اس لیے اس نسخہ سے ساتوں قراءتوں کے مطابق تلاوت ہو سکتی تھی، مثلاً قرآن

اس آیت یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَتَبَیَّنُوْا۔ (النساء۔ ۹۴) میں ایک قرارت "فَتَثَبَّتُوْا" ہے۔ دونوں کے معنی ایک ہیں یعنی تحقیق کر لو اور معلوم کر لو، نسخۂ عثمانی میں نقطے نہ ہونے کی وجہ سے دونوں قرائتیں ہو سکتی تھیں۔

قراءتوں میں اختلاف کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان میں معنوی تضاد پایا جاتا ہے۔ علامہ ابن الجزری نے لکھا ہے کہ اس اختلاف کی صرف تین ہی قسمیں ہیں (۱) لفظاً مختلف ہوں لیکن ان کے معنی ایک ہوں (۲) لفظاً مختلف ہوں ان کے معنی بھی جدا جدا ہوں لیکن ایک چیز میں دونوں معنی پائے جا سکیں (۳) لفظاً و معنی دونوں جدا جدا ہوں اس طرح کہ کسی ایک چیز میں دونوں معنی کا وجود ممکن نہ ہو لیکن کوئی دوسری صورت ایسی ہو جس سے دونوں معنوں میں تضاد باقی نہ رہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ	کیا پھر قرآن میں غور نہیں کرتے اور اگر
عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ	یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا
اخْتِلَافًا كَثِیْرًا (النساء۔ ۸۲)	تو لوگ اس میں بکثرت تفاوت پاتے۔

صحیح روایات کے ذریعہ جو قراءتیں مروی ہیں، ان کے قابل اعتماد ہونے کا گولڈ زیہر نے بھی اقرار کیا ہے، مگر اس کے باوجود وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ

"قرآن کا ایک ہی متن موجود نہیں ہے، چنانچہ اسی بنیاد پر ہم قرآن کے پیرایۂ بیان کے اختلافات میں ابتدائی تفسیری مراحل کو دیکھ سکتے ہیں، قرآن کا جو متن (مشہور قرارت) رائج ہے وہ بھی اپنے جزئیات کے لحاظ سے ایک نہیں ہے، اس کی کتابت خلیفۂ سوم حضرت عثمانؓ کی نگرانی میں مکمل ہوئی تھی، اور اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ مختلف حلقوں میں کلام اللہ کی الگ الگ طریقہ سے روایت کئے جانے کا خطرہ نہ رہے"

سلہ ابن الجزری: النشر ج ۱ ص ۴۹۔

اور فرائض و عبادت کی ادائیگی میں قرآن کی تلاوت متفقہ ترتیب کے خلاف نہ ہو۔[1]

قرآن مجید کا ایک متن نہ ہونے کی بات غلط ہے، اور نہ کسی مسلمان کے ذہن میں کبھی یہ خیال آیا کہ اس کے مختلف متن رہے، حضرت عثمانؓ کا بھی یہی خیال تھا، وہ صحیح قراءتوں کو برقرار رکھنا چاہتے تھے، انھوں نے صحیح اور متواتر قراءتوں میں سے کسی ایک پر بھی پابندی عائد نہیں کی، کبھی کسی نے یہ رائے نہیں دی کہ مغرب یعنی (مراکش اور تیونس وغیرہ) میں نافع کی روایت اور اہل مشرق میں حفص کی روایت کے رائج ہونے کی وجہ سے قرآن مجید میں اختلاف ہو گیا ہے، ایک قرآن ہے جو مختلف قراءتوں سے پڑھا جا سکتا ہے اور ان میں ہر ایک قراءت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اور مستند ہے، مسلمانوں کا یہ طرز عمل آزادی کا مرہون منت نہیں ہے، جیسا کہ گولڈزیہر کا خیال ہے، وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ

"ان قراءتوں میں اگر الفاظ کے معنوں میں کوئی بنیادی اختلاف نہ ہو، تو سب سے پہلے اس معنی پر اعتماد کیا جائے گا، جو متن سے ظاہر ہوتا ہو، اس رائے کے مطابق اس عبارت کو پڑھنا جائز ہے، جو قرآنی مفہوم کے مطابق ہو، خواہ اس میں قرآنی الفاظ سے مطابقت نہ پائی جائے"[2]

قرآن مجید کی معنوی تلاوت کا کوئی بھی شخص قائل نہیں ہے، لیکن گولڈزیہر نے ایک کاتب وحی عبداللہ بن ابی سرح کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

رسولؐ مجھ سے مثلاً "عَزِيزٌ حَكِيمٌ" لکھواتے تو میں یہ کہتا کہ اس کی جگہ "عَلِيمٌ حَكِيمٌ" لکھ دوں تو آپؐ فرماتے ہاں: ہر ایک درست ہے۔[3]

---

[1] گولڈزیہر: مذاہب التفسیر الاسلامی ص ۷۔　[2] ایضاً ص ۴۹۔

[3] گولڈزیہر: مذاہب التفسیر الاسلامی ص ۵۱۔

عبداللہ بن ابی سرح مرتد ہوگئے تھے۔[1] بعد کے لوگوں میں سے جنہوں نے عبداللہ بن ابی سرح پر بہت زیادہ الزامات عائد کئے ہیں، ممکن ہے یہ اضافہ ان ہی لوگوں کی طرف سے کیا گیا ہو یہ ثابت کرنے کے لئے کہ عبداللہ قرآن مجید میں تبدیلیاں کردیتے تھے، اگر یہ روایت صحیح ہو تب بھی قابل قبول نہیں ہے، کیونکہ وہ ان کے دور ارتداد کی روایت ہے، مرتد کی روایت کا کوئی اعتبار نہیں (اور پھر اس کے بعد تو وہ ... مسلمان بھی ہوگئے تھے۔ (مترجم) یہ بات کیونکر ممکن ہے کہ رسول اللہ، آیات قرآنی میں تبدیلی کی اجازت دیں، حالانکہ قرآن مجید میں یہ واضح کردیا گیا ہے کہ

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا	اور ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی
بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ لَا	ہیں جو بالکل صاف صاف ہیں تو یہ لوگ
يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ	جن کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے،
غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ قُلْ مَا	(آپ سے یوں) کہتے ہیں کہ اس کے سوا
يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ	کوئی (پورا) دوسرا قرآن (ہی) لائیے
تِلْقَآئِ نَفْسِيْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا	یا (کم سے کم) اس میں کچھ ترمیم کردیجیے،
يُوْحٰٓى اِلَيَّ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ	آپ کہہ دیجیے کہ مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ میں
عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ	اپنی طرف سے اس میں ترمیم کردوں،
(یونس۔ ۱۵)	بس میں تو اسی کا اتباع کروں گا جو

[1] فاضل مقالہ نگار نے یہ لکھا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مرتد ہوگئے تھے، مگر یہ بات درست نہیں ہے، مسلمان ہونے کے بعد وہ کچھ عرصہ تک تو ٹھیک رہے، مگر پھر مرتد ہوگئے، اور فتح مکہ تک اسی حالت میں رہے۔ فتح مکہ کے بعد وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کو معاف کردیا گیا اور علمائے اہل سنت کے نزدیک اس دور ثانی میں ایک مخلص اور سچے مسلمان کی طرح انھوں نے زندگی گزاری تفصیلات کے لیے دیکھیے

اسد الغابہ ج ۳ ص ۱۵۳، الاصابہ ج ۴ ص ۶۷ – ۶۶ ۔ (مترجم)

میرے پاس وحی کے ذریعہ سے پہنچا ہے اگر
میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں ایک
بھاری دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں۔

اختلاف قراءت کی یہ وجہ نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ رسم الخط کے فنی اشتباہ کو دور کرنا تھا، اور نہ یہ کہ اس کی مدد سے معنی و مفہوم کی تعیین میں مدد لینی تھی جیسا کہ گولڈ زیہر کا خیال ہے، مثلاً قرآن مجید کی آیت:

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا وَمُبَشِّرًا	ہم نے آپ کو گواہی دینے والا اور بشارت
وَنَذِيرًا لِتُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ	دینے والا اور ڈرانے والا کر کے بھیجا ہے،
وَتُعَزِّرُوهُ وَتُوَقِّرُوهُ وَتُسَبِّحُوهُ	تاکہ تم لوگ اللہ پر اور اس کے رسول پر
بُكْرَةً وَأَصِيلًا (فتح - ۸ - ۹)	ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرو اور اس کی
	تعظیم کرو اور صبح و شام اس کی تعظیم میں لگے رہو"

گولڈ زیہر کہتا ہے کہ

"تُعَزِّرُوهُ" (تم ان کی مدد کرو) کو بعض لوگوں نے "تُعَزِّزُوهُ" پڑھا ہے، میرے خیال میں متن میں اس تبدیلی کی ایک وجہ یہ بھی ممکن ہے کہ کہیں آیت قرآنی سے یہ مفہوم نہ اخذ کر لیا جائے کہ اللہ لوگوں سے مدد یا تعاون کا طلب گار ہے"۔ ؎

گولڈ زیہر کے مذکورہ بالا استنباط میں دو غلطیاں ہیں:۔

پہلی غلطی یہ ہے کہ یہ قراءت عامیانہ ہے، اس کا شمار نہ تو سات قراءتوں میں کیا گیا ہے اور نہ ہی ان چودہ قراءتوں میں جو دیگر قسموں کو شامل کر کے زیادہ سے زیادہ شمار کی جا سکتی ہیں، اس لیے علمی استدلال کے لیے اس پر اعتماد کرنا صحیح نہیں ہوگا۔

؎ مذاہب التفسیر الاسلامی، ص ۱۱ - ۱۲

دوسری غلطی یہ ہے کہ زیادہ تر مفسرین نے "تعزروہ" کی تشریح کی ہے کہ "تم اللہ کی مدد کرو، اس کے دین اور رسول کی حمایت کرکے" قرآن مجید میں اللہ کی مدد سے یہی مراد لیا گیا ہے، چنانچہ ایک جگہ ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ (سورۂ محمد۔۷)	اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔

اسلئے قرآن مجید کی وہی تفسیر درست ہے، جو قرآن مجید سے ثابت ہو، گولڈزیہر کا اصل قصور یہ ہے کہ وہ متواتر اور شاذ قراءتوں میں کوئی تمیز نہیں کرتا ہے، چنانچہ یہی غلطی اس نے سورۂ روم کی درج ذیل آیت میں بھی کی ہے:۔

غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ (الروم ۲۔۴)	اہل روم ایک قریب کی سرزمین میں مغلوب ہو گئے، اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد عنقریب تین سال سے لیکر نو سال کے اندر اندر غالب آجائیں گے۔

وہ لکھتا ہے کہ

"غَلَبَتْ (صیغہ معروف) بھی پڑھا گیا ہے، اس سے رومیوں کی اس فتح کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو ان کو شامی سرحدوں پر عربی قبیلوں کے مقابلہ میں حاصل ہوئی تھی، جن مسلمانوں نے اس قراءت کو تسلیم کیا ہے ان کے نزدیک اس میں بازنطینیوں کے خلاف نبی مسلم جماعت کی اس فتح کی خبر دی گئی تھی، جو اس وحی کے نو سال بعد حاصل ہوئی، ہمارے خیال میں مشہور قراءت اور اس قراءت میں معنوی فرق بہت زیادہ ہے، مشہور قراءت کے مطابق جو فتح پانے والے ہیں دوسری قراءت میں وہ شکست

دو چار ہوتے ہیں، پہلی صورت میں فعل ماضی کا صیغہ معروف استعمال ہوا ہے، اور
دوسری صورت میں اس کا صیغہ مجہول، لہذا کلام الہی کے ایک ہی نقرہ کی یہ
دو مختلف قراتیں ایسی ہیں جن میں انتہائی حد تک معنوی تضاد پایا جاتا ہے۔[1]

مندرجہ بالا اعتراض کا جواب یہ ہے کہ دوسری قرارت نہ تو صحیح ہے، اور نہ ہی متواتر، صحت اور تواتر کے لحاظ سے ایک ہی معیار کی دو قرارتوں میں موازنہ کیا جا سکتا ہے۔
اگر صحیح روایت کے مقابلہ میں کمزور روایت ہو تو صحیح روایت کو ترجیح دی جاتی ہے، نہ یہ کہ دونوں کو قبول کر لیا جائے، پھر اگر ہم بالفرض اس کو صحیح مان لیں تب بھی دونوں کے درمیان کوئی تعارض نہیں، اسلئے کہ دونوں قراتیں دو الگ الگ موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں، اور ہر ایک اپنے موضوع کے لحاظ سے واقعہ کے مطابق ہے، لیکن اگر گولڈ زیہر تعارض کے بجائے یہاں منطق کی اصطلاح تناقض کو ثابت کرنا چاہتے ہوں تو انھیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ منطق کے ماہرین کے نزدیک تناقض کی جو شرطیں متفق علیہ ہیں، وہ یہاں سرے سے معدوم ہیں تناقض اسوقت ہوگا جب کہ دو قضیوں کے درمیان کمیت کیفیت اور جہت میں اختلاف ہو لیکن آٹھ باتوں میں اتحاد پایا جائے، مثلاً موضوع و محمول، زمان و مکان اضافت و شرط، قوت و فعل اور جزء و کل، ان میں سے ایک یا چند باتوں میں اگر اتحاد نہ ہو تو ایسی صورت میں تناقض کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔

دونوں قراءتوں میں فتح سے متعلق موضوع ایک نہیں ہے، وہ مشہور قرارت کے مطابق روم و ایران ہیں، اور شاذ قرارت کے مطابق روم اور عرب ہیں،
البتہ گولڈ زیہر نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قراءت پر جو نوٹ لکھا ہے، تو اسمیں اسنے تو تناقض کا مظاہرہ کیا ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ

---

[1] مذہب التفسیر الاسلامی۔ ص ۳۰ - ۳۱ -

فَخَشِيْنَا اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا (۸ کہف ۸۰) ہم کو اندیشہ (یعنی تحقیق) ہوا کہ یہ ان دونوں پر سرکشی اور کفر کا اثر ڈال دے گا

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت میں پہلے ٹکڑے کی جگہ "وَخَافَ رَبُّكَ" ذکر کیا گیا ہے، جس پر گولڈ زیہر درج ذیل تبصرہ کرتا ہے کہ

"اس آیت میں چونکہ بات اللہ کے متعلق ہو رہی ہے، اس لئے ہمارا یہ خیال درست ہو سکتا ہے کہ جو عبارتیں بظاہر اللہ کے شایانِ شان نہ ہوں ان سے قرأتوں کے اختلاف میں بچنا، ہر موقع پر پیشِ نظر نہ تھا"[1]

لیکن یہی گولڈ زیہر دوسری جگہ لکھتا ہے کہ

"قرآن مجید کے مقبول اور مشہور متن کے برخلاف متعدد قرأتوں کا سبب یہ خطرہ تھا، کہ اللہ اور اس کے رسول کے متعلق وہ فقرے آجائیں گے جو نامناسب ہیں۔ یا اللہ اور اس کے رسول کے لازمی احترام کے نقطہ نظر سے وہ بے جوڑ ہیں۔"

گولڈ زیہر کی دونوں عبارتوں پر غور کیجئے تو ان سے کوئی نتیجۂ بحث سامنے نہیں آتا ہے، ان کو پڑھ کر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کچھ فقروں سے بچنے کی وجہ سے قرأتوں میں اختلاف پیدا ہوا یا یہ کہ ایسی عبارتوں کے وجود سے اختلافِ قرأت کی بحث کا کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ شاذ قرأتوں کی حیثیت عامیانہ روایات جیسی ہے عام لوگ بعض مرتبہ اپنی بے علمی نا سمجھی یا کم علمی کی وجہ سے صحیح واقعات اور مستند نثری اور شعری اقتباسات میں بھی تغیر و تبدل کر لیتے ہیں، اور اس بارہ میں ان کی یادداشت بھی ان کی صحیح رہنمائی کرنے سے قاصر رہتی ہے، مگر ان عامیانہ روایتوں کی وجہ سے کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کرتا ہے کہ ان کی بنیاد پر کسی نثر یا شعر کے

---

[1] مذاہب التفسیر الاسلامی۔ ص ۲۹۔

اصل متن میں تغیر کیا جائے یا اس عامیانہ روایت کو بنیاد بنا کر کسی شاعر یا نثر نگار پر تنقید کی جائے
اسلام کے ابتدائی مصنفین اور مؤرخین نے جب مختلف علوم و فنون کی تدوین کی تو انھوں نے
تمام چیزوں کو سمیٹنے اور ہر بات کو محفوظ کر لینے کی غرض سے ہر قسم کی روایتوں کو یکجا کر لیا، پھر جب
نقد و تجزیہ ہوا تو مقبول اور صحیح روایات کی نشاندہی کی، اور شاذ روایتوں کو عامیانہ حکایتوں کی حیثیت
سے جداگانہ طور پر ذکر کر دیا گیا، لیکن ظاہر ہے کہ علمی تحقیق کا مدار مستند روایات پر ہوگا، نہ کہ عام روایتوں
پر۔[1] جہاں تک متواتر قراءتوں کا تعلق ہے، تو ان میں ان قیاس آرائیوں اور تاویل و توجیہ کی
سرے سے کوئی گنجائش نہیں ہے جو صرف تخیل کی پرواز کا نتیجہ ہیں، اللہ کی ذات و صفات اور اس کے
رسول کے اوصاف کا صحیح طور پر تو خود اللہ ہی کو علم ہو سکتا ہے، اور اس نے جو کچھ بیان کر دیا ہے وہی
اس کے سایانِ شان ہے، گولڈزیہر کے سرکش تخیل نے اس کو اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ وہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مدافعت کے پردہ میں آپ کی دیانت داری کے
بارہ میں شبہات پیدا کر دے، اس سلسلہ میں اس نے قرآن مجید کی ایک آیت کی دو قراءتوں
کا سہارا لیا ہے، آیت یہ ہے۔ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ (آل عمران - ۱۶۱) قراء سبعہ میں
سے ابن کثیر، ابو عمرو اور عاصم نے يَغُلَّ کی روایت کی ہے، اور باقی چار ائمۂ قراءت سے يُغَلَّ روایت
کیا گیا ہے، پہلی قراءت کے مطابق مفہوم یہ ہوگا کہ نبی کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ مال غنیمت کی
تقسیم سے پہلے ہی بالا ہی بالا کچھ لے لیں، مقصد یہ ہے کہ نبی ایسے فعل سے بلند اور معصوم ہوتا ہے۔
نبوت اور خیانت دو متضاد چیزیں ہیں،[2] اس لیے نبی کے بارے میں خیانت کا شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا
ہے، ایک روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بدر کے موقع پر ایک سرخ چادر گم ہو گئی تھی جس پر کچھ
منافقوں نے یہ بات کہی کہ ہو سکتا ہے، کہ وہ چادر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھ لی ہو، اس پر

---

[1] اضافہ از مترجم [2] (ترجمہ) اور نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ خیانت کرے۔

مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی جس میں تمام نبیوں کی پاکبازی اور طہارت اخلاق کا اعلان کیا گیا ہے، مال غنیمت میں خورد برد، خیانت ہے، جس سے انبیائے کرام دور رہے ہیں۔

دوسری قراءت میں یُغَلَّ فعل مجہول استعمال کیا گیا ہے، اس کے مطابق مفہوم یہ ہوگا۔ کہ کسی نبی کی سیرت ایسی نہیں ہوتی کہ اس پر اس کی امت خیانت کا کوئی الزام عائد کرے[1] بہر حال نتیجہ کے اعتبار سے اس قراءت کا بھی وہی مفہوم ہے، جو پہلی قراءت سے متبادر ہوتا ہے[1]

لیکن گولڈزیہر یہ کہتا ہے کہ

"غالباً کسی مسلمان کو یہ بات نامناسب معلوم ہوئی ہوگی کہ نبی کی طرف کسی ناپسندیدہ کام کے لئے بطور مفروضہ ہی سہی، کوئی امکان برقرار رہے، خواہ اس میں تردیدی پہلو ہی اختیار کیا گیا ہو، چنانچہ زیادہ تر لوگوں نے فعل مجہول پڑھکر، متوقع شبہ کا ازالہ کر دیا، اب اس ناپسندیدہ مفروضہ کی نفی ہوگئی کہ نبی کسی نادرست فعل کا مرتکب ہو سکتا ہے"[2]

گولڈزیہر کی عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ کچھ لوگوں نے قرآن مجید کے لفظ کو فعل مجہول میں اس لئے تبدیل کر دیا تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سے خیانت کے الزام کو دور کیا جا سکے، لیکن ہم یہ پوچھتے ہیں کہ قرآن مجید کے کسی لفظ میں اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی تبدیلی نہیں کی تو پھر عام لوگ اس میں کسی ترمیم کی جرأت کیسے کر لیتے؟ آیت بالا کا باقی حصہ یہ ہے۔ وَمَن يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (اور جو شخص خیانت کرے گا وہ اپنی خیانت کی کوئی چیز کو قیامت کے دن حاضر کرے گا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو خیانت سے

---

[1] تفسیر خازن ا۔ لباب التاویل فی معانی التنزیل ج ۱ ص ۴۴۱ ط دار الفکر ۱۳۹۹ھ

[2] مذاہب التفسیر الاسلامی ص ۴۰ سے

بچنے کی دوسروں کو تاکید فرماتے تھے، ایک حدیث میں ہے کہ

الا لا اعرفن احدکم	دیکھو میرے علم میں یہ بات نہ آئے کہ تم
یاتی ببعیر له رغاء وببقرة	میں سے کوئی شخص (قیامت کے دن)
له خوار وبشاة لها ثغاء	اس طرح آئے کہ اس کے ساتھ اونٹ
فینادی یا محمد یا محمد فاقول	ہو جو بلبلا رہا ہو، گائے ہو جو چیختی ہو، بکری
لا املک لک من الله شیئا	ہو جو بے قرار ہو، اور پھر یہ شخص بار بار
فقد بلغتک[1]	پکارے کہ اے محمد! اے محمد! اور میں
	یہ جواب دوں کہ خدا کے مقابلہ میں مجھے تمہارے
	بارے میں کچھ بھی اختیار نہیں، میں نے تو پیام
	حق تم تک پہنچا دیا تھا۔

گولڈزیہر اگر تعصب سے پاک ہوتا، اور خالص علمی تحقیق اس کے پیش نظر ہوتی تو وہ ایک ایسے مفروضہ کو نہ چھیڑتا جس کا کسی نے بھی کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے، رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی دیانت داری کے بارے میں شک پیدا کرنے کے لیے وہ ایک قراءت کی ایسی توجیہ نہ کرتا جو سرے سے بے بنیاد ہے، لیکن وہ تو اس فکر میں تھا کہ کوئی ہلکا سا نشان ملے اور اسے وہ پہاڑ ثابت کردے۔

تفسیر قرآن کا صحیح طریقہ | اگر کسی قرآنی آیت میں کئی پہلو ہوں جن کے مطابق اس کی تفسیر کی جاسکتی ہو تو صحیح ترین اور قابل قبول تفسیر وہ ہوگی جو لغت اور محاورہ کے مطابق ہو، اور عقل اور شریعت کے خلاف نہ ہو، اور وہ تفسیر راہ حق سے بعید تر ہوگی، جو تعصب اور خواہش نفس کی پیداوار ہو۔ آیت قرآنی ہے کہ

---

[1] زمخشری: الکشاف ج ۱ ص ۲۵۰ - ط مصر ۱۹۴۳ء

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَلَا تَكُنْ فِي مِرْيَةٍ مِّن لِّقَائِهِ (السجدۃ - ۲۳)

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی تو آپ اس کے ملنے میں کچھ شک نہ کیجئے۔

منٹگمری واٹ نے مندرجہ بالا آیت میں "لقائہ" کی تشریح کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ

"اس کی ضمیر سے الکتاب یعنی تورات مراد ہے، کیونکہ یہ کتاب عربی میں موجود ہے اور محمدؐ اس سے ملتے اور اس کے ماہرین سے رابطہ رکھتے ہیں۔ محمدؐ اور قرآن کا علمی سرمایہ، ہر صورت میں اسی کتاب سے ماخوذ ہے، اور یہ سب کچھ وحی اور کلام ربانی کی تنزیل سے الگ ایک ماخذ تھا۔"

لیکن کسی مفسر قرآن نے وہ معنی نہیں بتائے جو اس عیسائی مصنف نے بیان کئے ہیں۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تورات نہیں ملی تھی، یہاں موسیٰ علیہ السلام کو تورات ملنے کا تذکرہ ہے یا دوسرے رایوں کے مطابق، شب معراج یا بروز قیامت، موسیٰ علیہ السلام سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، یا ایک رائے کے مطابق آخرت میں موسیٰؑ کی اپنے رب سے ملاقات کا ذکر کیا گیا ہے، علامہ آلوسی نے اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"مطلب یہ ہے کہ ہم نے آپ ہی کی طرح موسیٰؑ کو بھی کتاب دی، اور آپ ہی کی طرح ان پر بھی وحی اتاری اس لئے آپ کو اس بارہ میں کوئی شک نہیں ہونا چاہئے کہ آپ کو موسیٰؑ ہی کی طرح کتاب اور وحی حاصل ہوئی ہے۔"[۱]

"الکتاب" کے لقاء سے اگر تورات کو مراد لیا جائے تب بھی اس کی طرف ضمیر کو راجع کرنا

---

[۱] الآلوسی، روح المعانی ج، ص ۱۳۰-۱۳۱ بیروت ۱۹۸۵ء

صحیح نہیں ہو گا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص طور پر تورات نہیں ملی، حداد نے تورات
ملنے کے بارے میں مزید ثبوت کے لیے درج ذیل آیت پیش کی ہے :۔

فَإِنْ كُنْتَ فِي شَكٍّ مِمَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ فَاسْأَلِ الَّذِينَ يَقْرَءُونَ الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ (یونس - ۹۴)	پھر اگر بالفرض آپ اس (کتاب) کی طرف سے کچھ شک (و شبہ) میں ہوں جس کو ہم نے آپ کے پاس بھیجا ہے، تو آپ ان لوگوں سے پوچھ دیکھئے جو آپ سے پہلے (کی) کتابوں (تورات وانجیل) کو پڑھتے ہیں۔

مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ مذکورۂ بالا آیت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شک میں مبتلا ہو سکتے تھے، چنانچہ مصنف عبدالرزاق اور طبری (ابن جریر) میں قتادہ سے یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ جب مذکورۂ بالا آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لا أشك ولا أسأل (نہ مجھے شک ہے اور نہ ہی اللہ سے پوچھوں گا)[1] اور یہی حداد حضرت عیسیٰؑ کی طرف کلمۃ اللہ اور روح اللہ کو بشر ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ صفات ربانی کے طور پر نسبت دیتا ہے، حالانکہ صفات ربانی میں اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے اور مذکورۂ بالا دونوں باتیں یا ایسے ہی دوسرے امتیازات کی وجہ سے حضرت عیسیٰؑ بشریت سے بالاتر نہیں ہوئے، حداد کا یہ بھی زعم باطل ہے کہ حضرت عیسیٰؑ میں تورات وانجیل کی روشنی میں صفات الوہیت کامل طور پر پائی جاتی تھیں جیسا کہ قرآن نے اقتباسات پیش کئے ہیں ان کی تصدیق کی ہے اور ان کی صداقت کی شہادت دی ہے، حضرت عیسیٰؑ مخلوقات سے بالاتر ہو کر ایسی ذاتی صفت پا گئے، جو خالق ہی کے لیے خاص ہے" وہ یہ بھی کہتا ہے کہ :۔

---

[1] الآلوسی :۔ روح المعانی ج ۱۱ ص ۱۹۴ - طا بیروت ۱۴۰۵ھ

"[illegible] سے یہ تسلیم ہے کہ ہم کو تورات و انجیل کی روشنی میں ان تمام مشترک باتوں کو سمجھنے کا حق حاصل ہے جو قرآن میں غیر واضح رہ گئی ہیں، اس لیے کہ قرآن خود اپنی شہادت میں یا اس کے سمجھنے میں شک سے دوچار ہے، وہ ہمیں الکتاب (تورات) کے حوالہ کر دیتا ہے، جیسا کہ اس میں کہا گیا ہے، کہ "فَإِن كُنتَ فِي شَكٍّ مِّمَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ"۔"[1]

كَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ	اللہ کا فرمان تھا جو اس نے مریم کی طرف
وَرُوحٌ مِّنْهُ (نساء - ۱۷۱)	بھیجا اور ایک روح تھی اللہ کی طرف سے،

اس آیت میں کلمہ کے لفظ سے فرمان تخلیق کُنْ (ہو جا) مراد ہے اور اللہ نے آدم میں بھی اپنی طرف سے روح حیات پھونک دی لیکن اس نفخ (پھونک) نے ان میں کوئی ایسی ذاتی صفت نہیں پیدا کی جو اللہ کے لیے خاص ہو اس نے ان کو بشری حدود سے نکال کر الوہیت کا مقام نہیں دیا، اور جب یہ کہا جائے کہ کلمۃ اللہ تو اس اضافت سے، مضاف میں اللہ کے ذاتی اوصاف نہیں پیدا ہو جائیں گے، مثلاً خلیل اللہ اور کلیم اللہ وغیرہ خطابات بالترتیب حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے ہیں، مگر اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ ان انبیاء میں اس نسبت کی وجہ سے اللہ کے اوصاف ذاتی بھی پیدا ہو گئے ہیں۔

حداد کی اس بات کا کہ قرآن مجید خود اپنی شہادت میں یا اس کے سمجھنے میں شک سے دوچار ہے، کیا مطلب ہوا۔ کیا قرآن مجید کا وہی سرچشمہ نہیں ہے، جو نبیوں پر نازل ہونے والی تمام کتابوں کا تھا؟ قرآن نے تورات و انجیل کی اگر تصدیق کی ہے تو یہ ایک مقلد کی تصدیق نہیں بلکہ ایک محافظ اور نگہبان کی شہادت ہے۔

---

[1] المسیح فی القرآن - ص ۱۹۱ - ۱۹۲ -

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (مائدہ ۵ - ۴۸)

ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لے کر آئی ہے، اور الکتاب میں سے جو کچھ اس کے سامنے ہے اس کی تصدیق کرنے والی اس کی محافظ و نگہبان ہے،

یہاں مُهَيْمِن کے معنی یہ ہیں کہ قرآن مجید گذشتہ کتابوں پر ایک شاہد بھی ہے حضرت حسانؓ کا ایک شعر اسی معنی میں ہے،

ان الکتاب مهیمن لنبینا والحق یعرفه ذوو الالباب

یہ کتاب قرآن، ہمارے نبی کے لئے ایک شہادت کی حیثیت رکھتی ہے، اور حق کو عقلمند ہی پہچانتے ہیں۔

قرآن مجید پچھلی کتابوں کا محافظ ہے، اس لئے کہ اب اس کو نہ منسوخ ہونا ہے، اور نہ ہی اس میں کوئی تغیر و تبدل ہوگا، اور اس نے حضرت عیسیٰؑ کو کلمۃ اللہ (اللہ کا فرمان) قرار دیا ہے کیونکہ اس کا فرمان اور حکم یہ ہوا کہ عیسیٰؑ کو بغیر باپ کے پیدا کیا جائے۔ وَاِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (اس کا معاملہ یہ ہے کہ جب کسی کام کا ارادہ کرتا ہے، تو یہ فرما دیتا ہے کہ ہو جا پس وہ کام ہو جاتا ہے) آیت میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ حضرت عیسیٰؑ میں الوہیت پائی جاتی تھی، مگر اس کے باوجود حداد کو آیت کی ایسی تفسیر پر اصرار ہے جو اس کے مسیحی عقیدہ کے مطابق ہو، انجیل کے کسی فقرہ سے اس نے اپنی دل پسند بات ثابت کی ہوتی تو وہ شاید معذور سمجھا جاتا، مگر یہاں تو قرآن مجید کی روشن آیات ہیں، جنھوں نے مختلف موقعوں پر بار بار مسیح کو الٰہ قرار دینے کی نفی کی ہے، قرآن مجید نے مسیح کو ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ (تین میں سے تیسرا) تسلیم کرنے سے قطعی طور پر ایسے واضح طریقہ سے انکار کیا ہے، جس میں کسی تاویل و توجیہ کی

کوئی گنجائش ہی نہیں ۔ حداد کے لئے زیادہ بہتر یہ تھا کہ وہ قرآنی آیات میں اپنی دل پسند تاویلات سے باز رہتا لیکن وہ یہ لکھتا ہے کہ

" انجیل یوحنا کی ابتدائی بحث اس بارہ میں فیصلہ کن ہے ۔ لیکن دونوں کتابوں میں اصل پیچیدگی یہ ہے کہ " قرآن نے کلمۃ اللہ کا ربانی خطاب الوہیت سے مجرد کرکے آخر کیونکر نقل کیا ؟" صحیح حل یہ نہیں ہے کہ اس بارہ میں انجیل یا قرآن کے بیان کو رد کر دیا جائے بلکہ دونوں کے درمیان ممکن حد تک تطبیق کی کوشش کرنی چاہئے :

چنانچہ اس نے تمام مفسرین کی دلیلوں کو رد کر دیا ہے ، اور اپنی ناقابل قبول تاویلوں کے ذریعہ اس نے قرآن مجید کی عبارت کو اپنے اصل معنی و مفہوم سے جدا کرکے ، بقول خود انجیل اور قرآن مجید کے درمیان ایسی مخفی لیکن حقیقی یگانگت پیدا کر دی ہے جو نسبتاً زیادہ قابل قبول ہے ، اس ظاہری تعارض کے مقابلہ میں جو ناواقف لوگ اس عبارت سے ثابت کرنا چاہتے ہیں[1] ۔ حداد کی خام خیالی یہ ہے کہ اس کے نزدیک

" قرآن کلمہ اور روح کی صفت ربانی کو اگر وہ ایک جوہر الٰہی کے لاہوت کے ضمن میں ہو ، رد نہیں کرتا ہے ، مطلب یہ ہے کہ کلمہ سے مراد جوہری محبت کا وہ ثمرہ ہے جو ایک ذات الٰہی میں موجود ہے[2]

مذکورہ بالا تشریح جو تعصب اور کینہ سے پُر ہے دراصل ایک شخص کی شعبدہ بازی ہے جو ایک طرف تو حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کو بڑھانا چاہتا ہے اور دوسری طرف اسی نسبت سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اہمیت کو گھٹانا چاہتا ہے ۔ وہ بڑی بے شرمی اور بے غیرتی کے ساتھ حضرت عیسیٰؑ اور انجیل کے تقدس کو اس وحی کے حوالہ سے ثابت کرتا ہے ، جو رسول اللہ صلی اللہ

---

[1] المسیح فی القرآن ۔ ص ۲۰۶ [2] ایضاً ص ۲۱۵

پر نازل ہوئی تھی، اور پھر بڑی جرأت کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تعریض کرتے ہوئے اپنی خام خیالی سے نکتہ چینی بھی کرتا ہے، وہ لکھتا ہے کہ

مسیح نے دوسروں کی طرح مسجد کے قریب اپنی بیویوں کے مکانات تعمیر نہیں کئے تاکہ بعد نماز عشاء وہ ہر شب ان میں سے کسی ایک کے یہاں جاتے رہتے، وہ اپنی شب اللہ کے سامنے دعاؤں میں گزار دیتے تھے، انھوں نے جنگ نہیں کی، اور نہ ہی اپنی بیویوں کے درمیان قرعہ اندازی کی تاکہ جس کا نام نکلے اسے اپنے ساتھ لیجائیں، گویا کہ وہ جنگ کے معرکوں میں بھی عورت سے جدا نہ رہ سکتے ہوں، بلکہ وہ اپنے شاگردوں سے یہ کہا کرتے تھے، کہ میری خوراک تو یہ ہے کہ جس نے مجھے بھیجا ہے میں اس کی مشیت کو نافذ کر دوں اور اس کے کام کو پورا کروں، مسیح کو آغاز میں اس بات کی ضرورت نہیں پڑی کہ اللہ ان کا شرح صدر کرکے ان پر سے وہ بوجھ اتار دے جو ان پر بار گراں بنا ہوا تھا، ان کو اپنے آخری عہد میں اس بات کی بھی ضرورت نہیں پڑی کہ اللہ ان کی گذشتہ اور آیندہ غلطیوں کو معاف کرے۔"

حداد نے عباس محمود العقاد پر طنز کرتے ہوئے ان کی طرف ایسی بات منسوب کی ہے جو انھوں نے ہرگز کہیں لکھی نہ کہی، نہ لفظوں میں اور نہ ہی اشاروں کنایوں میں، مگر حداد داستاں سرائی کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

"عورت کی طرف احتیاج سے صرف مسیح ہی بالاتر ہیں، وہ غیر شادی شدہ رہے، اور اسی حالت میں اٹھائے گئے، یہ وہ کمال ہے، جس میں وہ منفرد ہیں، یہ جنسی بیچارگی کا نتیجہ نہ تھا، جیسا کہ عقاد نے طعن کیا ہے، انھوں نے یہ کہا ہے کہ ہم سے ایک مستشرق نے یہ کہا کہ زوجیاں تو جنسی رجحانات میں زیادتی کا ثبوت ہیں، ہم نے جواب دیا کہ

حضرت عیسیٰ نے کبھی نکاح نہیں کیا، مگر آپ انھیں جنسی بیچارگی کا الزام نہیں دیتے اس لئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر نو بیویاں کی تھیں تو ان کو بھی جنسی میلان کی زیادتی کا الزام نہ دیجئے۔[1]

عقاد ایک صاحب ایمان شخص ہیں، اور وہ اپنے اسلامی عقیدہ کی وجہ سے کسی بھی نبی و رسول کی ذات پر طعنہ زنی کی جرأت نہیں کر سکتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مِن رَّبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ ۚ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ (البقرہ۔ ٢٨٥)

رسول ایمان رکھتے ہیں اس وحی پر جو ان کے رب کی طرف سے ان پر نازل ہوئی، اور (اسی طرح دیگر) مومنین بھی، ہر ایک کا ایمان ہے اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر، (وہ یوں کہتے ہیں کہ) ہم اللہ کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان کو فرق نہیں کرتے ہیں، پھر اسی حکم الٰہی اور عقاد کی مومن شخصیت کی طرف حداد نے وہ بات کیسے منسوب کر دی جو انھوں نے نہیں کہی، اور نہ ہی یہ خیال ان کے ذہن میں پیدا ہوا، کچھ مستشرقین کی یہ عادت رہی ہے کہ وہ اپنے فاسد اغراض کو قرآن مجید میں تلاش کرتے رہتے ہیں، انھوں نے یہ تو پڑھا کہ

أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ	کیا ہم نے آپ کی خاطر آپ کا سینہ (علم
وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ	اور حلم سے) کشادہ نہیں کر دیا اور ہم نے
الَّذِي أَنقَضَ ظَهْرَكَ ۝	آپ پر سے آپ کا وہ بوجھ اتار دیا جس نے
(انشراح ١-٣)	آپ کی کمر توڑ رکھی تھی۔

---

[1] المسیح فی القرآن۔ ص ٢٢١ - ٢٢٢۔

لیکن اس کے بعد وہ رک جاتے ہیں، آگے نہیں پڑھتے کہ وَرَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ (ہم نے آپؐ کی خاطر آپؐ کی یاد کو بلند کر دیا) وہ یہ تو پڑھتے ہیں کہ

لِيَغۡفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ (الفتح۔۲) تاکہ اللہ آپ کی سب اگلی پچھلی خطائیں معاف فرما دے۔

لیکن اس کے بعد یہ نہیں پڑھتے کہ وَيُتِمَّ نِعۡمَتَهُ عَلَيۡكَ (اور آپ پر اپنے احسانات کی تکمیل کر دے) دراصل نبوں کے لیے شرح صدر سے مراد وہ نور الٰہی ہے جو ان کے دلوں میں اللہ کی طرف سے ڈال دیا جاتا ہے، تاکہ ان سے تنگی اور تاریکی دور ہو جائے، یہی وجہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنے رب سے یہ درخواست کی تھی کہ رَبِّ اشۡرَحۡ لِي صَدۡرِي (اے میرے رب میرا سینہ کشادہ فرما دے)

سورۃ الم نشرح میں جس وِزر (بوجھ) کا تذکرہ ہے، اس سے مراد گناہ نہیں ہے۔ جیسا کہ بعض مستشرقین نے سمجھ لیا ہے، اس سے مراد ہے وہ بارگراں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اٹھائے ہوئے تھے یعنی پیغام الٰہی کی وہ امانت جس کو دوسروں تک پہنچا دینے کی آپ پر ذمہ داری عائد ہوتی تھی، نزول وحی کے وقت آپ پر طاری ہونے والی تھکن، قریش کی سرکشی، ان کی غلط کاریوں، ان کے ظلم و جور، شرک اور گمراہی کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غیر معمولی طور پر فکر مند رہا کرتے تھے، دین الٰہی کی امانت کا بار آپ پر ایسا ہی تھا، گویا کہ بھاری بھرکم بوجھ پیٹھ پر لاد دیا گیا ہو، اللہ نے یہ بار آپ پر سے اتار دیا۔ اور وہ اس طرح کہ آپ پر مدینہ طیبہ کے باشندوں کی ایک بڑی تعداد ایمان لے آئی اور وہ فوج در فوج دین الٰہی میں آکر شامل ہوتے گئے، آپ کے پیرو جو بے بس تھے، اب طاقتور ہو گئے، جزیرۃ العرب سے شرک اور جاہلیت کا قلع قمع ہو گیا۔ اس کے باشندوں نے اطاعت قبول کی، اسلام پھیل گیا۔

اس پر یہ مزید عنایت ہوئی کہ اللہ نے آپ سے اپنی کامل رضا اور ہر نوع کی مغفرت کا وعدہ فرمایا۔
اسی طرح ساری دنیا میں اللہ نے آپ کے نام کو بلندی عطا فرمائی، چنانچہ کلمۂ شہادت میں، اذان میں، تشہد میں، قرآن مجید میں اور اہل ایمان کی طرف سے آپ پر درود پاک پڑھتے ہوئے جہاں کہیں اللہ کا ذکر ہوتا ہے وہیں نام محمد بھی ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے۔

مترادف نے آیت قرآنی لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ کا بھی ذکر کیا ہے، حضرت سفیان ثوری نے "مَا تَقَدَّمَ" سے قبل نبوت دور جاہلیت میں آپ کے کاموں کو مراد لیا ہے، (جو اگرچہ بہتر اور درست تھے، لیکن ظاہر ہے کہ وحی کی رہنمائی میں نہ ہوئے تھے، مترجم) انھوں نے "مَا تَأَخَّرَ" کے معنی یہ کئے ہیں اور جو رہ گئے" یعنی آپ نے نہیں کئے، اور جیسا کہ مثلاً کہا جاتا ہے کہ اعطی من راٰہ ومن لم یرہ (اس نے ہر ایک پر بخشش کی جس کو دیکھا اور جس کو نہیں بھی دیکھا) اور ضرب من لقیہ ولم یلقہ (اس نے ہر ایک کو مارا جو ملا اور جو نہیں بھی ملا) اسی طرح مذکورہ آیت میں معنی یہ ہونگے کہ آپ سے غلطیاں ہوئی ہوں یا نہ ہوئی ہوں، بہرحال آپ کی خاطر وہ سب معاف کر دی گئیں، یہ ایک واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلطیاں دوسروں کی طرح نہ ہونگی، مگر چونکہ ابرار کے لیے جو کام نیک اور قابل تعریف ٹھہرتے ہیں وہ مقربین کے یہاں کم رتبہ ہونے کی وجہ سے سیئات میں شمار کئے جاتے ہیں (حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْنَ[1]) اس لیے یہاں مقصود یہ ہے کہ بھول چوک اور تعبیر و ترجمانی میں اگر کوئی کسر رہگئی ہو تو وہ بھی معاف کی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس موقع پر آپ کیلئے ذنب کا لفظ حقیقی نہیں بلکہ بطور مجاز کے استعمال ہوا ہے، اور یہ ذنب مجازی نہ تو آپ کی نبوت پر اثر انداز ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس سے آپ کی اخلاقی بلندیوں اور کمال شرافت پر کوئی حرف آتا ہے

---

[1] تفسیر الخازن: لباب التاویل فی معانی التنزیل۔ ج ۴ ص ۱۸۰

اسلم روایت کرتے ہیں کہ شب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی سفر پر تھے اور حضرت عمر بن خطاب بھی ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے آپ سے کسی چیز کے بارے میں کچھ پوچھا آپ نے جواب نہیں دیا، انھوں نے پھر سوال کیا آپ نے پھر بھی جواب نہیں دیا، انھوں نے پھر پوچھا مگر اب بھی کوئی جواب نہیں دیا، اس پر حضرت عمرؓ نے (اپنے آپ سے مخاطب ہو کر) کہا کہ اے عمر! تیری بربادی ہو کر تو نے تین بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا اور انھوں نے جواب عنایت نہیں فرمایا۔ پھر حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے اونٹ کی رفتار بڑھائی اور لوگوں کے پاس سامنے آگیا، مجھے یہ ڈر تھا کہ میرے بارے میں قرآن مجید کی کوئی آیت نہ نازل ہو جائے مگر تھوڑی ہی دیر میں کسی نے مجھے آواز دی تو میں نے اپنے جی میں یہ خیال کیا کہ کہیں میرے بارے میں کوئی آیت تو نازل نہیں ہوئی، پھر میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری دی، آپ کو سلام عرض کیا تو ارشاد فرمایا کہ آج شب میں مجھ پر ایک ایسی سورت نازل ہوئی ہے جو مجھے دنیا جہاں سے زیادہ محبوب ہے پھر آپ نے پڑھا۔ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا۔۔۔۔ (ہم نے تجھے یہ نمایاں فتح عطا کی۔۔۔۔) رواہ الترمذی، یہ فتح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر میدان میں نصیب ہوئی جس پر تاریخ بھی شاہد ہے۔

مستشرقین نے قرآن مجید کے بارہ میں گمراہی پھیلانے اور شک پیدا کرنے کے لئے جو اعتراضات کئے ہیں انکا جائزہ لینا اور پھر ان میں سے ایک ایک اعتراض کی تردید اس مختصر مقالہ میں ممکن نہیں ہے۔ میرے نزدیک اس موضوع کے ہر گوشہ کا احاطہ کرنے اور ان پر تفصیلی مباحث کے لیے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے، جس کے لیے یہ مضمون ایک رہنما کا کام دے سکتا ہے، شاید یہی مقالہ علوم قرآنی کے ماہرین کو اس موضوع کی طرف متوجہ کرنے کا سبب بن جائے، اور پھر وہ قرآن مجید کے ربانی سرچشمہ کو اور قرآن کی بے پایاں صداقت اس کے ربانی تحفظ اور غیر معمولی استناد کو واضح کریں اور اس کی مختلف قراءتوں اور اسکی واضح اور بے خطا تشریح و تفسیر پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالیں، علمی طور پر یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ ہم مستشرقین کے بے سروپا الزامات اور انکی زہرناکیوں کا مداوا کر سکتے ہیں۔

(ختم)

سیرۃ النبیؐ جلد سوم
پر
کچھ اعتراضات اور ان کے جوابات

از ضیاء الدین اصلاحی

(۳)

سید صاحبؒ نے ان کتابوں سے محض اپنے موضوع کی حدیثیں نقل کر دینے پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ احادیث اور ان کے مندرجات اور رُواۃ پر مفصل بحث و تحقیق کی ہے، اور انھیں نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھا ہے، جرح و تعدیل اور اسماء الرجال کے ماہر کی حیثیت سے راویوں اور حدیثوں کی قوت و ضعف اور صحت و سقم کا فیصلہ بھی کیا ہے، حدیثوں کے بارہ میں شکوک و شبہات کا جواب دیا ہے، ایک مضمون کی دو یا کئی روایتوں کے فرق و اختلاف اور کمی بیشی پر گفتگو کی ہے، متعارض حدیثوں میں یا تو کسی کو ترجیح دی ہے، یا تضاد کو رفع کیا ہے، یا ان کے درمیان جمع و تطبیق سے کام لیا ہے۔

ہم اپنے گذشتہ مضمون میں سید صاحبؒ کی حدیث میں مہارت، وسعت علم و نظر، اور تحقیق و تدقیق کی کچھ مثالیں دے چکے ہیں، یہاں اس فن میں ان کے نقد و نظر کی بعض مثالیں پیش کرتے ہیں۔

واقعۂ ہجرت کے سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک معجزہ کا ذکر حدیث میں

اس طرح آیا ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نوعمر چھوکرا تھا، عقبہ بن معیط ایک قریشی کافر رئیس کی بکریاں مکہ میں چرایا کرتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کا ادھر سے گذر ہوا، آپ نے مجھ سے کہا، لڑکے! تمہارے پاس دودھ ہے، ہم کو پلاؤ گے، میں نے کہا میں امین ہوں، تم کو نہیں پلا سکتا، آپ نے پوچھا اچھا کوئی بکری کا بچہ ہے، میں نے کہا ہاں، فرمایا لے آؤ، میں لے آیا، حضرت ابوبکرؓ نے بچہ پکڑا اور آپ نے تھن میں ہاتھ لگایا اور دعا کی، حضرت ابوبکرؓ گھر پتھر لے آئے اس میں دودھ دوہا گیا، پہلے آپ نے خود دودھ پیا، پھر ابوبکرؓ نے اور آخر میں میں نے پیا، اس کے بعد آپ نے فرمایا اے تھن! سمٹ جا، وہ سمٹ کر خشک ہوگیا، میں نے عرض کی کہ اس عمدہ کلام یعنی قرآن مجید میں سے مجھے کچھ سکھایئے، فرمایا تم سیکھنے والے لڑکے ہو، تو میں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منھ سے ستر سورتیں سیکھیں جن میں کوئی دوسرا میرا مقابلہ نہیں کرسکتا، ابن سعد میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہا کرتے تھے کہ میرے اسلام لانے میں اسی معجزہ کو دخل ہے، (سیرۃ النبیؐ جلد سوم۔ صفحہ ۶۲۱ - ۶۲۳)

اس روایت پر حضرت سید صاحب کا نقد و تبصرہ ملاحظہ ہو۔

"یہ روایت مسند ابو داؤد طیالسی، مسند احمد ابن حنبل، ابن سعد اور دلائل ابی نعیم میں ہے، طیالسی اور ابو نعیم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ جب مشرکین سے بھاگے تھے تب یہ واقعہ پیش آیا یعنی ہجرت کے ایام میں، طیالسی کی اس روایت کا سلسلۂ سند ہر طرح سے محفوظ ہے، ابو داؤد حماد بن سلمہ سے اور وہ عاصم بن بہدلہ سے اور عاصم زر بن حبیش سے اور وہ خود حضرت ابن مسعودؓ سے اس کی روایت کرتے ہیں، یہ تمام اصحاب ثقہ اور معتبر ہیں، بایں ہمہ اس واقعہ کو زمانہ ہجرت میں قرار دینے سے متعدد خرابیاں نظر آتی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس روایت میں کسی صاحب

بھول ہوئی ہے، اس روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ ہجرت کے وقت
نوخیز لڑکے تھے، اور ابھی تک قرآن مجید سے ناواقف تھے، بلکہ مسلمان بھی نہ تھے، حالانکہ وہ ہجرت سے
بہت پہلے اسلام لا چکے تھے، وہ چھٹے مسلمان تھے، اور ہجرت کے وقت وہ حبش میں تھے اور وہاں سے
اس وقت لوٹے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ جا چکے تھے، جیسا کہ نماز میں سلام کرنے والی روایت سے
جو حدیث کی تمام کتابوں میں ہے، ثابت ہوتا ہے، اس لیے وہ اس وقت مکہ میں سرے سے
موجود ہی نہ تھے۔ اس روایت کے ان الفاظ کے متعلق میں اپنے یہ شکوک لکھ چکا تھا کہ
رجال اور سیر کی مختلف کتابوں میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کا حال الٹ پلٹ کر پڑھا
سب نے ان کے حال میں اس روایت کو نقل کیا ہے، مگر ان شبہات پر کسی کی نظر نہیں پڑی،
اسی اثنا میں فتح الباری جلد ہجرت اٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ بعینہ یہی اعتراضات حافظ
ابن حجر کے ذہن میں بھی گذرے ہیں، لیکن انھوں نے حسب دستور مختلف روایات کی تطبیق کے
متعلق جو انکا عام اصول ہے اس سے کام لیکر آگے بڑھ گئے ہیں، یعنی یہ کہہ دیا ہے کہ ممکن ہے کہ یہ ہجرت کے علاوہ کسی اور
زمانہ کا واقعہ ہو مگر مشکل یہ ہے کہ ہجرت کے علاوہ کوئی اور زمانہ ایسا نہیں جسمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ
کے ساتھ مشرکین سے بھاگے ہوں لیکن الحمد للہ کہ اثنائے تحقیق میں مجھے مسند احمد بن حنبل (جلد ۱ صفحہ ۳۷۹) میں
یہی روایت اسی قسم کی سند سے مل گئی ہے جسمیں ان قابل اعتراض الفاظ کے بجائے مطلق یہ الفاظ ہیں کہ میں
بکریاں چرا رہا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کا گذر ہوا، اس میں فرار اور ہجرت کا مطلق ذکر نہیں ہے۔
اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ہجرت سے بہت پہلے کا کوئی واقعہ ہے، پہلے الفاظ کے راوی عاصم سے انکے شاگرد
حماد بن سلمہ ہیں، اور دوسرے الفاظ کے راوی انہی کے شاگرد ابوبکر عیاش ہیں، گو حافظہ کی خرابی اور اغلاط
کی کثرت میں یہ دونوں برابر ہیں، تاہم ناقدانہ وجوہ ابوبکر بن عیاشؓ کی تائید میں ہیں، پہلی روایت میں
(فرّا بھاگے) اور دوسری میں مَرّ (گذرے) کا لفظ ہے، معلوم ہوتا ہے

کہ راویوں میں فخذ اور مذق کے الفاظ میں باہم تشابہ ہو گیا ہے، اور بعد کو پھر قسم کی مناسبت سے عن المشرکین بڑھ گیا ہے، ابن سعد نے بسند حسن (جلد اول صفحہ ۲۲) اس واقعہ کو ان الفاظ میں روایت کیا ہے جس سے تمام مسئلہ صاف ہو جاتا ہے حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں میں اپنے پہلے کسی کا مسلمان ہونا نہیں جانتا، میں گھر کی بکریاں چرا رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس آئے اور دریافت فرمایا کہ تمہاری کسی بکری میں دودھ ہے، میں نے عرض کیا نہیں، آپ نے ایک بکری کے تھن میں ہاتھ لگایا فوراً دودھ اتر آیا تو میں اپنے سے پہلے کسی کا مسلمان ہونا نہیں جانتا" (سیرۃ النبیؐ۔ جلد ۳ ص ۲۲۱ و ۲۲۲ حاشیہ)

دوسری مثال کے لیے بحیرا راہب کا قصہ ملاحظہ ہو، سید صاحبؒ لکھتے ہیں:۔

" جب آپ دس بارہ برس کے تھے تو اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ شام کا سفر کیا۔ راہ میں ایک عیسائی خانقاہ ملی جس میں بحیرا نام ایک راہب رہا کرتا تھا اس نے آپ کو دیکھ کر علامتوں سے پہچان کر یہ جان لیا کہ پیغمبر آخر الزماںؐ یہی ہیں اس نے دیکھا کہ ابر آپ پر سایہ افگن ہے، جس درخت کے نیچے آپ بیٹھے ہیں، اس کی شاخیں آپ پر جھکی آتی ہیں، اس نے آپ کی خاطر قافلہ کی دعوت کی اور ابوطالب سے باصرار کہا کہ اس بچہ کو مکہ واپس لیجاؤ ورنہ رومی اگر اس کو پہچان گئے تو قتل کر ڈالیں گے (شاید اس لیے کہ آپ کے ہاتھوں ان کی سلطنت کا خاتمہ ہوگا) ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ رومیوں کا ایک گروہ پہنچ گیا۔ دریافت سے ظاہر ہوا کہ رومیوں کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ پیغمبر آخر الزماں کے ظہور کا وقت آگیا ہے، اس لیے رومیوں نے تحقیق حال کے لیے ہر طرف اپنے دستے روانہ کیے ہیں، بحیرا نے ان سے کہا کہ خدا کی تقدیر کن نہیں

سکتی ہیں لیے بہتر ہے کہ تم واپس جاؤ۔ وہ رک گئے، اور ادھر ابوطالب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو واپس بھیج دیا، اور حضرت ابوبکرؓ نے حضرت بلالؓ کو آپ کے ساتھ کر دیا اور بحیرا نے کیک اور ناشتہ آپ کے ساتھ کیا۔

یہ روایت اختصار اور تفصیل کے ساتھ سیرت کی اکثر کتابوں میں اور بعض حدیثوں میں بھی مذکور ہے، مگر ابن اسحاق اور ابن سعد وغیرہ کتب سیر میں اس کے متعلق جس قدر روایتیں ہیں، ان کے سلسلے کمزور اور ٹوٹے ہوئے ہیں، اس قصہ کا سب سے محفوظ طریقہ سند وہ ہے، جس میں عبدالرحمٰن بن غزوان جو ابو نوح قراد کے نام سے مشہور ہے، یونس بن اسحاق سے اور وہ ابوبکر بن موسیٰ سے اور وہ اپنے باپ ابو موسیٰ اشعریؓ سے اس کی روایت کرتے ہیں۔

یہ قصہ اس سلسلۂ سند کے ساتھ جامع ترمذی، مستدرک حاکم، مصنف ابن ابی شیبہ، دلائل بیہقی اور دلائل ابونعیم میں مذکور ہے، ترمذی نے اس کو "حسن و غریب" اور حاکم نے صحیح کہا ہے، استاذ مرحومؒ نے سیرت کی پہلی جلد (طبع اول ص ۱۳۰ طبع دوم ص ۱۹۰) میں اس روایت پر پوری تنقید کی ہے اور عبدالرحمٰن بن غزوان کو اس سلسلہ میں مجروح قرار دیا ہے، اور حافظ ذہبی کا قول نقل کیا ہے کہ وہ اس روایت کو موضوع سمجھتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلۂ سند میں نہ صرف عبدالرحمٰن بن غزوان بلکہ دوسرے رُواۃ بھی جرح کے قابل ہیں

(۱) حضرت موسیٰ اشعریؓ مسلمان ہوکر سنہ ھ میں یمن سے مدینہ آئے تھے اور یہ واقعہ اس سے ۵۰ برس پہلے کا ہے، حضرت ابوموسیٰؓ نہ تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کی زبان مبارک سے اور نہ کسی اور شریک واقعہ کی زبان سے اپنا سنا بیان کرتے ہیں، اس لیے یہ روایت مرسل ہے۔

۲۔ اس واقعہ کو ابو موسیٰؓ سے ان کے صاحبزادے ابوبکر روایت کرتے ہیں۔ مگر ان کی نسبت کلام ہے کہ انھوں نے اپنے باپ سے کوئی روایت سنی بھی ہے، یا نہیں، چنانچہ ناقدین فن کو اس باب میں بہت کچھ شک ہے، امام ابن حنبلؒ نے تو اس سے قطعی انکار کیا ہے، بنابریں یہ روایت منقطع ہے، اس کے سوا ابن سعد نے لکھا ہے کہ "وہ ضعیف سمجھے جاتے ہیں"۔

۳۔ ابوبکر سے یونس بن اسحاق اس واقعہ کو نقل کرتے ہیں، گو متعدد محدثین نے ان کی توثیق کی ہے تاہم عام فیصلہ یہ ہے کہ وہ ضعیف ہیں، یحییٰ کہتے ہیں کہ ان میں سخت بے پروائی تھی، شعبہ نے ان پر تدلیس کا الزام قائم کیا ہے، امام احمدؒ ان کی اپنے باپ سے روایت کو ضعیف اور ان کی عام روایتوں کو مضطرب اور "ایسی ویسی" کہتے ہیں، ابو حاتم کی رائے ہے کہ وہ راست گو ہیں لیکن ان کی اپنے باپ سے حدیث حجت نہیں، ساجی کا قول ہے کہ وہ سچے ہیں، اور بعض محدثین نے ان کو ضعیف کہا ہے، ابو حاکم کا بیان ہے کہ "اکثر ان کو اپنی روایتوں میں وہم ہو جاتا تھا"۔

۴۔ چوتھا راوی عبد الرحمٰن بن غزوان ہے، جس کا نام مستدرکؒ ابونعیم میں ابو نوح قراد ہے، اس کو اگرچہ بہت لوگوں نے ثقہ کہا ہے، تاہم وہ متعدد منکر روایتوں کا راوی ہے۔ ممالیک والی مجہولؒ حدیث اسی نے روایت کی ہے، ابو احمد حاکم کا بیان ہے کہ "اس نے امام لیث سے ایک منکر روایت نقل کی ہے"۔ ابن حبان نے لکھا ہے کہ وہ غلطیاں کرتا تھا اور امام لیث و مالک سے ممالیک والی حدیث نقل کرنے کی

قائم ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہی ہے، جو ان سطور میں آپ کے سامنے موجود ہے۔

(ترجمان السنۃ۔ صفحہ ۱۰)

سید صاحبؒ کی عالمانہ و محققانہ بحث تقریباً بیس صفحات پر مشتمل ہے، طوالت کے خوف سے اس کے انہی حصوں کو نقل کیا جائے گا جو مولانا بدر عالم کی ان ایرادات سے متعلق ہیں، ان کے خیال میں، سید صاحبؒ نے ایک ثابت شدہ حدیثی اور تاریخی واقعہ کی تحریف اور عینی مشاہدہ کی تکذیب کی ہے، اور ان کی تاویل و توجیہہ کا مقصد معجزہ شق صدر کا انکار ہے، حالانکہ سید صاحبؒ صاف یہ تحریر فرماتے ہیں۔

" منجملہ نبوت کے ان خصائص کے جو ایک پیغمبر کو عطا ہوتے ہیں شق صدر یا شرح صدر بھی ہے، چنانچہ یہ رتبہ خاص پیشگاہ الٰہی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مرحمت ہوا ..... یہ مسئلہ کہ شق صدر واقع ہوا تمام صحیح روایتوں سے ثابت ہے، اور اس کے متعلق کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔" (سیرۃ النبیؐ جلد ۳ ص ۲۰۲)

یہ اعتراف درست ہے کہ سید صاحب نے شق صدر کو ایک بار تسلیم کیا ہے مگر نتیجہ میں معترض کی جانب سے جو مزید باتیں کہی گئی ہیں، وہ غلط ہیں، اور "ذوق یکتائی" درست نہیں ہے، اس مسئلہ میں سید صاحب نے جو بحث کی ہے، اس سے حسب ذیل صراحتیں معلوم ہوتی ہیں۔

۱۔ واقعہ شق صدر سید صاحب کے نزدیک مسلم ہے، اس لئے اس کے انکار، تحریف دبی تاویل کا اعتراض ان پر عائد کرنا خلاف واقعہ ہے۔

۲۔ شق صدر کی تمام روایتیں جمع کرنے سے پانچ مختلف اوقات میں آپ پر اس کا گذرنا ظاہر ہوتا ہے۔

۳ ۔ چار موقعوں کو حافظ ابن حجر وغیرہ نے تسلیم کیا ہے۔

۴ ۔ امام سہیلی صرف دو موقعوں کی روایت کو صحیح سمجھتے ہیں، ایک دفعہ صغرسنی میں حضرت حلیمہؓ کے یہاں پرورش پانے کے زمانہ میں، اور دوسری دفعہ معراج میں۔

۵ ۔ سینۂ مبارک کا آلودگیوں سے پاک وصاف ہوکر منور ہوجانا ایک ہی دفعہ ہوسکتا ہے۔ اس بنا پر بعض محدثین جیسے قاضی عیاض وغیرہ اس کو ایک ہی دفعہ کا واقعہ مانتے ہیں، مگر ان لوگوں کا اسے صغرسنی کا واقعہ ماننا جب آپ حضرت حلیمہؓ کے یہاں پرورش پارہے تھے، اور شب معراج میں اس کے ہونے کو راویوں کا سہو قرار دینا اصول روایت سے صحیح نہیں ہے۔

۶ ۔ واقعہ کی روایت کے مختلف طریقوں میں سب سے صحیح، سب سے مستند اور معتبر طریقہ وہ ہے، جس میں اس کا شب معراج میں ہونا بیان ہوا ہے۔

حضرت سید صاحبؒ نے شق صدر کے پانچوں موقعوں کی روایات کے سلسلۂ سند پر جو گفتگو اور راویوں کی قوت وضعف پر جو بحث کی ہے، اس کو بھی مدنظر رکھا جائے تو فن حدیث سے ان کی واقفیت اور نقد وجرح میں مہارت کا اندازہ ہوگا، لیکن مولانا ماہر، عالم کا اصل اعتراض اور ان کی زیادہ برہمی اس روایت پر سید صاحبؒ کی تنقید کی وجہ سے ہے، جس میں حضرت حلیمہؓ کے یہاں قیام کے زمانہ میں شق صدر کا ذکر ہے۔ حالانکہ اس روایت کے تمام سلسلوں پر سید صاحبؒ نے محدثین اور ائمۂ فن کے حوالہ سے بڑی عالمانہ بحث وتنقیح کرکے بتایا ہے کہ یہ روایت سات مختلف سلسلوں سے اور مختلف صحابیوں سے منقول ہے، مگر ان میں دو سلسلوں کے علاوہ بقیہ سلسلے صحت اور قوت سے تمامتر خالی ہیں، اور ان میں بعض ایسی لغو باتیں شامل ہیں، جو اس کو درجہ اعتبار سے گرا دیتی ہیں۔

اس حدیث کے مختلف طرق پر سید صاحبؒ نے کئی صفحوں میں جو بحث کی ہے وہ

حدیث میں ان کی دیدہ وری کا ثبوت ہے، مگر طوالت کے خوف سے یہاں صرف روایت کے سب سے محفوظ اور صحیح سلسلہ سند پر سید صاحبؒ کی تحقیق وتنقید کو نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے، کیونکہ معترض اسی پر زیادہ چیں بجبیں ہوئے ہیں، مصنف سیرت فرماتے ہیں۔

"اس سلسلۂ سند کے محفوظ اور صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ صحاح میں معراج اور شق صدر کی جس قدر روایتیں حضرت انسؓ سے مروی ہیں، ان کے دوسرے راوی تابعین میں حضرت انسؓ کے شاگردوں میں سے قتادہؒ، زہریؒ، شریکؒ اور ثابتؒ بنانی، چار شخص ہیں، ثابت بنانی سے دو آدمی ان واقعات کو نقل کرتے ہیں، سلیمانؒ بن مغیرہ اور حمادؒ بن سلمہ، حماد کے علاوہ اور جو طرق اوپر مذکور ہوئے، ان سب میں معراج کے واقعات کے آغاز میں شق صدر کا ذکر ہے۔ لیکن حماد نے اپنی روایت میں یوں کیا ہے کہ معراج کے سلسلہ میں وہ شق صدر کے ذکر کو ترک کر دیتے ہیں، اور شق صدر کے واقعہ کو الگ اور مستقل بچپن کے زمانہ کی تخصیص کے ساتھ بیان کرتے ہیں، حالانکہ نہ صرف حضرت انسؓ کے شاگردوں میں سے کوئی بلکہ حماد کے دوسرے ہم درس طلبہ میں سے بھی کوئی ان کی تائید نہیں کرتا، غالباً یہی وجہ ہے کہ امام بخاریؒ نے معراج کی حدیث حماد کے واسطہ سے نقل نہیں کی ہے، حماد کی نسبت اسماء الرجال کی کتابوں میں لکھا ہے، کہ "آخر عمر میں ان کا حافظہ خراب ہو گیا تھا، اسی سبب سے امام بخاریؒ نے ان کی روایتیں نہیں لی ہیں، امام مسلمؒ اپنی سمجھ کے مطابق کوشش کر کے خرابی حافظہ سے پہلے کی جو ان کی روایتیں ہیں ان ہی کو چن کر اپنی کتاب میں لائے ہیں" میرا میلان تحقیق یہ ہے کہ حماد کی یہ روایت اسی خرابی حافظہ کے زمانہ کی ہے کہ انھوں نے تمام معتبر راویوں کے خلاف شق صدر اور معراج کے مشترک واقعہ کو دو کر دیا،

میں سمجھتا ہوں کہ امام مسلمؒ بھی اپنی ترتیب بیان کے اشارات سے ایسا ہی کچھ جتانا چاہتے ہیں کہ معراج اور شق صدر کو دو الگ الگ زمانوں کے واقعات قرار دینے میں حماد کو غلطی ہوئی ہے، چنانچہ واقعات معراج کے ذکر میں امام مسلمؒ یہ کرتے ہیں کہ پہلے حضرت انسؓ سے ثابت کے شاگرد حماد کی یہ حدیث نقل کرتے ہیں، جس میں معراج کے شق صدر کا ذکر نہیں، پھر حماد کے ساتھی اور ثابت کے شاگرد سلیمان بن مغیرہ کی روایت ہے، جس میں شق صدر کے ساتھ معراج کا ذکر ہے، اس کے بعد حماد کی وہ روایت ہے جس میں تنہا بچپن کے شق صدر کا تذکرہ ہے، بعد ازیں حضرت انسؓ کے دوسرے شاگردوں کی روایتیں ہیں جن میں شق صدر اور معراج کا ایک ساتھ واقع ہونا مذکور ہے۔

حماد کی اس روایت میں بعض ایسے معنوی وجوہ بھی ہیں جن کی تائید کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہوتی، مثلاً یہ کہ شق صدر کی یہ کیفیت کسی عمر میں بھی گذری ہو، مگر بہر حال اس کا تعلق روحانی عالم سے تھا، گذشتہ تمام مستند اور مجروح روایتوں میں حصہ بغض، حصہ شیطانی، سکینت، تسلی، رحمت، شفقت، ایمان اور حکمت وغیرہ جن امور کا سینہ مبارک سے نکالنا یا اس میں رکھنا بیان ہوا ہے ان میں سے کسی چیز کا تعلق جسمانیات سے نہیں، بایں ہمہ حماد حضرت انسؓ سے روایت کرکے کہتے ہیں کہ "آپ کے سینہ پر زخم کے ٹانکے کے نشان مجھکو (جیسا کہ مسلم میں ہے) یا ہم کو (جیسا کہ مسند احمد میں ہے) نظر آتے تھے"۔ اگر یہ جسمانی واقعہ بھی تھا، تو حضرت انسؓ کی دیگر مروی روایات میں سے جو حماد کے علاوہ دوسرے راویوں نے نقل کی ہیں، یہ مذکور نہیں، علاوہ ازیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل شمائل کا ایک ایک حرف، جسم اطہر کے ایک ایک خط و خال تک کی کیفیت صحابہ نے بیان کی ہے، مگر کسی نے سینہ مبارک کے ان نمایاں ٹانکوں کا نام

نہیں لیا، ایسی حالت میں واقعہ کی یہ صورت کیونکر تسلیم ہوسکتی ہے" (سیرۃ النبیؐ ص۲۹۵ تا ۲۹۶، ۳)

حماد کی روایت پر حضرت سید صاحبؒ کا نقد و تبصرہ نہایت محتاط اور ذمہ دارانہ ہے، ان کو اعتراف ہے کہ اس روایت کا سلسلۂ سند صحیح اور محفوظ ہے، مگر اس کے ناقابل تسلیم ہونے کی اصل وجہ حماد کا تفرد اور تمام راویوں سے ان کا اختلاف ہے، لیکن مولانا بدر عالم نے اس بنیادی وجہ کو نظر انداز کرکے سید صاحبؒ کی غایت احتیاط پر مبنی رائے کو محض ظن و تخمین قرار دیا ہے، ان کا سارا اعتراض اس پر ہے کہ حماد کی روایت کو کیوں ان کے حافظہ کی خرابی کے زمانہ کی قرار دیا گیا ہے، اور کیوں شق صدر کو ایک روحانی معاملہ بتایا گیا ہے، فرماتے ہیں۔

"تاویل کرنے والوں نے یہاں صرف انہی تیاس آرائیوں پر بس نہیں کی بلکہ انھوں نے ایک قدم اور آگے بڑھا کر فن حدیث کے لحاظ سے بھی اس مستحکم قلعہ کو مسمار کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ لکھدیا ہے کہ اس واقعہ کا راوی حماد بن سلمہ ہے جن پر آخری عمر میں سوئے حفظ طاری ہوگیا تھا، اور کسی نقل کے بغیر محض اپنے ظن و تخمین سے صحیح مسلم کی اس روایت کو اسی زمانے کی روایت قرار دے ڈالا ہے" (ترجمان السنہ ص ۵)

آگے مولانا فرماتے ہیں کہ بھلا مسلم جیسے بڑے امام و محدث کو یہ تمیز کیسے نہ ہوتی کہ کون سی روایت سوئے حفظ سے پہلے کی اور کون سی بعد کی ہے، مگر اس کے باوجود انھوں نے یہ استثنائی صورت بھی بیان کی ہے، "الا یہ کہ اس جگہ کوئی خصوصی علت نکل آئے"۔ اس استثنا سے ثابت ہوتا ہے کہ صحیح روایتوں میں بھی بعض مخصوص حالات کی وجہ سے قدح و عیب کی صورتیں پیدا ہوجاتی ہیں اسی سبب سے محدثین نے روایات میں ترجیح کے اصول مقرر کئے ہیں، مگر جب سید صاحبؒ نے استثنائی قاعدہ کے رو سے اس حدیث کی بعض علتوں کا ذکر صد درجہ محتاط انداز میں کیا تو یہ مولانا کے نزدیک

رام کہانی ہوگئی، اور اس سے حدیث کے مستحکم قلعہ میں شگاف پڑ گیا، وہ سید صاحبؒ کو علت قادحہ کی تمیز کا اہل نہیں سمجھتے اسی لئے یہ نا روا اور غیر عالمانہ طنز فرماتے ہیں

" ان دقائق کو وہ شخص کیسے ادراک کرسکتا ہے، جو مورخین کی صف میں سے نکل کر محدثین کی جماعت میں گھسنے کی کوشش کرتا ہو، اور بقول ائمہ "لکل فن رجال" اس کو یہ علم کیا حاصل ہوسکتا ہے کہ کسی شیخ کو سوء حفظ کس زمانے میں اور کیوں طاری ہوا تھا، اور یہ تمیز کیسے حاصل ہوسکتی ہے کہ اس نے کس شیخ سے کس کس زمانے میں روایات اخذ کی ہیں، اس لئے اس بیچارہ کو صرف اپنے ظن وتخمین سے حکم لگادینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔ وان الظن لا یغنی من الحق شیئاً (ص ۲۷)

اس کے بعد انھوں نے پورا زور حماد کو ثقہ ثابت کرنے پر صرف کیا ہے، (یہ واضح رہے کہ سید صاحبؒ نے حماد کو مجروح نہیں قرار دیا ہے، صرف آخر عمر میں ان کے حافظہ کی خرابی کا ذکر کیا ہے، جو تمام ائمہ فن کے نزدیک بھی مسلم ہے،) اس سے ان کا مدعا یہ ہے کہ امام مسلم نے اپنی صحیح میں حماد کی جس قدر حدیثیں نقل کی ہیں وہ حافظہ کی خرابی سے قبل کی ہیں، مگر اس پوری بحث میں کہیں سید صاحبؒ کے ان اشکالات سے کوئی تعرض نہیں کیا ہے، جو انھوں نے اصول روایت ودرایت کے مطابق حماد کی روایت کے بارے میں ظاہر کئے ہیں، اس خلط بحث میں خود مصنف ترجمان السنۃ سے بھی دو عجیب غلطیاں ہوگئی ہیں۔

۱۔ اوپر گذر چکا ہے کہ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں حماد کی روایتیں سرے سے درج ہی نہیں کی ہیں، چاہے وہ ان کے حافظہ کی خرابی کے زمانہ سے پہلے کی ہوں یا اس کے بعد کی مولانا حماد کی توثیق اور سید صاحب پر طنز وتعریض کے جوش میں امام بخاریؒ پر بھی اس طرح زبان طعن دراز کر بیٹھے ہیں۔

" اور جن ائمہ نے حماد بن سلمہ کی روایت کو مطلقاً نہیں لیا یہ محض ان کا تشدد اور نا انصافی ہے۔" (ترجمان السنۃ، ص ۲۰۷)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معترض امام بخاری کے تشدد ہی کو بیجا اور نا روا نہیں خیال کرتے بلکہ ان پر نا انصافی کی تہمت بھی عائد کرتے ہیں۔ حالانکہ آگے اسی کو ان کی شان احتیاط اور شرائط تشدد کی بات کہا ہے۔" اب پتہ نہیں وہ اسی شان احتیاط اور شرائط تشدد کی بات لکھنے پر سید صاحبؒ سے کیوں اس قدر برہم ہیں، اور معترض کی اس شکایت کا ذکر بھی آچکا ہے کہ سید صاحبؒ نے محدثین کبار سے بدظنی پیدا کی ہے، کیا معترض کے نزدیک امام بخاریؒ محدثین کبار کی فہرست میں ہیں یا نہیں، اگر ہیں تو کیا انھوں نے ان کی جانب بیجا تشدد اور نا انصافی کو منسوب کر کے ان سے بدگمانی پیدا کی ہے یا نہیں؟

۲۔ حماد کی توثیق میں انھوں نے امام بیہقیؒ کا ایک بیان نقل کیا ہے، جس کے ترجمہ میں ان سے سہو ہو گیا ہے، ملاحظہ ہو۔

قال البیہقی ھو احد ائمۃ	امام بیہقی کہتے ہیں کہ حماد بن سلمہ مسلمانوں
المسلمین الا انہ لما کبر ساء	کے ائمہ میں سے ایک امام ہیں لیکن آخری
حفظہ فلذا ترکہ البخاری	عمر میں ان کا حافظہ کمزور ہو گیا تھا، اس لئے
و اما مسلم فاجتھد واخرج	امام بخاریؒ نے تو ان کو بالکل ترک کر دیا،
من حدیثہ عن ثابت ما سمع	لیکن امام مسلم نے کوشش کر کے ان کی وہ
منہ قبل تغیرہ وما سوی	احادیث اپنی صحیح میں سے نکال لیں
حدیثہ عن ثابت لا یبلغ	جو انھوں نے ثابت سے اپنے سوئے حفظ
اثنی عشر حدیثا اخرجھا فی	کے زمانہ سے قبل روایت کی تھیں اور ان سے

الشواھد۔ جو حدیثیں انھوں نے ثابت سے روایت کی ہیں
جن کی تعداد بارہ حدیثوں تک بھی نہیں
پہنچتی وہ صرف شواہد میں روایت کی ہیں (اصول میں نہیں)

مذکورۂ بالا عبارت میں واخرج من حدیثہ الخ کا ترجمہ صحیح نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امام مسلم نے حماد کی وہ احادیث اپنی صحیح میں نقل و بیان کی ہیں جو انھوں نے ثابت سے اپنے حافظہ کی خرابی کے زمانے سے پہلے روایت کی تھیں۔

امام بیہقیؒ کا یہ بیان مصنف ترجمان السنتہ نے امام بخاریؒ کے بیجا تشدد و ناانصافی اور امام حماد کی توثیق کے ثبوت میں نقل کیا ہے لیکن اہل نظر خود فیصلہ کریں کہ کیا امام بیہقیؒ نے اس میں کہیں امام بخاریؒ کے بیجا تشدد و ناانصافی کی جانب کوئی ادنیٰ سا اشارہ بھی کیا ہے۔ یا خود معترض ہی جوش غضب میں امام بخاریؒ کی شان میں ناز یبا بات لکھ گئے ہیں۔

اب رہا حماد کی توثیق کا معاملہ تو امام بیہقیؒ کے بیان میں ان کی اسی قدر توثیق کی گئی ہے جس قدر سید صاحبؒ نے کی ہے، اور اس بیان سے ترجمان السنتہ کے مصنف کی تائید کے بجائے خود سید صاحبؒ کی تائید ہوتی ہے، امام بیہقیؒ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حماد ائمہ مسلمین میں ہونے کے باوجود بڑھاپے میں سوئے حفظ میں مبتلا ہو گئے تھے، اسی بنا پر امام بخاریؒ نے ان کی کوئی حدیث نہیں لی ہے، البتہ امام مسلمؒ نے اپنے اجتہاد و فہم سے ان کی مرویات کی دو قسمیں کر دی ہیں، ایک بڑھاپے اور سوئے حفظ کے زمانے سے پہلی کی روایات جن کو انھوں نے اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے، اور دوسری قسم کی روایات بڑھاپے اور سوئے حفظ کے زمانہ کی ہیں، ان کو صرف شواہد و متابعات میں نقل کیا ہے، بعینہ یہی باتیں حماد کے سلسلہ میں سید صاحبؒ کے مذکورہ بالا اقتباس میں گذری ہیں، لیکن ترجمان السنتہ کے مصنف کو امام بیہقیؒ کا بیان تو اپنی تائید میں معلوم ہوا، اور سید صاحبؒ کا اقتباس الزام کھانی یا للعجب!

امام بیہقیؒ کے بیان کا آخری حصہ بہت قابل غور ہے، محدثین شواہد و متابعات میں جو حدیثیں لاتے ہیں ان میں اس درجہ احتیاط اور صحت کو ملحوظ نہیں رکھتے جس درجہ اصول میں صحت و احتیاط کا لحاظ کرتے ہیں۔ سید صاحب نے امام مسلمؒ کی ترتیب بیان کے اشارات سے بھی یہی سمجھا ہے کہ وہ معراج اور شق صدر کو دو الگ الگ زمانوں کے واقعات قرار دینے میں حماد کی غلطی کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں، اگر حماد کی اس روایت کو شواہد کی سمجھا جائے تو سید صاحبؒ نے اپنے میلان تحقیق کا جس احتیاط سے ذکر کیا ہے، وہ یقیناً صحیح ہے، مگر سید صاحبؒ نے مزید احتیاط کی بنا پر اپنے میلان تحقیق پر اصرار نہ فرماکر آخر میں دونوں روایتوں میں توفیق و تطبیق کی بھی کوشش کی ہے۔ لکھتے ہیں :-

"اس تشریح و تفصیل کے بعد بھی اگر کسی کو حماد کی اس روایت کے قبول کرنے پر اصرار ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس روایت کے مطابق بچپن میں جب عقل و ہوش کا آغاز ہوا تو سینہ مبارک سے حصہ شیطانی جو ہر انسان کے اندر ہے اس کو نکالا گیا کہ صحیح مسلم کی اس روایت میں اسی قدر ہے، ابھی علم و حکمت کی کوئی چیز رکھی نہیں گئی، مگر معراج کی رات جب اس عقل و ہوش کی تکمیل ہوئی تو دھوکر علم و حکمت سے معمور کیا گیا جیسا کہ تمام روایتوں میں ہے۔" (سیرۃ النبی جلد سوم ص ۴۹۰)

یہ تحقیق و احتیاط اگر کسی کے خیال میں رام کہانی، قیاس آرائی اور ظن و تخمین ہے، تو اس کا کیا علاج ؟

مولانا بدر عالم اس پر بھی معترض ہیں کہ سید صاحبؒ نے شق صدر کو روحانی معاملہ قرار دینے کے لیے اس کے بجائے شرح صدر کو صحیح اصطلاح بتایا ہے، اور پھر اسے علم لدنی اور روحانی انعام وغیرہ قرار دیکر نہایت پیچ دار بنا دیا ہے، اور اس سلسلہ میں اپنے موقف کا ہمنوا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کو بھی زبردستی ٹھہرایا ہے، اس لئے اجمالاً اس پر بھی ایک نگاہ ڈال لینا ضروری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شق صدر اور اس طرح کے دوسرے مسائل میں ہمیشہ سے مسلمانوں میں دو نقطۂ نظر پائے جاتے ہیں، ایک جماعت ظاہر بیں لوگوں کی ہے، یہ جماعت ظاہری الفاظ سے جو عام اور سیدھا سادہ مفہوم نکلتا ہے اسی کو مان لیتی ہے، چنانچہ اس کے خیال میں شق صدر کا مطلب یہ ہے کہ واقعی سینہ مبارک چاک کیا گیا اور قلب اقدس کو آب زمزم سے دھو کر ایمان وحکمت سے معمور کیا گیا، لیکن دوسری جماعت نکتہ شناس محققین اور حقیقت بیں صوفیہ کی ہے، یہ لوگ الفاظ کے ظاہری مفہوم کے بجائے ان کی اصل حقیقت و روح کو معلوم کرتے ہیں، اس لیے حضرت سید صاحبؒ کے بقول "ان تمام غیر محتمل الالفاظ معنی کو تمثیل کے رنگ میں دیکھتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ عالم برزخ کے حقائق ہیں، جہاں روحانی کیفیات جسمانی اشکال میں اس طرح نظر آتے ہیں، جس طرح حالت خواب میں تمثیلی واقعات جسمانی رنگ میں نمایاں ہوتے ہیں، اور جہاں معنی اجسام کی صورت میں متمثل ہوتے ہیں"۔ (ص ۴۰۹) سید صاحبؒ کے نزدیک شق صدر کے واقعہ کی یہی نوعیت ہے، اس لیے انھوں نے مدلل طور پر ثابت کیا ہے کہ اس کیلئے مناسب اور صحیح اصطلاح شرح صدر کی ہے، قرآن مجید میں بھی اسی کا ذکر ہے اور احادیث میں گو شق صدر کا لفظ بھی آیا ہے، تاہم شرح صدر سے وہ بھی خالی نہیں ہیں، خود صحیح مسلم میں بھی یہ لفظ ایک روایت میں مذکور ہے، سید صاحبؒ کے نزدیک علم لدنی بھی اسی حقیقت کی ایک تعبیر ہے، مولانا بدر عالم نے پہلے نقطۂ نظر کو قبول کیا ہے، ان کو اس کا حق ہے، لیکن دوسرے نقطۂ نظر کو اختیار کرنے والوں پر ان کی برہمی بلاوجہ ہے، کیا سید صاحبؒ جیسے محقق کو یہ حق نہیں کہ وہ اس نظریہ کو قبول کریں جو ان کے نزدیک دلائل کی روشنی میں قوی اور صحیح ہے۔

سید صاحبؒ نے اس موقع پر ایک اہم حقیقت اور بلیغ نکتہ کی جانب توجہ دلائی ہے اور بتایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے روحانی حالات وواقعات میں سیر ملکوت کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اس بنا پر سرور انبیاءؐ کی زندگی میں بھی سیر ملکوت یا معراج نہایت مہتم بالشان واقعہ ہے، اس میں پیش گاہ الٰہی سے آپؐ کو نہایت عجیب اور گوناگوں بشارتیں ملیں اور احکام وانعامات سے نوازے گئے، شرح صدر یا شق صدر بھی اسی سلسلہ کا ایک انعام ہے،

چنانچہ سید صاحبؒ نے معراج کے موقع پر اسے دئے جانے کی حکمت اور اس کی اہمیت بھی بیان کی ہو۔ ملاحظہ ہو (صفحہ ۳۸۶)
مگر افسوس کہ ان حقائق ونکات کو جو لعل وجواہر سے بھی بیش قیمت ہیں مولانا بدر عالم خزف ریزے کا درجہ بھی
دینے کے لیے تیار نہیں اور وہ انھیں رام کہانی قرار دیکر ان کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

دوسرے نقطہ نظر کے حامیوں میں سید صاحبؒ نے صرف حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا نام اسلئے
لیا ہے کہ ان کے بقول "علمائے اسلام میں کم از کم ایک شخص تو ایسا ہے، جو صوفی اور صاحبِ حال بھی ہو اور محدث
و متکلم بھی یعنی حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (صفحہ ۴۴۴)، سید صاحبؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ "چونکہ ایک بیگانہ کیلئے اس نادیدہ
شہرستان کی ہو بہو تشریح اپنی زبان میں مشکل ہے اس لیے ہم اس ملک کے ایک سیاح کا بیان نقل کر دینا
کافی سمجھتے ہیں، (صفحہ ۴۴۵)، مگر مولانا بدر عالم اس پر بہت طیش میں آگئے، معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحبؒ پر تنہا انکی
اجارہ داری ہے، اور صرف وہی ان کے اسرار کے واقف کار اور حامل ہیں، غالباً اسی وجہ سے انھوں نے
حضرت سید صاحبؒ کو شاہ ولی اللہؒ کے طریق سے ناواقف بھی بتایا ہے، شاہ صاحبؒ کی اصل عبارت یہ ہے۔

اما شق الصدر وملئوه ايمانا	لیکن سینہ کو چاک کرنا اور اس کو ایمان سے
فحقيقته غلبة انوار الملكية	بھرنا اس کی حقیقت انوار ملکیہ کا روح پر
والطفاء لهيب الطبيعة و	غالب ہو جانا اور طبیعت بشری کے شعلہ کا
خضوعها لما يفيض عليها من	بجھ جانا اور عالم بالا سے جو فیضان ہوتا
حظيرة القدس۔	ہے، اس کے قبول کے لیے طبیعت کا
(حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص۲۰۶)	آمادہ ہو جانا ہے۔

اس سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ شاہ صاحب شق صدر کو ایک روحانی اور تمثیلی واقعہ خیال کرتے تھے،
اس لیے سینہ مبارک کے چاک کیے جانے اور اسے دھو کر ایمان وحکمت سے بھرنے کی حقیقت یہ بتاتے ہیں کہ
اس سے آپؐ کے قلب پر ملکوتی انوار کا غالب ہونا، طبیعت بشری کے اشتعال کا فرو ہونا اور حظیرۃ القدس کے

فیوض و انعامات کے قبول کے لیے طبیعت کا آمادہ ہونا مراد ہے۔

فضائل و معجزات کی روایات میں تساہل

یہ اعتراض صحیح ہے کہ سید صاحبؒ عقائد و احکام اور فضائل و ترغیبات کی احادیث میں تفریق کو پسند نہیں کرتے اور انھوں نے بعض محدثین کے اس قاعدہ سے اختلاف کیا ہے کہ اول الذکر میں شدت اور موخر الذکر میں نرمی اور تساہل روا ہے، مولانا بدر عالم کے نزدیک دونوں قسم کی روایتوں میں تفریق معقول ہے، اور وہ اسے محدثین کے تساہل کے بجائے ان کی مراتب شناسی کا نتیجہ بتاتے ہیں، فرماتے ہیں کہ "ہر جگہ شدت اختیار کرنے سے سیرت اور فضائل کا بڑا حصہ ضائع ہو جائے گا" اس اعتراض کے جواب میں چند باتیں قابل غور ہیں۔

۱۔ محدثین کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ موضوع حدیثوں کی روایت حرام ہے، چاہے وہ احکام و عقائد سے متعلق ہوں یا فضائل اور ترغیب و ترہیب سے، مگر بعض محدثین نے فضائل و ترغیبات میں ایسی نقل و روایت کی اجازت دی ہے، لیکن ظاہر ہے اس نرمی اور رخصت کا یہ مطلب نہیں کہ فضائل و ترغیبات اور دلائل و معجزات کو تمامتر قصہ و افسانہ یا عجائب و غرائب کی داستان بنا دیا جائے، اگر ایسا کوئی سمجھتا ہے تو اس نے نہ ان محدثین کی صحیح مراد کو سمجھا اور نہ ان کے ساتھ اس نے انصاف کیا، فضائل و معجزات میں اگر ضعیف روایتوں کی تحریر و بیان کی کھلی چھوٹ دیدی جائے تو دین قصص و عجائب کا ایک طومار ہو جائے گا، اس موقف کی تائید سلف کے اقوال و اعمال سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ عمرو بن دینارؒ سے روایت ہے کہ تمیم داریؓ نے حضرت عمرؓ سے قصوں کی روایت کی اجازت چاہی تو انھوں نے اس کی اجازت نہیں دی، علامہ عراقی کا بیان ہے کہ تمام صحابہ عادل و امین تھے، جب حضرت عمرؓ کو ایک صحابی کو قصوں کی روایت کی اجازت دینے میں تامل ہوا، تو تابعین اور ان کے بعد آنے والوں کو اس کی اجازت کیسے دی جا سکتی ہے؟ سنن ابن ماجہ میں عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ قصہ گوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخینؓ کے زمانہ میں نہ تھی۔ (موضوعات ملا علی قاری، صفحہ ۱۰)

امام احمدؒ فرماتے ہیں، حدیث کی بدترین قسم غرائب ہے ان پر عمل و اعتماد نہیں کیا جائے گا۔

قاضی ابو یوسف فرماتے ہیں، غریب حدیثوں کے پیچھے پڑنے والے جھوٹے ہیں (کتاب الکفایہ خطیب ص ۱۴۱ تا ۱۴۲)

ان اقوال کی روشنی میں معجزات و فضائل کی روایتیں ملاحظہ کیجئے کیا ان کی حیثیت قصوں اور غرائب سے کچھ مختلف ہے، تفصیل کے لئے خود سیرۃ النبیؐ جلد سوم ملاحظہ ہو، یہاں مزید تفصیل کی گنجائش نہیں، اس لیے صرف اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

۲۔ اس تفریق کے وجوہ جو کچھ بھی ہوں لیکن اصل سوال یہ ہے کہ اس اصول کی بنیاد کیا ہے جرح و تعدیل کا دارومدار محدثین کے نزدیک قرآن مجید کی یہ آیت ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ	اے ایمان والو! جب تمہارے
فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا	پاس کوئی فاسق خبر لائے تو اس کی
(حجرات ۵)	تحقیق کر و۔

یہ حکم مطلق ہے، اور اس میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے کہ صرف احکام و عقائد ہی کی حدیثوں میں چھان بین ہونی چاہئے، باقی دوسری قسم کی حدیثوں کو آنکھ بند کر کے قبول کر لینا چاہئے، مشہور حدیث ہے کہ جس نے قصداً مجھ پر کوئی جھوٹ گڑھا اس نے اپنا ٹھکانا جہنم کو بنایا، اس مفہوم کی اور حدیثیں بھی ہیں، لیکن ان میں سے کسی سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ وعید ایک خاص قسم کی حدیثوں ہی کے بارہ میں ہے، اس بنا پر محدثین نے جو قاعدہ بنایا ہے اسکی بنیاد کسی نص پر نہیں معلوم ہوتی، امام دارقطنی کا بیان ہے۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے واسطے سے جھوٹی روایتیں کرنے والے کو جہنم کی تہدید بھی فرمائی ہے، اور اس کا حکم بھی دیا ہے کہ آپؐ کے ارشادات دوسروں تک پہنچائے جائیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ نے صرف حق و صحیح کو پہنچانے کا حکم دیا ہے اور سقیم و باطل کی روایت کرنے سے منع کیا ہے، اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ آپؐ سو

رطب و یابس جو کچھ منقول ہے ان سب کو بیان کیا جائے اور دوسروں تک انھیں پہنچایا جائے، کیوں کہ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے، کہ آپؐ نے فرمایا کہ آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے اسے بیان کرنے لگے، پس جو شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ایسی حدیث بیان کرے جس کے بارہ میں اسے یہ شک ہو کہ وہ صحیح ہے یا غیر صحیح، وہ بھی جھوٹا ہے، کیونکہ آپؐ کے الفاظ یہ ہیں، (جو مجھ سے کوئی ایسی حدیث بیان کرے جسے وہ جھوٹی خیال کرتا ہو) آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ جسے وہ جھوٹی یقین کرتا ہو، بلکہ صحت میں ذرا بھی شک و شبہ ہو جانے پر اسے آپؐ نے چھوڑ دینے کی تلقین فرمائی ہے؛ اسی بنا پر خلفاے راشدین اور برگزیدہ صحابۂ کرام تکثیر روایت سے احتراز کرتے تھے اور حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ سے جب کوئی ایسی حدیث بیان کی جاتی جو انھیں نہ معلوم ہوتی تو وہ اس کے لیے ثبوت اور گواہ کا مطالبہ کرتے تھے، اور دھمکی بھی دیتے تھے، حضرت علیؓ ایسے موقع پر لوگوں سے قسمیں لیتے تھے، صحابہ و تابعین میں محتاط لوگ بھی آپؐ کی جانب کوئی بات منسوب کرنے میں بڑی احتیاط کرتے تھے۔" (موضوعات ملا علی قاری۔ صفحہ ۱۵)

اس بنا پر مولانا بدر عالم کا یہ فرمانا کہ سید صاحب کا دعید کی لپیٹ میں ضعیف حدیثوں کو لینا خلاف تحقیق ہے، درست نہیں، امام دارقطنیؒ کے مرتبہ میں کس کو شک ہو سکتا ہے؟ انھوں نے صحیح کے مقابلہ میں غیر صحیح کہا ہے جس میں ضعیف روایتیں بھی شامل ہیں، محدثین نے بنیادی طور پر حدیث کی تین ہی قسمیں قرار دی ہیں (۱) صحیح (۲) حسن (۳) ضعیف یا سقیم، ان میں سے ہر قسم کی متعدد قسمیں ہیں، اور ضعیف کے اقسام میں موضوع و منکر بھی ہیں، (مقدمہ صحیح مسلم نووی صفحہ ۲۹، و تدریب الراوی۔ صفحہ ۵۹)

۳۔ قدیم محدثین کے یہاں ایسی تصریحات موجود ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ نہ اس

تفریق کے قائل تھے، اور نہ ضعیف کے معاملہ میں کسی طرح کے تساہل کے روادار تھے، امام مالکؒ عائشہؓ بنت سعدؓ بن ابی وقاص کو ضعیف سمجھ کر ان سے روایت نہیں کرتے تھے، ان سے یہ بھی مروی ہے کہ میں نے متعدد تابعین کو پایا مگر ان سے کوئی روایت نہیں کی کیونکہ میرے نزدیک وہ ضعیف تھے، عبدالرحمٰن بن مہدیؒ کا قول ہے کہ آدمی کو ضعیف روایتوں کی کتابت میں مشغول رہنا مناسب نہیں، (کتاب الکفایہ خطیب۔ صفحہ ۱۳۲ و ۱۳۳)

احمد بن ابی خیثمہؒ نے یحییٰ بن معینؒ سے (فلاں ضعیف ہے) کا مطلب پوچھا، تو انھوں نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ثقہ اور قابل اعتماد نہیں، اور اس سے حدیثیں نہ لکھی جائیں (ایضاً ص ۲)

ان اقوال سے ظاہر ہے کہ سید صاحبؒ کا یہ لکھنا کہ "معجزات ہوں یا فضائل ضرور ہے کہ آپؐ کی طرف جس چیز کی نسبت بھی کی جائے وہ شک و شبہ سے پاک ہو، خلاف تحقیق نہیں" بلکہ یہ قدیم محدثین کی تصریحات کے مطابق ہے، تساہل کا قول متاخرین محدثین کا ہے، جو گو بعض مصالح پر مبنی ہے، مگر اس کا مقصد یہ نہیں کہ فضائل میں ہر قسم کی روایتوں کے نقل و بیان کی گنجائش ہے۔

۴۔ اب رہا مولانا کا یہ اندیشہ کہ اس قدر تشدد سے سیرت اور فضائل اعمال کا بڑا حصہ ضائع ہو جائے گا، تو یہی اندیشہ تو احکام و عقائد کے باب میں بھی کیا جا سکتا ہے، مولانا عبدالحئی فرنگی محلی لکھتے ہیں :-

"قصہ گویوں، واعظوں اور خطیبوں کو چوکنا رہنا چاہئے، یہ لوگ ایسی بہت سی باتوں کو آپؐ کی ذات گرامی سے منسوب کر دیتے ہیں، جن کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا اور انھیں یہ خیال ہوتا ہے کہ اس طرح سے آپؐ کی فضیلت و برتری ثابت کرنے پر انھیں بڑا اجر و ثواب ملے گا، انھیں پتہ نہیں کہ صحیح حدیثوں سے آپؐ کے جو فضائل ثابت ہیں وہ ان جھوٹی اور واہی روایتوں سے مستغنی کر دینے کے لیے کافی ہیں، پھر ان اباطیل سے آپؐ کی فضیلت

ثابت کرنے کی کیا ضرورت ؟ یہ تو بڑے گناہ کا موجب اور گمراہی کا باعث ہے، (الآثار المرفوعۃ فی الاخبار الموضوعۃ ۔ صفحہ ۲۲)

۵۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ بعض ارباب سیر سے قطع نظر عام محدثین نے فضائل اعمال اور ترغیب و ترہیب کی حدیثوں میں تساہل کا تو ذکر کیا ہے، لیکن انھوں نے معجزات کے سلسلہ میں اسکی کوئی صراحت نہیں کی ہے، اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ معجزات کا اصل تعلق نبوت سے ہے جو اسلامی عقائد کا ایک اہم جزء ہے، اس اعتبار سے معجزات بھی عقائد ہی کا جز ہوئے، اس لئے قصہ گویوں واعظین اور میلاد خوانوں کی طرح معجزات کو جھوٹ اور عجوبہ کا انبار بنانے سے پرہیز کرنا لازم ہے، اور ان کے باب میں متاخرین محدثین کے تساہل کی رخصت سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہیئے۔

۶۔ معجزات کو آپؐ کے فضل و کمال کی تمامتر بنیاد و دلیل بنانا بھی درست نہیں کیونکہ یہ نہ نبوت کی کوئی منطقی دلیل ہیں، اور نہ لوازم نبوت میں ہیں، آپ کا فضل و کمال تو ان کے بغیر بھی گوناگوں پہلوؤں سے ثابت ہے، اس بنا پر یہ سمجھنا کہ ضعیف حدیثوں کے ترک سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و مناقب میں کمی ہو جائے گی، صحیح نہیں ہے،

۷۔ سیرۃ النبیؐ کا نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اس میں صحیح روایتوں کو نقل کرنے کا التزام کیا گیا ہے، اس طرح ضعیف، موضوع اور غیر صحیح حدیثوں کے لیے اس میں کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی تھی۔

چند اور اعتراضات ۱۔ سیرۃ النبیؐ میں صحیح حدیثوں کے التزام کی وجہ سے مولانا بدر عالم کو خیال ہوا کہ اس میں صحیحین کی حدیثوں ہی پر اقتصار کیا گیا ہے، (ترجمان السنہ ج ۱ صفحہ ۸۵، ۸۶) ان کے خیال میں سید صاحبؒ دوسری کتابوں کی حدیثوں کو صحیح نہیں سمجھتے تھے، مگر یہ ساری باتیں خلاف واقعہ ہیں، اس کی تفصیل پہلے گذر چکی ہے،

۲- مولانا بدر عالم کا یہ اعتراض بھی بجا نہیں ہے کہ سید صاحبؒ کے نزدیک معجزات اور فضائل کی کتابیں صحیح روایات سے خالی ہیں، البتہ وہ حدیث و سیرت کی کتابوں کو وعظ و قصص اور مولود ناموں سے علانیہ ممتاز دیکھنا چاہتے تھے۔

۳- مولانا بدر عالم نے یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ سید صاحبؒ نے محدثین کبار سے بدگمانی پیدا کی ہے، اور اس کی دو مثالیں دی ہیں کہ انھوں نے حافظ ابن عساکرؒ جیسے شخص کو ضعیف روایتوں کا سرپرست اور حافظ ابن حجرؒ کو کمزور روایتوں کا سہارا اور پشت پناہ کہا ہے، مولانا محدث بھی تھے، اور استاذ حدیث بھی، انھیں خود اندازہ ہوگا کہ محدثین نے بڑے سے بڑے آدمی کو بھی نقد و جرح میں معاف نہیں کیا ہے، یہاں تک کہ عباد و زہاد کے متعلق انھوں نے جس طرح کے الفاظ لکھے ہیں، ان کو خوش عقیدہ لوگ سننا بھی گوارا نہ کریں گے، مگر ائمہ فن اور علمائے رجال کی کتابیں اس طرح کے اقوال سے بھری ہوئی ہیں، بلکہ محدثین نے زہد و اتقا میں ممتاز لوگوں کی روایات کی زیادہ تحقیق پر زور دیا ہے، کیونکہ یہ لوگ عبادت و ریاضت کی کثرت کی وجہ سے روایات کے معاملہ میں زیادہ محتاط نہیں ہوتے، تمام ائمۂ فن نے اس پر زور دیا ہے کہ رواۃ پر بحث و کلام اور نقد و جرح ضروری ہے تاکہ کھرے کھوٹے کا پتہ چل جائے، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ (موضوعات ملا علی قاری صفحہ ۱۰ و ۱۱)

امام نوویؒ لکھتے ہیں۔

"رواۃ پر جرح جائز ہی نہیں، بالاتفاق واجب ہے، اور شریعت مطہرہ کی حفاظت اور اس کو آلائشوں سے بچانے کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے، اور یہ جرح غیبت نہیں ہے جو حرام ہے، بلکہ اللہ، رسول اور مسلمانوں کی خیرخواہی ہے، امت کے فضلا اور بزرگوں نے ہمیشہ ایسا کیا ہے۔ (شرح نووی ج ۱ صفحہ ۱۲۲)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رواۃ پر نقد و جرح سے نہ تو محدثین کبار سے بدگمانی پیدا ہوتی ہے،

اور نہ علماء فن کے نزدیک یہ کسی کی شان میں بے ادبی اور گستاخی ہے، سیرۃ النبی میں ان روایتوں پر بحث وگفتگو کے وقت جو کتب دلائل میں مذکور ہیں، بلا شبہ راویوں پر نقد وجرح کا ذکر موجود ہے، لیکن ظاہر ہے، اس سے ان کی تنقیص مقصود نہیں، یہ موقع ہی ایسا ہوتا ہے کہ اس میں بڑے بڑے لوگ بھی نقد وجرح سے بچ نہیں سکتے، اسی لئے سید صاحبؒ نے اس بحث کا خاتمہ اس طرح کیا ہے،

"ان روایتوں کی تنقید سے غرض نعوذ باللہ فضائل نبویؐ میں کلام نہیں ہے بلکہ یہ اعتقاد ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک کی طرف جو بات منسوب کی جائے وہ ہر طرح صحیح ہو۔" (سیرۃ النبی جلد سوم صفحہ ...)

حافظ ابن عساکر کا تاریخ میں پایہ جو بھی ہو لیکن حدیث میں ان کا درجہ علمائے فن کے نزدیک بلند نہیں ہے، امام سیوطیؒ کی کتاب میں اگرچہ معجزات کے متعلق ہر طرح کی روایتیں بھری ہوئی ہیں لیکن وہ اس کے مقدمہ میں ابن عساکر اور بعض دوسرے محدثین کی کتابوں کے بارہ میں لکھتے ہیں،

"ان کتابوں کے مندرجات ضعیف ہیں، اس لیے ان کا حال بیان کرنا ضروری نہیں ہے، محض ان کی جانب نسبت ہی ان کے ضعف کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔"

(بحوالہ کشف الخفاء ومزیل الالباس۔ ج ۱ ص ۱۰)

رہے حافظ ابن حجرؒ تو وہ مختلف ومتضاد روایتوں میں جمع وتطبیق کے لئے بڑی شہرت رکھتے ہیں، ایسے موقع پر وہ ضعیف وناقابل اعتبار روایتوں میں ترجیح سے کام لینے کے بجائے ان کی ایسی تاویل وتوجیہ کرتے ہیں جس سے یا تو روایتوں میں تطبیق کی صورت نکل آئے یا ضعیف روایت بھی صحیح قرار پا جائے، ان کے اس طریقہ کو عام محدثین نے بھی پسند نہیں کیا ہے، اس لئے ان کی ہر تاویل وتوجیہ پر بحث وگفتگو کے وقت سید صاحبؒ کو اس قسم کے اظہار خیال کے لیے مجبور ہونا پڑا۔

یہاں ہم یہ الزامی جواب نہیں دینا چاہتے کہ خود مصنف اور ان کے علاوہ کے لوگ بھی

حافظ ابن حجرؒ بھی نہیں امام بخاریؒ اور امام شافعیؒ جیسے اکابر کی شان میں بھی آزادانہ کلمات استعمال کرنے سے باز نہیں آتے ہیں۔

موضوع وضعیف روایتوں میں عدم امتیاز | مولانا بدر عالم صاحب نے جابجا یہ بھی فرمایا ہے کہ سید صاحبؒ ضعیف روایتوں کو بھی موضوع، لغو، جھوٹ اور جعلی کہہ دیتے ہیں، اس اعتراض کا مقصد یہ ہے کہ سید صاحبؒ فن حدیث سے بے بہرہ اور محدثین کی اصطلاحات سے ناواقف تھے، بالفاظ دیگر وہ موضوع اور ضعیف کے فرق سے ناآشنا تھے، حالانکہ سید صاحبؒ نے روایات پر نقد و تحقیق کے ضمن میں جابجا اس قسم کی عبارتیں لکھی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان دونوں کے فرق سے بخوبی واقف تھے اور جب وہ کسی حدیث کو موضوع کہتے ہیں تو ان کی مراد موضوع ہوتی ہے، اسی طرح جب کسی روایت کو ضعیف کہتے ہیں تو اس سے انکا مقصود ضعیف ہوتا ہے، مثلاً

"لیکن اس دفتر کا بڑا حصہ موضوع اور جعلی ہے اور باقی نہایت ضعیف اور کمزور اور ان میں جو ایک آدھ صحیح ہے وہ پہلے گذر چکا ہے۔" (صفحہ ۳۳)

سید صاحبؒ نے جابجا محدثین کی اصطلاحات پر بحث و گفتگو کر کے ان سے اپنی واقفیت کا ثبوت بھی بہم پہنچایا ہے اور محدثین کے اس قاعدہ کا ذکر کیا ہے کہ جو ضعیف روایتیں بکثرت طرق سے مروی ہوتی ہیں، ان کی کچھ نہ کچھ اصلیت ہوتی ہے، (ملاحظہ ہو صفحہ ۲۰۸ و ۲۳۶)

اسی طرح سید صاحبؒ نے منکر، منقطع، موقوف، مجہول، غریب، مشہور اور صحیح وغیرہ متعدد طرح کی روایات پر گفتگو کر کے فن کے تعلق سے مختلف، مفید، ضروری اور اہم باتیں بیان کی ہیں، اس کے بعد بھی ان کو فن حدیث سے بے بہرہ اور محدثین کی اصطلاح سے ناواقف بتانا عجیب ہے۔

معتزلہ کی تائید | مولانا بدر عالم صاحب نے سید صاحبؒ پر معتزلہ کی تائید اور ہمنوائی کا اعتراض بھی عائد کیا ہے، اس کی تردید کے لیے سید صاحبؒ کا یہ بیان کافی ہوگا۔

امام ابوداؤد نے باب لزوم السنۃ میں ایک حدیث نقل کی ہے۔

جو یہ ہے:۔

"میں تم میں سے کسی کو نہ پاؤں کہ وہ اپنی مسند پر تکیہ لگائے (غرور کی شان سے) بیٹھا ہو، اور اس کے پاس میرے کاموں میں سے کوئی کام جس کے کرنے کا میں نے حکم دیا یا جس سے میں نے منع کیا، وہ اس سے بیان کیا جائے تو کہے کہ ہم نہیں جانتے جو ہم نے قرآن میں پایا ہیں اسی کو مانتے ہیں"

سید صاحبؒ اس کے بارہ میں رقمطراز ہیں:۔

"بیہقی میں اس سے زیادہ صاف الفاظ ہیں۔ دور اول میں اگر یہ پیشین گوئی معتزلہ پر صادق آسکتی تھی، تو اب آجکل مصر و ہند کے ان اشخاص پر پوری طرح صادق آتی ہے، جو خود کو اہل القرآن کے نام سے موسوم کر رہے ہیں۔" (جلد ۳ ص ۵۱)

کیا یہ معتزلہ سے سید صاحبؒ کی برأت و بیزاری کا ثبوت نہیں ہے؟

حرف آخر: علمی و تحقیقی اختلاف معیوب نہیں ہے، لیکن مولانا بدر عالم نے سید صاحبؒ جیسے محقق بزرگ کے سلسلہ میں جو لب و لہجہ اختیار کیا ہے اور اس سے جس ذہنیت کا پتہ چلتا ہے وہ نہایت افسوس ناک ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ کے تعلقات علمائے دیوبند سے بہت اچھے تھے اور انھوں نے ان کے اکابر کا ذکر جس قدر فراخدلی اور احترام سے کیا ہے اور ہر ایک کی وفات پر جس قدر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے، اسی کی توقع دوسروں سے بھی ان کے بارہ میں تھی، سید صاحبؒ نے جہاں کسی بزرگ سے اختلاف کیا ہے، وہاں متانت اور شائستگی کا دامن ان سے نہیں چھوٹا ہے، بلکہ انھوں نے مراتب شناسی کا پورا لحاظ کیا ہے، لیکن اس کے بالکل ہی برعکس ایک محدث اور استاذ حدیث کا ان کے بارہ میں یہ لب و لہجہ دیکھکر حیرت بھی ہوئی اور دکھ بھی۔

روس کے ایک ممتاز عالم
قاضی عبدالرشید ابراہیم

از

جناب ثروت صولت صاحب کراچی

(۲)

قاضی عبد الرشید پھر روس میں

اس مدت میں ممکن ہے کہ قاضی عبد الرشید خاموش بیٹھے رہے ہوں، لیکن سنہ ۱۹۱۶ء کے بعد ان کی سرگرمیوں کے بارے میں ہمیں معلومات حاصل نہیں ہو سکیں، ہاں مشہور ترک دانشور اور باشعور حریت پسند زکی ولیدی طوغان کی خود نوشت سے اتنا معلوم ہو سکا ہے، کہ وہ سنہ ۱۹۲۰ء میں روس میں موجود تھے، کیا کرتے رہے، یہ نہیں معلوم، طوغان لکھتے ہیں۔

"مارچ سنہ ۱۹۲۰ء کے آغاز میں جب کہ شدید برفباری اور طوفان کے دن تھے، ایک دن ایک شخص ہمارے گھر کے دروازے پر آیا، اور کہا کہ میں ماسکو سے آ رہا ہوں" یہ صاحب رشید قاضی تھے، جو ترکی میں، ہمارے وطن (روس) اور عالم اسلام میں جانی پہچانی شخصیت ہیں، ان کا نام عبد الرشید ابراہیم تھا، ان کے

ساتھ دو آدمی اور تھے، جو بہت گاڑی میں سموریں پہنے ہوئے
بیٹھے تھے، یہ ہندوستان کے مولوی برکت اللہ اور مولوی
عبدالرب تھے، میں نے دونوں کو اندر بلایا، یہ ہندوستانی سردی
کی وجہ سے نیم مردہ نظر آ رہے تھے، یہ سب چند روز میرے
مہمان رہے، یہ ہندوستان کے حریت پسند اور اتحاد اسلام کے
علمبردار تھے، اگرچہ ان کا سوشلزم وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں تھا،
لیکن وہ عالم اسلام کو مغربی استعمار سے نجات دلانے کے لیے کمیونسٹوں
کے ساتھ تعاون کرنے پر غور کر رہے تھے۔ یورال کے پہاڑوں
میں ایک اسلامی ریاست (باشقردستان) قائم ہونے پر خوش تھے
اور اس ریاست کو پورے ترکستان میں قائم ہونے والی ایک
عظیم اسلامی ریاست کی ابتدائی شکل تصور کرتے تھے، برکت اللہ
کی لینن سے ملاقات ہوئی تھی، اور لینن نے ان کو مجھ سے بات
کرنے کا مشورہ دیا تھا، لیکن یہ لوگ ایک عظیم اسلامی مملکت کی
اس پہلی ریاست کی حالت سے بے خبر تھے، ہر ہر بات صاف صاف کہنا بھی ممکن نہیں تھا،
لہذا میں نے ان سے کہا کہ یہ سب آپ کی خام خیالی ہے،
اسلام اور قرآن کو کمیونزم سے ملانا ایک گناہ ہے آپ چونکہ
سوویت رہنماؤں سے بات چیت کر رہے ہیں، اس لئے مذہب
کو درمیان میں نہ لائیں، محض ایک سیاسی اور انقلابی تحریک کے طور پر
جس طرح چاہیں گفتگو کریں، ان سے بات کرنے کے لیے میں نے اپنے

والد ابراہیم کو بھی بلوا لیا، جو رشید قاضی کے قریبی دوست تھے[1]

اس واقعے کے کچھ دن بعد موسیٰ جار اللہ بھی زکی ولیدی طوغان کے مہمان ہوئے۔ ان کی مہمان داری کا ذکر کرنے کے بعد طوغان لکھتے ہیں کہ

"میں نے رشید قاضی، موسیٰ جار اللہ اور برکت اللہ تینوں کو مشورہ دیا کہ جب بھی ممکن ہو وہ اسلامی ملکوں میں جائیں، لیکن کمیونزم اور اسلام کو ملا کر سوویت رہنماؤں سے نقد کی شکل میں مدد لینے کا طریقہ اختیار نہ کریں، یہ مشورہ برمحل تھا، چنانچہ تینوں اصحاب نے روس سے جانے کے بعد شکریہ کے ساتھ اس مشورے کا ذکر کیا ہے"۔

طوغان لکھتے ہیں کہ رشید قاضی سن ۱۹۳۰ء میں ان سے پھر استنبول میں ملے تھے، اور ان کو اپنا ایک رسالہ پیش کیا تھا، جس میں انھوں نے روسی مسلمانوں اور باشقردوں کی پرانی جنگوں کی تاریخ لکھی تھی، اس رسالے میں قاضی رشید نے استرلیتمک (Isterlitamak) میں اپنے قیام کا مدح وثنا کے ساتھ تذکرہ بھی کیا تھا۔

طوغان لکھتے ہیں کہ میں نے استرلی تمک میں ان تینوں حضرات کو ایک ہفتہ مہمان رکھنے کے بعد سرکاری برف گاڑی کے ذریعے بمقام شفران (Shafran) پہنچا دیا جو قریب ترین ریلوے اسٹیشن تھا[2]

برکت اللہ بھوپالی خود بھی ایک بڑے انقلابی تھے اور وہ روسی اشتراکیوں کی مدد سے ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے تھے، قاضی رشید کے ساتھ ان کا باشقردستان آنا ظاہر کرتا ہے کہ شاید قاضی عبدالرشید بھی روسی کمیونسٹوں سے شروع میں امیدیں وابستہ کئے ہوئے تھے، لیکن جب وہ پوری نہ ہو سکیں تو انھوں نے روس چھوڑ دیا۔ قاضی عبدالرشید کی زندگی کا یہ وہ پہلو ہے جس پر تحقیق

---

۱ زکی ولیدی طوغان: خاطرہ لر، ص ۳۰۰-۳۰۱ (استنبول ۱۹۶۹ء) ۲ ایضاً

کی ضرورت ہے۔

قاضی عبد الرشید سنہ ۱۹۱۸ء سے سنہ ۱۹۲۹ء تک کہاں رہے، اس کے بارے میں معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ شاید اسی زمانے میں وہ انور پاشا سے ترکستان میں ملے ہوں جو اکتوبر ۱۹۲۱ء میں ترکستان پہنچ گئے تھے، اور ۴ اگست ۱۹۲۲ء کو اپنی شہادت تک دس ماہ ترکستان میں رہے۔ عبد الکریم سائیتو نے اپنے مضمون میں انور پاشا کے ساتھ مل کر جنگ کرنے کی جس روایت کا ذکر کیا ہے، وہ واقعہ یا تو اسی زمانے کا ہو سکتا ہے، یا پھر طرابلس کی جنگ کا واقعہ ہو سکتا ہے، جس کے دوران انور پاشا اکتوبر ۱۹۱۱ء سے نومبر ۱۹۱۲ء تک لیبیا میں رہے تھے۔ ارطغرل وزداغ کی تحریر سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ قاضی عبد الرشید طرابلس کی جنگ اور مشرقی ترکستان کی آزادی کی جد و جہد، دونوں میں سرگرم رہے تھے۔ سن ۱۹۳۰ء میں وہ استنبول آئے تھے، جیسا کہ طوغان نے لکھا ہے، اور اس موقع پر انھوں نے طوغان کو اپنا رسالہ بھی پیش کیا تھا۔

<u>ٹوکیو میں قاضی عبد الرشید کا انتقال</u> ارطغرل وزداغ نے اشرف ادیب کے حوالے سے لکھا ہے کہ سن ۱۹۳۰ء اور سن ۱۹۳۱ء میں مکہ میں جاپانی مسلمانوں سے گفتگو کے بعد وہ جاپان میں اسلامی تحریک کو فروغ دینے کے لیے استنبول سے جاپان چلے گئے۔ ابوبکر موری موتو نے اپنے سفر حج کی روئداد میں بتایا ہے، کہ سن ۱۹۰۹ء کے بعد دوسری عالمی جنگ کے خاتمے تک دس اور جاپانیوں نے حج کیا تھا۔[1] جاپان میں انھوں نے جمعیت عظیم ایشیا کی سرگرمیوں کو جاوا، ملایا اور ہندوستان تک بڑھا دیا۔ ان کو اپنی جد و جہد کا یہ صلہ ملا کہ دوسری عالمی جنگ کے نتیجے میں ان ملکوں کو آزاد دیکھنے کی ان کو جو توقع تھی اس کی بر آوری کے آثار ان کی زندگی میں ظاہر ہونے لگے تھے، بالآخر یہ نڈر، بہادر اور ان تھک مجاہد اور عظیم انسان ۳۱ اگست سنہ ۱۹۴۴ء کو ۹۰ سال کی عمر میں ٹوکیو میں وفات پا گئے۔[2]

---

[1] اسلامک کلچر فورم، ٹوکیو۔ اپریل ۱۹۷۶ء مضمون کے ترجمہ کے لیے دیکھئے جسارت کراچی ۲۲ جون ۱۹۷۶ء

[2] ارطغرل وزداغ، صفحات تدقیقلری۔ ص ۲۰۰۔

طوفان کی وضاحت کے مطابق وہ انتقال کے وقت ٹوکیو کی مسجد کے امام تھے۔[1]

جاپان کی موجودہ مسجدوں میں پہلی مسجد کا افتتاح ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو شہر کوبے میں ہوا تھا۔ یہ مسجد اوساکا اور کوبے کے مسلمان تاجروں اور ہندوستان، برما، ملایا وغیرہ کے مسلمانوں کی مالی امداد سے تعمیر کی گئی تھی۔ اس کے افتتاح کے موقع پر تین سو مسلمان موجود تھے، کوبے کے میئر اور مصری اور برطانوی قونصل اور متعدد جاپانی عمائدین نے بھی رسم افتتاح میں شرکت کی تھی۔[2]

جاپان کی دوسری مسجد ٹوکیو میں تعمیر ہوئی، اور ۱۲ر مئی ۱۹۳۸ء کو اس کا افتتاح ہوا۔ یہ مسجد ترک مسلمانوں اور مقامی جاپانیوں کے تعاون سے تعمیر کی گئی تھی، اس کی رسم افتتاح میں یمن کے شہزادے، سعودی سفیر متعینہ لندن جنھیں سلطان ابن سعود نے خاص طور سے بھیجا تھا، مصری نمائندے جسے شاہ مصر نے بھیجا تھا، ٹوکیو کے کئی سو مسلمانوں نے جن کی بڑی تعداد تاتاری تھی اور جاپانیوں کی ایک جماعت نے شرکت کی۔[3]

کوبے اور ٹوکیو کی مسجدوں کی تعمیر اور افتتاح جس زمانے میں ہوا، قاضی عبدالرشید ابراہیم اس ساری مدت میں جاپان میں تھے، لیکن تعجب ہے کہ پروفیسر نورالحسن برلاس نے مئی ۱۹۳۵ء اور نومبر ۱۹۳۸ء کے درمیان جاپان میں اسلام اور مسجدوں کے افتتاح پر جو مضامین ماہنامہ معارف میں لکھے تھے، ان میں قاضی عبدالرشید کا نام نہیں آتا۔ ہاں ایک دوسرے تاتاری مسلمان قربان علی کا تذکرہ ضرور ملتا ہے، جو ٹوکیو کی مسجد کے امام بھی تھے، کوبے کی مسجد کے افتتاح کے موقع پر قاضی عبدالرشید ۷۸ سال کے ہو چکے تھے، اور ٹوکیو کی مسجد کے افتتاح کے موقع پر ان کی عمر ۸۰ سا

۱؎ طوفان، در خاطرہ لر ص ۳۰۲ (استنبول ۱۹۶۹ء)۔ ۲؎ جرنل (۵۵)، جلد اول شمارہ اول ۱۹۶۹ء میں عبدالکریم سائیتوہ کا مضمون۔ ۳؎ ایضاً۔ ۴؎ ملاحظہ کیجیے "معارف" اعظم گڑھ، بابت مئی ۱۹۳۵ء، جنوری ۱۹۳۶ء، اور مئی اور نومبر ۱۹۳۸ء۔

کی تھی، ہو سکتا ہے کہ بڑھاپے کی وجہ سے وہ عملی سرگرمیوں سے دست بردار ہو چکے ہوں، پروفیسر براتس کے ان مضامین سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ٹوکیو کی مسجد کی امامت قربان علی کے سپرد تھی۔ اور کوبے کی مسجد کی امامت بھی تاتاری مسلمان کرتے تھے۔ لہٰذا زکی ولیدی طوغان کا یہ لکھنا کہ وفات کے وقت قاضی عبدالرشید ٹوکیو کی مسجد کے امام تھے تحقیق طلب مسئلہ ہے، کیونکہ اس وقت ان کی عمر ۹۰ سال ہو چکی تھی۔ ہاں اس کا امکان ضرور ہے کہ مسجد کے اصل امام قاضی عبدالرشید ہوں لیکن ان کی ضعیفی کی وجہ سے یہ فرض عملاً قربان علی انجام دیتے ہوں۔

تصانیف۔ قاضی عبدالرشید ابراہیم چھوٹی بڑی کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے، جن میں سب سے اہم کتاب "عالم اسلام" ہے۔ اس کا پورا نام "عالم اسلام اور جاپان میں اسلام کی اشاعت" ہے۔ [۱] یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے پہلی جلد چھ سو بیس صفحات پر مشتمل ہے، اور دوسری جلد دو سو بیالیس صفحات پر۔ یہ کتاب میں ترکستان، سائبیریا، جنگولیا، منچوریا، کوریا، جاپان، چین، سنگاپور، جزائر مشرق الہند (انڈونیشیا)، ہندوستان، عرب اور استنبول کی سیاحت سے متعلق ہے۔ [۲]

۲۔ چولپان یلدزی (ستارۂ زہرہ)، یہ کتاب جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ۱۸۹۵ء میں استنبول سے شائع ہوئی تھی، اس کا موضوع کیا تھا معلوم نہیں۔

۳۔ لوار الحمد۔ اس نام سے قاضی عبدالرشید نے متعدد رسالے لکھے تھے اور ان میں روس کے مسلمانوں کو ہجرت کر کے خلافت عثمانیہ میں آباد ہونے کی ترغیب دی گئی تھی۔

۴۔ باشقردوں اور روسیوں کی جنگوں پر ایک رسالہ جسے ۱۹۳۰ء میں انھوں نے استنبول میں طوغان کو پیش کیا تھا۔

۵۔ طوغان نے اپنی خاطرات کے صفحہ ۱۳۰ پر ترکستان کی آزادی کے موضوع پر ان کی ایک

---

[۱] عالم اسلام وژاپونیاده انتشار اسلامیت (صفحات تدقیقلری ص ۱۹۰) [۲] ارطغرل وزدار، صفحات تدقیقلری۔ ص ۱۹۹۔

اور کتاب کا ذکر کیا ہے جو ۱۹۰۵ء اور ۱۹۱۰ء کے درمیان لکھی گئی تھی، لیکن اس میں طوغان نے مصنف کا نام عبدالرشید قاضی ابراہیموف لکھا ہے، معلوم نہیں یہ ہمارے قاضی عبدالرشید ہی ہیں یا کوئی دوسرے صاحب ۔

قاضی عبدالرشید ایک صحافی کی حیثیت سے

قاضی عبدالرشید ایک صحافی بھی تھے، اور انھوں نے کازان اور پیٹرسبرگ سے "الفت" اور "تلمیذ" کے نام سے دو اخبار بھی نکالے تھے، ان اخباروں کے علاوہ انھوں نے روس اور ترکی سے نکلنے والے اخبار اور رسالوں میں بکثرت مضامین لکھے، ان اخباروں میں سے کازان کے "بیان الحق" (جو ۱۴ مارچ ۱۹۰۶ء کو جاری ہوا تھا) اور استنبول کے بصیرت" کا ذکر پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے۔[1] بعد میں انھوں نے صراط مستقیم[2] میں بھی باقاعدہ لکھا، اس ہفت روزہ میں ان کے وعظ اور تقریریں بھی شائع ہوتی تھیں ۔

سلیمانیہ کے منبر پر

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ عاکف نے اپنے مجموعۂ کلام "صفحات" کی دوسری نظم "سلیمانیہ کے منبر پر" میں قاضی عبدالرشید کو واعظ کی حیثیت سے پیش کیا ہے، اور اپنے خیالات کا اظہار ان کی زبان سے کیا ہے، لیکن اس نظم میں عالم اسلام کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ بالکل وہی ہے، جو قاضی عبدالرشید نے اپنی کتاب "عالم اسلام" میں پیش کیا ہے، یہ نظم ۱۰ رمضان المبارک

---

[1] بصیرت اپنے زمانہ میں (۱۲۸۵ھ/۱۸۶۹ء تا ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء) ترکی کا سب سے اچھا اخبار تھا، اور جرمن چانسلر بسمارک نے اس اخبار کو طباعت کی جدید ترین مشین فراہم کی تھیں۔ (ترک دیلی و ادبیاتی انسی کلوپیدیاسی جلد اول۔ ص ۳۴۰)

[2] صراط مستقیم بھی اس زمانہ میں سب سے زیادہ چھپنے والا ترکی ہفت روزہ تھا، جس کی اشاعت چالیس اور پچاس ہزار کے درمیان تھی۔ (اشرف ادیب کی خود نوشت مطبوعہ یئی آسیا استنبول۔ ۱۹ جنوری ۱۹۶۰ء)

۲۰ اگست سنہ ۱۳۳۲ھ / ۱۹۱۴ء کو مکمل ہوئی تھی، جب کہ کتاب عالم اسلام کی پہلی جلد کو شائع ہوئے دو سال ہو چکے تھے، اور عارف بے روزنامہ صراط مستقیم کے شمارہ ۳۰۹ دکم جولائی سنہ ۱۳۲۲ / ۱۹۱۴ء میں اس پر ایک انتہائی اہم کتاب کے زیر عنوان تبصرہ کر چکے تھے۔ چونکہ اس نظم میں عالم اسلام سے متعلق قاضی عبدالرشید کے مشاہدات کو پیش کیا گیا ہے اس لئے اس کے اقتباسات قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث بھی ہوں گے اور قاضی عبدالرشید کے خیالات بھی معلوم ہو سکیں گے۔ قاضی عبدالرشید کہتے ہیں :-

"مجھکو منبر پر دیکھکر آپ لوگ یہ خیال نہ کریں کہ میں کوئی وعظ کہنے والا ہوں۔

میں علماء کے طبقہ سے نہیں ہوں، میری شکل و صورت سے آپ دھوکا نہ کھائیں، دینی احکام کا بیان کرنا فقہا کا کام ہے۔ لیکن اگر آپ عالم اسلام سے متعلق کوئی سوال کرنا چاہیں تو مجھ سے کر سکتے ہیں، کیونکہ مشرق بعید سے مغرب اقصیٰ تک کوئی جگہ ایسی نہیں جسے میں نے نہ دیکھا ہو، ایشیا، یورپ اور افریقہ میں جہاں جہاں مسلمان موجود ہیں میں وہاں گیا ہوں اور ان کے حالات اور ان کے ماضی کے بارے میں تحقیق کی ہے۔"[1]

اس کے بعد قاضی عبدالرشید کہتے ہیں :-

"میں اس سے پہلے بھی استنبول آچکا ہوں، لیکن یہاں کے حالات سے دل برداشتہ ہو کر پھر روس واپس چلا گیا تھا۔" اس کے بعد قاضی عبدالرشید روس کے مسلمانوں کی تباہ حالی کا ذکر کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ مہذب یورپ کو حکومت روس کے مظالم دکھائی نہیں دیتے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے مسلمانوں کو جگانے کے لئے ایک خفیہ چھاپہ خانہ قائم کیا تھا، اور پندرہ بے سہارا لوگوں کو تلاش کر کے فن طباعت سکھایا۔

---

[1] محمد عاکف ارصوے :۔ صفحات۔ ص ۱۶۱ (استنبول سنہ ۱۹۴۳ء)

اور کتاب کا ذکر کیا ہے جو سنہ ۱۹۰۹ء اور سنہ ۱۹۱۰ء کے درمیان لکھی گئی تھی، لیکن اس میں طوغان نے مصنف کا نام عبدالرشید قاضی ابراہیموف لکھا ہے، معلوم نہیں یہ ہمارے قاضی عبدالرشید ہی ہیں یا کوئی دوسرے صاحب ۔

قاضی عبدالرشید ایک صحافی کی حیثیت سے

قاضی عبدالرشید ایک صحافی بھی تھے، اور انھوں نے کازان اور پیٹرسبرگ سے "الفت" اور "تلمیذ" کے نام سے دو اخبار بھی نکالے تھے، ان اخباروں کے علاوہ انھوں نے روس اور ترکی سے نکلنے والے اخبار اور رسالوں میں بکثرت مضامین لکھے، ان اخباروں میں سے کازان کے "بیان الحق" (جو ۲۱ مارچ سنہ ۱۹۰۶ء کو جاری ہوا تھا) اور استنبول کے "بصیرت"[1] کا ذکر پچھلے صفحات میں کیا جا چکا ہے، بعد میں انھوں نے "صراط مستقیم"[2] میں بھی باقاعدہ لکھا، اس ہفت روزہ میں ان کے وعظ اور تقریریں بھی شائع ہوتی تھیں ۔

سلیمانیہ کے منبر پر

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ عاکف نے اپنے مجموعۂ کلام "صفحات" کی دوسری نظم "سلیمانیہ کے منبر پر" میں قاضی عبدالرشید کو واعظ کی حیثیت سے پیش کیا ہے، اور اپنے خیالات کا اظہار ان کی زبان سے کیا ہے، لیکن اس نظم میں عالم اسلام کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ بالکل وہی ہے، جو قاضی عبدالرشید نے اپنی کتاب "عالم اسلام" میں پیش کیا ہے، یہ نظم ۱۰ رمضان المبارک

---

[1] بصیرت اپنے زمانہ میں (سنہ ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء تا ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء)، ترکی کا سب سے اچھا اخبار تھا، اور جرمن چانسلر بسمارک نے اس اخبار کو طباعت کی جدید ترین مشینیں فراہم کی تھیں۔ (ترک دیلی وادبیاتی انسیکلوپیدیاسی جلد اول۔ ص ۳۳۰)

[2] صراط مستقیم بھی اس زمانہ میں سب سے زیادہ چھپنے والا ترکی ہفت روزہ تھا، جس کی اشاعت چالیس اور پچاس ہزار کے درمیان تھی، (اشرف ادیب کی خود نوشت مطبوعہ یینی آسیا، استنبول۔ ۱۰ جنوری سنہ ۱۹۶۰ء)

۲۰ اگست سنہ ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء کو مکمل ہوئی تھی، جب کہ کتاب عالم اسلام کی پہلی جلد کو شائع ہوئے دو سال ہو چکے تھے، اور عاکف ہفت روزہ صراط مستقیم کے شمارہ ۹ مؤرخہ ۳ جولائی سنہ ۱۹۱۲ء میں اس پر ایک انتہائی اہم کتاب کے زیر عنوان تبصرہ کر چکے تھے۔ چونکہ اس نظم میں عالم اسلام سے متعلق قاضی عبد الرشید کے مشاہدات کو پیش کیا گیا ہے اس لئے اس کے اقتباسات قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث بھی ہوں گے اور قاضی عبد الرشید کے خیالات بھی معلوم ہو سکیں گے۔ قاضی عبد الرشید کہتے ہیں:

"مجھکو منبر پر دیکھکر آپ لوگ یہ خیال نہ کریں کہ میں کوئی وعظ کہنے والا ہوں۔ میں علماء کے طبقہ سے نہیں ہوں، میری شکل و صورت سے آپ دھوکا نہ کھائیں، دینی احکام کا بیان کرنا فقہا کا کام ہے۔ لیکن اگر آپ عالم اسلام سے متعلق کوئی سوال کرنا چاہیں تو مجھ سے کر سکتے ہیں، کیونکہ مشرق بعید سے مغرب اقصی تک کوئی جگہ ایسی نہیں جسے میں نے نہ دیکھا ہو۔ ایشیا، یورپ اور افریقہ میں جہاں جہاں مسلمان موجود ہیں میں وہاں گیا ہوں اور ان کے حالات اور ان کے ماضی کے بارے میں تحقیق کی ہے۔"[1]

اس کے بعد قاضی عبد الرشید کہتے ہیں:-

"میں اس سے پہلے بھی استنبول آچکا ہوں، لیکن یہاں کے حالات سے دل برداشتہ ہو کر پھر روس واپس چلا گیا تھا۔" اس کے بعد قاضی عبد الرشید روس کے مسلمانوں کی تباہ حالی کا ذکر کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ مہذب یورپ کو حکومت روس کے مظالم دکھائی نہیں دیتے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے مسلمانوں کو جگانے کے لئے ایک خفیہ چھاپہ خانہ قائم کیا تھا، اور پندرہ بے سہارا لوگوں کو تلاش کر کے فن طباعت سکھایا۔

۱۔ محمد عاکف ارصوی، صفحات۔ ص ۱۶۱ (استنبول سنہ ۱۹۴۳ء)

میں سے عبد ایک اخبار نکالا، مسلمانوں کو متحد ہونے اور تعلیم کو فروغ دینے کی تلقین کی، جس کے نتیجے میں دولت مند آگے آئے اور مدرسے قائم کئے۔ قاضی رشید کہتے ہیں کہ ہم اس محنت سے کام کر رہے تھے کہ ایک دن انکے چھاپہ خانہ پر چھاپا مارا جاتا ہے، اور وہ ترکستان میں پناہ لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ وہ تاشقند، بخارا، سمرقند اور جیشمار مقامات پر جاتے ہیں، یہاں کے مسلمانوں کے بارے میں وہ اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

"ان لوگوں کے مذہبی تعصبات کو نہ پوچھو کہ وہ بہت مضحکہ انگیز ہیں، وہ خواجہ (مولوی) جس کے خرقے کی آستین اور دامن زمین پر گھسٹ رہے ہیں، وہی حدود مذہبی تجاوز کرنے میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ ملت کے فائدے کے لئے تم جو کچھ بھی سوچو اس کی نظر میں بدعت ہے، مگر شریعت کو بدل دینا اور ذلیل کرنا اس کی نگاہ میں سنت ہے۔"

یہاں کثیر التعداد شعراء موجود ہیں، جن کا موضوع عورت ہے، اور یہ لوگ اس داستان حسن و عشق کو تصوف کہتے ہیں، مگر اس خطے کے نوجوان بیدار ہو رہے ہیں، ایک دن ان کی کوشش بار آور ہوگی۔"[1]

ترکستان سے عبدالرشید چین اور منچوریا جاتے ہیں، چین کے بارے میں بتاتے ہیں کہ:۔

یہاں کے مسلمانوں کے نزدیک مذہب جامد روایات کا دوسرا نام ہے، مسلمان آبادی جاہل اور پسماندہ ہے۔

ہمارا سیاح اس کے بعد جاپان جاتا ہے، اور جاپانیوں کے بارے میں حسب ذیل تاثرات کا اظہار کرتا ہے:۔

---

[1] محمد عاکف: صفحات۔ ص ۱۲۱ - ۱۲۹ - اردو ترجمہ ڈاکٹر محمد صابر کا ہے اور علی نہاد تارلان کی کتاب محمد عاکف سے لیا گیا ہے، دیکھئے کتاب مذکور کا صفحہ ۴۴ - ۶۰۔

"چھوٹے قد کے آدمیوں کی یہ عظیم قوم اسلام کے تمام اصولوں کی پیروی کرتی ہے، وہ صرف توحید پر یقین نہیں رکھتے لیکن ایمانداری، وفاشعاری، رحم، قناعت، فیاضی، مکمل ضبط و نظم اور ملک کی بھلائی کے لئے قربان کرنے پر آمادہ رہنا، یہ تمام باتیں اسلامی تعلیمات کا جزو ہیں، اور اہل جاپان میں پائی جاتی ہیں، جاپان نے مغربی سائنس کو اپنایا مگر اس کے مضر اثرات سے اجتناب کیا۔ ضابطہ اخلاق کی جتنی پابندی جاپانی کرتے ہیں، ان کا مسلمانوں میں دور دور پتہ نہیں۔[1]

قاضی عبدالرشید کا خیال تھا کہ جاپان میں اسلام آسانی سے پھیل سکتا ہے، صرف خلافت عثمانیہ کو اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اسی مقصد سے انھوں نے سلطان عبدالحمید سے مدد طلب کی تھی۔

قاضی عبدالرشید ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں کا ذکر تعریف کے ساتھ کرتے ہیں۔ کہتے ہیں:۔

ہندوستان کا سفر: میں ہندوستان کی ایک سرے سے دوسرے سرے تک سیر کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں جہاں جاتا تھا، پولیس میرے تعاقب میں وہاں تک پہنچ جاتی تھی۔ اس کی وجہ سے میری طاقت جواب دے گئی۔ اور میں اپنی آرزو پوری نہ کر سکا۔ پھر بھی میں نے وہاں پر حمل کا تھوڑا بہت لطف اٹھایا، یہاں میں نے مسلمانوں میں دینی روح پائی، وہ قرآن کی حکمت کو سمجھتے ہیں، ان کے علماء ایسے ہیں، جن کے آگے اہل مغرب سر جھکاتے ہیں۔ نوجوانوں میں بھی یہی جذبہ ہے، جو لوگ تعلیم حاصل کرنے انگلستان جاتے ہیں، وہ بندر کی طرح مغرب کی اندھی تقلید نہیں کرتے، یہاں بے حیائی نہیں، لوگ شراب نہیں پیتے، عالی ہمت ہیں، اور ان میں شریعت کا احترام ہم سے زیادہ ہے۔

---

[1] ڈاکٹر علی ہناو تارلان :۔ محمد عاکف (اردو ترجمہ) ص ۱۰، نیز محمد عاکف۔ صفحات ۱۱۰

[2] ارطغرل ودوداغ :۔ صفحات تدقیقلری۔ ص ۱۹۱

افسوس وہ عنصر ایمانی جو لائق ستائش ہے، ہم میں نہیں ہے، ہند کے مسلمانوں کو ترکوں پر قیاس نہ کرو، ان کے جسموں میں روح شجاعت سے جوش مارنے والا خون موجود ہے، ہم میں ان کے جیسے خلوص حمیت اور جذبۂ دینی نہیں ہے۔[1]

قاضی عبدالرشید جب حیدر آباد (دکن) پہنچتے ہیں تو ان کو معلوم ہوتا ہے، کہ سلطان نے آخر کار سلطنت عثمانیہ میں آئین بحال کر دیا ہے، وہ بڑی توقعات اور جوش کے ساتھ استنبول آئے ہیں، مگر یہ توقعات پوری نہیں ہوئیں، وہ جب استنبول کے ساحل پر قدم رکھتے ہیں تو یہ دیکھ کر حیرت میں رہ جاتے ہیں، کہ ملک انتشار کا شکار ہے، اور حالت پہلے سے بھی زیادہ خراب ہے۔ وہ لکھتے ہیں ؛۔

> "جب میں استنبول آیا تو میں نے دیکھا کہ ہر کوچہ و بازار نعروں سے قائم ہے۔ ہاں ایسا کیوں نہ ہو آزادی جو مل گئی ہے، لوگ سچ کہتے ہیں، کہ جب جوش و خروش میں ہیجان آجاتا ہے، تو عقل اور سمجھ رخصت ہو جاتی ہے، میں نے اس دن ہر شخص کو عقل سے بیگانہ دیکھا۔"[2]

صفحات کے مندرجہ بالا اقتباسات قاضی عبدالرشید ابراہیم کی زندگی اور ان کے افکار پر اچھی خاصی روشنی ڈالتے ہیں، اگر ان کی کتاب "عالم اسلام" دستیاب ہوتی تو ہم اس سے مزید اقتباسات پیش کرتے تاکہ یہ معلوم ہو سکتا کہ انھوں نے مختلف ملکوں میں اور کیا دیکھا، اتفاق سے ارطغرل دزداغ نے اپنی کتاب صفحات تدقیقلری میں عالم اسلام سے چند اقتباسات پیش کئے ہیں۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے ہم انھیں ذیل میں پیش کرتے ہیں چین سے متعلق وہ لکھتے ہیں ؛۔

---

[1] محمد عاکف ؛۔ صفحات۔ ص ۱۶۱ ۔ ۱۶۳ (استنبول ۱۹۴۲ء) [2] علی نہاد تارلان ؛۔ محمد عاکف (اردو ترجمہ) ص ۶۳ (لاہور ۱۹۵۸ء)

چین | عام طور پر چین کی مسجدوں میں نماز سے پہلے طلبہ ایک حلقہ بنا کر سورۂ کہف پڑھتے ہیں اس مرتبہ بھی جب ہم مسجد میں آئے تو سورۂ کہف پڑھی جا رہی تھی، محمد حنیف آفندی پہلی مرتبہ چین کی کسی مسجد میں آئے تھے، وہ پہلے تو حیرت سے دیکھتے رہے، پھر مجھ سے پوچھا کہ یہ لوگ کیا پڑھ رہے ہیں، میں نے بتایا کہ سورۂ کہف پڑھ رہے ہیں کہنے لگے میرے دوست مجھے پوری سورہ کہف زبانی یاد ہے لیکن یہ لوگ جو پڑھ رہے ہیں، اس کا ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آرہا۔" (عالم اسلام۔ جلد اول۔ ص ۲۲۵ [1])

میں بھی محراب کے پاس ایک جگہ بیٹھ گیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ شور کی آواز بلند ہوئی۔ میں فوراً دروازے کی طرف لپکا۔ دیکھا کہ لوگ ناقوس بجا رہے ہیں، ان لوگوں کے ناقوس عیسائیوں کے ناقوسوں کی طرح نہیں ہیں بلکہ بودھ مت کی عبادت گاہوں میں جو ڈھول بجائے جاتے ہیں ان سے مشابہ ہیں، یہ ڈھول مسجد کے دروازے کے سامنے رکھے ہوتے ہیں، لوگ مسجد میں آتے وقت اس کو بجاتے ہیں، اور امید کرتے ہیں کہ اس طرح ان کو ثواب ملے گا۔"

عالم اسلام جلد دوم۔ ص ۵۰ [2]

جاپان | جہاں تک عیسائی مبلغوں کا تعلق ہے، وہ دنیا کے ہر حصے میں دن رات جدوجہد کر رہے ہیں۔ چین میں بھی ہر طرف حشرات الارض کی طرح پھیلے ہوئے ہیں، یہ مبلغ پہاڑوں میں، وادیوں میں میدانوں میں ہر جگہ نظر آئیں گے، جہاں کہیں خلا پاتے ہیں وہیں اپنا گھونسلا بنا لیتے ہیں، چین میں ان لوگوں نے جس کثرت سے خانقاہیں بنائی ہیں، دنیا کے کسی ملک میں نہ ہوں گی، یہ لوگ اسلام کی اشاعت میں رکاوٹ ڈالتے ہیں حتیٰ کہ جان لینے سے بھی باز نہیں آتے، ایک دن چینی لوگوں کو نکال باہر کریں گے اور اس کے لیے خون کی ندیاں بہہ جائیں گی (جلد اول ص ۲۰۵ [3])

ہندوستان | مسیحیت کے یہ خادم جو حشرات الارض دنیا کے ہر حصہ کی طرح ہندوستان میں بھی کثرت سے

---

[1] از طول وزدراغ، صفحات تدقیقلری۔ ص ۱۱، [2] ایضاً ص ۱۱، [3] ایضاً ص ۱۸۱

موجود ہیں۔ ہندوستان میں کسی جگہ کسی قسم کا اجتماع ہو، مسیحی مبلغ وہاں پہنچ جاتے ہیں، اور اپنی دوکان لگا لیتے ہیں، تین چار فرنگی خواتین بناؤ سنگھار کر کے آ بیٹھتی ہیں اور عیسائیت کو نیلام کرنا شروع کر دیتی ہیں، اور ہندو اور مسلمان دونوں کو عیسائیت کی دعوت دیتی ہیں، معلوم نہیں ان اجتماع میں خواتین کو کیوں لایا جاتا ہے۔ (عالم اسلام جلد دوم۔ ص ۱۰۰)[1]

ایک دن ایک گھر میں بطور مہمان ٹھہرا ہوا تھا۔ قریب ہی ایک دوکان تھی جس کا کھلا ہوا تھا، سامنے بیشمار لوگ جمع تھے، دوکان کے اندر دو نوجوان خواتین بناؤ سنگھار کئے موجود تھیں، اور باہر دو مسیحی مبلغ اردو زبان میں مسلمان حاجیوں کو خطاب کر کے حج اور دوسرے اسلامی دینی امور کے خلاف بدزبانی کر رہے تھے۔ (عالم اسلام جلد دوم۔ صفحہ ۱۰۱)[2]

میں کسی کو اطلاع دیئے بغیر بمبئی جانے کے لئے ٹرین پر سوار ہو گیا۔ ایک جگہ میرے پاس ایک پولیس افسر آیا۔ اور مجھ سے دوسرے ڈبے میں جانے کے لیے کہا لیکن میں نے اپنی جگہ چھوڑنے سے قطعی انکار کر دیا۔ اس کے بعد ایک انگریز افسر آیا۔ اس نے بھی مجھ سے کچھ کہا جس کی میں نے پروا نہ کی۔ آخر میں میرے ڈبے میں ایک مسیحی مبلغ آیا اور میرے سامنے بیٹھ گیا، میں نے محسوس کیا کہ وہ سول پولیس سے تعلق رکھتا ہے، میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور کتاب پڑھنے میں مصروف رہا جب بمبئی آیا تو یہ شخص سو رہا تھا، میں فوراً گاڑی سے اترا اور اپنے راستے پر روانہ ہو گیا، میں بڑی سڑک سے مسلمانوں کے محلے کی طرف جا رہا تھا کہ وہ شخص بھاگتا ہوا میرے پیچھے آنے لگا، سڑک سنسان تھی، اور قریب تھا کہ وہ مجھے پکڑ لے، میں نے اس کو ایک گھونسہ رسید کیا، پھر دو تین گھونسے اور لگائے، اس کے بعد وہ سیٹی بجاتا ہوا بھاگ گیا۔" (عالم اسلام جلد ۲ ص ۱۱۱)[3]

مضمون ختم کرنے سے پہلے ہم قاضی عبدالرشید کی مذکورۂ بالا کتاب سے ایک اور اقتباس

---

[1] اعتزال در دماغ:۔ صفحات تذکیری ص ۱۰۱ - ۱۰۲ [2] ایضاً ص ۱۰۲ [3] ایضاً ص ۱۰۳

دینا چاہتے ہیں، جس میں انھوں نے علماء کو مخاطب کرکے ان کا فرض یاد دلایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"خود کو ہم انبیاء کا وارث ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن اگر ہم اوپر سے نیچے تک اپنا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ ہم کیا چاہتے ہیں اور کیا نہیں چاہتے۔ افسوس کہ ہم کس حال میں مبتلا ہوگئے ہیں، دوسروں کو اسلام کی دعوت دینا ایک طرف رہا۔ نوجوانوں کو اسلام سے متنفر کرنا، ذرا ذرا سی بات پر مسلمان بھائیوں کو کافر قرار دینا ہمارے علماء کا کام رہ گیا ہے، آج ہمارے بہت سے علماء کا دین و ایمان پیسہ ہوگیا ہے، دین کی خاطر خود کو قربان کرنے کے بجائے شریعت کو اپنی بداعمالیوں اور نفس امارہ کا آلۂ کار بنا لیا ہے۔" (عالم اسلام جلد اول ص ۵۰۹)[1]

قاضی عبدالرشید پر مزید تحقیق کی ضرورت

قاضی عبدالرشید ابراہیم کے یہ مختصر حالات ان کی عظمت اور ان کے کارناموں کی اہمیت ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں، ضرورت اس کی ہے کہ ان پر تحقیق کی جائے تاکہ ان کے مفصل حالات اور کارنامے سامنے آسکیں، اور وہ تشنگی دور ہوسکے جو اس مختصر مضمون کے مطالعہ سے پیدا ہوتی ہے، انھوں نے روس میں جو مدرسے قائم کیے ان کے بارے میں ہمیں کچھ نہیں معلوم۔ اسی طرح سینٹ پیٹرس برگ میں انھوں نے چھاپہ خانہ قائم کرکے جو مطبوعات شائع کیں، ان کے ہم کو نام تک معلوم نہیں۔ ان کے نکالے ہوئے اخبارات الفت اور تلمیذ کے بارے میں بھی ہماری معلومات صفر کے برابر ہیں۔ روسی مسلمانوں کی سیاسی زندگی میں زار کے دور میں اور اس کے بعد اشتراکی دور میں انھوں نے جو سیاسی خدمات انجام دیں، ان کے بارے میں بھی ہم تاریکی میں ہیں، اتحادِ اسلام، خلافت عثمانیہ کے تحفظ اور اشاعت اسلام کے سلسلے میں ان کی خدمات بہت اہم[2]

---

[1] از طفل وز دانش۔ صفحات تدقیقلری ص ۱۸۷

اس کا تفصیلی تعارف ضروری ہے، دار الحرب سے ہجرت کرکے دار الاسلام میں آنا اسلامی شریعت کا ایک اہم مسئلہ ہے، برصغیر پاکستان و ہند میں تحریک آزادی کے زمانہ میں ایسی ایک تحریک چل چکی ہے۔ جدید تاریخ میں اس کی پہلی مثال شاید قاضی عبدالرشید نے قائم کی، اور روسی مسلمانوں کو ہجرت کرکے دولت عثمانیہ میں آباد ہونے کی ترغیب دی، اس تحریک کا بھی پورا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ ان کی سیاحت کی تفصیلات پر روشنی ڈالنا بھی ضروری ہے، کیونکہ ایک سیاح کی حیثیت سے بھی ان کا مقام کافی بلند ہے۔ یہ کوئی زیادہ مشکل کام نہیں ہے، اس سلسلے میں سب سے پہلے قاضی عبدالرشید کی تمام تصانیف کی بالعموم اور "عالم اسلام" کی بالخصوص از سر نو اشاعت ضروری ہے۔ روزنامہ "بصیرت" استنبول اور ہفتہ روزہ "صراط مستقیم" استنبول کی فائلیں ترکی میں موجود ہیں، ان کی مدد سے ان میں شائع ہونے والے مضامین بھی جمع کئے جا سکتے ہیں، اور قاضی عبدالرشید کے حالات بھی معلوم کئے جا سکتے ہیں، اسی طرح روس سے ترکی زبان میں نکلنے والے اخبارات اور رسالوں کی پچھلی فائلوں سے بھی بہت مدد مل سکتی ہے، جو شاید روس اور ترکی کے کتب خانوں میں موجود ہوں

دولت عثمانیہ

مسلمانوں کی قابل فخر شاندار سلطنت عثمانیہ کے عروج و زوال کی مفصل تاریخ، اور جمہوریہ ترکیہ کے کارناموں کی تفصیل، جلد اول بانی سلطنت عثمانیہ عثمان اول ۱۲۹۹ء سے مصطفیٰ رابع ۱۸۰۸ء تک جلد دوم۔ محمود ثانی ۱۲۲۳ھ سے تا جنگ عظیم ۱۳۳۱ھ ۱۹۱۹ء تک کی تاریخ، ان ہی دونوں جلدوں میں اس سلطنت کی پوری تاریخ آگئی ہے، جس سے صدیوں تک ہندوستان کے مسلمانوں کا بڑا تعلق رہا ہے، اور وہ اس کی مصیبتوں میں برابر دامے، درمے، قدمے مدد بھی کرتے رہے۔

از۔ ڈاکٹر محمد عزیز ایم، اے، ایل، بی، پی، ایچ ڈی، سابق رفیق دارالمصنفین۔

قیمت۔ علی الترتیب ۳۰، ۲۰ روپیے

مکتوبِ مدینۂ منوّرہ

محمد علی اکاڈمی، مدینہ منورہ،

۴ ذی الحجہ سنہ ۱۴۰۶ھ

یا حضرت المکرم ذوالجود والکرم:- السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میں ایک سفر پر تھا، واپس آیا، تو گرامی نامہ نظر افروز ہوا، میرے لیے فخر و ناز کی بات ہے، کہ ایک چھوٹی سی نیکی آپ کے ہاں اتنی عظیم بن گئی، بے شک مدینہ کا ذرہ ذرہ عظیم ہے، کاش ہمیں قدر دانی نصیب ہو، مکتوب گرامی اس وقت سامنے نہیں ہے، بہت دن سے ارادہ کر رہا تھا، جواب نہیں لکھ سکا، اس وقت مسجد میں بین المغرب والعشاء، وقت مل گیا غنیمت سمجھا کہ دو سطریں ہی لکھ دوں، آپ تو انتظار کرتے کرتے کبھی کے مایوس ہوگئے ہوں گے۔

آپ کو تعجب ہوگا کہ میں سنہ ۲۶ء میں معارف کا خریدار ہوا تھا جی چاہتا ہے، کہ ساٹھ برس کے بعد سنہ ۸۶ء میں بھی خریدار ہو جاؤں یہ آپ کے معارف کی تاریخ میں بھی شاید انوکھی بات ہوگی، مگر میں چاہتا ضرور ہوں، قیمت کس طرح روانہ کروں، ؟ والسلام

میری پیدائش اکتوبر سنہ ۱۲ء کی ہے، اکتوبر ۲۵ء میں ۱۳ سال کا ہوا، سنہ ۲۶ء میں چودھواں شروع ہوا تھا، ابا جان قدس سرہ خوش نویس تھے ہی مجھے کتابت پر ڈالا سنہ ۲۵ء کے آخر میں ہم کاتب ہوگئے، جو پہلا کام کیا اس کی اجرت چھ روپیے ملی، رسائل و جرائد کا بہت شوق تھا، دن رات یہی مشغلہ تھا، ابا جان نے بھی یہ شوق دیکھ کر ہماری اس پہلی

مزدوری سے رسالہ معارف جاری کرادیا۔

عید کا دن تھا، صبح کا وقت ڈاک آئی تھی، میں اخبارات دیکھنے میں مشغول تھا، بلکہ منہمک تھا، میرے کتابت کے استاد اللہ بخشے منشی علی حسن تاب نہ لاسکے فرمایا یہ کیسا بچہ ہے، عید کا دن ہے اور یہ اخباروں میں پڑا ہوا ہے، استاذ گرامی مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ العالی نے اور زیادہ غصہ سے فرمایا، یہ بچہ نہیں بابا آدم ہے، (یہ سب اخبار مدینہ بجنور کے دفتر کی باتیں ہیں)

یہ معارف ہمارے یہاں کیوں جاری ہوا، حضرت والد صاحب قدس سرہ مولانا شبلیؒ کے قلم کے قائل تھے، الفاروق سبقاً سبقاً پڑھائی تھی، پھر سیرۃ النبیؐ شروع کرائی، مولانا شبلیؒ کے بعد سید صاحبؒ ہی ان کے جانشین تھے، وہ چاہتے تھے کہ میں ان کے قلم کو اپناؤں، یوں اس زمانہ میں ہمایوں (لاہور) ایک اچھا سنجیدہ رسالہ تھا، الناظر بھی تھا، زمانہ بھی تھا، مگر ان کے نزدیک سب سے مرجح معارف ہی تھا۔

الشئی بالشئی یذکر، ہم اپنی کتابت کے ساتھ جامعہ ملیہ میں داخل ہوئے، فیس کا ایک حصہ اس کی اجرت سے ادا ہوتا تھا، مولائے کل مولائے تحریک خلافت مولانا محمد علیؒ کی خدمت میں ڈاکٹر ذاکر صاحب نے پیش کیا، دو باتیں فرمائیں۔

۱۔ یہ مراد آباد کے رہنے والے ہیں۔

۲۔ اپنی فیس اپنی مزدوری سے ادا کرتے ہیں۔

دوسری بات پر تو کچھ نہیں فرمایا، پہلی پر یہ کہہ کر چمٹا لیا، یہ تو میرا ہم وطن ہے، مگر جب خود شوکت صاحب سے تعارف کرایا تو یہ فرماتے ہوئے۔

یہ جامعہ میں سلف ہیلپ (self help) کی مثال ہے، اور پھر شاید اسی بنا پر اپنی خط کتابت کے لیے میرا انتخاب فرمایا خاص طور پر، بمبئی میں تو وہاں ذاکر صاحب سے فرمایا

میرے لیے ذاکر صاحب نے میرے نہایت محبوب استاد سعید انصاری صاحب کو لکھا کہ عبدالملک کو تعطیلات میں، (جون، جولائی) گھر نہ جانے دو، مولانا اس کو چاہتے ہیں، وہ اپنے والد کی اجازت منگا لے، مگر یہی جون جولائی مولانا محمد علیؒ کی بیماری کی شدت کا زمانہ ہے، جب وہ شملہ تشریف لے گئے، یوں عملی طور پر ایک سطر لکھنے کا بھی شرف حاصل نہیں ہوا۔

مگر میں بفضلہٖ تعالیٰ واحد شخص تھا، جو اس وقت ان سے قریب قریباً مولانا سے چھوٹ چکی تھی، ذاکر صاحب کا اخلاقی کمال تھا کہ وہ پھر بھی پوری نیازمندی کے ساتھ حاضری دیتے تھے، اگرچہ مولانا کو ایک دفعہ لکھنا پڑا "ذاکر! کیا تم بھی میری طرف سے بدگمان ہو"

واحد شخص ہونے کی بنا پر ہی میں اپنے آپ کو "مولانا کا آخری آدمی" کہا کرتا ہوں، اگست ۱۹۲۹ء سے لے کر ۱۵ رمئی ۱۹۳۰ء تک کا زمانہ صرف میرا زمانہ ہے، اس زمانہ کے حالات میرے سوا کوئی نہیں جانتا، الا ماشاء اللہ۔

میں ذاکر صاحب کی سیاسی روش سے راضی نہیں تھا، ایک موقع پر لکھ دیا "جامعہ والوں پر سیاست کا بھوت جب سوار ہوتا ہے تو مذہبیت پیچھے رہ جاتی ہے"، ذاکر صاحب کو خبر ہوئی، بنفس نفیس بورڈنگ تشریف لائے، مجھے باہر بلایا، اور سڑک پر ٹہلتے ہوئے فرمایا "تم تو یہ کہتے ہو، اور میں روتا ہوں کہ یہاں مذہب ہے نہ سیاست"!

جامعہ میں اپوزیشن صرف میری ذات سے ہی تھی، گاندھی جی کی نمک سازی کی مارچنگ پر جلسہ ہوا، مجھے خبر نہیں تھی، تلاش کر کے بلوایا گیا، تقریر کرائی گئی، اور پھر ذاکر صاحب نے اس کا جواب دیا، اس کا ایک فقرہ یہ بھی تھا "انگریز کا جانا تو اب طے ہو گیا ہے، مسلمان نہیں چاہتے تو ان کی ٹانگیں پکڑ کر لٹک جائیں"، میں ایک دن مولانا کے پاس ایسے وقت پہنچا، کہ ذاکر صاحب بھی وہاں موجود تھے، مولانا سے فرمایا، یہ ملک کی سیاست میں ایک الگ نظریہ رکھتے ہیں،

سے کسی وقت ان سے گفتگو فرمائیں، مولانا نے فرمایا ہاں ہاں میں ضرور باتیں کروں گا، مولانا پر میرا حال خوب روشن تھا،

حکایت کتنی دراز ہوگئی، لذیذ بود، والی بات ہے۔ خط کتابت والی بات تو اب ختم ہوگئی تھی کہ گھر میں بی گلنار کی شادی کی وجہ سے ٹھہرا رہا، ہمارے ہی ہوسٹل میں اس کا نظم تھا" لڑکے سب جا چکے تھے، ہوسٹل سارا خالی تھا، وہاں زاہد علی صاحب سے ملایا، فرمایا "یہ ہماری شادی کے منتظم ہیں" یہ بڑے لوگ کیا ہوتے ہیں، کس طرح چھوٹوں کو بڑا بناتے ہیں، حالانکہ میرا انتظام سے کوئی تعلق نہیں تھا، اور نہ ہو سکتا تھا، کیا پدی کیا پدی کا شوربہ، برائے نام بھی تو تعلق نہیں تھا، مگر یہ اعزاز ملنا تھا ملا۔

ڈاکٹر انصاری سمدھی بن کر آئے تھے، شعیب صاحب کو دولہا بنا کر لائے تھے، قلاقند کی پلیٹیں سچی چینی کی تقسیم کی گئی تھیں، اسی دن ایک قصہ بھی پیش آگیا تھا، مگر قصے کہاں تک بیان کروں، یہ تو الف لیلہ بن جائے گی۔

انصاری صاحب کو مولانا سے بے حد محبت تھی۔ حد سے زیادہ راہ جدا ہوگئی تھی مجبور تھے، محبت کا اظہار کب ہوا، مولانا کی وفات، نہیں بلکہ شوکت صاحب کی واپسی پر (تدفین بیت المقدس میں) کے بعد، جامع مسجد میں جلسہ ہوا، ڈاکٹر صاحب کو آنا ہی تھا، اللہ اللہ وہ جب مسجد میں داخل ہوئے ہیں، میں نے کسی آدمی کو اس طرح دھاڑیں مار مار کر روتے نہیں دیکھا، جس طرح وہ دھاڑیں مار رہے تھے، لوگوں نے دونوں جانب سے بہ مشکل ان کو پکڑ رکھا تھا، پھر اس کے بعد شوکت صاحب سے مل کر ان کا رونا۔

میں ایک قلمی رسالہ نکالا کرتا تھا، اس کا محمد علی نمبر نکالنے کا ارادہ کیا، ڈاکٹر صاحب سے مضمون کی درخواست کی، زخم تازہ ہوگیا، کہنے لگے "مجھے بڑا رنج ہے، جامعہ والوں نے

محمد علی کو بڑی جلدی بھلا دیا ، بھلانا کیا ، انھوں نے یاد رکھنے کا ارادہ بھی کب کیا تھا ، سیرت محمد علی (از استاذی رئیس احمد جعفری) کی بھی ایک حکایت ہے ، یہ دفع الوقتی کے لیے تیار کی گئی تھی ، اصلی پلان یہ تھا ، کہ بہت ضخیم کتاب لکھی ہے ، اس کے ابواب تقسیم ہوئے تھے ،

(۱) شعیب قریشی (۲) عبد الرحمٰن صدیقی (۳) ڈاکٹر انصاری (۴) ذاکر حسین (۵) مولانا شوکت علی (۶) مولانا دریابادی ، یہ قاضی عبد الغفار وغیرہم پر ،

پھر یکایک خیال بدل گیا ۔ مجھے خبر ہوئی ، روتا ہوا ذاکر صاحب کے پاس گیا ۔ یہ آپ نے کیا کیا ، کیوں ملتوی کر دیا ۔ فرمایا ۔

مولانا پر صحیح اور سچی بات لکھنی ہے ، تو وہ ۲۵ برس سے پہلے نہیں لکھی جا سکتی جب تک ان کے معاصرین زندہ ہیں ، زبان بند رکھنی پڑے گی ، اس کے بعد کتاب کا وقت آئے گا ۔

میں نے کہا تو اس وقت تک اس کے چاہنے والے بھی ختم ہو جائیں گے ۔ اور جذبات بھی ختم ہو جائیں گے ، سو ایسا ہی ہوا ۔

خط تو مسجد میں لکھا جا چکا تھا ، اب تین دن میں اس کا حاشیہ ہوا ہے ۔

محمد عبد الملک

مطبوعاتِ جدیدہ

تذکرہ صوفیائے میوات: مرتبہ مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں میواتی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۰۰، مجلد، قیمت ایک سو پچاس (۱۵۰) روپے، پتہ میوات اکیڈمی، متصل جامع مسجد، گھاسیڑہ، ضلع گوڑگانوں، میوات۔

یہ میوات کے ان صوفیائے کرام کا تذکرہ ہے جن کے فیضان اور نفس گرم سے میو قوم کی خاکستر میں ایمانی حرارت کی چنگاریاں دبی ہوئی ہیں، اور ایک ہزار برس سے یہ علاقہ نور ایمان سے جگمگا رہا ہے، اس کے شروع میں مصنف کے قلم سے ایک مقدمہ ہے، اس میں میو قوم کی قدامت و عظمت، اس کی موجودہ پسماندگی و زبوں حالی اور اس کا تاریخی و جغرافیائی پس منظر بیان کیا ہے۔ میو قوم کے نسب، وسط ایشیا سے اس کے ہندوستان آکر مختلف جگہوں میں آباد ہونے، اسکی نمایاں خصوصیات اور میوات کے امتیازات وغیرہ کا تذکرہ ہے، پھر میو قوم کے قبول اسلام کی عہد بعہد سرگذشت بیان کی گئی ہے، جس سے اُن لوگوں کے مجاہدانہ کارناموں اور دعوتی و تبلیغی سرگرمیوں کا حال بھی معلوم ہوتا ہے، جن کی بدولت یہاں اسلام کی اشاعت ہوئی، اور یہ علاقہ مسلمانوں کے زیر نگیں آیا، اس کے بعد مصنف نے ان سرچشموں اور رشد و ہدایت کے مرکزوں کا ذکر کیا ہے، جن کی وجہ سے ان کے خیال میں اسلام کی حفاظت و پاسبانی ہوئی اور یہاں اسلام کا چراغ گل نہ ہونے پایا، انھوں نے اسلام کے تحفظ و بقا کے ضامن مرکزوں میں پہلے مدارس و خانقاہوں کا ذکر کیا ہے، اس سلسلہ میں یہاں ان مدارس اور خانقاہوں

بارہ میں معلومات تحریر کئے ہیں، وہاں ان مقامات کے بارہ میں بھی مفید باتیں قلمبند کی ہیں، جن میں مدارس اور خانقاہیں قائم تھیں، اور آخر میں ان صوفیہ ومشائخ اور علماء وفقہا کے حالات اور کارنامے بیان کیے ہیں، جن کی اصلاحی، دعوتی اور دینی سرگرمیوں کا یہ علاقہ محور رہا اس سلسلہ کا آغاز حضرت پیر زطنؒ اور حضرت سید سالار مسعود غازیؒ وغیرہ کے تذکرہ سے ہوا ہے، پھر تصوف کے سلاسل چشتیہ، مداریہ، قادریہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ کے ان عارفین کا تذکرہ ہے جن سے میو قوم کو فیض پہنچا، ایک حصہ میوات کے علماء وفقہا کے ذکر کے لیے مخصوص ہے، اس میں ان کے حالات اور فقہی وعلمی خدمات درج ہیں، یہ کتاب محنت وجستجو سے مرتب کی گئی ہے، ابھی تک اس موضوع پر اتنی وسعت سے نہیں لکھا گیا تھا، اور یہ صرف میوات کے صوفیائے کرام ہی کا تذکرہ نہیں ہے، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے، بلکہ میو قوم اور میوات کی مختصر تاریخ اور یہاں کے مدارس اور خانقاہوں کا اجمالی خاکہ بھی ہے، مصنف نے اس کا دائرہ وسیع کر دیا ہے، اور اس میں خاص میوات اور میو قوم ہی کے مدارس، خانقاہوں اور صوفیہ کرام کے ذکر پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ اُن سب کا ذکر بھی کیا ہے جن سے میو قوم کے لوگوں کو فیوض پہنچے مگر ہر تذکرہ میں اہل میوات یا میو قوم سے صاحب تذکرہ کے تعلق اور ربط وغیرہ کی صراحت بھی کرنے کی ضرورت تھی، کہیں کہیں طوالت و تکرار بھی ہے، مثلاً خانقاہوں اور تصوف کی اہمیت اور ان کے مخالفین کی تردید متعدد جگہ کی گئی ہے جو غیر ضروری ہے، ایک جگہ بہرائچ کو ضلع سلطان پور کا حصہ لکھا ہے، (صفحہ ۱۸۰) بہرائچ تو خود ضلع ہے، کہیں کہیں کتابت وطباعت کی غلطیاں بھی ہیں، جیسے خانقاہ کا املا خانقہ (۳۳) مذاق کا مزاق (۳۸۳) لکھا ہے، ایک جگہ نعت کو ذکر لکھا ہے، (۶۰)

جدید میڈیکل مسائل فقہ اسلامی کی روشنی میں | از مولانا برہان الدین سنبھلی، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۷۰، قیمت آٹھ روپے، پتے (۱) مجلس تحقیقات اسلامی، متصل مسجد جامع شاہ سعید آباد، حیدرآباد (۲) مکتبہ امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ، بہار (۳) مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ،

مولانا برہان الدین سنبھلی استاذ تفسیر وحدیث وناظم مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء نے موجودہ زمانہ کے مسائل کو اپنے غور وفکر کا موضوع بنایا ہے، اور وہ ان کا اسلامی حل تلاش کرنے کے لیے فکر مند بھی رہتے ہیں، ان کی اسلامی فقہ پر اچھی نظر ہے، اور وہ فقہی مسائل پر برابر مضامین لکھتے ہیں، مجلس تحقیقات اسلامی حیدرآباد نے اس نوعیت کے ان کے مضامین کا یہ مجموعہ شائع کیا ہے، جس میں مندرجۂ ذیل نئے مسائل پر اسلامی شریعت کی روشنی میں بحث وگفتگو کی گئی ہے، ضبط تولید اور اس کے مختلف رائج طریقے، ٹسٹ ٹیوب سے تولید، اعضا کی پیوند کاری، پوسٹ مارٹم، دوا کے طور پر حرام چیزوں کا استعمال، انسانی خون اور انسانی دودھ کی خرید وفروخت، لاعلاج مریضوں کے لیے مہلک ادویہ، الکوحل کی مخلوط ادویہ، جانوروں کے جسم پر میڈیکل تجربات، پلاسٹک سرجری وغیرہ، فاضل مصنف نے ان مسائل کا تجزیہ وتنقیح کرکے ان کا واضح حکم بیان کیا ہے، گو بعض امور میں اس دور کے دوسرے فضلا کی رائیں ان کی رائے سے مختلف ہیں، نیز ناشر کے بقول "حالات وضروریات کے اقتضا سے بعض مسائل میں مزید توسع سے کام لینا چاہیے تھا" تاہم مولانا نے ہر مسئلہ پر محقق ومدلل بحث کی ہے، اس لیے ان کی رائے میں بھی وزن واعتدال ہے، اس مجموعہ سے ان لوگوں کو بڑی مدد ملے گی جو ان مسائل پر غور وفکر کرتے ہیں۔

ذکر رسول / مردوں کی مسیحائی از مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم، مرتبہ جناب حکیم عبدالقوی صاحب دریابادی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۶۶، مجلد مع حسین گردپوش، قیمت ۲۰ روپے، ناشر ادارۂ انشائے ماجدی، ۴/۱۰ رابندر سرانی کلکتہ ۱۳

مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کے مضامین کا ایک مجموعہ سیرت واسوۂ رسولؐ کے موضوع پر "مردوں کی مسیحائی" کے نام سے بہت عرصہ قبل چھپا تھا، اب یہ دوبارہ کسی قدر ردوبدل کے بعد نئی سج دھج میں نہایت خوبصورت وخوشنما ایک اور نام "ذکر رسولؐ" کے اضافہ کے ساتھ شائع ہوا ہے، پرانے اڈیشن کے مضامین مولانا کے جریدہ "سچ" سے منقول تھے، نئے اڈیشن میں طبع اول کے

چند مضامین جو براہ راست سیرت کے موضوع پر نہ تھے، حذف کر دیئے گئے ہیں، اور ان کے بجائے چار ریڈیائی تقریریں "صدق جدید" سے شامل کی گئی ہیں، یہ مجموعہ کل سترہ مضامین پر مشتمل ہے، ان مضامین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے دنیا کی بھیانک حالت، عربوں کی ضلالت و گمراہی، راہ حق میں آپ کی صعوبتوں، آپ کی یتیمی، عسرت و فقر اور آپ کی تعلیم و ہدایت کے انقلاب انگیز اثر سے دنیا کی کایا پلٹ ہونے کا ذکر ہے، مصنف نے آپ کی عظمت و برتری، کامیابی و کامرانی اور آپ کے مخالفین کی ذلت و رسوائی اور ہلاکت و تباہی بھی دکھائی ہے، اور نوع انسانی پر آپ کے احسانات، یتیموں کی سرپرستی اور غریبوں اور محیدوروں سے ہمدردی و مواسات کا تذکرہ بھی کیا ہے، بعض مضامین استفسارات کے جواب میں لکھے گئے تھے، "حبّ محبوب" اسی نوعیت کا مضمون ہے جو دراصل سورۂ عبس کی ابتدائی آیات کی نرالی تفسیر ہے، ایک اور مضمون "ورفعنا لک ذکرک" کی تفسیر ہے، اس میں ذکر رسول کی بلندی اور آپ کے آوازۂ شہرت کے بعض پہلوؤں کا عجیب دلچسپ انداز میں ذکر ہے، ایک مضمون میں سیرت نبوی کو مستشرقین کے تلبیسات و تحریفات کا ہدف بنانے کا ذکر ہے، اس طرح یہ مجموعہ خلق محمدی کا جوہر اور اسوۂ رسول کا عطر ہے، جس میں مولانا کے جادو نگار قلم اور ان کی انشا کے بانکپن نے چار چاند لگا دیا ہے، شروع میں مولانا کی کیف و اثر میں ڈوبی ہوئی نعت نور علیٰ نور کی مصداق ہے، مولانا کی تحریروں کے عاشق اور ان کے ادب و انشا کے شیدائی جناب منظور علی صاحب لکھنوی نے اسے صوری حیثیت سے اس قدر دلکش شائع کر کے اپنے عمدہ سلیقہ اور نہایت خوش مذاقی کا ثبوت دیا ہے۔

فیضانِ محبت:۔ مرتبہ مولانا قمر الزماں صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۰۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت تیئیس روپیے۔ پتہ مکتبہ دار المعارف ۲/۴۰۴، بخشی بازار الہ آباد۔

مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی کی ذات علم و عمل اور شریعت و طریقت کی جامع اور

مولانا برہان الدین سنبھلی استاذ تفسیر و حدیث و ناظم مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء نے موجودہ زمانہ کے مسائل کو اپنے غور و فکر کا موضوع بنایا ہے، اور وہ ان کا اسلامی حل تلاش کرنے کے لیے فکرمند بھی رہتے ہیں، ان کی اسلامی فقہ پر اچھی نظر ہے، اور وہ فقہی مسائل پر برابر مضامین لکھتے ہیں، مجلس تحقیقات اسلامی حیدرآباد نے اس نوعیت کے ان کے مضامین کا یہ مجموعہ شائع کیا ہے، جس میں مندرجۂ ذیل نئے مسائل پر اسلامی شریعت کی روشنی میں بحث و گفتگو کی گئی ہے، ضبط تولید اور اس کے مختلف رائج طریقے، ٹسٹ ٹیوب سے تولید، اعضا کی پیوندکاری، پوسٹ مارٹم، دوا کے طور پر حرام چیزوں کا استعمال، انسانی خون اور انسانی دودھ کی خرید و فروخت، لاعلاج مریضوں کے لیے مہلک ادویہ، الکوحل کی مخلوط ادویہ، جانوروں کے جسم پر میڈیکل تجربات، پلاسٹک سرجری وغیرہ، فاضل مصنف نے ان مسائل کا تجزیہ و تنقیح کرکے ان کا واضح حکم بیان کیا ہے، گو بعض امور میں اس دور کے دوسرے فضلا کی رائیں ان کی رائے سے مختلف ہیں، نیز ناشر کے بقول "حالات و ضروریات کے اقتضا سے بعض مسائل میں مزید توسع سے کام لینا چاہیے تھا" تاہم مولانا نے ہر مسئلہ پر محققانہ و مدلل بحث کی ہے، اس لیے ان کی رائے میں بھی وزن و اعتدال ہے، اس مجموعہ سے ان لوگوں کو بڑی مدد ملے گی جو ان مسائل پر غور و فکر کرتے ہیں۔

ذکر رسول
مردوں کی مسیحائی } از مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم، مرتبہ جناب حکیم عبدالقوی صاحب دریابادی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۹۶، مجلد مع حسین گردپوش، قیمت ۲۰ روپے، ناشر ادارۂ انشائے ماجدی، ۱۴۰، رابندر سرانی کلکتہ ۲۳۔

مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کے مضامین کا ایک مجموعہ سیرت و اسوۂ رسولؐ کے موضوع پر "مردوں کی مسیحائی" کے نام سے بہت عرصہ قبل چھپا تھا، اب یہ دوبارہ کسی قدر رد و بدل کے بعد نئی سج دھج میں نہایت خوبصورت و خوشنما ایک اور نام "ذکر رسول" کے اضافہ کے ساتھ شائع ہوا ہے، پرانے اڈیشن کے مضامین مولانا کے جریدہ "سچ" سے منقول تھے، نئے اڈیشن میں طبع اول کے

چار مضامین جو براہ راست سیرت کے موضوع پر نہ تھے، حذف کر دیئے گئے ہیں، اور ان کے بجائے چار ریڈیائی تقریریں "صدق جدید" سے شامل کی گئی ہیں، یہ مجموعہ کل سترہ مضامین پر مشتمل ہے، ان مضامین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے دنیا کی بھیانک حالت، قوموں کی ضلالت و گمراہی، راہ حق میں آپ کی صعوبتوں، آپ کی یتیمی، عسرت وفقر اور آپ کی تعلیم و ہدایت کے انقلاب انگیز اثر سے دنیا کی کایا پلٹ ہونے کا ذکر ہے، مصنف نے آپ کی عظمت و برتری کامیابی و کامرانی اور آپ کے مخالفین کی ذلت و رسوائی اور ہلاکت و تباہی بھی دکھائی ہے، اور نوع انسانی پر آپ کے احسانات، یتیموں کی سرپرستی اور غریبوں اور مجبوروں سے ہمدردی و مواسات کا تذکرہ بھی کیا ہے، بعض مضامین استفسارات کے جواب میں لکھے گئے تھے، "عتاب محبوب" اسی نوعیت کا مضمون ہے جو دراصل سورۂ عبس کی ابتدائی آیات کی نرالی تفسیر ہے، ایک اور مضمون "ورفعنا لک ذکرک" کی تفسیر ہے، اس میں ذکر رسول کی بلندی اور آپ کے آوازۂ شہرت کے بعض پہلوؤں کا عجیب دلچسپ انداز میں ذکر ہے، ایک مضمون میں سیرت نبوی کو مستشرقین کے تلبیسات و تحریفات کا ہدف بنانے کا ذکر ہے، اس طرح یہ مجموعہ خلق محمدی کا جوہر اور اسوۂ رسول کا عطر ہے، جس میں مولانا کے جادو نگار قلم اور ان کی انشا کے بانکپن نے چار چاند لگا دیا ہے، شروع میں مولانا کی کیف و اثر میں ڈوبی ہوئی نعت نور علی نور کی مصداق ہے، مولانا کی تحریروں کے عاشق اور ان کے ادب و انشا کے شیدائی جناب منظور علی صاحب لکھنوی نے اسے صوری حیثیت سے اس قدر دلکش شائع کرکے اپنے عمدہ سلیقہ اور نہایت خوش مذاقی کا ثبوت دیا ہے۔

فیضانِ محبت:- مرتبہ مولانا قمر الزماں صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۰۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت تین روپیہ ۲۵ پیسے۔ پتہ مکتبہ دار المعارف ۲۰۶ بخشی بازار الہ آباد۔

مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی کی ذات علم و عمل اور شریعت و طریقت کی جامع اور

ورکھنے سنداں عشق کا نمونہ ہے، اللہ تعالیٰ نے انھیں شعر و سخن کا خاص ملکہ عطا فرمایا ہے، اس کے پردہ میں وہ مشاہدۂ حق کی گفتگو کرتے ہیں، اس لیے ان کی شاعری ان کے قلبی واردات و باطنی کیفیات کا مرقع، حقیقت و معرفت کے رازہائے سربستہ کی ترجمان، عشق و محبت کے حقائق سے معمور اور جنون و سرمستی کے جذبات سے لبریز ہوتی ہے، دراصل یہ ساز لاہوتی اور ترانۂ ربانی طالبین و سالکین کے لیے ایک ایسا دستور عمل ہے، جس میں سلوک و عرفان کے ہر کوچہ و مرحلہ کے آثار و نشانات موجود ہیں، اس لئے اس کی شرح و تفسیر کی ضرورت تھی، مگر ذوقی و وجدانی حقائق اور ان کے اسرار و کیفیات کی شرح و تعبیر آسان نہیں، مولانا قمر الزماں صاحب اس کوچہ کے ماہر ہیں، انکی توجہ و محنت نے "عرفان محبت" کو فیضان محبت کی صورت دیکر جلوہ گاہ عام کر دیا ہے، انھوں نے مولانا کے منتخب عارفانہ کلام کو مختلف عنوانات کے تحت درج کر کے ان کی دلنشیں تشریح کی ہے اور جا بجا مزید وضاحت کیلئے دوسرے عارفین خصوصاً نکتہ دان روم کے اشعار بھی پیش کئے ہیں جس سے لطف دوبالا ہو گیا ہے

پورنیہ پر فوجداروں کی حکومت: ۔ مرتبہ جناب اکمل یزدانی جامعی صاحب متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر صفحات ۹۴، قیمت۔ درج نہیں، ملنے کا پتہ (۱) جنرل پرنٹنگ پریس لائن گنج پورنیہ۔ بہار۔ (۲) سلیمان لائبریری، بہادر گنج، پورنیہ۔ بہار (۳) محمد فرید بک سیلر کانکی مغربی دیناج پور بنگال

پورنیہ صوبۂ بہار کا قدیم ضلع ہے جو پہلے طول و عرض کے لحاظ سے موجودہ ضلع سے کافی بڑا تھا خلجیوں کے زمانہ میں یہ علاقہ مسلمانوں کے زیر نگیں آیا اور مغلوں کے دور میں یہاں مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت قائم ہوئی، سترہویں صدی عیسوی کے آخر سے یہاں کے حکام فوجدار کہلاتے تھے جو برائے نام صوبہ داران بنگالہ کے ماتحت ہوتے تھے، انکی حکومت انگریزوں کے دور حکومت سے پہلے تک رہی، اس کتاب میں پورنیہ کے انہی فوجداروں کے دور کا حال بیان کیا گیا ہے، یہ دو حصوں میں ہے، پہلے حصہ میں فوجداروں کے مختصر حالات، سیاسی خدمات اور فوجی کارنامے بیان کیے گئے ہیں، اور دوسرے باب میں محلات اور مضافات کے اعتبار سے پورنیہ کی تقسیم کا ذکر کرنے کے بعد اسکی مشہور مسجدوں، مندروں، مقبروں، اہم عمارتوں، سڑکوں اور پلوں وغیرہ کا تذکرہ ہے، پھر مرکزی مقامات اور معروف بازاروں کا ذکر ہے، ایک حصہ میں پورنیہ کی آمدنی، مالگزاری، زمینی پیداوار اور اس زمانہ کی مشہور صنعتوں کا ذکر ہے، ہندوؤں و مسلمانوں کے اعلیٰ، متوسط اور ادنیٰ طبقوں کے مردوں اور عورتوں کے لباس اور پوشاک کا تذکرہ ہے، اسی باب میں فوجداروں کی علم و ادب نوازی کے ضمن میں پورنیہ میں فارسی و اردو کے رواج، دونوں زبانوں کی کچھ تصنیفات و مخطوطات اور اہم شعرا کا ذکر بھی آگیا ہے، آخر میں فوجداروں کے غیر مسلموں سے اچھے برتاؤ کا جائزہ لیا گیا ہے، اور انکے دور میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے خوشگوار تعلقات کی مثالیں پیش کی گئی ہیں، یہ کتاب محنت سے لکھی گئی اور مفید ہے۔

"ض"

سلسلۂ مذہبی رواداری

تاریخ ہند کا سلسلہ اب تک اٹھائیس کتابوں تک پہنچ چکا ہے، اسی ضمن میں ہندوستان کے مسلما
رانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ ہے، جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔

جلد اوّل اس میں مغل دور سے پہلے کے مختلف خاندانوں کے مسلمان حکمرانوں مثلاً محمد بن قاسم، محمود غزنوی
ہاب الدین غوری، علاء الدین خلجی، محمد بن تغلق وغیرہ کی مذہبی رواداری وفراخدلی کے واقعات پیش کئے گئے ہیں، قیمت [illegible]

لد دوم۔ اس میں مغل فرماں روا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے حکمراں، شیر شاہ، اسلام شاہ، پھر مغل
نشاہ اکبر، جہانگیر، شاہجہاں کی مذہبی رواداری وغیرہ کے دلچسپ واقعات قلمبند کئے گئے ہیں، قیمت [illegible]

د سوم ہندوستان کے مغل عہد کے مشہور مورخ سر جدو ناتھ سرکار کی کتاب کا جواب خود ان کی
ابوں کے حوالوں سے اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر اور اس کے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی
اداری وغیرہ کی تفصیلات آگئی ہیں، مولانا شبلی کی مضامین عالمگیر، اور مولانا سید نجیب اشرف صاحب ندوی
رحوم کی مقدمۂ رقعات عالمگیر کے بعد اورنگ زیب عالمگیر پر دوسری اہم اور پر از معلومات کتاب جس میں
ں کے پورے پچاس سالہ عہد حکومت وفرمانروائی کی پوری تاریخ آگئی ہے، قیمت: ۲۵ روپے،

سلام کی مذہبی رواداری۔ اس میں مستند حوالوں سے مذہبی رواداری، غیر مسلم رعایا کے ساتھ سلوک
ر ذمیوں کے حقوق کے متعلق مذہب اسلام کی تعلیمات اور ان پر مسلمانوں کے عمل کو پیش کیا گیا ہے، (زیر طبع)

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

[illegible] نومبر [illegible]

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

قیمت تین روپئے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

مجلس ادارت

۱۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی　　۲۔ ڈاکٹر نذیر احمد مسلم گڑھ

۳۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی　　۴۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن

برید فرنگ

۱۹۲۰ء میں علامہ سید سلیمان ندوی نے مولانا محمد علی وغیرہ کے ساتھ وفد خلافت کے ایک رکن اور خصوصاً علمائے ہند کی نمائندگی کی حیثیت سے مسئلۂ خلافت پر اس دور کے ارباب حکومت سے گفتگو کرنے اور ترکوں کے حق میں ... کے لئے لندن کا سفر کیا تھا، اسی ضمن میں وہ فرانس اٹلی وغیرہ بھی تشریف لے گئے، ان تمام مقامات سے ہندوستان کے جن بزرگوں، دوستوں، اور عزیزوں کو انھوں نے جو خطوط لکھے تھے، وہ اس میں جمع کر دیئے گئے ہیں، اس کا پہلا اڈیشن خود سید صاحب کی زندگی میں ان کے پیش لفظ کے ساتھ ان کے اشاعتی ادارہ مکتبۃ الشرق کراچی سے شائع ہوا تھا، ایک عرصہ کے بعد بمبئی سے اس کا دوسرا اڈیشن مولانا فضل ربی ندوی نے شائع کیا، اسی دوسرے اڈیشن کا عکسی اڈیشن دارالمصنفین نے اپنے مطبع معارف میں چھپوا کر شائع کیا ہے،

اس میں اس دور کی پوری دنیائے اسلام کے سیاسی و اجتماعی حالات مسلمانوں کے سیاسی مسائل اور ہر اسلامی ملک کے مسلمانوں اور مشاہیر کی دلچسپ ملاقاتوں کی تفصیل بھی آگئی ہے، اس دور کی اسلامی سیاست کو سمجھنے کے لئے اس کا مطالعہ بہت ضروری ہے،

قیمت :- ۱۸ روپے

جلد ۱۳۸ ماہ ربیع الاول ۱۴۰۷ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۸۶ء عدد ۵

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

شذرات

آہ! مولانا محمد عمران خان ندوی الازہری

۲۲ر اکتوبر ۱۹۸۶ء کو یکایک خبر ملی کہ مولانا حافظ محمد عمران خان ندوی ازہری اپنے خاندان والوں کو دل فگار اور اپنے جاننے والوں کو دل گیر چھوڑ کر تہتر سال کی عمر میں اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو سدھارے، اس خبر سے جسم و دماغ پر ایک بجلی گر پڑی۔

ان کی موت ایک خاص قسم کی قوت عمل، عزم، ارادہ، خوش انتظامی، خوش سلیقگی، خوش فکری، اور خوش وضعی کی موت ہے، وہ اپنے پیچھے ایک درس چھوڑ گئے کہ عمل پیہم اور یقین محکم سے کس طرح اہم اور بڑے سے بڑا کام انجام دیا جاسکتا ہے، بے سروسامانی میں کیسے کیسے ساز و سامان پیدا کیے جاسکتے ہیں، یاس کے عالم میں مخلص کارکنوں کی جماعت کی تنظیم کیسے کی جاسکتی ہے، اور ناداری کے عالم میں بھی وہ کام انجام دیا جاسکتا ہے جو بڑی دولت کے ذریعہ سے نہیں کیا جاسکتا۔

وہ بھوپال کے رہنے والے تھے، ۱۹۴۷ء کے بعد جب بھوپال کا فرماں روا خاندان بھوپال چھوڑ کر دوسری جگہ پناہ گزین ہوگیا تھا تو مولانا عمران خان ندوی نے اپنی قوت ارادی کو بروئے کار لاکر بھوپال کے لوگوں کے دلوں پر اپنی فرماں روائی شروع کردی اور یہ نمونہ پیش کیا کہ تاج و تخت کے بغیر بھی اخلاص کی پاکیزگی، نیت کی طہارت اور عمل کی پختگی کے ساتھ فرماں روائی ہوسکتی ہے۔

انھوں نے تاج المساجد کی تعمیر جس طرح از سر نو کی اور اس کی زینت و آرایش میں جس طرح اضافہ کیا، اور پھر اس کے ذریعہ سے جو دینی حمیت اور ایمانی حرارت پیدا کی، وہ ایسا کارنامہ ہے کہ دنیا کی بڑی مسجدوں کی تعمیر کی جب تاریخ لکھی جائے گی تو ان کا نام نامی بھی اس تاریخ میں ضرور لکھا جائے گا، بڑی مسجدیں تو شاہی خزانوں اور حکومت کی مالی امداد سے بنتی رہیں، لیکن تاج المساجد کی تعمیر مولانا عمران خان ندوی کے کاسۂ گدائی سے انجام پائی، یہ اس کی مثال ہے کہ کاسۂ گدائی کو جام جمشید کس طرح بنایا جاسکتا ہے، تاج المساجد کو

بھوپال کا فرماں روا خاندان اپنے خزانہ سے نہ بنا سکا، لیکن مولانا عمران خاں نے اس کو پایۂ تکمیل تک پہونچا کر یہ مثال پیش کی کہ عمل پیہم ہو تو آسمان ہُن برسا سکتا ہے اور زمین دولت اُگل سکتی ہے، انھوں نے تاج المساجد کے اردگرد اتنی مختلف قسم کی عمارتیں بنوادی ہیں کہ یہ مسجد کے لیے شاہی خزانہ سے زیادہ مفید ثابت ہوں گی، ان عمارتوں کے کرایہ سے جو آمدنی ہوگی وہ شاید تاج المساجد کے اخراجات کے لیے کافی ہو، مرحوم کی مساعی جمیلہ سے اس مسجد کے ساتھ ایک عربی اور دینی مدرسہ بھی دارالعلوم تاج المساجد کے نام سے قائم ہے، جس کی شہرت اس وقت تمام ملک میں پھیل چکی ہے، وہ اس کے امیر جامعہ تھے، انھوں نے اپنے شفیق استاد حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی یاد میں ایک بزم سلیمانی کی بھی تاسیس کی ہے جو شاید آگے چل کر ایک اہم علمی ادارہ ہو جائے، ان ہی کی سرپرستی میں پندرہ روزہ جریدہ نشان منزل شایع ہوتا رہا جو دارالعلوم تاج المساجد کا ترجمان ہے،

دارالمصنفین سے ان کا تعلق تقریباً چھپن سال تک رہا، وہ حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے عزیز شاگرد تھے، اپنی شاگردی کا حق انھوں نے حضرت سید صاحبؒ پر ایک سمینار منعقد کرکے اور مطالعۂ سلیمانی کی دلآویز جلد شایع کرکے ادا کیا، وہ مولانا مسعود علی ندوی کے بڑے معتمد علیہ تھے، ان کے خاندان والوں سے آخر وقت تک بڑی وضعداری اور محبت سے ملتے رہے، ملازمت ندوہ کے مہتمم کی حیثیت سے شروع کی، تاج المساجد کی خاطر بھوپال چلے گئے، لیکن ندوہ کو حرز جاں بنائے رکھا اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کے ساتھ مل کر ندوہ کے تمام مسائل کو حل کرنے میں برابر کے شریک رہے، دارالمصنفین کے ہر چھوٹے بڑے جلسہ میں اس کی مجلس انتظامیہ کے رکن کی حیثیت سے برابر شرکت کرکے اس کی رہنمائی کرتے رہے۔

وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں اپنی فقیری میں امیری، اپنی بے سروسامانی میں میرسامانی اور اپنی تنگدستی میں کشادہ دستی کے لیے مشہور رہے، ان کے جسم پر لباس بہت ہی سادہ رہتا لیکن اس سادگی میں ان کی عظمت کی پرکاری نظر آتی، وہ اپنے بزرگوں کی طرح اپنی وضعداری کے لیے ہر جگہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے، وہ اپنے معاصروں اور دوستوں سے اختلاف کرتے تو اس میں بھی ان کی مروت اور شرافت اخلاق کے موتی بکھیرتے رہے،

وہ اپنے ماتحتوں کو ڈانٹتے تو ان کی ڈانٹ میں اخلاص ہوتا اور ان کی پھٹکار میں کریم النفسی چھپی رہتی، ان کے گھر میں بڑا خوش ذائقہ کھانا پکتا جس کو وہ بہت ہی خوش سلیقگی سے کھاتے اور کھلاتے، وہ منبر پر وعظ کہنے یا تقریر کرنے بیٹھتے تو اپنی بذلہ سنجیوں کے پھولوں کو سامعین پر نچھاور کرتے رہتے جس میں وہ ایمان کی شمامہ کی نکہت بیزی محسوس کرتے،

ان کی موت سے ان کا خاندان ایک شفیق باپ، دارالعلوم ندوہ ایک نامور فرزند، تاج المساجد ایک بے مثال نگہبان، تبلیغی جماعت ایک انتہائی متحرک رہنما، بھوپال ایک جلیل القدر شہری اور ملک ایک معزز شخصیت سے محروم ہو گیا، ان کی اولاد اپنے آنسوؤں کے موتیوں کی لڑیوں کے ساتھ ان کی شفقت و محبت کو یاد کرتی رہے گی، دارالعلوم ندوہ دعا گو رہے گا کہ ان کا ثانی پھر پیدا ہو جائے، تاج المساجد کے چپہ چپہ پر چشم بینا ان کا نام منقش دیکھے گی، اس مسجد میں جو سالانہ تبلیغی اجتماع ہوگا تو اس کے تمام حاضرین ان کی خوش انتظامی کو اپنی نم ناک آنکھوں سے یاد کرکے ان کے ایصال ثواب کے لیے دعائیں کرتے رہیں گے، ملک کے برادران وطن جو ان سے ملتے رہے وہ بھی ان کو اس حیثیت سے یاد کرتے رہیں گے کہ ان کے ایسا اخلاص ملک کے تمام لوگوں میں پیدا ہو جائے تو ان کی دھرتی سونے کی ہو جائے،

جانے والے جا! رخصت، الوداع! تیری تربت مغفرت الٰہی کی خوشبوؤں سے معطر رہے، تیری ابدی آرام گاہ انوار الٰہی سے منور رہے، سلام، لاکھوں سلام۔

وہ مجددی سلسلہ کے مشہور بزرگ اور کامل طریقت حضرت شاہ محمد یعقوب عرف ننھے میاں قدس سرہٗ العزیز سے بیعت ہو کر ان کے زیر تربیت بھی رہے اور ان کے بہت ہی محبوب اور چہیتے مرید اور مجاز بیعت تھے، ان ہی کی ہدایت پر تاج المساجد کے کھنڈر کی از سر نو تعمیر شروع کی، اس خانقاہ کے موجودہ سجادہ نشین حضرت شاہ سعید میاں کو بہت ہی عزیز رکھتے تھے، اور حضرت سعید میاں ان کی رحلت سے ایسے ہی مغموم اور ملول ہوں گے جیسے اپنے خاندان کے کسی شفیق بزرگ کی وفات سے ہوتے، اسی تعلق کی بنا پر مرحوم کی ابدی خوابگاہ ان کے مرشد کے پہلو میں ہے، حالانکہ ان کی ابدی نیند کی اصلی جگہ تاج المساجد کے کسی گوشہ ہی میں ہونی چاہیے تھی، مگر شاید خود ان کو اپنے مرشد کی قربت زیادہ عزیز تھی،

مرحوم کا جنازہ بڑی دھوم سے اٹھا، ان کی میت کے پیچھے بھوپال کے ایک لاکھ لوگ سوگوار اور گریہ کناں تھے، وہ بھوپال کے عاشق تھے اور اس عاشق کا جنازہ اسی دھوم سے نکلنا چاہیے تھا۔

وہ عالم بقا کو جا رہے تھے لیکن ان کی میت کی غمناک فضا ان کی طرف سے لوگوں سے یہ کہہ رہی تھی ؎

رفتم و از رفتنِ من عالمے تاریک شد ❊ من مگر شمعم چو رفتم بزم برہم ساختم

مقالات

شاخت اور حدیث نبویؐ

از:-
ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی، استاذ حدیث ملک سعود یونیورسٹی (ریاض)

ترجمہ از حافظ محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی، رفیق دار المصنفین

تمہید زمین پر انسان کا وجود، مرد و زن کے باہمی تعلقات کا رہین منت ہے، انسانی آبادی کی وسعت اور کثرت بھی اسی سے ہے، فطری طور سے ایک انسان تنہا زندگی گزار نہیں سکتا ہے، اس روئے زمین پر جب تک زندگی کی رونق رہے گی اس وقت تک فرد، خاندان محدود طبقے اور ان محدود و مختصر طبقوں سے ترتیب پائے ہوئے بڑے بڑے معاشرے قائم رہیں گے، اور یہ سب اس کرۂ ارض کی تعمیر میں اپنا اپنا کردار ادا کرتے رہیں گے، یہ اس لیے کہ انسان اپنی فطرت اور نشو و نما کے لحاظ سے معاشرتی اور اجتماعی زندگی گزارنے کی صفت سے آراستہ ہے،

معاشرہ میں انسان کو اپنی مادی حاجتوں اور روحانی خواہشوں کو پورا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، تو وہ کوشش کرتا ہے کہ جس قدر ممکن ہو، اپنے لیے خیر اور نفع کو حاصل کرے، اسی لیے افراد کے درمیان مقابلہ اور تصادم کی صورتیں بھی پیدا ہوتی ہیں، اور اس راہ میں جب انسان بے قید اور بے پناہ ہوتا ہے تو پھر انتشار کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے، اسی لیے فطری طور سے ہر معاشرہ کے لیے ایک ایسا نظام ناگزیر ہو جاتا ہے، جس میں رسوم و رواج اور قوانین و ضوابط کی کارفرمائی ہو اور

پھر ان سب عوامل کے تحت زندگی گزاری جائے، قانون کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ وہ معاشرہ کی عمدہ قدروں کی روشنی میں، افراد کی زندگی کو منظم رکھے تاکہ اجتماعی زندگی کا کارواں خوبی اور سلامتی کے ساتھ رواں دواں رہے،

یہیں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جب کسی معاشرہ کی اعلیٰ اخلاقی اور انسانی قدروں میں کوئی تغیر ہوتا ہے یا اس معاشرہ کے اجتماعی نقطۂ نظر میں کوئی تبدیلی آتی ہے تو پھر اس معاشرہ کے قانونی نظام میں بھی تبدیلی ناگزیر ہو جاتی ہے، ایسی مثالیں ان ممالک کی تاریخ میں صاف مل جاتی ہیں، جو ایک نظام سے دوسرے نظام میں منتقل ہوتے ہیں، مثلاً سرمایہ دار ملک جب سوشلسٹ یا کمیونسٹ حکومتوں میں تبدیل ہوئے تو ان کے معاشرہ کے قانونی نظام میں بڑی تبدیلی آئی،

بعثت نبوی کے وقت عرب کی حالت، اسی طرح جب ہم چھٹی صدی عیسوی کے جزیرۂ عرب پر نظر ڈالتے ہیں کہ کعبہ، پہلا وہ گھر خدا کا، جسے صرف خدائے واحد کی پرستش کے لیے بنایا گیا تھا، وہ بتوں کی ایک خاصی بڑی تعداد سے بھرا ہوا تھا، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب فتح مکہ کے موقع پر بیت اللہ میں داخل ہوئے تو آپ نے کعبہ میں تقریباً ۳۶۰ بتوں کو دیکھا،

مستشرق میور نے لکھا ہے کہ عربوں کے عقیدہ کی بنیاد خالص بت پرستی پر تھی، اور ان کے اس عقیدہ میں کسی کمزوری کی کوئی علامت نہیں تھی، اسی لیے ان کا یہ مضبوط عقیدہ، مصر و شام کی تمام مسیحی تبلیغی کوششوں کا مقابلہ کرتا رہا تھا، ان کی تجارت میں سود کا معاملہ عام تھا، اور اجتماعی وحدت صرف قبیلہ کی صورت میں نظر آتی تھی، ان کی کوئی باضابطہ اور منظم حکومت نہیں تھی، اسی لیے حکومت اور ریاست کے پیمانہ پر فریاد رسی اور انصاف طلبی کی کوئی سبیل نہیں تھی، تنازعوں کے حل کی دو ہی صورتیں تھیں کہ یا تو انتقام لیا جائے یا پھر فریقین میں سے کوئی ایک کسی فیصلہ کو تسلیم کرلے۔[1]

---

[1] لائف آف محمد، میور: ص ۸۳-۸۲،

ایسے صنم پرست ماحول میں اور ایسے معاشرہ میں جو کسی عادلانہ نظام یا قانون ساز ادارے سے واقف نہیں تھا، اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے دین کا داعی بنا کر بھیجا، آپؐ نے دس برس تک مکہ کے سخت اور دشوار ترین حالات میں اسلام کی تبلیغ کی، یہاں یہ حقیقت بھی سامنے رہے کہ آپؐ کی بعثت سے قبل مکہ میں بعض عیسائی مبلغ موجود تھے اور ایسے شعراء بھی تھے جو بتوں کا مذاق اڑایا کرتے تھے، لیکن ان مسیحی مبلغوں یا ان شاعروں کو بت پرستوں کی طرف سے کسی مقابلہ یا تصادم کا سامنا نہیں کرنا پڑا، یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ یہ سخت مرحلے اور دشوار گزار منزلیں آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ کی ہی راہوں میں کیوں آئے، اس کا واحد جواب یہ ہے کہ مشرکین کو یہ خوب معلوم تھا کہ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه کے اقرار کے بعد زندگی کا رُخ کس سمت ہو جائے گا، ان کو یہ یقین تھا کہ یہ کلمہ محض ایک بے روح کلمہ نہیں ہے، ان کو یہ بھی احساس تھا کہ یہ ایسا کلمہ ہے جو خدا کے سامنے سپر اندازی بلکہ مکمل سپردگی کا طالب ہے، یہ عقل و جذبہ، جسم اور روح، تجارت اور سیاست، قانون اور عبادت اور معاملہ اور فہم معاملہ، ہر چیز میں انسان سے مکمل سپردگی کا تقاضا کرتا ہے، اور اسی کی جانب قرآن کی اس آیت میں اشارہ ہے کہ: [1]

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ	آپ فرما دیجیے کہ بالیقین میری نماز اور
وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ	میری ساری عبادات اور میرا جینا اور
لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ	میرا مرنا یہ سب خالص اللہ کا ہی ہے، جو
اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ٥	مالک ہے سارے جہان کا اس کا کوئی شریک نہیں اور
(الانعام ۱۶۳-۱۶۲)	مجھ کو اسی کا حکم ہوا ہے اور میں سب ماننے والوں میں

قرآن مجید نے اس حیثیت کو یہ کہہ کر اور زیادہ اہمیت دی کہ قانون اور اس کی بالادستی کا عمل صرف خدا کی ذات اور ہاتھ میں ہے،

---

[1] آیتوں کا ترجمہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کی بیان القرآن سے ماخوذ ہے۔ (ع۔ص)

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ
السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ
أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ
يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ
حَثِيثًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ
وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ
أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ
تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ۝

(اعراف: ۵۴)

بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے
سب آسمانوں اور زمینوں کو چھ روز
میں پیدا کیا، پھر عرش پر قائم ہوا چھپا دیتا
ہے شب سے دن کو ایسے طور پر کہ وہ
شب اس دن کو جلدی سے آلیتی ہے
اور سورج اور چاند اور دوسرے ستاروں
کو پیدا کیا، ایسے طور پر کہ سب اس کے حکم
کے تابع ہیں، یاد رکھو اللہ ہی کے لیے
خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا، بڑی
خوبیوں کے بھرے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ
جو تمام عالم کے پروردگار ہیں،

ایک جگہ اور فرمایا کہ:

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ
أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا
حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ
لِتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ
إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ
عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ ۝

(نحل: ۱۱۶)

اور جن چیزوں کے بارے میں محض تمہارا
جھوٹا زبانی دعویٰ ہے، ان کی نسبت یوں
مت کہہ دیا کرو کہ فلانی چیز حلال ہے اور
فلانی چیز حرام ہے، جس کا حاصل یہ ہوگا
کہ اللہ پر جھوٹی تہمت لگا دو گے، بلاشبہ
جو لوگ اللہ پر جھوٹ لگاتے ہیں وہ فلاح
نہ پاویں گے،

چنانچہ جب مدینہ میں مسلمانوں کی جماعت زیادہ طاقتور بن کر سامنے آئی تو پھر قرآن کے عطا کردہ اسلامی عقیدہ کی بنیاد پر ایک اسلامی حکومت بھی وجود میں آگئی،

اس نو خیز حکومت میں قانون کی عملداری صرف اللہ تعالیٰ کے لیے تھی، اس نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت دی کہ:

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (جاثیہ: ۱۸)

پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کر دیا، سو آپ اسی طریقہ پر چلے جائیے اور ان جہلاء کی خواہشوں پر نہ چلیے،

اس لیے کسی انسان کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے لیے یا کسی دوسرے شخص کے لیے خود قانون سازی کرے، کیونکہ قانون سازی یا تشریع صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو یہ کہتے ہوئے قوت تشریع دی کہ:

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (اعراف: ۱۵۷)

جو لوگ ایسے رسول امی کا اتباع کرتے ہیں، جن کو وہ لوگ اپنے پاس توریت و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، وہ ان کو نیک باتوں کا حکم فرماتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں، اور پاکیزہ چیزوں کو ان کے لیے حلال بتلاتے ہیں اور گندی چیزوں کو ان پر حرام فرماتے ہیں اور ان لوگوں پر جو بوجھ اور طوق تھے ان کو دور

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اپنے پیغمبرؐ کی اطاعت فرض کی، قرآن مجید میں اس مضمون کی آیتیں بکثرت ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں:

۱- یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ۝ (نساء: ۵۹)

اے ایمان والو، تم اللہ کا کہنا مانو اور رسول کا کہنا مانو، اور تم میں جو لوگ اہل حکومت ہیں ان کا بھی، پھر اگر تم کسی امر میں باہم اختلاف کرنے لگو تو اس امر کو اللہ اور رسول کی طرف حوالہ کرلیا کرو اگر تم اللہ پر اور یوم قیامت پر ایمان رکھتے ہو، یہ امور سب بہتر ہیں اور ان کا انجام خوشتر ہے،

۲- وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ۝ (مائدہ: ۹۲)

اور تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے رہو اور رسول کی اطاعت کرتے رہو اور احتیاط رکھو، اور اگر اعراض کروگے تو یہ جان رکھو کہ ہمارے رسول کے ذمہ صرف صاف صاف پہونچا دینا تھا،

۳- یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْہُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (انفال: ۲۰)

اے ایمان والو! اللہ کا کہنا مانو اور اس کے رسول کا، اور اس کہنا ماننے سے روگردانی مت کرو اور تم سن لیتے ہی ہو،

۴۔ مَن یُّطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللهَ (نساء: ۸۰)

جس شخص نے رسول کی اطاعت کی، اس نے خدا تعالیٰ کی اطاعت کی،

۵۔ وَمَا آتَاکُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا، (حشر: ۷)

اور رسول تم کو جو کچھ دیدیا کریں وہ لے لیا کرو، اور جس چیز سے تم کو روک دیں تم رک جایا کرو،

قرآن وحدیث ہی مصدر شریعت ہیں

اس طرح مسلمانوں کے نزدیک یہ حقیقت ثابت شدہ ہو کہ تشریع اور قانون سازی کا اساسی مرجع ومصدر، قرآن مجید اور سنت رسول اللہؐ ہے اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد مسلمانوں کا جاہلیت کے ہر عقیدہ اور ہر قول وعمل سے تعلق ختم ہو جاتا ہے، اور ساری اسلامی دنیا کے لیے کتاب وسنت ہی راہ نما قرار پاتی ہے، چنانچہ جب تک مسلمان ان دونوں سرچشموں سے انفرادی اور اجتماعی زندگی میں فیض حاصل کرتے رہے، اس وقت تک وہ غالب اور طاقتور رہے، صدیوں یہی صورت حال رہی، اور جب ان دونوں بنیادی نقطوں سے ان کا انحراف بڑھا، تو عالم اسلام میں فوجی کمزوری آئی اور سیاسی زوال کے ساتھ اقتصادی فقر بڑھا، یہاں تک کہ عالم اسلام کا اکثر حصہ استعمار کے زیر تسلط آیا، اور مسلمان شکست وریخت کی ذلت وخواری سے دوچار ہوئے،

بعض علاقوں میں مسلمانوں نے سامراجیوں کے اس غلبہ سے رہائی کی کوشش کی، جیسا کہ ہندوستان اور دوسرے اسلامی ممالک کی تاریخ سے ظاہر ہے، ان لوگوں نے جہاد کے علم کو بلند کیا، اور جان ومال کی قربانی دے کر اپنی سرخروئی کا سامان کیا،

استشراق کا اصل مقصد

لیکن اس کشمکش کے نتیجہ میں استعمار نے یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں میں جہاد بالسیف کی روح جب تک برقرار رہے گی، اس وقت ان کا تسلط اور غلبہ مکمل نہیں ہوگا، اس نے

اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے یہ بھی ضروری سمجھا کہ اسلامی معاشرہ کی امتیازی خوبیوں کو ہی ختم کر دیا جائے، ان امتیازی خوبیوں میں اسلام کا تشریعی، تعلیمی اور تربیتی نظام تھا، اسی لیے مغربی استعمار کی اولین کوشش اس بات کی رہی کہ وہ شریعت اسلامیہ کو مہمل اور ناکارہ ثابت کرے، اور اس کے لیے اس کے قدیم مصادر و مآخذ میں شکوک و شبہات پیدا کرے، اور پھر ان کی افادی حیثیت پر طنز و تعریض کا رویہ اختیار کرے۔ تاکہ مسلمانوں کو ان سے رجوع کرنے کا خیال ہی نہ آئے،

قرآن مجید کے اکثر احکام، کلیات اور عمومیات کی قسم سے ہیں، جن کی تشریح و تفسیر کا حق حامل قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، جیسے نماز، اسلام کا بنیادی رکن ہے، قرآن میں متعدد موقعوں پر اقامت صلوٰۃ کا حکم موجود ہے، لیکن نماز کیسے پڑھی جائے، اس کی تفصیل قرآن مجید میں نہیں ہے، یہ امر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ہے، کہ آپ اپنے قول و فعل سے اقامت صلوٰۃ کے طریقوں کو بیان فرمائیں، اس طریقہ کار میں یہ حکمت پوشیدہ ہے کہ سنت کی اہمیت ثابت ہو، اور اس طرح تشریع و قانون سازی میں اس کے مرتبہ و مقام کی تعیین ہو سکے،

چنانچہ مغرب کی استعماری قوموں نے سب سے پہلے یہ ضروری سمجھا کہ سنت و حدیث سے جنگ کی جائے، کیونکہ مسلمانوں کو حدیث سے دور کر دینے کے بعد، اور تشریع کے میدان میں اس کے مرتبہ و مقام میں شکوک پیدا کر دینے کی وجہ سے قرآن کریم سے مقابلہ کرنا زیادہ آسان ہو جائیگا،

منکرین حدیث کا وجود، استعمار کی اس کوشش کے نتیجہ میں خود مسلمانوں میں ایک ایسا طبقہ ظہور میں آیا جس نے پہلے تو حدیث نبویؐ کے کسی ایک جزو کا انکار کیا، مثلاً وہ جہاد بالسیف کی حدیثوں کا منکر ہوا، اور بعد میں اس طبقہ نے پوری حدیث نبویؐ کا ہی انکار کر دیا،

مدعی نبوت مرزا غلام قادیانی اور چکڑالوی، ہندوستان میں اسی فکر کے نمایندے ہوئے جبکہ مصر میں توفیق صدقی نے بھی یہی دعویٰ کیا،

حدیث نبویؐ پر طنز و تشکیک کے اس عمل میں اس "روشن خیال" اور فکری و روحانی شکست خوردہ اور مغربی تہذیب کے دلدادہ طبقہ کے ساتھ مغرب نے اپنے علماء استشراق کی مدد حاصل کی، ان مغربی مستشرقین کے لیے ہر قسم کی مادی آسائشیں فراہم کی گئیں، تاکہ تلاش و جستجو کی ہر راہ ان کے لیے ہموار اور آسان ہو جائے، ساتھ ہی ان کے گرد تقدس کے ہالے بھی قائم کر دیے گئے، احادیث نبویؐ پر حملہ کرنے والے یہ لوگ استعمار کی فوج کا اقدامی دستہ بن گئے، اس طرح اندرونی اور بیرونی دونوں محاذوں پر ایک جنگ چھیڑ دی گئی، اندرونی محاذ پر "شکست خوردہ لیکن روشن خیال" مسلمان تھے، اور بیرون میں مستشرقین کا ایک ہراول دستہ تھا۔

مستشرقین کے اس ہراول دستہ کی پہلی صف میں دو حضرات ایسے ہیں جن کی زندگی کا بڑا حصہ شریعت اسلامیہ کے مطالعہ اور تجزیہ میں صرف ہوا، ایک تو سناؤک ہورجرونیہ اور دوسرے گولڈزیہر، ان دونوں نے حدیث نبویؐ کے مرتبہ اور مقام اور تشریع کی بنیاد کو چیلنج کیا، تاہم وہ کوئی ایسا مربوط و منطقی اور جامع و مکمل نظریہ پیش کرنے سے قاصر رہے کہ جس کی بنیاد پر وہ حدیث اور اس کی تشریعی اہمیت کے بارے میں مسلمانوں کے عقیدہ پر ضرب لگا سکیں،

شاخت کا مرتبہ، البتہ ایک اور مستشرق جنھوں نے اس سلسلہ میں نسبتاً زیادہ وسیع اور جدید نظریہ پیش کیا، وہ پروفیسر شاخت ہیں، جن کے بعض نظریات ہمارے اس مقالہ کا موضوع ہیں، شاخت نے اپنے نظریات کا محور فقہ اسلامی کو قرار دیا اور اس لحاظ سے بلاشبہ پروفیسر شاخت کے مرتبہ تک نہ ان کا کوئی پیش رو پہنچ سکا، اور نہ کسی ہم عصر کو دعوائے ہمسری کا یارا ہوا، شاخت نے اپنے نظریات کی تشریح اور تبلیغ کے لیے انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں کئی مقالات اور کتابیں لکھیں، ایک کتاب "انٹروڈکشن ٹو اسلامک لا" کے نام سے مدون[1]

---

[1] نام میں عربی تلفظ کا لحاظ رکھا گیا ہے، (ع - ص)

کی، ان کی مشہور ترین کتابوں میں "اصول شریعت محمدیؐ" (اوریجنز آف محمڈن جورس پروڈنس) ہے، جس نے مغرب کی علمی دنیا میں غیر معمولی قبولیت اور عزت حاصل کی .... اس کے متعلق پروفیسر گب نے لکھا ہے کہ "اسلامی تہذیب اور تشریع کے مطالعہ کے لیے یہ کتاب کم از کم مغرب میں ایک بنیادی کتاب ہوگی۔"[1] لندن یونیورسٹی میں فقہ اسلامی کے پروفیسر کولسن نے اس کتاب کی تعریف میں یہ کہا کہ "شاخت نے شریعت کے اصولوں سے متعلق ایسا نظریہ پیش کیا ہے جو اپنے وسیع دائرہ میں کسی غلطی کو قبول نہیں کرتا۔"

پروفیسر شاخت کے ان نظریات نے تقریباً سارے مستشرقین کو متاثر کیا، ان میں پروفیسر اینڈرسن، رابسن، فیز جیرالڈ، کولسن، اور بوسورتھ جیسے ممتاز اسکالر بھی شامل ہیں، شاخت کے دائرۂ اثر میں فیضی، فضل الرحمن اور نیازی جیسے مسلمان بھی آتے ہیں۔

شاخت نے اپنی اس کتاب میں اس کی پرزور کوشش کی ہے کہ وہ شریعت کی بنیادوں کو منہدم کردیں، اور اس طرح فقہ اسلامی کی تاریخ کے خدوخال ہی بدل دیں، اسلام کی ابتدائی تین صدیوں کے محدثین وفقہاء کے بارے میں انھوں نے بار بار یہ تاثر دیا ہے کہ وہ سب دروغ گو غاصب اور تحریف کرنے والے تھے۔

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ لندن اور کیمبرج کی یونیورسٹیوں میں کسی طالب علم کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ شاخت کی اس کتاب کا تنقیدی مطالعہ و تجزیہ پیش کرسکے، حالانکہ یہ دونوں یونیورسٹیاں، مطالعہ و تحقیق میں آزادی اور غیر جانب داری کا علم بلند کرتی ہیں،

اس طرح شاخت اور ان کے نظریات کو تنقید سے بالاتر قرار دیا گیا، اگر کسی نے ان کے نظریات سے بحث کی تو اس کی یہ تحقیق لائق اعتناء نہیں سمجھی گئی، جیساکہ آکسفورڈ یونیورسٹی کے

---

[1] جرنل آف کمپیریٹیو لیجسلیشن اینڈ انٹرنیشنل لا، ج ۳۳ ص ۱۱۴۔

کے ایک استاذ کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا[1] جنہوں نے فقہ اسلامی میں حدیث نبویؐ سے متعلق شاخت کے خیالات کا تجزیہ کیا ہے، مثلاً انہوں نے یہ لکھا تھا کہ پروفیسر شاخت اسلام میں شریعت کے مقام کے سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ :

"قانون یعنی شریعت، بڑی حد تک دین کے دائرہ سے خارج ہے"۔

اسی بات کو انھوں نے اپنی کتاب "انٹروڈکشن ٹو اسلامک لا" میں زیادہ وضاحت کے ساتھ دہرایا ہے، ایک جگہ وہ کہتے ہیں کہ :

"اسلام کی پہلی صدی کے بڑے حصہ میں اس فقہ اسلامی کا وجود ہی نہیں جو نبی کریمؐ کے عہد میں موجود تھی، اور جو فقہ اور قانون اس وقت رائج تھی وہ دین کے دائرہ سے باہر کی چیز تھی"۔

شاخت کا ایک بنیادی نظریہ

شاخت کی تقریباً ہر تحریر میں اسی نظریہ کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے، اور یہی نظریہ ان کے تمام خیالات کا مرکزی اور بنیادی نظریہ ہے، اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب فقہ یا قانون یا شریعت کا موجودہ ذخیرہ، دین کے دائرہ سے خارج ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور اسی طرح صحابہؓ و تابعینؒ جیسے اولین مسلمانوں نے اس سے اعتنا نہیں کیا، تو اس میدان میں زیادہ اہتمام کی ضرورت ہی نہیں ہے، اور اگر کبھی اہمیت دی بھی گئی تو یہ وقتی اور فوری ضرورت کے تحت دی گئی، اب اگر مصادر ب میں کہیں یہ اشارہ ملتا ہے کہ تشریع کے میدان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپؐ کے بعد صحابہؓ و تابعینؒ میں علمائے مجتہدین نے کوششیں کیں تو یہ باتیں جھوٹ اور من گھڑت ہیں، شاخت کے ان خیالات کا یہ تجزیہ محض منطقی استدلال کے تحت نہیں ہے، بلکہ انھوں نے نہایت صراحت

---

[1] السنۃ و مکانتہا فی التشریع الاسلامی، ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی، ص ۲۷۔

کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہے کہ "کسی ایک بھی فقہی حدیث کے متعلق یہ کہنا بہت دشوار ہے کہ وہ نبی کریمؐ سے صحیح طور پر منسوب ہے"۔[۱] شاخت کے ان مذکورہ خیالات کے نتیجہ میں کئی ایسے مقاصد سامنے آئے جو اسلام کے دشمنوں کو مطلوب تھے، اور جن سے ان کی خواہشوں کی تکمیل ہوتی نظر آتی تھی، مثلاً:

۱۔ مسلمان ملکوں میں شریعت کے نفاذ کا مطالبہ اور اس کی آرزو ایک مہمل بات ہے، اصلاً شریعت کا تعلق دین سے ہے ہی نہیں، بلکہ یہ دین سے خارج کی چیز ہے،

۲۔ حدیث کا وجود ایک فرضی دعویٰ ہے اس لیے جس فقہ کو قرآن و حدیث سے ماخوذ بتایا جاتا ہے، وہ دراصل فقہ اسلامی نہیں ہے، بلکہ اس کا بڑا حصہ یہودیوں، عیسائیوں اور دوسرے مذاہب کی شریعتوں سے ماخوذ ہے، اور جو حصہ ان کے علاوہ ہے وہ مجتہدین کے اپنے اجتہادات پر مشتمل ہے۔[۲]

اس طرح بحث و تحقیق کے نام پر یہ سبق دیا گیا کہ مغرب کے بنائے ہوئے قوانین سے مسلمان استفادہ کر سکتے ہیں، اور اس سلسلہ میں ان کو یہ شبہہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس سے ان کے دین کی کسی بھی درجہ میں مخالفت ہوتی ہے، بلکہ وہ چاہیں تو ان قوانین کو فقہ اسلامی سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں کہ ان کے سلف کا عمل بھی ایسا ہی تھا۔

ایسے خیالات کی تہوں میں جو بنیادی اور کھلی غلطیاں ہوتی ہیں، وہ کسی بھی صاحب نظر سے مخفی نہیں، ایسے تصورات سے محض غیر دانشمندانہ اور غیر منصفانہ نتائج کی ہی امید کی جا سکتی ہے، پروفیسر شاخت کی علمی بلند نظری کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب کے

---

[۱] انٹروڈکشن ٹو اسلامک لا، ص ۳۴، [۲] فارن ایلیمنٹس ان اینشنٹ اسلامک لا، شاخت ج ۳۲ ص ۱۷-۹۔

نام "شریعت محمدی کے اصول" رکھا ہے، حالانکہ ہر مسلمان شریعت کو اسلامی شریعت سمجھتا ہے بشر محمدی کہہ کر دہ خدا کے دین کو دنیا کے اور دوسرے شخصی مذہبوں کی طرح ثابت کرنا چاہتے ہیں، اس لیے اسلامیات کا کوئی بھی حقیقت پسند طالب علم یہ کہہ سکتا ہے کہ ان کی باتیں حقایق کو گمراہ اور مسخ کرنے کی کوشش ہیں۔

شاخت کے نظریات کی اصلی غلطی: شاخت کے مذکورۂ بالا دعوؤں کے متعلق ہماری رائے یہ ہے کہ ان کے اس تجزیہ میں دو جگہ غلطیاں سرزد ہوئی ہیں۔

اوّل تو یہ کہ انھوں نے اپنے مطالعہ میں عقلی اور منطقی طرز فکر کو راہ نہیں دی، ورنہ ان کا نتیجہ فکر یقیناً برعکس ہوتا۔

دوسرے یہ کہ اپنے نظریہ کو ثابت کرنے میں انھوں نے اسلام کے مصدر اول قرآن مجید سے اعتنا نہیں کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قرآن مجید کی پیش کردہ حقیقتوں سے لاعلم رہے،

عقلی پیمانہ سے اگر شاخت نے حقیقتوں پر نظر کی ہوتی یہ مسلّمہ صداقت صاف عیاں تھی، کہ جب معاشرہ میں اعلیٰ اخلاقی و انسانی قدریں بدلتی ہیں اور لوگوں کے نظریہ اجتماع میں تبدیلی آتی ہے تو زندگی کے تمام قوانین، رسوم اور لوازم میں بھی انقلاب آجاتا ہے، تو پھر اس میں کیا تعجب ہے کہ اسلام نے جب دور جاہلیت کے تمام فرسودہ نقوش کو مٹا دیا، اور انسانوں کو ایسے آداب و رسوم سے روشناس کرایا جو ماضی کی بہ نسبت زیادہ مہذب زیادہ معقول اور زیادہ مفید تھے، تو پھر اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ اپنے پیروکاروں کو ایک نیا تشریعی نظام دے، یہ تو واضح اور منطقی بات ہے کہ ایک نئے اور اسلامی معاشرہ کے لیے رسول اللہؐ نے تشریع کی ضرورت محسوس کی، لیکن شاخت نے اس سادہ عقلی اور منطقی حقیقت سے قطعی اعراض کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے علمی مفروضوں کی ساری عمارت ہی کج بنیاد ہوگئی، اس کے ساتھ ہی انھوں نے دوسری بنیادی غلطی یہ کی کہ

قرآن مجید سے انہوں نے تجاہل اور صرف نظر کا معاملہ کیا، ہم سمجھتے ہیں کہ ان سے اس غلطی کا ارتکاب عمداً ہوا ہے، کیونکہ یہ حقیقت سب کے نزدیک تسلیم شدہ ہے، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو ایسی کتاب دی جس کے لفظی اور معنوی مشتملات میں کوئی شبہ نہیں اور جس کے مضامین میں آغاز سے آج کے دور تک نہ کوئی تبدیلی ہوئی اور نہ تحریف ہوئی، اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام مسلمانوں کا یہ ایمان ہے کہ قرآن مجید خدا کی نازل کی ہوئی کتاب ہے، یہ تو ہو سکتا ہے کہ ایک متشکک یا دوسرے لفظوں میں ایک غیر مسلم، قرآن مجید کے منزل من اللہ ہونے سے انکار کرے، تاہم جب وہ بھی اسلام، پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کے بارہ میں بحث کرے گا تو قرآن مجید کے مطالعہ سے وہ بھی بے نیاز نہ ہو سکے گا۔

انصاف کہتا ہے کہ اسلامی علوم کے ہر غیر مسلم طالب علم کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس نکتہ کو ہمہ وقت ملحوظ نظر رکھے کہ اس کے مذہبی خیالات اور مسلمانوں کے معتقدات میں بہر حال فرق ہے اگر اس کا موضوع تحقیق اسلامیات ہے تو یہ ضروری ہے کہ وہ مسلمانوں کے اعتقادات کی روشنی میں اپنی راہ تحقیق طے کرے،

عام طور سے مستشرقین کی تحریروں میں اس غلط روش اور غلط مبحث کا احساس ہوتا ہے، کہ یہ لوگ اسلامی پس منظر میں علمی بحث نہیں کرتے، بلکہ ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے ذاتی نقطۂ نظر کے متعلق یہ باور کرائیں کہ وہی مسلمانوں کا بھی زاویۂ نظر ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی بحث و تحقیق میں عجیب وغریب اور ناقص ومتضاد نتائج سامنے آتے ہیں۔

کیا شریعت کا تعلق قرآن مجید سے نہیں ہے؟

شاخت نے اسلامی شریعت میں حدیث کے مرتبہ ومقام کو جس طرح مجروح کیا ہے، اس کی تفصیل تو آیندہ آئے گی، ہم یہاں ذرا اس کا جائزہ لیتے ہیں کہ کیا واقعی قانون اور شریعت، قرآن کی روشنی میں، دائرۂ دین سے خارج ہیں، اس سلسلہ میں ہم نے چند

آیتیں اوپر ذکر کی ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ اور بھی چند آیات یہاں درج کر دی جائیں، مثلاً:

۱۔ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَاتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ (انعام: ۱۵۵)	اور یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے بھیجا بڑی خیر و برکت والی، سو اس کا اتباع کرو اور ڈرو تاکہ تم پر رحمت ہو،
۲۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ (نساء: ۱۰۵)	بے شک ہم نے آپ کے پاس یہ نوشتہ بھیجا ہے، واقع کے موافق تاکہ آپ ان لوگوں کے درمیان اس کے موافق فیصلہ کریں جو کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتلا دیا ہے،
۳۔ وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ (یونس: ۱۰۹)	اور آپ اس کا اتباع کرتے رہیے جو کچھ آپ کے پاس وحی بھیجی جاتی ہے، اور صبر کیجیے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ فیصلہ کر دیں گے،
۴۔ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا، (نور: ۵۱)	مسلمانوں کا قول تو جب کہ ان کو اللہ کی اور اس کے رسول کی طرف بلایا جاتا ہے یہ ہے کہ وہ یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا۔
۵۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ	کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا کہ جو دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب پر بھی ایمان

أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَآ أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوٓا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوٓا أَنْ يَكْفُرُوا بِهٖ (نساء: ۶۰)

بھی رکھتے ہیں جو آپ کی طرف نازل کی گئی اور اس کتاب پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کی گئی اپنے مقدمے شیطان کے پاس لے جانا چاہتے ہیں، حالانکہ ان کو یہ حکم ہوا ہے کہ اس کو نہ مانیں۔

۶- أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَىٰ كِتَابِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُونَ (آل عمران: ۲۳)

کیا آپ نے ایسے لوگ نہیں دیکھے جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا، اور وہی کتاب اللہ کی طرف اس غرض سے ان کو بلایا بھی جاتا ہے کہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کر دے پھر ان میں سے بعض لوگ انحراف کرتے ہیں بے رخی سے،

۷- وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُودًا (نساء: ۶۱)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس حکم کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے، اور رسول کی طرف، تو آپ منافقین کی یہ حالت دیکھیں گے کہ آپ سے پہلو تہی کرتے ہیں۔

۸- قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هٰذَآ أَوْ بَدِّلْهُ قُلْ مَا يَكُونُ

یہ لوگ جن کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے یوں کہتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی دوسرا قرآن لائیے یا اس میں کچھ

لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓى اِلَیَّ (یونس: ۱۵)	ترمیم کر دیجئے، آپ یوں کہہ دیجئے کہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکے گا کہ میں اپنی طرف سے اس میں ترمیم کر دوں، بس میں تو اسی کا اتباع کروں گا جو میرے پاس وحی کے ذریعہ سے پہونچا ہے۔
۹۔ وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (مائدہ: ۴۴)	اور جو شخص خدا تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے کے موافق حکم نہ کرے سو ایسے لوگ بالکل کافر ہیں
۱۰۔ وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (مائدہ: ۴۵)	اور جو شخص خدا تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے کے موافق حکم نہ کرے سو ایسے لوگ بالکل ستم ڈھا رہے ہیں۔
۱۱۔ وَمَنْ لَّمْ یَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَیْكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (مائدہ: ۴۷)	اور جو شخص خدا تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے کے موافق حکم نہ کرے سو ایسے لوگ بالکل بے حکمی کرنے والے ہیں۔

ان تمام آیتوں کی روشنی میں مندرجہ ذیل باتیں ثابت ہوتی ہیں:

۱۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تشریع کا حق اپنے لیے خاص کر لیا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے نفاذ کا حق و اختیار دیا۔

۲۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے زندگی کے ہر معاملہ میں اپنے احکام کی بجا آوری کو لازم قرار دیا ہے، اور اس کے لیے مسلمانوں سے مکمل سپردگی کا مطالبہ کیا ہے،

۳۔ تیسرے یہ کہ اسلامی شریعت، زندگی کے ہر پہلو کو شامل ہے۔

۴۔ اور آخری بات یہ کہ خدا کے نازل کیے ہوئے احکام میں کسی کو تغیر و تبدّل کا حق نہیں، خواہ وہ پیغمبر ہو، فرشتہ ہو یا کوئی اور ہو۔

ہم نے جب قرآن مجید کا اس حیثیت سے مطالعہ کیا کہ اس کے احکام، زندگی کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتے ہیں تو ہم نے یہ احکام چھ طرح کے پائے، جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ عبادات، جس میں ایک رکن زکوٰۃ ہے، اور جس کا تعلق مالیات سے ہے،

۲۔ دین کی اشاعت کی غرض سے جہاد، جس میں ضمناً حکومت کے قوانین اور ضابطے شامل ہو جاتے ہیں۔

۳۔ معاشرتی نظام، اس میں فرد اور خاندان دونوں شریک ہیں۔

۴۔ کھانے پینے کے آداب و احکام،

۵۔ معاملات و حقوق سے متعلق احکام،

۶۔ جرائم اور ان کی سزائیں۔

یہاں ہم قرآن کے احکام اور آیات سے متعلق ایک مفصل جدول پیش کرتے ہیں، جس سے یہ بات زیادہ آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے، کہ قرآن کی تعلیمات، کس طرح زندگی کے ہر شعبہ کا احاطہ کرتی ہیں، بعض انصاف پسند مستشرقین بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ تورات میں جو تشریعی احکام ہیں وہ عالمی ادب میں قانون کے نام سے معروف ہیں، لیکن قرآن مجید کے تشریعی احکام، تورات کے احکام سے کم نہیں ہیں۔[۱]

مندرجۂ ذیل جدول اس حقیقت کی غماز ہے کہ اصلاً دعوت الی اللہ اور غیر مسلمین سے مجادلہ اور انبیاء کے واقعات اور سیرۃ رسولؐ کے مضامین پر مشتمل ہونے کے باوجود قرآن نے انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو کس درجہ اہمیت دی ہے

---

[۱] اسٹڈیز ان اسلامک ہسٹری، ڈی ایس گولڈ تائن ص ۱۲۸۔

احکام والی سورتیں	عبادات	جہاد ملکی قانون	معاشرتی نظام	آداب طعام	بیوع	جنایات	قضا	شہادات	عقوبات مالی اور بدنی
۱۔ بقرہ	۲۹	۱۰	۲۳	۴	۹	۰	۰	۳	۵
۲۔ آل عمران	۱	۰	۰	۰	۱	۰	۱	۰	۰
۳۔ نساء	۸	۷	۵۰	۰	۰	۲	۵	۳	۷
۴۔ مائدہ	۹	۰	۵	۲۰	۰	۲	۵	۰	۶
۵۔ انعام	۱	۰	۰	۹	۰	۰	۰	۰	۰
۶۔ اعراف	۴	۰	۰	۲	۰	۰	۰	۰	۰
۷۔ انفال	۱	۱۲	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۸۔ توبہ	۹	۲۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۹۔ ہود	۱	۱	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۱۰۔ ابراہیم	۱	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۱۱۔ نحل	۰	۱	۰	۴	۰	۰	۰	۰	۰
۱۲۔ اسراء	۱	۱	۳	۰	۱	۰	۰	۰	۱
۱۳۔ طٰہٰ	۱	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۱۴۔ حج	۰	۳	۰	۱	۰	۰	۰	۰	۰
۱۵۔ مومنون	۵	۰	۴	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۱۶۔ نور	۰	۰	۱۴	۰	۰	۰	۴	۱	۵
۱۷۔ فرقان	۰	۰	۱	۰	۰	۱	۰	۰	۰
۱۸۔ نمل	۲	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰

احکام والی سورتیں	عبادات	جہاد و ملکی قانون	معاشرتی نظام	آداب طعام	بیوع	جنایات	قضا	شہادات	عقوبات مالی اور بدنی
۱۹ - عنکبوت	۱	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۲۰ - روم	۱	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۲۱ - لقمان	۲	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۲۲ - احزاب	۲	۰	۸	۰	۰	۰	۱	۰	۰
۲۳ - فاطر	۱	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۲۴ - فصّلت	۱	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۲۵ - شوریٰ	۱	۰	۱	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۲۶ - محمد	۰	۵	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۲۷ - فتح	۰	۳	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۲۵ - حجرات	۰	۳	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۲۹ - مجادلہ	۲	۰	۳	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۳۰ - حشر	۰	۲	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۳۱ - ممتحنہ	۰	۵	۴	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۳۲ - صف	۰	۱	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۳۳ - جمعہ	۱	۰	۰	۰	۱	۰	۰	۰	۰
۳۴ - طلاق	۰	۰	۵	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۳۵ - مزمّل	۲	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
۳۶ - مطففین	۰	۰	۰	۰	۱	۰	۰	۰	۰
۳۷ - بیّنہ	۲	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰	۰
مجموعی احکام	۸۹	۷۴	۱۲۱	۴۰	۱۳	۹	۱۲	۷	۲۴

اس ساری تفصیل کا مدعا یہ ہے کہ جس شریعت کو قرآن مجید نے پیش کیا ہے، اس میں یا تو نئے قوانین وضوابط ہیں یا پھر اس میں زمانۂ جاہلیت کے رسوم ورواج اور اس دور کے مروّجہ قوانین کے بالکل برخلاف ایسے آداب ورسوم کی تعلیم ہے، جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہترین و کامل ترین شکل میں لوگوں تک پہونچایا اور اسلامی معاشرہ میں ان کو جاری وساری کیا،

تشریع کی اہمیت میں بعض مستشرقین کی رائیں تشریع اور اسلام کے نظام قانون کی اس اہمیت کا بعض مستشرقوں نے بھی کیا ہے، مثلاً کولسن کا قول ہے کہ "اسلام کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی واحد قانون ساز ہے، اور زندگی کے تمام شعبوں میں اسی کے احکام کا غلبہ ہے۔"[1]

فیز جیرالڈ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ "اسلام، اللہ تعالیٰ کو واحد قانون ساز وصاحب تشریع قرار دیتا ہے، اور اس سلسلہ میں کسی کو بھی اس کا شریک نہیں گردانتا۔"[2]

گوائے ٹائن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "دقیق قانونی معاملات بھی دین سے مربوط ہیں، بلکہ وہ وحی الٰہی کا ناقابل تقسیم حصہ ہیں، شریعت، ایسے عصری تقاضوں کا مجموعہ نہیں ہے جو قرآن اور نبی کریمؐ کے بعد مرتب ہوئے ہوں، بلکہ اسلامی معاشرہ میں ان کا باضابطہ نفاذ خود رسول اللہؐ نے اپنی زندگی میں کیا۔"[3]

ان قرآنی آیات اور مستشرقین کے اقوال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شاخت کا یہ بنیادی نظریہ کہ شریعت دین کے دائرۂ اثر سے خارج ہے، یہ محض ان کا خیال خام ہے، اور قرآن مجید سے ان کی لاعلمی اور تجاہل کا غماز بھی ہے،

ایک اہم نکتہ یہاں یہ بات بھی محل غور ہے کہ شاخت کے اس نقطۂ نظر سے دوسرے مستشرقین مثلاً

---

[1] اے ہسٹری آف اسلامک لا، کولسن ص ۲۰۔ [2] دی ایجیڈ ڈ ٹ آف اسلامک تو ردمن لا، فیز جیرالڈ ج ۶۷ ص ۸۲، [3] اسٹڈیز ان اسلامک ہسٹری، گوائے ٹائن ص ۳۰۔ ۱۲۹،

نیز جبیر اللہ کولسن اور گوائٹے شائن متفق نہیں ہیں، تاہم یہ عجیب معاملہ ہے کہ یہ مستشرقین جزئیات میں اور بعض بنیادی مسائل میں باہم اختلاف رائے کا اظہار کرتے ہیں، ایک دوسرے پر تنقید بھی کرتے ہیں، لیکن ان اختلافات اور اعتراضات کی صدائے بازگشت صرف اسی حد تک سنی جاتی ہے، ناقص اصولوں سے مستنبط کی ہوئی غلط رایوں اور باطل نتائج پر یہ لوگ معترض نہیں ہوتے، مثلاً کچھ مستشرق یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ شاخت نے اپنے اس بنیادی نقطۂ نظر میں غلطی کی ہے، مگر شاخت جب اسی غلط بنیاد پر تفصیل سے اپنے نتائج فکر کو پیش کرتے ہیں تو یہ مستشرق اس کو رد نہیں کرتے، حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ جب وہ شاخت کے بنیادی مفروضہ کو غلط سمجھتے ہیں تو پھر اس مفروضہ کی بنیاد پر ان کے استنباط اور ان سے مرتب کیے ہوئے نتائج کو بھی رد کر دیتے، مگر وہ ایسا نہیں کرتے ہیں، بلکہ کولسن نے تو نہایت صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ شاخت کا نظریہ اپنے وسیع تر پس منظر میں کسی بھی رد و اعتراض کو قبول نہیں کرتا ہے، اور ہر مستشرق کے لیے یہ ضروری ہے کہ شریعت کو مہمل ثابت کرنے کے لیے شاخت کے نظریہ سے استفادہ کرے،

شاخت کے دعویٰ کی تاریخ اسلام سے تردید

شاخت اور ان کے ہمنواؤں کے مذکورہ بلند آہنگ دعویٰ کی حقیقت کو آشکارا کرنے کے لیے ہم قدرے تفصیل کے ساتھ یہ دیکھیں گے کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام نے ایک نیا ضابطہ و قانون پیش کیا، اور خدا کے اوامر و نواہی اور اس کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کا مطالبہ کیا، اور ایسے قانونی ضابطوں اور اخلاقی اصولوں کو پیش کیا جن کے دائرۂ کار دائرہ میں زندگی کے سارے گوشے شامل ہیں تو کیا یہ دعوے محض نظری اور قولی ہیں، یا واقعۃً زندگی کی حقیقتوں سے منطبق ہوتے ہیں؟

اسلامی تاریخ کی روشنی میں اس سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ روز اول سے اپنے صفحات میں ایسے واقعات کو سموئے ہوئے ہے جو قرآن کریم کے احکام و مطالبات کے عین مطابق ہیں، اور نظری لحاظ سے بھی اس کی متعدد مثالیں ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے امراء و عمال کو ہمیشہ یہ ہدایت دی کہ وہ لوگ جب معاملات

کا فیصلہ کریں تو ان کا ہر فیصلہ اللہ تعالیٰ کے احکام و قوانین کے مطابق ہو۔ ایک خط میں آپؐ نے حضرت عمروؓ بن حزم کو تمام معاملات میں اللہ سے ڈرتے رہنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ اللہ کے حکم کے مطابق حق بات کا فیصلہ کریں۔[1] آپؐ کے جانشین صحابہؓ و خلفاءؓ کرام کا بھی یہی عمل رہا، چنانچہ ایک موقع پر حضرت عمرؓ نے حضرت ابو عبیدہؓ اور حضرت معاذؓ کو لکھا کہ آپ حضرات، صالح لوگوں کو نظر میں رکھیں اور ان کو عہدۂ قضا پر مامور کریں، اور باضابطہ ان کو تنخواہیں دیں۔[2]

عملی لحاظ سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قاضی اور حکم کی حیثیت سے نظر آتے ہیں۔ آپؐ کی اس حیثیت کے متعلق قرآن مجید میں ہے کہ:

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝ (احزاب: ۳۶)	ترجمہ	اور کسی ایماندار مرد اور کسی ایماندار عورت کو گنجایش نہیں جبکہ اللہ اور اسکا رسول کسی کام کا حکم دیں کہ ان کو ان کے اس کام میں کوئی اختیار رہے اور جو شخص اللہ کا اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانیگا وہ صریح گمراہی میں پڑا۔

رسول اللہؐ کے عہد مبارک میں آپؐ کے حکم سے بعض صحابۂ کرامؓ نے قضا کی ذمہ داریاں سنبھالیں جن میں چند ممتاز یہ ہیں:- ۱۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ، ۲۔ ابی بن کعبؓ، ۳۔ حذیفہ بن الیمانؓ، ۴۔ دحیۃ الکلبیؓ، ۵۔ زید بن ثابتؓ، ۶۔ عبداللہ بن مسعودؓ، ۷۔ عتاب بن اسیدؓ، ۸۔ علی بن ابی طالبؓ، ۹۔ عقبہ بن عامرؓ، ۱۰۔ عمر بن الخطابؓ، ۱۱۔ عمروؓ ابن حزم، ۱۲۔ عمرو بن العاصؓ، ۱۳۔ معاذ بن جبلؓ، ۱۴۔ معقل بن یسارؓ۔

اس ابتدائی دور میں ہی تشریع و قضا اور فقہ کا کام اس قدر وسیع ہو گیا کہ باقاعدہ ان قضایا کی ترتیب و تالیف کا عمل بھی شروع ہو گیا، چنانچہ امام طاؤس (۳۰ھ، ۱۰۰ھ) نے حضرت معاذ بن جبلؓ کے فتاویٰ کی ایک کتاب نقل کی۔

---

[1] الوثائق السیاسیۃ، حمید اللہ وثیقہ ۱۰۵، [2] سیر اعلام النبلاء، ج ۱ ص ۳۲۶۔

حضرت معاذؓ بن جبل کے یمن کے فتووں کی طرح ان کے شام کے فتاوی کی بھی تدوین ہوئی،[1] اسی طرح حضرت عمرؓ بن خطاب اور حضرت علیؓ کی فقہی رایوں کو مدون کیا گیا، حضرت عبداللہؓ بن مسعود اور حضرت عبداللہؓ ابن عباسؓ کی فقہ کو باقاعدہ مرتب کیا گیا،[2] پھر تابعین میں ابراہیم نخعیؒ، ابو قلابہؒ، شعبیؒ، ضحاک بن مزاحمؒ اور سلیمانؒ بن یسار کی کتابیں مرتب کی گئیں۔[3] ان ساری تاریخی، نظری اور عملی شہادتوں کی موجودگی میں شاخت کے اس نظریہ کی کیا وقعت رہ جاتی ہے کہ تشریع اور قانون اور فقہ، دین کے دائرہ سے خارج ہیں، اگر شاخت کا دعویٰ محض یہ ہوتا کہ اسلام نے شریعت کو اور نظام قانون و فقہ کو نظری اعتبار سے تو پیش کیا لیکن عملی زندگی کے تقاضوں سے وہ مکمل طور پر ہم آہنگ نہ ہو سکا تو بھی ہم تاریخی شواہد کی بناء پر اس کی تردید کرتے لیکن ستم یہ ہے کہ انھوں نے تشریع یا قانون و فقہ اسلامی کی تردید میں بالکلیہ یہ فیصلہ کر دیا کہ ایک بھی حدیث ایسی نہیں ہے جس کی نسبت صحیح طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کی جا سکے۔ اس طرح انھوں نے ہزاروں متصل السند احادیث کا ہی انکار کر دیا، اگر شاخت کا یہ دعویٰ تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس سارے مجموعۂ احادیث اور اسانید و اصحاب اسانید کے بارہ میں کیا فیصلہ کیا جائے گا، اور اس سارے ذخیرۂ کتب کا کیا حشر ہوگا جو فقہ و حدیث کی ہزاروں کتابوں پر مشتمل ہے۔[4]

چونکہ شاخت، فقہ کی نشو و نما اور احادیث نبویہ کی اہمیت کے منکر ہیں، اور اس سلسلہ میں انھوں نے فقہ اسلامی کے ذخیرہ کے متعلق اپنے کچھ جدید نظریات پیش کیے ہیں، اس لیے آیندہ سطور میں ہم ان نظریات کا ایک جائزہ لیں گے۔ (باقی آیندہ)

---

[1] محدث فاضل رامہرمزی، [2] طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۱۳۱، [3] دیکھیے مضمون نشاۃ الکتابۃ الفقہیۃ فی الاسلام، مصطفیٰ الاعظمی فی مجلۃ دراسات کلیۃ التربیۃ جامعۃ الریاض ۱۳۹۵ھ، [4] بقول حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ یہ بجا طور پر مغرب کے تبحر علمی کی شرمناک مثال ہے، (ع۔ ص)

یادِ رفتگاں

(از سید صباح الدین عبد الرحمن)

یادِ رفتگاں استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی اُن تعزیتی تحریروں کا مجموعہ ہے جو وہ اپنی زندگی میں ۱۹۱۶ء سے ۱۹۵۲ء تک برابر قلمبند کرتے رہے، اس میں انھوں نے اپنے اساتذہ کی وفات پر ماتم کیا ہے، اپنے پیرِ طریقت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے وصال پر اس فراق اور مہجوری کی کیفیت بیان کی ہے، جو ایک وفا کیش اور انتہائی عقیدت مند مرید پر طاری ہونی چاہئے، وہ اپنے ممتاز معاصر علماء کی موت پر گریہ کناں ہوئے ہیں، اپنے دوست علماء کی جدائی پر اشک بہایا ہے، اپنے سے چھوٹے علمی عزیزوں کی مفارقت پر اپنی سوگواری کو نذرِ قلم کیا ہے، ملک کے اُن مشاہیر کی رحلت پر اپنے سوزِ غم کا اظہار کیا ہے، جن سے وہ کسی نہ کسی حیثیت سے متاثر ہوئے، ان کے زمانہ میں جو باکمال فضلا اور شعراءِ عالمِ جاودانی کو رخصت ہوئے، ان سے متعلق بھی اپنے غمناک جذبات کو احاطۂ تحریر میں لائے ہیں، اُن سیاسی رہنماؤں کی دائمی جدائی پر بھی انتہائی طور پر دلگیر اور دلگرفتہ ہوئے ہیں، جو ان کی نظر میں سچے معنوں میں ملک و ملت کے سچے غم گسار تھے، اس طرح اس پوری کتاب میں ان کے قلم کی سیاہی کی بوندیں ان کی معصوم اور طاہر آنکھوں کے آنسوؤں میں منتقل ہو کر کاغذ کے صفحات پر ٹپکتی نظر آتی ہیں، اور یہ اللہ کے خاموش آہ و فغاں اور نالہ و شیون کا ماتم نامہ بن گئی ہے، اس میں بعض ہندوؤں اور مستشرقین کی وفات پر بھی مغموم ہوئے ہیں جس سے ان کی

رواداری اور فراخدلی کا ثبوت ملتا ہے، اسلامی ممالک کے بعض مشاہیر کی وفات پر بھی اپنے غمناک جذبات کو ظاہر کرکے اپنی بین الاقوامی وسیع النظری کا اظہار کیا ہے،

سید صاحبؒ اپنی اور تصانیف میں تو مصنف کی حیثیت سے نظر آتے ہیں، مگر اس کتاب کے ذریعہ سے ان کی ذات، اور شخصیت اور پھر ان کے اندرونی جذبات واحساسات اور علمی، ادبی اور سیاسی زندگی میں ان کے نظری اور فکری خیالات کا مطالعہ کرنے میں مدد ملتی ہے، اس لئے اس کا مطالعہ کئی حیثیتوں سے کئے جانے کی ضرورت ہے، مثلاً انھوں نے اپنے اساتذہ کی تعظیم و تکریم کس طرح کی، اپنے پیر طریقت سے اپنی شیفتگی اور وارفتگی کس کس طریقہ سے دکھائی، اپنے سے عمر میں بڑے معاصر علما اور اپنی عمر کے برابر علما کو کن نظروں سے دیکھتے رہے، اپنے سے چھوٹے علمی عزیزوں کے ساتھ کس بزرگانہ برتاؤ کے ساتھ پیش آئے، عالم ہونے کے باوجود غیر عالم فضلا اور شعراء کی قدر و منزلت کس طرح کی، اپنے دور کے مشاہیر سے عقیدت و محبت کن اسباب کی بناء پر رکھتے تھے، ان کی کن خوبیوں سے متاثر ہوئے اور ان کے محاسن کے بیان کرنے میں ان کا قلم کس طرح رواں ہوا، سیاسی رہنماؤں کے ساتھ مل کر کس طرح کام کرتے رہے، اور ان کی عزت اور قدر ان کے دل میں جو رہی اس کا اظہار کس طرح کیا ہے، ہندوؤں کے مشاہیر کی موت پر ان کی وطنی محبت کس طرح دکھائی دیتی ہے، اپنے دور کے مستشرقین کے متعلق کیا رائے رکھتے تھے، اسلامی ممالک کے کن مشاہیر سے متاثر رہے، اپنی ان تمام باتوں کو قلمبند کرنے میں انھوں نے کون سی زبان اور کون سا بیان اختیار کیا، اور مجموعی حیثیت سے اس پوری کتاب کی کیا قدر و قیمت ہے، یہ کتاب بظاہر وفات نامہ ہے، مگر اس کے اندر سید صاحبؒ جس طرح چھپ کر ظاہر ہوتے ہیں وہ بھی اس کی اصلی خوبی ہے۔

اساتذہ کا احترام وہ جب اپنے اساتذہ کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے سروں پر ادب و احترام کا

چتر لگائے ہوئے مودب اور مہذب بنے نظر سے دکھائی دیتے ہیں، ابتدائی تعلیم پھلواری شریف میں حضرت شاہ محی الدین سجادہ نشین خانقاہ مجیبیہ (المتوفی ۱۹۴۰ء) کی نگرانی میں پائی، ان کے بزرگانہ تبسم ایک ساتھ طعام کی سعادت مندی اور درسی کتابوں کی شاگردی کو برابر یاد کرتے رہے، پھلواری شریف ہی میں مولانا شاہ سلیمان صاحبؒ المتوفی ۱۳۵۴ھ سے منطق کے کچھ سبق پڑھے، ان کے حالات لکھنے میں، ان کی خبریں گفتاری، بذلہ سنجی، شعر گوئی، ذوق سماع اہل بیت سے خوش عقیدگی اور لطیفہ گوئی کا ذکر مزے لے لے کر کیا ہے، دار العلوم ندوۃ العلماء میں شمس العلماء مولانا محمد حفیظ اللہ (المتوفی ۱۳۶۱ھ) بھی ان کے استاد تھے، ان کی وفات پر قدیم فلسفہ، منطق اور ریاضیات میں ان کے دسترس کی تعریف کی اور ان کی تصانیف میں تصریح الافلاک کے حاشیہ کا ذکر خاص طور سے کیا۔ ندوہ کے ناظم مولانا عبدالحیؒ المتوفی ۱۹۲۲ء سے مقامات حریری پڑھی، تو ان کے علمی تبحر، ادبی ذوق، کثرت تصانیف اور ندوہ کی خدمت میں ان کے ثبات و استقلال کے معترف رہے، وہ اپنے استادوں میں علامہ شبلی نعمانیؒ (المتوفی ۱۹۱۴ء) کو اپنا بہت بڑا مربی، محسن، علمی قائد سمجھتے تھے، ان کی قدر نہ صرف یگانۂ روزگار، مجموعۂ الفنون شاعری کا کہنہ مشق استاد، تحریر اور تقریر یعنی انشاء پردازی اور زبان آوری دونوں کا کشور کشا اور سخن سنجی کے طائر کمال کی حیثیت سے کی، بلکہ اپنی شیفتگی اور وارفتگی میں یہی تحریر فرمایا:

"ہندوستان کی سیر حاصل زمین نے علوم و فنون میں جو بالیدگی پیدا کی، اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، تاہم مختلف دوروں میں کلام و اسرار شریعت میں بحر العلوم اور شاہ ولی اللہؒ، ادب و معانی میں قاضی عبد المقتدر، ملک العلماء دولت آبادی اور ملا محمود جونپوری، فلسفہ و منطق میں ملا نظام الدین اور ملا محب اللہ بہاری، ادب و شاعری میں مسعود سعد سلمان خسرو اور فیضی، تاریخ و سیر میں ضیاء برنی

ابوالفضل اور آزاد بلگرامی کو پیدا کیا، لیکن اس کی آغوش کا آخری فرزند شبلی وہ
تھا، جو ملا محمود بھی تھا اور فیضی بھی، محب اللہ بھی تھا اور آزاد بھی اور کم از کم وہ
یگانہ انفراداً ان میں سے شروع کے دو ایک کو چھوڑ کر اکثر کے برابر اور مجموعاً

ان میں سے اکثر سے بہتر تھا۔ (یادِ رفتگان ص ۱۱-۱۲ مطبوعہ معارف پریس)

یہ محض جذباتی تحریریں نہ تھیں، یہ ان کے قلم سے جوانی کے عالم میں ۱۹۱۶ء میں نکلی تھیں،
جب وہ اپنی یہ کتاب یادِ رفتگان ۱۹۵۲-۵۳ء میں مرتب کرنے لگے تو اس کی ابتدا اسی مضمون
سے کی، اور اس میں کوئی رد و بدل نہیں کیا جس سے ظاہر ہے کہ وہ اپنی بالغ نظری اور دیدہ وری
کے زمانے میں اسی کے قائل تھے جو اپنی جوانی کی سرشاریوں میں لکھ گئے تھے، اور اسی ایجاز کا
اطناب ان کی حیات شبلی میں ملے گا، وہ اپنے اساتذہ سے اپنی فریفتگی کا اظہار کرکے نہ
صرف اپنی شاگردانہ سعادت مندی کا ثبوت دیتے رہے بلکہ یہ سب کچھ لکھ کر نئی نسلوں کو
اپنے اساتذہ کے ساتھ اسی سعادت مندی کا درس دیتے رہے۔

پیرِ طریقت سے وارفتگی سید صاحبؒ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ المتوفی ۱۶ رجب ۱۳۶۲ھ
کے آستانے پر اس وقت جھکے جب وہ خود علم دین کے ایک شہباز، گلشن رسالت کے ایک
عندلیبِ خوشنوا، اور بقول علامہ محمد اقبال استادِ کل اور جوئے شیر اسلامیہ کے فرہاد بن چکے
تھے، مگر ان کے سامنے اپنا سر تسلیم اس لیے خم کیا کہ ان کی نظر میں وہ مولانا قاسم نانوتویؒ اور
مولانا شیخ محمد تھانویؒ کی یادگار تھے، ان کی ذات میں حضرات چشتیہؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ
اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی نسبتیں یکجا تھیں، ان کے خیال میں ان کا سینہ چشتی ذوق و عشق اور
مجددی سکون و محبت کا مجمع البحرین تھا، ان کی زبان شریعت و طریقت کی وحدت کی ترجمان
تھی، ان کے قلم نے فقہ و تصوف کو ایک مدت کی ہنگامہ آرائی کے بعد باہم ہم آغوش کر دیا تھا۔

اور ان کو اس پر یقین راسخ تھا کہ ان ہی کے فیض و توفیق سے اپنی تعلیم و تربیت اور تزکیہ و ہدایت سے ایک عالم کو مستفید بنا رکھا تھا، اور انھوں نے اپنی تحریر و تقریر سے حقایق ایمانی و دقائق فقہی، اسرار احسانی اور رموز حکمت ربانی کو برملا فاش کیا تھا، اسی لئے دنیا نے ان کو حکیم الامت کہہ کر پکارا، اور حقیقت یہ ہے کہ اس اشرف زمانہ کے لیے یہ خطاب عین حقیقت تھا، (یادِ رفتگان صفحہ ۲۵۴)

اس عقیدت کے بعد ان کی ذات اقدس سے شیفتگی اور وارفتگی کیوں نہ پیدا ہوتی۔

یوپی کے علما سے لگاؤ سید صاحبؒ کی بیشتر زندگی یو۔ پی میں گذری، اس لیے یہاں کے علما کے ساتھ قریب تر رہنے کی وجہ سے ان کے فضائل کو جاننے اور پرکھنے کا موقع ملا، اس کے علاوہ ان کا یہ بڑا وصف رہا کہ علماء کے محاسن پر ان کی نظر اس طرح جاتی جس طرح ایک اچھے جوہری کی نگاہ قیمتی جواہرات پر جاتی ہے، ان کے اوصاف کا ذکر کرکے اپنی اس پنہاں مسرت کو آشکارا کرتے کہ ان کا تعلق بھی اسی قابلِ فخر طبقہ سے ہے، وہ ندوی تھے، دیوبند اور ندوہ میں بڑا ذہنی تفاوت رہا ہے، مگر سید صاحبؒ نے دیوبند کے علماء کے مناقب بیان کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی،

دیوبند کے علماء کے فضائل کا اعتراف وہ دیوبند کے مفتی عزیز الرحمٰن المتوفی ۱۹۲۸ء کے اس لئے قدرداں تھے کہ تقویٰ اور دینداری ان کے چہرۂ کمال کا خط و خال تھی کتب فقہ کی جزئیات پر ان کی وسعت نظر بدرجۂ اتم تھی، فتویٰ کے جوابات مختصر لیکن مدلل و دل دہتے تھے۔ (ایضاً۔ ص ۸۸)

دیوبند کے مہتمم مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی المتوفی ۱۹۲۹ء کی قدر اس لئے کی کہ وہاں کی روح بن کر رہے، عالم متبحر ہونے کے علاوہ عربی کے ادیب بھی تھے، عربی نظم و نثر

دونوں پر ان کو قدرت حاصل تھی، سید صاحبؒ ان سے برابر ملتے رہے، آخری بار جب ان سے ملے تو اس کی یاد بڑی حسرت سے یہ لکھ کر کی کہ ضعف اور لاغری سے فضل و کمال کا یہ ماہِ درخشاں اب ہلال بن کر رہ گیا تھا، اب یہ ہلال بھی محاق ہو کر دنیا کی نگاہوں سے چھپ گیا۔ (یادِ رفتگاں ص ۹۳) یہ دو سطریں کاہے کو ہیں، قلم اور قدردانی کے چقماق کی چنگاریاں ہیں۔

مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ (المتوفی ۱۹۳۳ء) دیوبند میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے جانشین تھے، اور وہاں صدر مدرس بھی رہے، اپنے علم و فضل کی وجہ سے علما کی آبرو تھے، چین و ہندستان سے لے کر روم تک ان کے فیضان کا سیلاب موجیں مارتا رہا، سید صاحبؒ نے ان کو دین و دانش کا مہر انور کہہ کر ان کا ماتم اس طرح کیا۔

"مرحوم کم سخن لیکن وسیع النظر عالم تھے، ان کی مثال اس سمندر کی سی تھی جس کی اوپر کی سطح ساکن لیکن اندر کی سطح موتیوں کے گراں قیمت خزانوں سے معمور ہوتی ہے، وہ وسعت نظر، قوت حافظہ اور کثرت حفظ میں اس عہد میں بے مثال تھے، علوم حدیث کے حافظ اور نکتہ شناس، علوم ادب میں بلند پایہ، معقولات میں ماہر، شعر و سخن سے بہرہ مند، زہد و تقویٰ میں کامل تھے"۔ (ایضاً ص ۱۴۶)

وہ سید صاحبؒ کی تصنیف ارض القرآن کو پسند کرتے تھے، جو سید صاحبؒ کے لیے بہت بڑی سند ہے۔ (ایضاً صفحہ ۱۴۷)

مولانا الیاس کاندھلویؒ المتوفی ۱۹۴۴ء) کا ذکر خیر کرنے میں سید صاحبؒ پر جو انشراحی کیفیت طاری ہوئی، تو ان کا قلم ایک لمبی تحریر لکھنے کے بعد ہی رکا، جس میں ان کے وطن کاندھلہ، ان کی تعلیم، بیعت و استفاضہ، خاندانی شجرہ اور خود سید صاحبؒ سے ان کی ملاقاتوں،

پھر ان کے اخلاص، ان کے درد، ان کی سادگی، دین کے ساتھ ان کی غم خواری، خدمت گذاری، تبلیغی کاموں میں مخلصانہ اصولِ دعوت کی کچھ ایسی حیرت انگیز تفصیلات ہیں کہ ان کو پڑھتے وقت خواہش ہوتی ہے، کہ یہ ختم ہونے کے بجائے جاری رہے، اس کا انداز بیان کچھ ایسا ہی دلچسپ ہے، ان کو اپنا خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے، رقمطراز ہیں۔

"وہ اس عہد میں ان نفوسِ قدسیہ کی مثال تھے، جن کے دم قدم سے ہندوستان میں اسلام کا چراغ روشن ہوا، ان کا وجود اس دعوی کی کہ ہندوستان میں اسلام بادشاہوں کے تیغ و خنجر کے سایہ میں نہیں بلکہ بے نوا فقیروں کے فیوض و برکات کے زیرِ سایہ بڑھا اور پھلا پھولا، یہ سب سے تازہ دلیل ہے"۔ (یادِ رفتگاں ۲۷۹)

سید صاحبؒ نے میوات میں ان کے تبلیغی کاموں کی بڑی پُرکیف تفصیل لکھی ہے کہ کس طرح میوات کے لڑاکے چوری ڈاکہ اور قتل میں بدنام مسلمان نیک، صالح اور دیندار مسلمان بن گئے، اور پھر اپنے طبقۂ علماء کے ان کارناموں سے اپنی خوشی کا اظہار پورے زورِ بیان کے ساتھ کیا ہے، سلاطین اور بادشاہوں کی طاقت اگر روحانی طاقت سے محروم ہو تو اس ظاہری حکومت کا جاہ و جلال حق کی قوت کے بجائے باطل کی قوت کے فروغ کا سامان ہو جاتا ہے، لیکن باطن کی قوت ظاہری طاقت کی محتاج نہیں، اس لیے رشد و ہدایت کے مسند نشین، تاج و کلاہ، فوج و لشکر کے بغیر اور زر و جواہر کے خزانوں سے بے نیاز ہو کر اپنی دلق مرقع میں اور اپنی شکستہ حصیر پر بیٹھ کر دلوں پر جو حکمرانی کرتے ہیں وہ بادشاہ اور سلاطین نہیں کر سکتے، مولانا الیاس کاندھلوی سید صاحب کی نظر میں دلوں ہی پر حکومت کرنے والے فرمانروا گزرے ہیں، کیونکہ ان کے روحانی آثار و برکات سے اس وقت نہ صرف یہ برصغیر بلکہ اس سے باہر کی دنیا بھی فیض یاب ہو رہی ہے۔

سید صاحبؒ دیوبند کے مشہور عالم اور مفتی مولانا کفایت اللہ کی بھی بڑی قدر کرتے،
اسی لئے کہ اور لوگوں کی طرح وہ بھی ان کو فقیہ الامت تسلیم کرتے، ان کے سفر حضر، سیاسی
جلسوں، فقہی مجلسوں اور نجی صحبتوں میں برابر ملتے رہے، اور ان کے متعلق ان کا تاثر یہ تھا کہ
ان کی ظاہری صورت اور متواضع لباس کی بناء پر قیافہ ان کے فضل و کمال سے حسن ظن پیدا
نہ ہونے دیتا، مگر تھوڑی سی بات سے پتہ چل جاتا کہ اس غلاف کے اندر تلوار کیسی ہے (یادِ رفتگاں ص۳۵۲)
اوپر جن بزرگوں کا ذکر آیا ہے، وہ سید صاحبؒ سے سن میں بڑے تھے، مگر مولانا شبیر احمد
عثمانی (المتوفی ۱۹۴۹ء) ان کے معاصر تھے، ان پر جو ماتمی تحریر لکھی ہے وہ بھی لمبی ہے اور
اس میں ان سے اپنے نصف صدی کے تعلقات اور ملاقاتوں کا ذکر اس طرح کیا ہے، کہ
ان کی بڑی دل آویز تصویر سامنے آجاتی ہے سید صاحبؒ لکھتے ہیں:۔

ان کے تقویٰ کا حال یہ تھا کہ ایک بار عظم گڈھ آئے تو اُن کو چائے پیش کی گئی، لیکن
پینے سے انکار کیا کہ جاپانی پیالی پر جانوروں کی تصویریں بنی تھیں، وہ پاکستان
کے بانیوں میں سے ہیں، لیکن سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ یہ معلوم کرکے تعجب ہوگا، انھوں
نے کراچی میں نہ تو اپنا کوئی خاص گھر بنایا، نہ کسی کی ذاتی کوٹھی پر قبضہ کیا، بلکہ اپنے
بعض عقیدت مند اہل ثروت کے مکان میں رہے، اور اسی مسافرت میں
اس مسافر نے اپنی زندگی گزاردی، سید صاحبؒ کو ان کی تقریر بہت پسند آتی۔
اس لیے کہ اس میں عالمانہ استدلال کے ساتھ بڑے دلچسپ تھے اور لطیفے بھی
بیان کرتے تھے، جس سے محفل کو بڑی دلچسپی ہوتی تھی، وہ ظریفانہ فقرے اس طرح
ادا کرتے تھے، کہ خود نہیں ہنستے تھے، مگر دوسروں کو ہنسا دیتے تھے، ذہانت
طباعی اور بدیہہ گوئی ان کی تقریروں سے نمایاں ہوتی تھی، وہ اکبر کے ظریفانہ

کلام کو اپنی تقریروں میں عمدگی سے کھپاتے تھے، انھوں نے حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے ترجمۂ قرآن پر حواشی لکھے ہیں، ان کے متعلق سید صاحبؒ لکھتے ہیں!

کہ ان حواشی سے مرحوم کی قرآن فہمی اور تفسیروں پر عبور اور عوام کے دل نشیں ہونے کے لیے ان کی قوت تفہیم صدبیان سے باہر ہے، خود مولانا شبیر احمد سید صاحب کو بہت پسند کرتے، اسی لیے ان کے متعلق فرمایا کہ۔

"مجھے ان سے بہت انس ہے، اس لئے کہ یہ علما، اور تعلیم یافتوں کے درمیان ایک مفید اور متوسط کی حیثیت رکھتے ہیں" (یادِ رفتگان معارف پریس اعظم گڈھ، ص ۳۹۲)

سید صاحب بھی اپنی اس تعریف سے خوش تھے، ان کو بھی ان سے بڑا انس رہا، اسلیے ان کی وفات پر لکھا کہ ایسے نادرۂ روزگار صاحب کمال صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں (ایضاً ۴۰۳) کسی اور عالم نے اپنے ہمسر اور معاصر عالم کی ایسی تعریف شاید ہی کی ہو۔

فرنگی محل کے علمائے عقیدت مولانا محمد یونس فرنگی محلی (المتوفی ۱۹۲۲ء) کو دارالمصنفین سے بڑا تعلق رہا جب وہ چوبیس پچیس برس کے تھے، انھوں نے دارالمصنفین کے لئے دو کتابیں روح الاجتماع اور ابن رشد کے نام سے لکھیں، اسی کے بعد جوانی میں ان کی موت ہوگئی تو سید صاحب نے بہت مغموم ہوکر لکھا کہ مرحوم کے دوستوں کو ان سے بڑی توقعات تھیں، خیال تھا کہ ان کی کوششوں سے فرنگی محل کی عقلی اور فلسفیانہ شان پھر دوبارہ زندہ ہو جائے گی، افسوس کہ دستِ اجل نے ان کو امان نہ دی، اناللہ (یادِ رفتگان صفحہ ۲۲)

مولانا عبد الباری فرنگی محلیؒ (المتوفی ۱۹۲۶ء) سے ان کے تعلقات مولانا شبلیؒ کے زمانے سے رہے، پھر طرابلس اور بلقان کی جنگ کے زمانے، کانپور کی مسجد کے ہنگامے، خلافت تحریک اور مسئلۂ حجاز کے سلسلہ میں ان کے ساتھ سیاسی کاموں میں حصہ لیتے رہے، ان کی خوبیوں کی

وجہ سے ان کی ذات گرامی سے بڑی شیفتگی پیدا ہوگئی تھی، اور گو حجاز کے مسائل میں سید صاحبؒ سے ان کا اختلاف ہوگیا تھا، مگر مولانا کی شفقت ان پر آخر وقت تک رہی، اور خود سید صاحبؒ کا اخلاص برابر قائم رہا، وہ ان کی گوناگوں خوبیوں کے معترف تھے، اسی لیے جب ان کی رحلت ہوئی تو عربی کے دو اشعار لکھ کر یہ ظاہر کیا کہ ان کا مرنا ایک آدمی کا مرنا نہیں ہے، بلکہ پوری قوم کی بنیاد کا گر جانا ہے، ان کو وہ مجسمۂ علم و اخلاص اور فرنگی محل کی کہنہ عمارتوں میں فضل و کمال، ایمان و معرفت اور زہد و ورع کی آخری شمع سمجھتے رہے، اسی لیے ۴۰ سال کی عمر میں ان کی وفات پر اس طرح نوحہ کیا۔

"فرنگی محل کے متاخرین میں حضرت استاذی مولانا عبدالحیؒ کے بعد مولانا عبدالباری کی ذات نمایاں ہوئی تھی، جو بزرگ اجداد کی بہت سی روایات کی حامل تھی، ارشاد و ہدایت، وعظ و نصیحت، درس و تدریس، تلاش و مطالعہ، تحریر و تالیف ان کے روزانہ مشاغل تھے، ان دینی علمی مناقب کے ساتھ دین و ملت کی راہ میں ان کا جان فروشانہ جذبہ اور مجاہدانہ اخلاص ہر رنگ شہد انتھا۔"

اپنے ذاتی تعلقات اور مراسم کی وجہ سے ان کی نجی زندگی کے حالات اور سیرت کے اوصاف سے بھی باخبر تھے، اس لیے یہ بھی لکھا کہ۔

"ذاتی اخلاص، جود و سخا، تواضع و انکسار علم کی عزت، صداقت، حق گوئی انکے صفات گران مایہ تھے، وہ بے کسوں کے ملجا، مسافروں کے ماوی، اور تنگدستوں کے دستگیر تھے، عبادت گذار، شب زندہ دار، اور حق کے طلب گار تھے، ہندوستان میں ان کی ذات ذی اقتدار علمار کی حیثیت سے اس وقت فرد تھی۔ (یادِ رفتگان معارف پریس ص ۵۷)

ان کا اثر انگریزی تعلیم یافتوں پر غیر معمولی تھا، جس کا ایک بہت ہی نمایاں ثبوت یہ تھا کہ مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی ان سے بیعت ہو گئے تھے، اسی لیے سید صاحبؒ نے یہ بھی تحریر فرمایا کہ

"جدید تعلیم یافتوں کی سیاسی جد و جہد کو مذہبی تحریک بنا دینا یقیناً ان ہی کا کارنامہ شمار کیا جائے گا، اس لیے ان کی غیر متوقع موت صرف فرنگی محل کا نہیں بلکہ اسلام کا سانحہ ہے، بنا بریں ان کی جوان مرگی ہمیشہ کے لیے تاریخ اسلام کا ایک اندوہناک واقعہ شمار ہوگا، شمع بجھ گئی، مگر اس کے دھوئیں کی سیاہی سے جریدۂ عالم پر یہ ہمیشہ لکھا نظر آئے گا۔

من اگر شمع چو رفتم بزم بہم ساختم   رفتم و از رفتنِ من عالمے تاریک شد

اس ماتمی تحریر کی چند سطروں میں کیسی درد بھری تاثیر پیدا کر دی ہے، ایسے غمناک جذبات کا اظہار طاہر دل اور پاکیزہ قلم ہی کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے، اور یہ دونوں چیزیں سید صاحبؒ کو حاصل تھیں۔

سید صاحبؒ مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی المتوفی ۱۳۶۱ھ کی عزت اس لیے کرتے تھے کہ ان کو معقولات اور منقولات پر یکساں دسترس حاصل تھی، اسی لیے تمام مسائل پر وہ مبصرانہ اور ناقدانہ نظر رکھتے تھے، انھوں نے بھی سید صاحب کو اپنے سے قریب تر پایا، ان کی آخری علالت کے زمانے میں بھوپال سے لکھنؤ تک سید صاحبؒ کا ریل کا سفر ایک ساتھ ہوا سید صاحبؒ سفر میں ان کی خدمت کرتے آئے، اور جب لکھنؤ اسٹیشن پر رخصت ہونے لگے تو سید صاحبؒ سے فرمایا کہ آپ کی زحمتوں اور خدمتوں کا شکریہ اس لیے نہیں ادا کرونگا کہ میں آپ کو اپنے سے علٰحدہ نہیں سمجھتا، اس جملہ میں باہمی یگانگت و مؤانست کی ایک دنیا آباد ہے،

یوپی کے دوسرے علماء کی قدردانی،

دیوبند اور فرنگی محل کے علماء کے ساتھ سید صاحب کی نظر یوپی کے اور خطوں کے علماء کی طرف بھی رہی، مولانا حافظ عبداللہ غازی پوری (المتوفی ۱۹۱۸ء) کے اتباع سنت، طہارت طبع، تقویٰ اور کتاب و سنت کی تفسیر و تعبیر کی مہارت کو نظر تحسین سے دیکھتے رہے، (یادِ رفتگان ص ۱۲) علی گڈھ کے مولانا رشید احمد انصاری (المتوفی ۱۹۲۲ء) کے ان مترجمات کے قدرداں رہے جو وہ عربی کی کتابوں سے کرتے رہے، (ایضاً صفحہ ۵۴) اور جب ۱۹۲۶ء میں مولانا عبدالرحمن نگرامی کی وفات ستائیس برس کی عمر میں ہوئی، تو سید صاحب یہ کہہ کر چیخ اٹھے کہ ہماری جماعت کا لعل شب چراغ گم ہو گیا، اور پھر لکھا کہ آہ کس زبان سے کہیں عبدالرحمن مرحوم دارالعلوم ندوہ نے اپنی تیس برس کی مدت میں جتنے کارآمد اور علم دین کے خادم پیدا کیے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ عبدالرحمن سب میں بہتر تھا، اللہ تعالیٰ نے انکی ذات میں علم و عمل کی ساری خوبیاں جمع کر دی تھیں، یہ ایک ندوی عزیز کی محبت کی ایک سرشارانہ کیفیت ہے، جس سے ان کی پوری ماتمی تحریر بھری ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

گورکھپور کے مولانا ابوالفضل عباسی (المتوفی ۱۹۲۶ء) نے قرآن مجید کا ترجمہ اردو میں کیا، اور پھر جو تاریخ اسلام اور قانون محمدی کی تصنیف کی اس سے ان کی نگاہ میں ان کی عزت تھی، (ایضاً صفحہ ۸۳) مولانا عبدالحئی سہارنپوری (المتوفی ۱۹۲۶ء) کی شہرت اس لئے تھی کہ وہ عربی کے شاعر اور عربی ادب و امثال و محاورات کے بہت بڑے عالم تھے، سید صاحب نے بھی ان کی اس علمی شان کو تسلیم کیا۔ (ایضاً صفحہ ۹۰)

سید صاحبؒ نے جب اعظم گڈھ میں آکر قیام کیا تو وہ مولانا حمید الدین فراہی (المتوفی ۱۹۳۰ء) کے علم و فضل کے بے حد گرویدہ ہوئے، ان کو اپنے عہد کا ابن تیمیہ سمجھتے تھے۔ وہ مولانا شبلیؒ کے ماموں زاد بھائی بھی تھے، اس لیے ان کی قدردانی میں دوآتشہ کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی، ان کا ساتھ ۱۹۱۴ء سے ان کی وفات نومبر ۱۹۳۰ء تک رہا۔

قرآن فہمی میں ان کے فہم، ادراک اور تدبر، عربی میں ان کے فضل وکمال اور فارسی میں ان کی شیوا بیانی سے بہت متاثر ہوئے، ان کی وفات پر تیس صفحے کا جو نثری نوحہ لکھا ہے، وہ یادِ رفتگان کی سب سے لمبی تحریر ہے، اس سے ان کی ذات سے ان کی عقیدت ومحبت کا اظہار ہوگا، اس میں ان کے حالات کے سلسلہ میں جو کچھ لکھ دیا ہے وہی ان کی زندگی کا ماخذ دوسروں کے لیے بنا ہوا ہے، وہ ان کو کیا سمجھتے تھے، وہ ان کی حسبِ ذیل تحریر سے معلوم ہوگا۔ اگر یہ اقتباس طویل ہو جائے تو ناظرین گھبرائیں نہیں، بلکہ ان کے ذوقِ سلیم سے امید ہے کہ وہ اس کو غور سے پڑھیں گے۔

"الصلوٰۃ علی ترجمان القرآن (مفسرِ قرآن کی نمازِ جنازہ) یہ وہ صدا ہے جو ساڑھے چھ سو برس پیشتر مصر وشام سے چین کی دیوار تک ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی نمازِ جنازہ کے لیے بلند ہوئی تھی، حق ہے کہ یہ صدا آج پھر بلند ہو، اور کم از کم ہندوستان سے مصر وشام تک پھیل جائے کہ اس عہد کا ابنِ تیمیہ، ۱۱ نومبر ۱۹۳۰ء (۹ جمادی الثانی ۱۳۴۹ھ) اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔"

یہاں تک تو صرف ان کی موت کی خبر ایک خاص انداز میں دی گئی ہے، پھر ان کے تمام محاسن ومناقب کا ذکر اس طرح کیا ہے،

"وہ جس کے فضل وکمال کی مثال آیندہ بظاہر حال عالمِ اسلام میں پیدا ہونے کی توقع نہیں، جس کی مشرقی ومغربی جامعیت عہدِ حاضر کا معجزہ تھا، عربی کا فاضلِ یگانہ اور انگریزی کا گریجویٹ، زہد وورع کی تصویر، فضل وکمال کا مجسمہ، فارسی کا بلبلِ شیراز، عربی کا سوق عکاظ، ایک شخصیت مفرد لیکن ایک جہانِ دانش، ایک دنیائے معرفت، ایک کائناتِ علم، ایک گوشہ نشین مجمعِ کمال، اک بے نوا سلطانِ ہنر، علومِ عربیہ میں یگانہ، علومِ عربیہ کا خزانہ، علومِ عقلیہ کا ناقد، علومِ دینیہ کا ماہر، علوم القرآن کا واقف، اسرارِ قرآن پاک کا دانائے رموز، دنیا کی دولت سے

نے دنیا اہلِ دنیا سے مستغنی انسانوں کے ردّ و قبول اور عالم کی داد و تحسین سے بے پروا، ادھر گوشۂ علم
کا معتکف اور اپنی دنیا کا آپ بادشاہ، وہ ہستی جو تیس برس کامل قرآن پاک اور
صرف قرآن پاک کے فہم و تدبر، درس و تعلیم میں محو اور ہر شے سے بیگانہ، ہر شغل سے ناآشنا رہی"
سید صاحبؒ کو اس کا افسوس رہا کہ ان کا علم ان کے سینہ سے سفینہ میں بہت کم منتقل
ہو سکا، مسودات کا دفتر چھوڑا ہے، مگر افسوس کہ اس کے چھپنے اور ربط و نظام دینے کا دماغ
اب کہاں، سید صاحب کو یہ بھی دکھ رہا کہ دنیا ان کی قدر و منزلت کو نہ پہچان سکی، اور
ان کے فضل و کمال سے ناآشنا رہی، مگر خود سید صاحب نے ان کا ماتم جس طرح کیا ہے، وہ ماتمی تحریر کا
ایک دل گداز نمونہ ہے، اور ایسی تحریر وہی لکھ سکتا ہے، جس کے دل میں بھی محبت، اصلی عقیدت
اور حقیقی اخلاص ہو، ورنہ تصنع، تکلف اور آورد کے ذریعہ ایسی عبارت نہیں لکھی جا سکتی ہے۔
سید صاحب نے جب یہ تحریر لکھی اُس وقت ان کی عمر چھیالیس سال کی تھی، وہ خود عالم بے بدل
ہوتے جا رہے تھے، اس لیے وہی ایک یگانۂ روزگار کے عارف ہو سکتے تھے، وہ خود علوم و
فنون کے جامع بنتے جا رہے تھے، اسلئے فضل و کمال کی جامعیت کے وہی قدرداں ہو سکتے تھے، انکو ماہر قرآنیات ہونا تھا
اسلئے علوم قرآن کے واقف اسرار اور دانائے رموز کا قدرشناس ان سے بڑھ کر کون ہو سکتا تھا، انکی ان کیفیات کے
اظہار کیلئے جس قلم اور انداز بیان کی ضرورت تھی، وہ انکے ممدوح کی وفات سے خود بخود مل گیا جس سے اسکے پڑھنے والے
ہمیشہ محظوظ ہوتے رہیں گے۔
دہلی کے اور جن علماء سے متاثر رہے، ان میں مولانا عبد الماجد بدایونی المتوفی سنہ ۱۹۳۲ء کا نام بھی نمایاں ہے، وہ
قدر حسانِ زمانہ کی حیثیت سے کرتے تھے، انکے ساتھ سیاسی کاموں میں بھی رہے، مگر انکی اصلی خوبی سید صاحب کی نظر میں یہ تھی
"ان کی ہستی سراپا محبت تھی، خدا سے محبت، رسول سے محبت، آل رسول
سے محبت، اکابر سے محبت، دوستوں سے محبت، کارکنوں سے محبت، اور

عزیزوں سے محبت - (یادِ رفتگان معارف پریس ص ۱۳۹)

صفی الدولہ حسام الملک شمس العلماء نواب سید محمد علی حسن خان نواب سید صدیق حسن خان کے چھوٹے بیٹے تھے، جنھوں نے بیگم بھوپال سے شادی کر لی تھی، اس لئے گھر میں امارت [illegible]تی تھی، مگر سر سید کی جدید تعلیمی تحریک اور ندوۃ العلماء کی مذہبی سرگرمیوں میں شریک رہے، دار المصنفین کے اساسی ارکان میں تھے، آخر میں لکھنؤ میں اکر رہنے لگے تھے، جہاں ہر سنجیدہ تحریک میں ان کا نام سر فہرست رہتا تھا، متعدد مذہبی اور تاریخی کتابوں کے مصنف ہوئے، جن میں شعرا کا ایک تذکرہ، فطرۃ اسلام اور مآثر صدیقی مشہور ہیں، مولانا شبلیؒ کے بے تکلف دوستوں میں تھے، اسی تعلق سے سید صاحبؒ سے ایک خاندانی بزرگ کی حیثیت سے ملتے، تیس برس کی ملاقاتوں میں اپنی بزرگانہ محبت کی وضعداری میں کوئی فرق نہ آنے دیا، سید صاحبؒ نے ہر موقع پر ان کو مجسم اخلاق، حد درجہ پاک باطن، نیک طینت شر و فساد سے نفور اور ہنگامہ آرائیوں سے کوسوں دور، تمول کے باوجود خاکسار، اور علم و فضل کے ساتھ حد درجہ ملنسار پایا، اسی لئے ان کی وفات پر یہ لکھ کر ماتم کیا۔

نور محل کے رہنے والے! تو بڑے باپ کا چشم و چراغ اور ایک بڑے خاندان کا چراغ سحر تھا، ۵ نومبر ۱۹۳۶ء کو تیرا آخری دیدار نصیب ہوا، خیال نہ تھا کہ علم و فضل کا یہ ٹمٹماتا ہوا دیا اتنا جلد بجھ جانے والا ہے، اب تو وہاں ہو گا جہاں نور [illegible] کے سوا ظلمت کا گذر نہیں، صفی الدولہ حسام الملک اب تو وہاں ہے، جہاں کسی کی دولت ہے اور نہ کسی کا ملک ہے، تیرے اعمال نیک کی دولت اور تیرے کار خیر کی مملکت تیرے ساتھ ہے، دعا ہے کہ وہ شہنشاہ علی الاطلاق اپنے ملک لازوال کی دولت جاوید سے تجھ کو سرفراز فرمائے (معارف)

یہ دل کی آواز تھی، جو تحریر میں منتقل ہو گئی،

سید صاحب مولانا ابو بکر شیث (المتوفی سنہ ۱۹۴۲ء) سے جب جب ملے، ان کے ایسا شریف، ایسا نیک باطن، ایسا دور اندیش، ایسا فیاض، ایسا سادہ مزاج، ایسا خوش اخلاق، ایسا باغ و بہار، ایسا خشک و ترکسی اور کو نہیں پایا، ان کی وفات پر جو تحریر لکھی اس میں یہ ان کی یہ بات بہت ہی معنی خیز ہے،

> "موصوف سے میری ملاقات سنہ ۱۹۲۰ء میں تحریک خلافت کے سلسلہ میں ہوئی، یہ ملاقات دوستی اور دوستی اتحاد کی اس منزل تک پہونچ گئی جس کے بعد خیال کی دوئی کا کوئی مرتبہ نہیں رہتا، ایک دفعہ میں نے کہا اور انھوں نے مانا تھا کہ ایک مذہب ہے جس کے دو ہی پیرو ہیں، ایک وہ اور ایک میں، مقصود تقلید و عدم تقلید کے مسائل میں اعتدال سے تھا۔" (یادِ رفتگاں ص ۱۱ - ۲۱)

اس تحریر سے سید صاحبؒ کے مزاج کی اعتدال پسندی اور میانہ روی کا اندازہ ہوگا۔
سید صاحبؒ مولانا معز الدین خیر آبادی (المتوفی سنہ ۱۹۴۳ء) کی فقیہانہ قابلیت کے مداح رہے، مولانا سید محمد عیسیٰ الٰہ آبادی (المتوفی سنہ ۱۹۴۲ء) سے اسلیے محبت کرتے کہ وہ ان کے پیر بھائی تھے، مولوی ضیاء الحسن علوی سابق رجسٹرار انسپکٹر مدارس یو۔پی (المتوفی سنہ ۱۹۴۵ء) سے اس لیے قلبی لگاؤ رکھا کہ ندوہ میں ان ہی کے ساتھ دستار بندی ہوئی، ان کو اپنے تعلیمی عہد محبت کا نخل بار آور سمجھتے تھے، مولانا عمادی ان کے بہت بڑے علمی دوست تھے، وہ ان کی قدر ان کے علمی تبحر کے علاوہ اس لیے کرتے کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اپنی تعظیم و تکریم سے اس قدر غلط فہمی میں مبتلا کر دیتے کہ وہ اپنے ہی کو ان سے بڑا سمجھنے لگتے، مولانا یعقوب بخش قادری بدایونی (المتوفی سنہ ۱۹۴۲ء) سے سید صاحب کی ایسی بے تکلفی تھی، کہ وہ بدایوں سے وہاں کے مشہور پیڑے ڈاک کے ذریعہ سے بھیجا کرتے تھے۔

وہ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی (المتوفی ۱۹۵۰ء) کو دیکھ کر اسی طرح خوش ہوتے جس طرح کوئی یونان کے کسی ماہر سنگ تراش کی سنگ تراشی کے شاہکار کو دیکھ کر خوش ہو، ان کو پہلی دفعہ دیکھا تھا، تو اس کی مرقع آرائی اس طرح کرتے ہیں،

"میں نے موصوف کو سب سے پہلے ۱۹۰۸ء میں نصف صدی پہلے پٹنہ کے اجلاس ندوہ میں دیکھا تھا، بھرا شباب، موزوں حسن و جمال، سفید رنگ، سیاہ خوبصورت داڑھی، سر پر زلفیں، بلند و بالا قامت، لطیف و قیمتی لباس، اس جلسہ کے ہر اجلاس میں نیا جوڑا زیب بدن، کبھی سر پر عمامہ، کبھی ٹوپی، کبھی ترکی ٹوپی، جدھر نکل جاتے، آنکھیں اٹھ جاتیں، انگلیاں اشارہ کرتیں، لوگ ایک دوسرے کو دکھاتے اور بتاتے، اسی طرح میں نے بھی دیکھا اور مجھے بتایا گیا کہ علی گڑھ کے رئیس اعظم ہیں"۔ (یادِ رفتگاں ... معارف پریس اعظم گڑھ، ص ۱۱۴)

اس سراپا میں مثنوی نگاری کا رنگ پیدا ہو گیا ہے یہ سید صاحبؒ نے اپنی جوانی کے عالم میں نہیں لکھا بلکہ اسوقت لکھا جبکہ انکی عمر چھیاسٹھ سال کی ہو چکی تھی ان کا قلم بوڑھا نہیں ہوا تھا، بلکہ جوان اور رعنا ہی نظر آتا تھا، اس وقت اپنی صحت کی کمزوری کی وجہ سے ان کا قلم ان کو چھوڑ رہا تھا، مگر وہ قلم کو نہیں چھوڑ رہے تھے، اسی لئے جب مولانا شروانی پر لکھنے کے لئے قلم اٹھایا تو ان کے قلم کی پرانی چٹخنی اور سحر طرازی ان کا ساتھ دینے لگی جس کا اظہار اس پوری تحریر میں ہوتا ہے سید صاحبؒ سے ان کی دید و شنید اور ملاقاتوں کی مدت نصف صدی تک پھیلی ہوئی ہے، وہ مولانا شبلیؒ کے ساتھ الندوہ کی ادارت کرتے رہے، ندوہ کے جزء بن گئے تھے، دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے صدر رہے، سید صاحبؒ ان سے کس طرح ملتے رہے، ان ہی کی زبانی سنئیے جس سے خود ان کی سیرت کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔

میرا ہمیشہ یہ دستور رہا کہ حضرت الاستاذ مولانا شبلیؒ کے مخصوص احباب اور دوستوں سے بزرگ داشتہ کا تعلق رکھوں اور ہمیشہ ان کے سامنے اپنے کو چھوٹا سمجھوں، چنانچہ مرحوم سے خصوصیت کے ساتھ میری طرف سے خوردانہ اور ان کی طرف سے بزرگانہ تعلق قائم رہا، میں انھیں مخدوم لکھتا، وہ عزیز لکھتے، دارالمصنفین کی تاسیس میں مرحوم کی بزرگانہ حمایت ہمیشہ رہی، دارالمصنفین کے پہلے صدر جسٹس مولوی کرامت حسین اور دوسرے نواب عماد الملک اور تیسرے مولانا شروانی ہوئے، اس تعلق سے بھی ان سے خط و کتابت کا سلسلہ اکثر رہا، ایک دفعہ جب احباب اور بزرگوں کے محفوظ خطوط گنے، تو سب سے زیادہ جن کے خطوط میرے پاس نکلے وہ ان ہی کے تھے، میں نے جب انھیں اس کی اطلاع دی تو اس پر مسرت ظاہر فرمائی، اور لکھا کہ اس میں تعجب کی کیا بات ہے، اس کا الٹا ہوتا تو تعجب ہوتا۔ (یاد رفتگان ... ص ۲۱۴)

یہ تحریر سید صاحبؒ نے اس وقت لکھی جب وہ اپنے زمانے کے بہت ہی مشہور مصنف اور عالم دین ہو چکے تھے، مگر تحریر لکھتے وقت اپنے کو ایک ادنیٰ اور چھوٹا عزیز سمجھنے پر آمادہ کیا۔ اور اپنے زمانے کے علمی بزرگ کے سامنے ہر طرح عجز و نیاز کے ساتھ جھکے نظر آتے ہیں، اسی سے ان کے اسلوب میں بھی خاص جان اور شان پیدا ہو گئی ہے، اس کے بعد جب وہ اپنی تحریر میں ان کی غیر معمولی دلچسپی، قدیم و جدید تعلیم سے ان کی رغبت، تاریخ، سیر اور حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ان کی محبت، اپنے استاذ استاذ العلماء مولانا لطف اللہ سے ان کے لگاؤ، شعر و شاعری سے ان کے پاکیزہ ذوق، قلمی کتابوں سے ان کے شوق، اخلاقی فضائل میں ان کی وضعداری، ملنے ملانے میں ان کی تہذیب و شرافت، نجی مجلسوں میں ان کی لطیفہ گوئی، اور شیریں بیانی، نظام حیدر آباد کی

ملازمت کے زمانے ان کی خودداری، پابندی وضع، ملت اسلامیہ سے محبت مگر سیاست سے کنارہ کشی، بزرگوں کی یادگاروں سے والہانہ شیفتگی کا ذکر کرتے ہیں تو افسانہ نویس یا ناول نگار کی کردار نگاری کے آرٹ میں جو جوہر دکھائی دے سکتا ہے، وہی ان کی اس تحریر میں دکھائی دیتا ہے، پھر اس کے پڑھنے میں لطف اس لئے بھی دوبالا ہو جاتا ہے، کہ یہ ایک خاص رنگ کے یگانۂ روزگار کی کہانی ایک دوسرے رنگ کے یگانۂ روزگار کی زبانی ہے، کیسی حسرت سے لکھتے ہیں کہ

"علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی میٹنگ میں سب سے آخری دفعہ ان سے ملا تو میں نے دیکھا کہ ان کا تیر سا قد نیم کمان بن چکا تھا، وہ چہرہ جو گلاب سا تر و تازہ اور شاداب رہتا تھا، پژمردہ اور مرجھایا تھا، اسی وقت دل نے کہا کہ یہ چراغ سحری بجھا ہی چاہتا ہے، (یاد رفتگاں . . . معارف پریس اعظم گڑھ ص ۴۱۳)

ان کی وفات چھیاسی سال کی عمر میں ۱۹۵۰ء میں ہوئی تو سید صاحبؒ کراچی جا چکے تھے، وہیں، یہ خبر سنی، لکھتے ہیں کہ

"اگست کی آخری تاریخ تھی کہ لاہور کے کسی اخبار میں سرسری طور سے یہ خبر پڑھی کہ مولانا شروانی کا انتقال ہو گیا، خبر پڑھ کر دل دھک سے ہو گیا۔

اور اپنی دوری، مہجوری اور مجبوری پر بڑا افسوس آیا" اور آخر میں لکھتے ہیں۔

مرحوم اپنے دور کے خاتم تھے، اب اس جوہر شرافت کا نمونہ کبھی دیکھنے میں نہ آئے گا، اب گلستان کا رنگ اور ہے، چار دانگ میں ہوائیں اور سمت کی چل رہی ہیں، اب ریاست اور ریاست کے ساتھ کمالات و فضائل کا یہ اجتماع گذشتہ تاریخ کا ورق بن کر رہ جائے گا، مگر انشاء اللہ یہ ورق یادگار رہیگا

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اس آخری ٹکڑے میں کیسی خلش ہے، جو اسی کے دل میں ہو گی جس میں خود جوہر شرافت جگمگاتا رہتا ہے۔

بہار کے علماء سے تعلق خاطر

سید صاحب بہار کے تھے، اس لئے فطری طور پر ان کو بہار کے علماء سے لگاؤ رہا۔ ان کے وطن دیسنہ کے ۔ ۔ ۔ ۔ پڑوسی گاؤں استھانواں کے مولوی عبد الغنی وارثی عربی کے فاضل تھے، انگریزی کی تعلیم ایم - اے - او کالج علی گڈھ میں پائی، آخر میں نظام حیدرآباد کی ریاست میں اسسٹنٹ اکاونٹنٹ ہو گئے تھے، مگر اپنے علمی ذوق کی بناء پر وہاں علامہ شبلی نعمانی، مولانا عبد الحلیم شرر اور عزیز مرزا کی علمی بزم میں شریک رہتے، ان کو ترجمہ کرنے میں بڑی مہارت پیدا ہو گئی تھی، ہندی قصہ یوذاسف بلوہر کا ترجمہ اردو میں کیا پھر عربی میں، اخلاق پر ہندوشاہ کی الکلم الروحانیہ فی الحکم الیونانیہ کو بھی اپنی زبان میں منتقل کیا، الف لیلہ ابن شداد کی سیرۃ، اسٹینلی لین پول کی مورس ان اسپین کے ترجمے بھی اردو میں کئے۔

سید صاحب نے یہ چند سطریں ان کے لئے جو لکھ دی ہیں، وہی ان کی علمی سرگرمیوں کا حاصل ہے، ان کے دو بیٹے اچھے عہدوں پر مامور رہے، لیکن وہ اپنے مرحوم والد بزرگوار کی علمی حیثیت سے بیگانہ رہے۔

بہار میں ان کو کوئی جوہر قابل مل جاتا تو اپنی تربیت میں لے لیتے، ان ہی میں مولوی ابو الحسنات ندوی تھے، اشرف پور ضلع پٹنہ کے رہنے والے تھے، انھوں نے ندوہ کی تعلیم ختم کی تو سید صاحبؒ نے ان کو دارالمصنفین بلا لیا، یہاں رہ کر انھوں نے "ہندوستان کی اسلامی درسگاہیں" لکھی، اور خلافت تحریک کے

زمانہ میں ترک اور خلافت کے نام سے ایک رسالہ بھی قلمبند کیا ۔۔۔ طویل علالت کے بعد ۱۹۲۴ء میں ان کی وفات ہو گئی، تو سید صاحب بہت دلگرفتہ ہوئے اور لکھا کہ وہ ہماری کوششوں، ندوہ اور دارالمصنفین کی تعلیم و تربیت کی بہت بڑی کمائی تھے، ان کی موت نے ہماری مجلس کو وہ صدمہ پہونچایا جس کی تلافی شاید بہت دنوں تک نہ ہو سکے، ان سے ہم بڑی ۔۔۔ توقع رکھتے تھے،

(یادِ رفتگان ۔۔۔ معارف پریس اعظم گڈھ صفحہ ۵۳)

پھلواری شریف میں سید صاحبؒ نے اپنی ابتدائی تعلیم پائی، پھر وہاں کی خانقاہ مجیبیہ سے ان کے خاندان والوں کے بڑے روحانی تعلقات رہے، خود سید صاحبؒ وہاں کے بزرگوں کی دینی عظمت کے قائل تھے، اس لئے ۱۹۲۴ء میں جب وہاں کی خانقاہ کے سجادہ نشین حضرت مولانا بدرالدینؒ کی رحلت ہوئی تو بہت دلگیر ہو کر لکھا۔

حضرت مولانا شاہ بدرالدین سجادہ نشین پھلواریؒ، اس عہد کے جنید و شبلی تھے، ان کا زہد و ورع، زاہدت و اتقاء، علم و عمل، صورت و سیرت اور ہر چیز نمونۂ سلف تھی، کم و بیش چالیس برس تک یہ علم و عرفان کی شمع صوبہ بہار میں روشن رہی، اور اس کی روشنی دور دور تک پھیلتی رہی، ان کے شب و روز کے چوبیس گھنٹے ذکر و فکر اور مطالعۂ کتب کے سوا اور مشاغل میں کمتر صرف ہوتے تھے، ان کی نشست گاہ ایک کتب خانہ تھی، ان کے چاروں طرف کتابوں کا انبار لگا رہتا تھا، اور اس کے بیچ میں یہ زندہ کتب خانہ جلوہ فرما رہتا تھا، اس

عہد میں وہ ایک ہستی تھی، جو ظاہر و باطن علم و معرفت، حقیقت و شریعت کا مجمع البحرین تھی، اور جس سے ہزاروں اور لاکھوں علم و معرفت کے پیاسے سیراب ہوتے رہتے تھے، پھلواری کا سجادہ اس بزرگ ذات کی رونق افروزی سے چشمۂ خورشید تھا، افسوس کہ یہ آفتاب ہمیشہ کے لیے ڈوب گیا" (یادِ رفتگاں، صفحہ ۵۲)

کیسی ڈوبی تاثیر کے ساتھ بہار کے جنید و شبلی کی سیرت کی مرقع آرائی کر دی ہے، ایسی پاکیزہ تحریر لکھنے کے لئے قلم کی سیاہی کے پاکیزہ اور دل کی ہر دھڑکن کے لیے پاکیزہ ہونے کی ضرورت ہے تب ماتمی اسلوب بھی پاکیزہ ہو سکتا ہے۔

۱۹۳۶ء میں مولوی نورالہدیٰ ندوی کی وفات بہت کم عمری میں ہوئی، ندوہ سے فراغت حاصل کر کے مدرسہ الٰہیات کانپور میں تکمیل کی، پھر بی۔ اے آنرز کا امتحان پاس ہوئے کلکتہ میں ایک اخبار کے اڈیٹر کی حیثیت سے کام شروع کیا، اور جب ان کی علمی زندگی کی ترقی سے توقعات کے پورے ہونے کے دن آئے تھے، تو وفات پا گئے، سید صاحبؒ نے بہت ہی ملول ہو کر لکھا ہے۔

ایں ماتم سخت است کہ گویند جوان مرد

وہ مولانا سلیمان اشرف کے اوصاف کے بڑے مداح رہے، جو بہار شریف ضلع پٹنہ کے ایک محلہ میر داد کے رہنے والے تھے، ساری عمر علی گڑھ یونیورسٹی میں دینیات کے ایک استاد کی حیثیت سے گذاری ۱۹۳۹ء میں ان کی وفات ہوئی تو سید صاحبؒ نے ان پر جو اپنی ماتمی تحریر لکھی، اس میں دل کھول کر ان کے محاسن و مناقب بیان کئے، کہ وہ خوش اندا

ش لباس، خوش طبع، نظافت پسند، سادہ مزاج، بے تکلف تھے، ان کی سب سے بڑی خوبی
ن کی خودداری اور عزت نفس کا احساس تھا، ان کے یہاں امراء اور ارباب جاہ کا تانتا لگا رہتا تھا،
انھوں نے کبھی کسی کی خوشامد نہیں کی، اور نہ ان میں سے کسی سے دب کر یا جھک کر ملے جس سے
ے برابری سے ملے، اور اپنے عالمانہ شان و وقار کو پوری طرح ملحوظ رکھ کر ملے، علی گڑھ کے
سیاسی انقلابات کی آندھیاں بھی ان کو اپنی جگہ سے ہلا نہ سکیں، وہ نہایت فیاض کشادہ دست
ور سیر چشم تھے، ان کی مجلس سدا بہار تھی، خود بھی سدا بہار تھے، ان کے مذہبی خیالات علمائے بریلی
کے مطابق تھے پھر بھی ان کی ملاقات اور میل جول ہر خیال کے لوگوں سے تھا، تحریر و تالیف کا بھی
ذوق تھا، خسرو کی ایک مثنوی پر مقدمہ لکھا ہے، حج کے مسائل اور عربی کے فضائل پر دو رسالے
بھی لکھے، عربی فیلالوجی پر ایک کتاب مبین کے نام سے لکھی، سید صاحب علماء کے طبقہ میں سے کسی کی
جو تعریف لکھتے ہیں تو خود ان کو فخر محسوس ہونے لگتا ہے کہ انکی جماعت میں کیسے کیسے نادرۂ روزگار
پیدا ہوتے رہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ سید صاحب قرب مکانی، اتحاد زمانی اور شدت ہم ذوقی کے لحاظ سے
مولانا سجاد (المتوفی ۱۹۴۰ء) نائب امیر شریعت بہار سے زیادہ متاثر تھے، تو صحیح ہوگا، ان کی
وفات کی خبر سنی تو لکھتے ہیں۔

"دل کو یارائے ضبط نہ رہا، آنسوؤں کے چند قطرے زمین پر گرے، وہ زمین
جو اب مرنے والے کی خواب گاہ ہے، ابھی قلب میں یہ ہمت بھی نہیں کہ جی بھر کے
ماتم کروں، اور دل کے شیون کو سپرد قلم۔

دریں آشوب غم عذرم تنبہ گر تا لہ زن گریم
جہانے را جگر خون شد ہمیں تنہا نہ من گریم"

مرنا اور جینا دنیا کے روزانہ کے کاروبار ہیں، کون نہیں مرا، اور کون نہیں مرے گا، آج وہ کل ہماری باری ہے، اس پر بھی عزیزوں اور دوستوں کی موت پر رونے والے روتے ہیں، ان کے دائمی فراق پر ماتم اور فریاد کرتے ہیں ان کی ایک ایک خوبی کو یاد کرکے ان کا نوحہ پڑھتے ہیں، عام حالت یہی ہے، لیکن بعض موتیں ایسی بھی ہوتی ہیں، کہ ان کی خبر سن کر زبان بند ہو جاتی ہے، آنسو سوکھ جاتے ہیں، دل کی حرکت بڑھ جانے کے بجائے گھٹ جاتی ہے، اندر اندر گھٹن محسوس ہوتی ہے، مگر جی نہیں چاہتا کہ کچھ بول کر دل کی بھڑاس نکالیے اور آنسو بہا کر غم ہلکا کیجیے، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد مرحوم کے سانحہ کا مجھ پر بالکل یہی اثر ہوا، دن بیت گئے، ہفتے گذر گئے مہینے ختم ہوگئے، مگر زبان نہ کھلی اور دل کی امانت قلم کے سپرد نہ ہو سکی، عزیزوں اور دوستوں کو تعجب ہوا کہ میرا قلم جو احباب کے سوگ میں ہمیشہ اشک ریز رہتا ہے، اس پہلی دفعہ وہ اپنے فرض کو کیوں بھولا ہوا ہے، مگر یہ کیسے بتاؤں کہ اس ناگہانی اور غیر متوقع غم سے مجھے کیوں چپ سی لگ گئی، ہر چند زبان خاموش تھی، لیکن کئی دن تک سوتے جاگتے، مرحوم کی صورت آنکھوں میں پھرتی، اور خواب میں نظر آتی رہی۔ فدمع العین ویحزن القلب ولا نقول الا ما یرضی ربنا وانا بفراقک لمحزونون۔ (یادرفتگان۔ ص ۲۱۳)

یہ کیسی دردناک تحریر ہے، سید صاحب کے شیون وفغان کے اظہار کا یہ بھی ایک ایک طریقہ تھا، اس میں درد کے ساتھ اخلاص، تاثیر کے ساتھ حقیقت اور تڑپ کے ساتھ اصلیت بھی ہے، وہ درد آشنا دل ہی کچھ ایسا رکھتے تھے، کہ بے تاب اور مضطرب ہو کر

تڑپ جاتے تھے، وہ جب مولانا ابوالمحاسن سجاد کے محاسن لکھنے لگے تو ان کی ایک ایک خوبی
ان کو یاد آئی، اور اس کو اس طرح سمیٹ کر قلمبند کیا ہے کہ ان کی یہ ماتمی تحریر اپنے بیان
کے لحاظ سے شاہکار بن گئی ہے، ان کی تواضع میں بلندی، سادگی میں بناؤ، خاموشی میں
گویائی، حال میں قال، قال میں سراپا حال، قوت عمل، ذوق سیاست، معاملہ فہمی، حاضر علمی
بے نیازی، استغنا، عسرت بھری زندگی کے باوجود مسلمانوں کی متحدہ تنظیم کی دھن اور
بے پناہ اخلاص کی تصویر کھینچنے کے ساتھ لکھتے ہیں کہ عقیدت کی یہ چند سطریں ان کے دیرینہ نیازمند
کی طرف سے یادگار اوراق رہیں، تو محسن کے شکریہ کا بار اس کے کندھے سے کم ہو، سید صاحب
نے ان کی زندگی کا یہ روح فرسا واقعہ بھی لکھا ہے کہ ان کا لڑکا مرض الموت میں تھا، کہ مسلمانوں
کی ایک ضرورت ایسی سامنے آئی کہ باپ بیٹے کو چھوڑ کر سفر پر روانہ ہو گیا، واپس آیا تو بیٹا
دم توڑ رہا تھا، پوری تحریر میں یہی سوگوارانہ فضا قائم ہے۔

مولانا حاجی معین الدین سید صاحب سے دس برس چھوٹے تھے، ندوہ سے فارغ ہو کر
بتیس تینتیس سال کی عمر میں دار المصنفین آگئے، اور یہ معلوم کرکے انتہائی تعجب ہوگا کہ یہاں ایک
دو سال کے قیام میں دار المصنفین کے لیے دو کتابیں، خلفائے راشدین
اور مہاجرین حصہ اول لکھیں جو بہت مقبول ہوئیں، ایک سال کے بعد یہاں سے چلے گئے،
مختلف جگہوں کی ملازمت کے بعد آخر میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے پرنسپل ہو گئے تھے،
اور اسی عہدہ پر تھے کہ پچاس سال کی عمر میں وفات پا گئے، ان کا وطن سید صاحب کے وطن
دیسنہ کے قریب گیلانی اور استھانواں تھا، ان کی وفات پر ان کا ماتم یہ لکھ کر کیا کہ خاموش
طبیعت، ملنسار، متواضع، نیک دل مجموعۂ فضل و کمال و اخلاق تھے،

<u>بنگال کے علمائے</u> | یو۔پی اور بہار کے علماء کے ساتھ بنگال کے علماء کی طرف بھی ان کی

نظر اٹھی رہی، کلکتہ کے شمس العلماء حافظ نذیر احمد (المتوفی ۲۲ ۱۹۴۸ء) کی وہ عزت اس لئے کرتے کہ ان کو ہندوستان کے گوشے گوشے کے موتیوں جواہرات سے ان کو واقفیت تھی، عجائب خانہ کلکتہ کے آثار قدیمہ کی تحقیق کا کام بھی ان کے سپرد تھا، ان کی وفات پر لکھا کہ وہ بنگال کے ان چند ممتاز علماء میں تھے، جن پر اس صوبہ کو ناز تھا۔

ڈھاکہ کے حکیم حبیب الرحمٰن (المتوفی ۱۹۴۷ء) سے سید صاحبؒ کو انس اس لئے رہا کہ وہ مولانا شبلیؒ کے دوستوں میں تھے، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے شاگرد اور عاشق رہے کانپور میں عربی تعلیم حاصل کرنے کے بعد طب حکیم عبدالمجید دہلوی سے پڑھی، فطرت کے خزانے سے وہ ایک ذہین اور لطیف دماغ اپنے ساتھ لائے تھے، اپنے اس فکری ذوق کی مدد سے تاریخ و ادب کی کتابیں پڑھیں، اس سلسلہ سے مولانا شبلیؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، ڈھاکہ سے المشرق نام کا ایک ہفتہ وار اخبار نکالا اور پھر جادو کے نام سے ایک ادبی اور علمی رسالہ بھی جاری کیا، ان کے قلم میں بڑی لطافت تھی، سید صاحبؒ ان کی طرف اس لئے بھی مائل ہوئے کہ مولانا محمد حسین آزاد کی نقالی کسی سے تھوڑی بہت ہو سکی، تو وہ حکیم صاحب ہی تھے، ان کو اردو ادب اور بنگال کی تاریخ سے خاص ذوق تھا، سکوں کے جمع کرنے کا بھی شوق رہا، وہ حاذق طبیب بھی تھے، صورت دیکھ کر اور حال سن کر مرض بتا دیتے تھے، سید صاحبؒ نے ایک بار لکھنؤ ریڈیو پر تقریر کی، ڈھاکہ میں حکیم صاحب نے ان کی آواز سنی، تو لکھ بھیجا کہ ان کی آواز ضعف قلب کا اعلان کر رہی تھی، اس کی جلد خبر لیں، اور واقعی اس کے بعد ان پر قلب کا حملہ ہوا، ان کی وفات پر انھوں نے ان کا ماتم اس طرح کیا۔

"اے حبیب! دوستوں نے تمہارے لئے مرثیے لکھے، احباب نے تمہارے فراق میں آہ جگر سوز کھینچی، جاننے والوں نے تمہارے اوصاف گنائے، ماننے والوں نے

تمہارے احسانات یاد کیے، مگر تم اس دنیا میں ہو جہاں اس دنیا کی مدح و ستائش کی حکایتیں نہیں پہونچتیں مغفرت کی دعائیں تمہارے لیے ہیں، غفور رحیم ان کو قبول فرمائے۔

سید صاحب کی ماتم گساری کا یہ انداز بیان بھی تھا، جس میں کیسا درد بھرا ہوا ہے۔

مولانا ابو البرکات عبد الرؤف دانا پوری (المتوفی سنہ ۱۹۴۸ء) جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، صوبہ بہار کے قصبہ دانا پور ضلع پٹنہ کے رہنے والے تھے، مگر کلکتہ میں جا کر سکونت پذیر ہو گئے تھے، سید صاحب نے نکاح و طلاق کے مسئلہ پر ان کی ایک تحریر کا رد بھی کیا، مگر پھر سیاسی جلسوں میں ان کا ساتھ رہا، تو ان کی عزت کرنے لگے، ان کی وفات پر ان سے اپنی عقیدت کا اظہار یہ لکھ کر کیا کہ وہ زمانہ کی ضروریات اور عصری خیالات و افکار سے پوری طرح آگاہ تھے، اور ان علماء میں تھے، جو قدیم علوم و اعتقادات حقہ کو جدید خیالات و افکار سے تطبیق دینے کی قدرت رکھتے ہیں، پھر یہ بھی لکھا کہ وہ ایک ممتاز طبیب، ایک مشہور عالم، ایک خوش بیان خطیب اور ایک مفکر ہونے کے ساتھ مصنف بھی تھے، ان کی تصنیفات میں سب سے اہم کتاب اصح السیر ہے، جو افسوس ہے کہ ان کی وفات سے ناتمام رہی۔

ٹونک کے علماء | ٹونک کے علماء سے بھی سید صاحبؒ کی راہ و رسم رہی مفتی محمد عبد اللہ ٹونکی (المتوفی سنہ ۱۹۳ء) لاہور کے اورینٹل کالج میں رہنے کے بعد دار العلوم ندوہ کے مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے، اس لیے ان کی لیاقت و قابلیت سے براہ راست واقفیت تھی، وہ ندوہ سے مدرسۂ عالیہ کلکتہ چلے گئے تھے، وہاں بیمار ہوئے تو اپنے لڑکے مفتی انوار الحق ناظم و مشیر تعلیمات بھوپال کے پاس چلے گئے، وہیں وفات پائی، لاہور میں انجمن مستشار العلماء سے بھی وابستہ رہے، عربی کی درسی کتابوں پر حواشی بھی لکھے تھے، ان کی وفات پر سید صاحبؒ نے لکھا کہ مرحوم عربی درسگاہوں کی

قدیم تعلیم کے بہترین نمونہ تھے، ہندوستان کے مشاہیر علماء میں ان کا شمار تھا۔

سید صاحب کو مولانا حکیم برکات احمد بہاری ٹونکی (المتوفی ۱۹۲۸ء) سے اس لئے جذباتی لگاؤ رہا کہ وہ ضلع پٹنہ ہی کے رہنے والے تھے، تعلیم پاکر ٹونک گئے، تو وہیں سکونت پذیر ہوگئے، والی ٹونک نے ان کی پوری قدردانی کی، اور ان کو اپنی ریاست کا فخر سمجھتے تھے، سید صاحب ان کی قدر، تصوف میں ان کی کتاب انہار اربعہ، فلسفہ میں القول الصائب فی تحقیق الوجود الرابطی اور اعلام الکلام فی تحقیق الاجسام کلام میں بر حاشیہ شرح مواقف حدیث میں حاشیہ بر جامع ترمذی کی وجہ سے کرتے، ان کی وفات پر اپنے غمگین جذبات کا اظہار اس طرح کیا کہ مرحوم نہ صرف اپنے علم و فضل میں بلکہ اپنے محاسن اخلاق میں بھی پرانے بزرگوں کی شان رکھتے تھے، کتب بینی کا یہ عالم تھا، کہ وہ رات بھی جس میں ان کی وفات ہوئی مطالعہ سے ناغہ نہ گئی، نوجوان دنیا ان بوڑھے بزرگوں کی نظیر و مثال پیدا نہ کر سکے گی۔

مفتی محمد انوار الحق ٹونکی المتوفی ۱۳۶۱ھ مفتی محمد عبداللہ ٹونکی کے لڑکے تھے، بھوپال میں وزیر تعلیم اور وزیر بھوپال رہے، ان کی وفات پر سید صاحب نے لکھا کہ صاحب علم اور محب دین تھے، ان کی علمی خدمات، تحریری مجاہدات بھی خاص ذکر کے قابل ہیں، ان کی تاریخ ابو البشر، اثبات واجب الوجود اور دوسری مذہبی کتابیں تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے بہت مفید ثابت ہوئیں۔

مولانا محمد سورتی المتوفی ۱۹۴۲ء جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، سورت کے رہنے والے تھے، مگر ان کی شادی ٹونک میں ہوئی، بڑے لائق اور فاضل عالم تھے، مگر اپنے استغنائے مزاج کی وجہ سے کہیں ایک جگہ مستقل طریقہ سے نہیں رہے، جامعہ ملیہ میں معلم تھے، پھر بنارس کے جامعہ رحمانیہ چلے آئے، پھر بمبئی کے ایک اہل حدیث کے مدرسہ میں حدیث کا درس دینے لگے، ان کو قلمی کتابوں کا بڑا شوق تھا، ان کی تلاش میں پٹنہ، رامپور، کلکتہ، حیدرآباد کا

سفر کیا کرتے تھے، وفات علی گڈھ میں ہوئی، بڑے غالی قسم کے اہل حدیث تھے، پھر سیدصاحب ان کے علم و فضل کی وجہ سے ان کے بڑے قدردان رہے، اسی لیے ان کی وفات پر یہ لکھ کر ماتم کیا کہ اس عہد کے مستثنیٰ دل و دماغ اور حافظ کے صاحب علم تھے، جہاں تک میری اطلاع ہے، اس وقت اتنا وسیع النظر اور وسیع المطالعہ کثیر الحافظہ عالم موجود نہیں، صرف و نحو، لغت، ادب، اخبار، انساب اور رجال کے اس زمانہ میں درحقیقت وہ امام تھے، اس عہد میں ان کی نظیر نہیں ہم کتاب دیکھتے تھے، وہ ان کے حافظہ کی قید میں آجاتی تھی، سینکڑوں نادر عربی قصائد، ہزاروں عربی اشعار و انساب نوک زبان تھے، ان کو دیکھ کر یقین آتا تھا کہ ابتدائی اسلامی صدیوں میں علماء ادباء اور محدثین کی وسعت حافظہ کی جو عجیب و غریب مثالیں تاریخوں میں مذکور ہیں یقیناً صحیح ہیں، ایک عالم یا ایک مصنف اپنے معاصر عالم اور مصنف کی مدح و ستائش میں ایسی فراخدلی کم دکھاتا ہے، جو سید صاحب نے اپنی مذکورۂ بالا تحریر میں دکھائی ہے،

مولانا حیدر حسن ٹونکی متوفی جولائی ۱۹۳۱ء تقریباً پندرہ سال تک دارالعلوم ندوہ میں شیخ الحدیث رہے، اس لئے سید صاحب ان سے اور وہ ان سے بہت قریب رہے اس لیے ان کے علم و فضل سے اچھی طرح واقف ہوئے، ان سے برابر علمی گفتگو بھی کی، وہ ان کی قابلیت اور صلاحیت کے قائل ہوئے، ان کا علمی خاندان بھی علم و فن کا قدردان تھا، ان کے بڑے بھائی مولانا محمود حسن خاں تھے، جن کی معجم المصنفین بڑی مقبول ہوئی، مولانا حیدر حسن خاں کی وفات پر سید صاحب نے یہ لکھا کہ مرحوم بڑے جامع العلوم تھے، علوم عقلیہ اور نقلیہ کے دو یکساں ماہر تھے، اپنے علم و فضل کے باوجود بے حد منکسر المزاج خاکسار، بے حد متواضع، اتباع سنت اور پابندی شریعت میں ممتاز تھے، ان کی نماز خضوع و خشوع اور سکون

طمانیت کی تصویر ہوتی تھی، لکھنؤ کے اکثر اہل علم ان کے معترف اور مداح رہے، اور مسائل میں ان کا فیصلہ قول فیصل کا حکم رکھتا تھا۔

خطۂ پنجاب کے علماء مولانا قاضی محمد سلیمان منصور پوری المتوفی سنہ ۱۹۳۰ء پٹیالہ میں جج رہے، ندوۃ العلماء کے دیرینہ رکن تھے، اسی واسطے سید صاحبؒ سے تعلقات پیدا ہوئے، جب دونوں ملتے تو سیرۃ، جدید مناظرات، کلام اور محاسنِ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر ایسی گفتگو رہتی کہ بقول سید صاحبؒ اس لطف میں تھوڑی دیر کے لیے ہر چیز کو بھول جاتے، اسی محبت میں وہ دار المصنفین بھی آئے، ایک بار حج کر چکے تھے، دوسری بار حج کے لیے گئے تو واپسی میں جہاز ہی پر وفات پائی، جس کے بعد سید صاحبؒ نے ان پر بہت ہی غمناک تحریر لکھی کہ وہ علم و عمل، زہد و کمال، اور فضل و ورع کے جامع تھے، روشن دل اور روشن دماغ دونوں تھے، ان کے جدید و قدیم دونوں خیالات حد اعتدال پر رہے، عربی زبان اور علوم دین کے مبصر عالم تھے، توریت و انجیل پر ان کی فاضلانہ اور ناقدانہ نگاہ تھی، غیر مسلموں سے برابر مناظرہ کرتے، مگر ان کے مناظرہ کا طرز سنجیدگی، متانت اور عالمانہ وقار کے ساتھ تھا، مسلکاً اہلِ حدیث تھے، مگر اماموں اور مجتہدوں کی عزت دل سے کرتے، ان کی مستقل تصنیفات میں رحمۃ للعالمین، الجمال والکمال، تفسیر سورہ یوسف اور سفرنامہ حجاز یادگار ہیں، چھوٹے بڑے بیسیوں رسائل بھی لکھے، لیکن سب سے زیادہ مقبولیت رحمۃ للعالمین کو حاصل ہوئی، مدرسوں میں داخل کی گئی، لوگوں نے ذوق و شوق سے اسکو پڑھا، خدا رحمۃ للعالمین کے مصنف کو اپنی رحمت عالم سے نوازے۔

اس تحریر سے بھی سید صاحب کی علمی فراخدلی کا اظہار ہوتا ہے۔

وہ شملہ کے مولوی غلام محمد المتوفی سنہ ۱۹۴۳ء کے اس لئے معترف تھے کہ جوانی میں

وہ تارک الدنیا ہو کر جنگلوں میں رہا کرتے، مگر ندوۃ العلماء کی تحریک سے ایسے متاثر ہوئے کہ دوبارہ دنیا میں داخل ہوئے، اور اس کے لئے ہندوستان کی گلی گلی کی خاک چھانی، ان کی وفات پر سید صاحب نے لکھا کہ وہ بڑے پُرجوش مقرر، روشن خیال عالم اور صاحبِ عزم محنتی تھے، ستر برس کی عمر میں بھی، ان کی محنت جوانوں کو شرماتی تھی۔

مولانا عبد القادر قصوری المتوفی ۱۹۴۲ء سید صاحب کے ساتھ خلافت کی تحریک اور وفد حجاز میں ساتھ رہے، ان ہی کے ساتھ مکلا، سوڈان، جدہ اور قاہرہ کا سفر کیا، ان کے مشوروں کے بے حد قائل تھے، وہ مسلکاً اہلِ حدیث تھے، مگر سید صاحب ان کی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے ان کے بڑے قدر دان رہے، ان کی وفات ہوئی تو ان کو بڑا صدمہ ہوا، اور اسی حال میں لکھا کہ، قصور ضلع لاہور ان کا وطن تھا، وہیں وکالت کرتے تھے، مگر عربی کے عالم، دینیات کے بھی فاضل تھے، مولانا ابو الکلام آزاد کے الہلال والی تحریک سے ان کو ایسی دلچسپی تھی کہ اس کے لیے انھوں نے بہت کچھ نثار کیا، نہایت دیندار، متواضع ملنسار، پابندِ وضع، علامہ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم کی تصانیف کے بڑے شائق تھے، ان ہی کی تحقیقات پر ان کا عمل تھا،

مولانا ثناء اللہ امرتسری المتوفی ۱۹۴۸ء بڑے غالی قسم کے اہلِ حدیث تھے، گو سید صاحب سے ان کے برابر خوشگوار تعلقات رہے، وہ ندوہ کے بھی اکثر رکن ہوئے۔ تحریکِ خلافت جمعیۃ العلماء کے بعض اجلاسوں، وفد حجاز اور حج کے سفر میں بھی ان کا ساتھ رہا، ان کے حقیقی حریف مولانا عبد العزیز خطیب گوجرانوالہ مصنف اطراف بخاری تھے، دونوں کے تحریری مناظرہ میں، سید صاحب نے مولانا عبد العزیز کا ساتھ دیا، اور پھر وہ برابر ... مولانا ثناء اللہ کو لکھتے رہے کہ وہ آمین اور رفع یدین وغیرہ پر وقت نہ ضائع کیا کریں

مگر اس کے باوجود آخر وقت تک دونوں کی راہ و رسم میں خوشگواری رہی، لاہور کے ایک سفر میں امرتسر جاکر ان کے پاس دو دن قیام بھی کیا، اور جب ان کی وفات ہوئی تو لکھا کہ مرحوم اسلام کے بڑے مجاہد سپاہی تھے، زبان اور علم سے اسلام پر جس نے بھی حملہ کیا، اسی کی مدافعت میں جو سپاہی سب سے آگے بڑھا، وہ وہی ہوتے، اللہ تعالیٰ اس غازی اسلام کو شہادت کے درجات و مراتب عطا فرمائے۔

<u>اجمیر کے عالم</u> | اجمیر کے عالم مولانا معین الدین اجمیری المتوفی محرم ۱۳۵۹ھ سے بہت متاثر تھے اسی لیے خلاف معمول ان پر بڑی لمبی تحریر لکھی، اس لیے کہ ان کو ذات نبویؐ سے بڑا عشق رہا، اور ان کے استغنا، رجوع الی اللہ اور توکل کی وجہ سے اجمیر میں ان کی بڑی مقبولیت تھی، ان کی والدہ دانا پور ضلع پٹنہ کے ایک نومسلم خاندان سے تھیں، ان کا خاندان بھی نومسلم راجپوت تھا، ان کے والد جلیل الدین اترپردیش کے رہنے والے تھے، ریاست ٹونک میں وہاں کے سکریٹری ہو گئے تھے، مولانا معین الدین اجمیری کی پیدائش دیولی (راجپوتانہ) میں ہوئی، انھوں نے تعلیم مولانا برکات احمد ٹونکی سے پائی، ریاضی کی تعلیم مولانا لطف اللہ سے حاصل کی، تعلیم پانے کے بعد بڑے اچھے مناظر ہوئے، آریوں اور رامپور میں مولانا عبد الوہاب فلسفی سے مناظرے کرکے اپنی قابلیت کی دھاک جما دی تھی، لاہور کے مدرسہ نعمانیہ میں صدر مدرس ہوئے، پھر اجمیر میں سکونت اختیار کرلی، وہاں نظام حیدرآباد کی مالی امداد سے ایک مدرسہ معینیہ عثمانیہ قائم کیا، وہاں اختلاف ہوا تو دوسرا مدرسہ دار العلوم حنفیہ صوفیہ قائم کیا، یہاں بھی اختلاف ہوا تو اس سے الگ ہو گئے، مگر ان کے درس و تدریس کی بڑی دھوم رہی، ہندستان کے علاوہ بلخ، بخارا، حبش اور افغانستان سے بھی طلبہ آکر ان سے درس لیتے، انھوں نے تحریک خلافت میں بھی پورا حصہ لیا، اور قید و بند کی مشقت جھیلی، ان کے فتوی کی بڑی دھوم رہی، حرمین کے علما بھی ان کی تائید کرتے، سلوک اور تزکیہ باطن کی طرف بھی ان کی توجہ تھی، فرنگی محل کے مولانا شاہ عبد الوہاب سے بیعت تھے۔ (باقی)

مولانا محمد علیؒ

از

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، دہلی یونیورسٹی دہلی

سب سے پہلے تو میں آپ کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے مولانا محمد علی کے نام سے یہ بزم آراستہ کی اور اس ناچیز کو اس جلسہ کی صدارت کا شرف عطا فرمایا، اس عزت افزائی کے لئے الفاظ ناکافی ہیں، جذبات کی شدت مجھ سے صرف خاموشی کا مطالبہ کرتی ہے، اور دل سے یہ دعا نکلتی ہے کہ اللہ تعالےٰ اس یاد کے طفیل میں مجھے اور آپ کو مولانا محمد علی کے قلب کی گرمی مرحمت فرمائے۔ ؎

کفر، کافر را و دیں، دیں دار را　　　ذرۂ دردِ دلِ عطار را

یہی دعا میں نے ۱۹۵۶ء میں بیت المقدس میں مولانا محمد علی کے مزار پر مانگی تھی۔

میں جب کلکتہ آیا تھا جو غالب، مولانا ابو الکلام آزاد اور مولانا محمد علی کا عزیز شہر ہے، تو ایک دوست نے جو تاریخ کے پروفیسر ہیں پوچھا، محمد علی پر سیمنار کے کیا معنی ہ آج ان کی کیا Relevance اور معنویت ہے؟ میں نے ان سے عرض کیا تھا، ایک عاشقِ صادق نے اس کا جواب اس طرح دیا تھا۔ ؎

افروختن و سوختن و جامہ دریدن　　　پروانہ زمن، شمع زمن، گل زمن آموخت

ؔ یہ مقالہ کلکتہ کی مولانا محمد علی لائبریری کے اس سمینار میں پڑھا گیا، جو فروری ۱۹۷۶ء میں ہوا تھا۔

یعنی پروانہ نے جلنا، شمع نے تابانی ودرخشانی اور پھول نے اپنا دامن چاک کرنا، یہ سب اسی عاشقِ صادق سے سیکھا ہے۔

پروانہ زمن، شمع زمن، گل زمن آموخت
افروختن وسوختن وجامہ دریدن

میرے یہ معروضات اسی نقطۂ نظر کی تشریح اور توضیح ہیں۔

عجیب لطیفہ ہے کہ چند مہینے پہلے St. Antonys College آکسفورڈ میں ایک طالب علم نے مجھ سے پوچھا تھا، کیا آپ مولانا محمد علی کو پسند کرتے ہیں، میں نے عرض کیا تھا. I do not like him; I love him. اس محبت اور شیفتگی کے باوجود میں اُن پر تنقید کو جائز سمجھتا ہوں اور ان کو مستقبل کی کڑی دھوپ میں جانچنا چاہتا ہوں۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ اس تنقید سے میری عقیدت اور ارادت میں کمی نہیں آئی، شیکسپیر کے الفاظ ہیں۔ With all thy faults, love thee still۔

مجھے اس کا اقرار واقعی افسوس ہے کہ ہماری موجودہ تاریخوں میں مولانا محمد علی کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے۔ ع

ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے۔

یہ نہ صرف تاریخی غلطی ہے بلکہ بدترین ناسپاسی اور حق ناشناسی ہے، ہمارے سماج کا فرض ہے کہ وہ تعلیم میں خاص طور پر اُن امور کا خیال رکھے جن سے ہماری مشترکہ تہذیب کا تانا بانا تیار ہوا ہے، وہ کثرت میں وحدت کو تلاش کرے۔ اور لالہ وگل ونسرین سب ہی رنگوں کو اپنی آنکھوں میں جگہ دے، گذرے ہوئے زمانے کو اپنی آنے والی نسلوں تک پہنچائے، اور تعلیم کی بنیاد، اپنے تمدن پر استوار کرے، ہماری تاریخ صرف کتابوں میں لکھے رہنے

سے یا ایک سمپوزیم سیمینار کے انعقاد سے زندہ نہیں رہ سکتی، اس کی زندگی کی صرف یہ صورت ہے کہ وہ سماج کے دل و دماغ کے ریشے ریشے میں زندہ ہو۔

یہ نیا سماج جو بن رہا ہے، اگر اس میں مولانا محمد علی کے قلب کی گرمی اور روح کی بیتابی، مولانا ابوالکلام آزاد کے ذہن کی جودت اور بصیرت، رفیع احمد قدوائی کی شگفتگی اور فراخدلی، اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی فرزانگی اور رواداری شامل نہ ہوئی تو تمدن کتنا بے رنگ اور بے روح ہوگا۔ اور یہ نقصان صرف مسلمانوں ہی کا نہیں پورے ہندوستانی سماج اور پورے ملک کا ہوگا۔

اس خطبہ کا مقصد نہ مولانا محمد علی کی زندگی بیان کرنا ہے، اور نہ خلافت کی تحریک کی روداد پیش کرنا ہے، بلکہ اس کا مقصد مولانا محمد علی کے کام کی قدر و قیمت ہندوستان کے بڑے نقشے میں متعین کرنا ہے، اور اس طرح خلافت کی تحریک کو ہندوستان کے برتر مفاد سے ہم آہنگ کرکے اس کی اہمیت اور معنویت کو جاننا ہے، اس کا مقصد ہم کلامی ہے، اور اپنے خیالات اور شبہات میں آپ کو شریک کرنا ہے، اور یہ سب از روئے استعداد نہیں، بلکہ کسب شرف کے طور پر ہے۔

مولانا محمد علی کے انتقال پر ایچ۔ جی ویلز نے جو انگلستان کا بڑا ادیب اور مورخ تھا لکھا تھا، محمد علی کا دل نیپولین کا تھا، قلم میکالے کا تھا اور زبان یا خطابت برک کی سی تھی، یہ بات صحیح ہے، ان میں اور نیپولین میں بہت مشابہت تھی، نیپولین بھی ناکام رہا، اور محمد علی بھی ناکام رہے، لیکن نیپولین کی عظمت اس میں ہے کہ وہ ماسکو تک پہنچا تو ۲۹ minus ٹمپریچر میں، جب تمام روس برف کی موٹی چادروں سے ڈھکا ہوا تھا۔ مولانا محمد علی کی بڑائی کا راز یہ ہے کہ انھوں نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد

پہلی سب سے بڑی عوامی تحریک کی قیادت کی جس میں انھوں نے ایک کرور دو انشیر و میلہ اپنی شعلہ بیانی سے تمام ملک میں آگ لگوادی، سرفروشوں کی ایک بڑی جماعت پیدا کری۔ اور ہندو مسلم اتحاد کے وہ نظارے پیش کیے جو چشم فلک نے آج تک نہیں دیکھے تھے، اور جن کو دیکھ کر حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند، انھوں نے اس تحریک کے ذریعے یہ بھی بتایا کہ ہندوستان اسی وقت ترقی کے راستہ پر گامزن ہو سکتا ہے، جب یہ دو بڑے گروہ ہندو اور مسلمان باہم متحد ہو جائیں، اور ان میں فاصلہ باقی نہ رہے یہی وہ پالیسی ہو جو کانگریس کی امتیازی شان رکن رکین بنی، اور جس کی خاطر مہاتما گاندھی نے اپنی جان دی، مانا کہ مولانا محمد علی نے جذبات اور تخیل کی مدد سے صابن کے بلبلے بھی بنائے، جو خلافت کی تنسیخ کے ساتھ فضا میں تحلیل ہو گئے، لیکن کون سی تحریک ہے، جو بغیر جذبات کی گرمی کے فروغ پا سکتی ہے۔

مولانا محمد علی پر تنقید کرتے وقت ہمیں ان کے ماحول، ان کے مزاج اور ان کی مجبوریوں پر ضرور غور کرنا چاہیے، ان کا تو یہ حال تھا کہ ذیابیطس کی سخت تکلیف تھی، بلڈ پریشر بھی بڑھا ہوا تھا، اور آشوب چشم کی وجہ سے آنکھ نہیں کھلتی تھی، ان کی عزیز بیٹی آمنہ سخت بیمار تھیں اب دم اب دم ہو رہا تھا، اس پر مستزاد یہ کہ پیسے مطلق پاس نہیں تھے، اس وقت یہ ضروری تھا کہ ایک عرض داشت وائسرائے بہادر کو پیش کی جائے۔ ناچار اس بیماری اور بخار کے عالم میں خود عرضداشت کا مسودہ تیار کیا، خود بہت پرانے ٹائپ رائٹر پر ٹائپ کیا اور خود اکنی سواری کے تانگہ میں بیٹھ کر وائسرائے کے ملٹری سکریٹری کو جا کر عرضی دے آتے۔

جو باتیں آج ہمیں غیر حقیقی اور تخیلی معلوم ہوتی ہیں، وہ مولانا محمد علی کی نظر میں حقیقت بسیط تھیں۔ اور وہ ان پر اس طرح سہارا لیے ہوئے تھے، جیسے ایک کمزور آدمی لکڑی پر سہارا لیتا ہے، ایک مرتبہ مولانا محمد علی نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ میں سنت ابراہیمی پر عمل کر کے

خلافت کے راستہ میں اپنے آپ کو، اپنی بیٹیوں کو، اپنی بوڑھی ماں کو قربان کرنا چاہتا ہوں۔"

یہ الفاظ اتنی شدت اور اتنے جوش میں کہے گئے تھے کہ تمام مجمع رونے لگا تھا، اور اگلی صف کے لوگوں نے اٹھ کر کہا تھا "نہیں خدا کی قسم، سب سے پہلے ہم یہ قربانی پیش کریں گے" یہ سچا ڈرامہ اس وقت کھیلا جا رہا تھا، جب خلافت لوح جہاں سے حرف غلط کی طرح مٹ چکی تھی اور ترکی میں نا مذہبی ری پبلک قائم ہو چکی تھی، میں اس کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں کہ جو چیز غیر حقیقی تھی، وہی مولانا کی نظر میں حقیقت بن گئی تھی، وہ بار بار عرفی کا یہ شعر پڑھتے تھے، ؎

طفیان ناز ہیں کہ جگر گوشۂ خلیل — در زیر تیغ رفت و شہیدش نمی کنند

وہ واقعی شہید ہونا چاہتے تھے، اور یہ آرزو ان کے دل کی آرزو تھی، اور یہ آواز ان کے ہر بن مو کی آرزو تھی، مولانا محمد علی کی خطابت اور عوام کے جوش و خروش کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حاضرین مجلس، لباس فاخرہ پہن کر جمع تو ہو گئے ہیں، لیکن ان کی سمجھ میں نہیں آتا کدھر جائیں، اور کیا کریں، خلافت کی تنسیخ کے بعد ان کا جذباتی سہارا ختم ہو گیا۔ اور اس بدبخت اور حق ناشناس قوم نے الزامات کی بوچھار کر کے ان کا کلیجہ چھلنی کر دیا، ان کو ٹوڈی کہا گیا، اور ان کی تحریک کو یہ بتایا گیا کہ اس کا کوئی تعلق ہندوستان کی حب الوطنی سے نہیں تھا اور یہ صرف مُلائیت کی زائیدہ تھی۔

ان غلط اور بے بنیاد الزامات کے باوجود اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا محمد علی اپنے عہد کی غیر معمولی شخصیتوں میں سے تھے، واقعی دیو پیکر، اور جامع صفات جنھیں قدرت نے ذہن بیدار کے ساتھ ساتھ قلب اور روح کی بے تابی بھی عنایت فرمائی تھی، انھوں نے ہماری قومی زندگی کے بہت سے اجارے توڑے۔ اور بہت سے شیشہ گروں کی دوکانیں درہم برہم کر دیں، انھوں نے بہت سے سہارے چھوڑ کر خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھایا، اور

یہ بتلایا کہ کوئی تحریک بغیر دلوں کی بیتابی اور بغیر عوام کی شرکت کے کامیاب نہیں ہو سکتی، اور
اسی طرح بغیر ملکی آزادی کے ہماری بین الاقوامی ساکھ بھی قائم نہیں ہو سکتی، مولانا محمد علی نے برطا
حکومت کے خلاف جو شور انگیز آواز بلند کی اُس نے یہ ثابت کر دیا کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ہم
کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتے، انھوں نے یہ بھی اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اس راستہ کے نشیب فرا
اس وقت تک طے نہیں ہو سکتے جب تک ہم احساس کی شدت کے ساتھ لیلائے آزاد
سے محبت نہ کریں اور اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہ کریں۔ عراقی کے الفاظ م

بعالم ہر کجا درد و محن است　　　بہم کردند و عشقش نام کردند

عشق کے اس راستے میں انھوں نے بہت سی صعوبتیں اٹھائیں، بڑی بڑی کڑیاں جھیل
لیکن برطانیہ کے خلاف جس کے اقتدار کا پرچم تا حد نظر لہرا رہا تھا، انھوں نے دار و رسن او
قید و بند کی ہر منزل کو . . . غزل خوانی کے ساتھ طے کیا حتیٰ کہ ان کی زندگی اور پھر موت
غزل بن گئی، ذیل کی غزل ان کی روحانی زندگی کی آئینہ دار ہے، اور اسیری و نظر بندی
"لطافتوں" کو پیش کرتی ہے۔

"تنہائی کے سب دن ہیں، تنہائی کی سب راتیں　　　اب ہونے لگیں اُن سے خلوت کی ملاقاتیں
ہر آن تسلی ہے، ہر لحظہ تشفی ہے　　　ہر وقت ہے دل جوئی، ہر دم ہیں مداراتیں
کوثر کے تقاضے ہیں، تسنیم کے وعدے ہیں　　　ہر روز یہی چرچے، ہر رات یہی باتیں
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت　　　اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں
بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں　　　بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

اور اُن کی موت پر تو خود زندگی کو رشک آیا ہوگا، بیت المقدس میں اقبال نے
ان اشعار کو پڑھ کر جو مولانا محمد علی کی وفات پہلے گئے تھے، میرے دل کی جو کیفیت ہو

رہے۔ ۵

غبار از کہ در جنب حرم | از کنار اندلس و از ساحل بربر گذشت
ابہ آغوش تمنا در گرفت | سوئے گردوں ز ان رفت و رہے کہ پیغمبر گذشت

علی عقیدوں کا وفاق چاہتے تھے، اور ان کا مقصد خود انہی کے الفاظ میں
انوں کو کیتھولک عیسائیوں کی طرح ایک طرف اپنی قومی ریاست کا وفادار
دوسری طرف ویٹی کن کی طرح ایک بین الاقوامی مذہبی تنظیم کا وفادار رکن بنانا تھا۔
د علی کے لیے اسلامی ملکوں کی اور خصوصاً ترکوں کی حمایت کو محض جذبات کا معاملہ
جیسا کہ وہ عام مسلمانوں کے لیے تھا، اُن کا یہ سوچا سمجھا نظریہ تھا کہ اسلام
ترکی خلافت کو قائم رکھنا اور ایک موثر عالمگیر مذہبی تنظیم بنانا از بس ضروری ہے۔
سے یہ نظریہ اسلامی ملکوں کے اندرونی حالات غیر حقیقت پسندانہ معلومات
تخمیں پر مبنی تھا۔ مولانا محمد علی کے اخبار کامریڈ کے نمائندوں کے ذرایع معلومات
ناقص تھے، اور انھیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ عام طور پر اسلامی ملکوں میں جو سلطنت
ت ہیں، ان کے ہم خیال بہت کم ہیں، اور ان کو مجبور و محکوم ہندوستانی مسلمانوں
کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ یہ بھی غضب تھا، کہ ترکی کی خلافت ختم ہونے کے بعد بھی
دمدمے سے جاری رہی۔

ان مقاصد کے لئے مولانا محمد علی نے برطانوی حکومت کے مظالم کا جس بے جگری
یا اور جس طرح آزادی کی تحریک کو عوام کے اتحاد اور جوش عمل میں تبدیل کر دیا وہ
بسو آزادی کا زریں ورق ہے۔

لانا محمد علی کے سامنے ہندوستان اور ہندوستانی مسلمانوں کے مستقبل کا کوئی صاف

اور واضح نقشہ نہیں تھا، ہندوستان ایک برعظیم ہے، اس کا رقبہ روس کو چھوڑ کر پورے یورپ کے برابر ہے، اس کے مسائل بڑے پیچیدہ اور نازک ہیں، ان امور کو لمبی لمبی قراردادوں تقریروں اور طویل وطویل خطبوں اور تحریروں سے طے نہیں کیا جا سکتا، چاہے وہ تحریریں اور تقریریں کتنی اچھی، اور دلکش انگریزی میں کیوں نہ ہوں، مولانا محمد علی کا وہ خطبہ جو انھوں نے کوکناڈا میں بہ حیثیت کانگریس کے صدر کے دیا تھا، کانگریس کی پوری تاریخ میں سب سے لمبا خطبہ ہے، اور پورے ساڑھے چار گھنٹہ میں ختم ہوا تھا، اس میں بھی کا سرجوش زیادہ ہے۔ اور ہم کی آواز مدھم ہے، انھوں نے بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ بیک وقت "مسلمان" اور "ہندوستانی" ہونا ممکن ہے، لیکن کس طرح کا مسلمان ہونا؟ مولانا عبد الباری کی قسم کا، مولانا محمود الحسن کے انداز کا، یا جناح صاحب کی طرز وروش کا؟ اس کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ خطبہ میں وہی جوش وخروش، وہی انتہاپسندی، وہی صحافی کا سا عاجلانہ انداز، وہی اضطراب کی فراوانی اور بصیرت کی کمی، وہی خواب وخیال کی غیر حقیقی فضا ہے، جو ان کی زندگی اور شخصیت میں ملتی ہے، اس میں فکر کی گہرائی اور جادو اثر بن جانے والا جذبہ نہیں ہے[1]،

یہاں اس کے اعادہ میں مضائقہ نہیں کہ ترکی کی حکومت نے ۱۹۲۲ء میں خلیفہ محمد ششم کو معزول کر کے سلطان عبد المجید کو مسند خلافت پر بٹھا دیا تھا، اور اس کے اختیارات صرف روحانی دنیا تک محدود ہو گئے تھے، ٹھیک اس وقت جب مولانا محمد علی اپنا خطبہ پڑھ رہے تھے، ترکی کی اسمبلی نے خلافت کو ختم کر دیا تھا، اور سلطان عبد المجید اور ان کے اہل کو سوئٹزرلینڈ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا، اس طرح مولانا محمد علی کی طلاقت لسانی، بے محل، اور ان کا جوش وخروش بے بنیاد تھا، اور اس غبارہ میں پہلے ہی چھید ہو چکا تھا، یہاں یہ ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ

---

[1] معارف۔ شاید ہمارے بعض ناظرین کو اس سے اتفاق نہ ہو۔

مسلمان قوم کے آیندہ رہنما یعنی علامہ اقبال، اور محمد علی، جناح نے خلافت کے اختتام پر ایک آنسو بھی نہیں گرایا۔ لیکن مولانا محمد علی کی ساری کائنات لٹ گئی، اور ان کے چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔

خلافت کے دوران جو ہندو مسلم اتحاد پیدا ہوا تھا، اس کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ مصنوعی اور غیر حقیقی تھا، اس زمانہ میں جو فسادات برپا ہوئے، یا جو فسادات انگریزوں نے کرائے اُن میں خاص طور پر قابلِ ذکر مالیگاؤں اور علی گڑھ کے بلوے ہیں جو ۱۹۲۱ء میں ہوئے، اس کے بعد ۱۹۲۳ء میں سہارنپور کا ہولناک فساد ہوا موپلوں کی بغاوت کی اقتصادی بنیاد تھی، لیکن انھوں نے اپنا علٰحدہ خلیفہ چُن لیا تھا۔ اور ہندوؤں میں دوروں پر پے در پے حملے شروع کر دیئے تھے۔

مولانا محمد علی نے اپنی کوکناڈا کی تقریر میں ہندو مسلم اختلافات، تنسیخ تقسیم بنگال، مسجد کانپور، شدھی اور سنگٹھن، غرض تمام عصری مسائل کا احاطہ کیا ہے، لیکن آج وہ کتنے غیر اہم معلوم ہوتے ہیں، خطابت کے جوش میں انھوں نے بعض باتیں ایسی بھی کہہ دیں جو آج عجیب و غریب معلوم ہوتی ہیں، مثلاً یہ کہ اگر افغانستان کی فوج انگریزوں کو نکالنے کے لیے ہندوستان پر حملہ کرے تو ہمیں افغانوں کی جان و مال سے مدد کرنا چاہیئے، بغیر یہ دیکھے ہوئے کہ امیر افغانستان کس وضع اور کس مسلک کا آدمی ہے، یا یہ فرمایا کہ مسلمانوں کو ہندو اکثریت بالکل گوارا ہے۔ اگر کسی طرح خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین کو پورے پورے اختیارات مل جائیں۔

تحریکِ خلافت کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ خود ترکی میں خلافت کا قلع قمع ہو چکا تھا اور اس کی جگہ وہاں سیکولر حکومت قائم ہو چکی تھی، اور زمین پیروں کے نیچے سے نکل چکی تھی، پھر بھی مولانا محمد علی اور ان کے ہمنوا خلافت پر جان دینے کے لیے تیار تھے۔

لیکن خلافت کی تحریک کا سب سے بڑا مثبت پہلو یہ ہے کہ اس نے نیشنلزم کا صور پھونکا، اور ہمیں انگریزوں کے ساتھ وفادارانہ پالیسی سے نجات دلائی اور علمائے اسلام اور علی گڑھ کے طلبہ اور متوسط طبقہ نے دل وجان سے تحریک آزادی میں شرکت کی۔ اس تحریک نے جنگ عظیم اوّل کے بعد اور مسلمانوں کو ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد پہلی دفعہ من حیث القوم برطانیہ کے خلاف صف آرا کر دیا۔ سر سید کی مجبوریوں اور ان کے خیالات و افکار کو تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے، تو معلوم ہوگا کہ خلافت کی تحریک دراصل سر سید اور مولانا ابوالکلام آزاد کے گنگا جمنی نیشنلزم کے درمیان ایک ضروری کڑی تھی، بغیر اس عبوری منزل کے ہم منزلِ مقصود تک نہیں پہونچ سکتے تھے، اس لئے مولانا محمد علی کو سر سید کا مخالف سمجھنا بھی غلط ہے۔

خلافت نے علی گڑھ کے طلبہ اور اساتذہ کو تحریکِ عدم تعاون میں شریک ہونے کا موقع دیا۔ اور انہی کی مدد سے ایک آزاد قومی یونیورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے قائم ہوئی، جس کا مقصد سچے مسلمان اور سچے ہندوستانی کا آمیزہ تیار کرنا تھا۔ اور جو دراصل علی گڑھ اور دیوبند کے درمیان ایک پُل کی حیثیت رکھتی ہے۔

مولانا محمد علی کو ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت معلوم تھی، اور وہ اس کے لئے ہر قسم کی قربانی اور ایثار کے لیے تیار تھے، بڑے بھائی مولانا شوکت علی قشقہ لگانے، دیر میں بیٹھنے اور عید الاضحیٰ میں قربانی چھوڑنے پر آمادہ تھے، مولانا محمد علی کا خیال تھا کہ آزاد ہندوستان میں بکری کا گوشت اتنا سستا ہوگا کہ مسلمان گائے کا گوشت کھانا چھوڑ دیں گے۔ افسوس ہے کہ مولانا محمد علی نے مرض کے بجائے مرض کی علامت کو اصل مرض سمجھ لیا تھا۔

تاہم ہمیں اس کا کھلے دل سے اعتراف کرنا چاہیے کہ تحریکِ خلافت نے نیشنلزم کو

غ دیا، مغرب کے خلاف صف بندی کی، آزادی کی بنیادوں کو وسیع تر کیا اور جاگیردارانہ قیادت کو ختم کر دیا، نے متوسط طبقہ کو جو سر سید کے علی گڑھ کا پروردہ تھا، آگے بڑھایا اور اس کے دل میں آزادی کی چنگاریاں ن کیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ اس تحریک نے بھی کوئی ایسا سماجی اور اقتصادی پروگرام نہیں دیا جس بوط بنیادوں پر مستقبل کی تعمیر ہو سکتی، مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مولانا محمد علی نے اسی تحریک کے زمانہ ات پورے خلوص نیت سے کہی تھی کہ ہندوستان کے مسائل کا حل لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ اور قیدوں اور مذہبوں کے وفاق میں پوشیدہ ہے، جو ایک بلند سطح پر پہونچکر سیاسی وفاق بن سکتا ہے، اور جس پر مولانا آزاد نے وزارتی مشن مذاکرات کے درمیان اتنا زور دیا تھا، اور جس کی تائید ہت پہلے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے کاشی ودیاپیٹھ کے جلسہ میں فرمائی تھی، ان کے الفاظ یہ ہیں، ہم اسی اقتباس پر اپنی تقریر ختم کرتا ہوں اور یہی میرے خیال میں اس سمپوزیم کا ماحصل ہے :۔

"آپ مجھے معاف فرمائیں اگر اس معزز مجمع کے سامنے میں صفائی سے یہ بات پیش کروں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ قومیت سے بار بار الگ کھینچتی ہے، اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں، تنگ نظری اور دیش کے مستقبل کا صحیح تصور نہ قایم کر سکنے کو دخل ہے، وہاں اس شدید شبہہ کو بھی بڑا حصہ ہے کہ انھیں قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے، اور مسلمان کسی حال میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں، اور میں بہ حیثیت مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندوستانی کی حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کو ادا کرنے پر تیار نہیں، اس لیے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا، سو ہوگا ہی، خود ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہونچ جائے گا۔"

لیکن خلافت کی تحریک کا سب سے بڑا مثبت پہلو یہ ہے کہ اس نے نیشنلزم کا صور پھونکا، اور ہمیں انگریزوں کے ساتھ وفادارانہ پالیسی سے نجات دلائی اور علمائے اسلام اور علی گڑھ کے طلبہ اور متوسط طبقہ نے دل وجان سے تحریک آزادی میں شرکت کی۔ اس تحریک نے جنگ عظیم اول کے بعد اور مسلمانوں کو ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد پہلی دفعہ من حیث القوم برطانیہ کے خلاف صف آرا کر دیا۔ سر سید کی مجبوریوں اور ان کے خیالات و افکار کو تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے، تو معلوم ہوگا کہ خلافت کی تحریک دراصل سر سید اور مولانا ابوالکلام آزاد کے گنگا جمنی نیشنلزم کے درمیان ایک ضروری کڑی تھی، بغیر اس عبوری منزل کے ہم منزلِ مقصود تک نہیں پہونچ سکتے تھے، اس لئے مولانا محمد علی کو سر سید کا مخالف سمجھنا بھی غلط ہے۔

خلافت نے علی گڑھ کے طلبہ اور اساتذہ کو تحریکِ عدم تعاون میں شریک ہونے کا موقع دیا۔ اور انہی کی مدد سے ایک آزاد قومی یونیورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے قائم ہوئی، جس کا مقصد سچے مسلمان اور سچے ہندوستانی کا آمیزہ تیار کرنا تھا۔ اور جو دراصل علی گڑھ اور دیوبند کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتی ہے۔

مولانا محمد علی کو ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت معلوم تھی، اور وہ اس کے لئے ہر قسم کی قربانی اور ایثار کے لیے تیار تھے، بڑے بھائی مولانا شوکت علی قشقہ لگانے، دیے میں بیٹھنے اور عیدالاضحیٰ میں قربانی چھوڑنے پر آمادہ تھے، مولانا محمد علی کا خیال تھا کہ آزاد ہندوستان میں بکری کا گوشت اتنا سستا ہوگا کہ مسلمان گائے کا گوشت کھانا چھوڑ دیں گے۔ افسوس ہے کہ مولانا محمد علی نے مرض کے بجائے مرض کی علامت کو اصل مرض سمجھ لیا تھا۔

تاہم ہمیں اس کا کھلے دل سے اعتراف کرنا چاہیے کہ تحریکِ خلافت نے نیشنلزم کو

فروغ دیا، مغرب کے خلاف صف بندی کی، آزادی کی بنیادوں کو وسیع تر کیا اور جاگیردارانہ قیادت کو ختم کر دیا۔
اس نے متوسط طبقہ کو جو سر سید کے علی گڑھ کا پروردہ تھا، آگے بڑھایا اور اس کے دل میں آزادی کی چنگاریاں
روشن کیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ اس تحریک نے بھی کوئی ایسا سماجی اور اقتصادی پروگرام نہیں دیا جس
مضبوط بنیادوں پر مستقبل کی تعمیر ہو سکتی، مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مولانا محمد علی نے اسی تحریک کے زمانہ
یہ بات پورے خلوص نیت سے کہی تھی کہ ہندوستان کے مسائل کا حل لکم دینکم ولی دین اور
عقیدوں اور مذہبوں کے وفاق میں پوشیدہ ہے، جو ایک بلند سطح پر پہونچ کر سیاسی وفاق بن سکتا
ہے، اور جس پر مولانا آزاد نے وزارتی مشن مذاکرات کے درمیان اتنا زور دیا تھا، اور جس کی تائید
بہت پہلے ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم نے کاشی ودیا پیٹھ کے جلسہ میں فرمائی تھی، ان کے الفاظ یہ ہیں یہی
اقتباس پر اپنی تقریر ختم کرتا ہوں اور یہی میرے خیال میں اس سمپوزیم کا ماحصل ہے:۔

"آپ مجھے معاف فرمائیں اگر اس معزز مجمع کے سامنے میں صفائی سے یہ
بات پیش کروں کہ مسلمانوں کو جو چیز متحدہ قومیت سے بار بار الگ کھینچتی
ہے، اس میں جہاں شخصی خود غرضیاں، تنگ نظری اور دیش کے مستقبل کا صحیح
تصور نہ قایم کر سکنے کو دخل ہے، وہاں اس شدید شبہہ کو بھی بڑا حصہ ہے کہ انھیں
قومی حکومت کے ماتحت مسلمانوں کی تمدنی ہستی کے فنا ہونے کا ڈر ہے، اور مسلمان کسی حال
میں یہ قیمت ادا کرنے پر راضی نہیں، اور میں بحیثیت مسلمان ہی نہیں بحیثیت ہندوستانی کی
حیثیت سے بھی اس پر خوش ہوں کہ مسلمان اس قیمت کو ادا کرنے پر
تیار نہیں، اس لیے کہ اس سے مسلمانوں کو جو نقصان ہوگا، سو ہوگا ہی، خود
ہندوستان کا تمدن پستی میں کہاں سے کہاں پہونچ جائے گا۔"

باب التقریظ والانتقاد

پیغمبر اسلام کے سیاسی مکتوبات میں سے چھ کی اصلیں[1]

مولفہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ (۲۰۴) صفحہ، کئی درجن تصویریں، نفیس طباعت۔

یہ مولف کی تازہ ترین تالیف ہے، جو فرانسیسی زبان میں ہے، اس کے متعدد ابواب سے اردو داں کافی عرصے سے واقف ہیں، مثلاً آنحضرتؐ کا خط قیصر روم کے نام (معارف جون ۱۹۳۵ء) عہد نبویؐ کے عربی ایرانی تعلقات (معارف جولائی ۱۹۳۲ء) لیکن اس میں بہت سی چیزیں بالکل نئی ہیں، اور خاص اس کتاب کے لئے تالیف ہوئی ہیں۔

کتاب میں رسول اکرمؐ کے مکتوبات بنام مقوقس، نجاشی، قیصر، کسریٰ، المنذر بن ساویٰ اور جیفر و عبد ہر دو فرزندان الجلندیٰ، سے بحث ہے، ان کے فوٹو بھی دیئے گئے ہیں، اور ان کی صحت و اصلیت اور ہر ایک کے تاریخی پس منظر پہ الگ الگ بابوں میں بحث ہے بعض یورپ فرنگیوں نے بھی کچھ لکھا تھا، اس کی تفصیل اور تردید بھی ہے، جیفر اور عبد عمان کے مشترکہ حکمران تھے، ان کے نام کا نامۂ مبارک تازہ ترین دستیاب ہوا ہے،

لیکن شروع میں تقریباً ایک سو صفحوں کا ایک طویل مقدمہ ہے، جو عربی خط کے ارتقا کی تاریخ پر مشتمل ہے، قبل اسلام کے قدیم ترین عربی کتبے جو اب تک ملے ہیں، ان سب کے

---

[1] Six Originaux des lettres diplomatiques du Prophete de L'Islam, Paris 1935, 75 Francs

فوٹو دیئے گئے ہیں، اور یہ عجیب انکشاف ہوتا ہے، کہ عربی زبان ہی کی طرح عربی خط بھی بعثت نبویؐ کے وقت اس قدر مکمل ہوگیا تھا کہ اس میں بعد از ان عملاً کوئی ترمیم نہیں ہوئی، حتیٰ کہ حروف پر نقطوں کا بھی عہد نبویؐ سے ذکر ملتا ہے، (صفحہ ۴۰ دما بعد) جرمن مستشرق ... نے لکھا ہے، کہ "عربی خط دنیا کے سارے خطوں کی ملکہ ہے"۔

اس سے کتنوں کو واقفیت ہوگی کہ طباعت کے موجد گوٹن برگ (فوت ۱۴۶۸ء) سے پانچ سو برس پہلے عہد سلجوقی میں عربی کتابیں چھپنے لگی تھیں؟ ایسا ایک قرآن مجید اب ویانا (آسٹریا) کے کتب خانۂ عام میں محفوظ ہے، اس کے ایک صفحے کا فوٹو بھی دیا گیا ہے، (صفحہ ۴۸)

انگلستان میں منصور و ہارون رشید اور شارلمان کا معاصر بادشاہ اوفا (OFFA) گزرا ہے، اس کا ایک طلائی دینار برٹش میوزیم میں محفوظ ہے، اس کے ایک طرف لاطینی میں OFFA REX (اوفا بادشاہ) کندہ ہے تو دوسری طرف عربی خط میں "لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ" (صفحہ ۴۸) کندہ ہے، حمید اللہ صاحب نے یہ قیاس و امکان ظاہر کیا ہے، کہ غالباً اس بادشاہ کا نام اوفیٰ تھا، جو ایک معروف عربی نام ہے (اور جس کے معنے ہوتے ہیں سب سے زیادہ وفادار) اور شاید وہ مسلمان ہو چکا ہو، اور اپنے رقیب شارلمان ہی کی طرح اس نے بھی ہارون رشید سے خط و کتابت کی ہو، اور سفیر جب واپسی پر عباسی سکے ساتھ لایا تو انگریزی دار الضرب نے ان ہی نقل کی ہو (صفحہ ۵۰)، کہ یہ سکہ جس کا فوٹو دیا گیا ہے، خلیفہ منصورؒ کے دینار کی ہو بہو نقل ہے۔

مقدمۂ کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ترین اسلامی کتبے ۵ھ کے غزوۂ خندق کے زمانے کے مدینۂ منورہ میں دستیاب ہوئے ہیں، ان کے فوٹو بھی ہیں، ان میں سے ایک پر (صفحہ ۶۵) اور ... سپاہی صحابہ کے ناموں کے ساتھ "انا محمد بن عبد اللہ" لکھا ہوا ہے، انگیز نام بھی صاف پڑھا جاتا ہے، ایک اور میں ابوبکرؓ اور عمرؓ بھی ہیں۔

ایک اور فوٹو نوٹ ۲۲ھ (ص ۲۲) یعنی حضرت عمرؓ کے زمانے کا ایک فوجی مراسلہ ہے جس کے بعض حروف پر نقطے بھی ہیں۔

ایک اور قابل ذکر فوٹو حضرت عثمانؓ کے اپنے قرآن مجید کا ہے جس کے آخر میں لکھا ہے: (ص ۱۲۰) "کتبہ عثمان بن عفان" حضرت عثمانؓ کے مختلف صوبوں کو بھیجے ہوئے دو اور قرآن محفوظ ہیں، ان میں سب عجیب چیز یہ نظر آتی ہے کہ اس زمانے میں حرف یا ایک شوشے سے نہیں بلکہ دو شوشوں سے لکھے (زائد کو اسی، آیتہ کو ایتہ تحریر کیا جاتا تھا)، ایسی درجن بھر آیتوں کے فوٹو دئے گئے ہیں، (صفحہ ۲۰۱ و مابعد) یہ بحث اس سلسلے میں ہوئی ہے کہ مکتوب نبویؐ بنام المنذر بن ساوی میں "لا الہ غیرہ" لکھا ہوا ملتا ہے، لا الہ غیرہ نہیں، فرنگیوں کے لئے یہ کافی تھا، کہ اس مکتوب کو جعلی قرار دیں، حمید اللہ صاحب بتلاتے ہیں کہ عہد نبویؐ میں یہی طریقہ کتابت زیادہ تر رائج تھا۔

ایک پر لطف چیز یہ ہے کہ ۶ھ میں صلح حدیبیہ سے واپسی پر، جس پر اس سال پورے چودہ سو سال گزر رہے ہیں، رسول اکرمؐ نے تبلیغ دین کے لیے بیک وقت تین براعظموں میں کوشش فرمائی، مرسل الیہم میں سے ایک قیصر روم یورپ میں تھا، کسرائے ایران ایشیا میں اور نجاشی حبشہ اور مقوقس مصر افریقہ میں ہیں اور متعدد دیگر تبلیغی خط ایک ہی دن خصوصی سفیروں کے ذریعے سے روانہ کئے گئے، نبی اُمی "علم بالقلم" کی تعلیم بھی دیتے ہیں، تعمیل بھی کرتے ہیں، صلی اللہ علیہ وسلم۔

صفحہ ۲۰۳ پر ایک طباعتی غلطی بھی ہے، کتبہ نہیں کتبتہ ہونا چاہئے، جیسا کہ اصل کے فوٹو میں صاف نظر آتا ہے۔

کتاب میں اشاریہ (انڈکس) بھی ہے۔

(معارف)

مطبوعات جدیدہ

تفسیر سورۃ الاخلاص مع تالیف شیخ الاسلام تقی الدین احمد بن عبد الحلیم بن تیمیہؒ، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۰۸ مع خوبصورت ٹائٹل قیمت تحریر نہیں، الدار السلفیہ ۶/۸ اے، حضرت تیرس، شیخ حفیظ الدین روڈ، بائیکلہ برج بمبئی ۲۷ ہند

الدار السلفیہ بمبئی نے مولانا مختار احمد ندوی نائب صدر جمعیۃ اہلحدیث ہند کی سرپرستی میں بڑی ترقی کی ہے، اور اس نے تھوڑی ہی مدت میں اردو کی مفید اصلاحی و دینی کتابوں کے علاوہ عربی کی بھی متعدد بلند پایہ اور نادر کتابیں اہتمام سے شائع کی ہیں، اب ادارہ کو طباعت و اشاعت کے جدید وسائل و آلات بھی میسر آگئے ہیں، اس لئے اس نے اپنے دوسرے اشاعتی پروگرام موخر کرکے جدید مطبع کا آغاز زیر نظر کتاب سے اس بنا پر کیا ہے کہ یہ قرآنی موضوع اور اسلام کے اساسی و اولین عقیدۂ توحید کے متعلق ایک بے نظیر تصنیف ہے، اس کے مصنف شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ ان نادرۂ روزگار علمائے اسلام میں ہیں، جن کی تمام کتابیں اور تحریریں دینی و ایمانی حرارت، اور اسلام کے صحیح فکر و عقیدہ کی ترجمان اور ان کی مجتہدانہ فکر و نظر، علمی تبحر، جودتِ طبع اور ذہن رسا کا حیرت انگیز نمونہ ہوتی ہیں، سورۂ اخلاص کی یہ تفسیر بھی امام ہمام کی نہایت اہم تصنیف ہے، جو ان کی وسعت علم و نظر، کتاب و سنت سے گہری واقفیت اور عقیدہ و مسلک کی استواری و پختگی کا ثبوت اور نکتہ آفرینی و دقیقہ سنجی سے معمور ہے، یہ کتاب دراصل ایک استفسار کے جواب میں قلمبند کی گئی تھی، جو سورۂ اخلاص کے فضائل اور اس کے ثلث قرآن کا مطلب دریافت کرنے

کے لیے ان سے کیا گیا تھا، امام ابن تیمیہ نے مجرد سوال کے جواب پر اکتفا نہ کرتے ہوئے پوری سورہ کی مکمل تفسیر لکھی، اور اس کے ضمن میں گوناگوں علمی، دینی اور قرآنی حقائق و دقائق بیان فرمائے، لفظ صمد کی لغوی تحقیق کے سلسلہ میں مختلف روایات، آثار اور سلف کے اقوال بھی جمع کر دئے ہیں، سورہ کے مضمون توحید پر مختلف پہلوؤں سے مفصل بحث کی ہے، اور اس ضمن میں خدا کی صفات کے مسئلہ میں صحیح اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کے علاوہ مشرکین و نصاریٰ اور خود مسلمانوں کے باطل فرقوں کے گمراہ کن خیالات کی تردید بھی کی ہے، اور مشاہد و مساجد کی زیارت و تقدس کے مسئلہ میں بھی بے اعتدالیوں کا ذکر کیا ہے، یہ تفسیر اصلاً امام صاحب کے مجموعۂ فتاویٰ میں شامل تھی، جو کئی بار علیحدہ کتابی صورت میں بھی شائع ہو چکی ہے، مگر اب بہت کمیاب تھی اس لئے الدار السلفیہ نے اسے اپنے نئے مطبع سے موجودہ اعلیٰ طباعتی معیار کے مطابق شائع کیا ہے، ادارہ کے علمی و تحقیقی شعبہ کے صدر ڈاکٹر عبد العلی نے مختلف نسخوں کی مدد سے اس کے متن کی تصحیح کر کے جا بجا حواشی لکھے ہیں، جن میں آیتوں اور حدیثوں کی تخریج، روایتوں کی قوت و ضعف کی وضاحت اور بعض راویوں کے مختصر حالات تحریر کئے ہیں، شروع میں ان کے قلم سے ایک مفید مقدمہ بھی ہے، اس میں امام ابن تیمیہ کے حالات اور تفسیر سورۂ اخلاص کی اہمیت و خصوصیت کے علاوہ زیر نظر نسخہ کے بارہ میں بعض وضاحتیں درج ہیں،

اسلامیات: مرتبہ جناب مالک رام صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر۔ صفحات ۱۸۴۔ مجلد، قیمت ۲۰ روپے پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵-۱۱۰

اردو کے مشہور اہل قلم اور غالبیات کے ماہر جناب مالک رام صاحب وقتاً فوقتاً اسلام اور اسلامی مسائل کے بارہ میں بھی مضامین لکھتے رہے ہیں، اب مکتبہ جامعہ نے اسلامی موضوعات پر ان کے حسب ذیل پانچ مضامین کا مجموعہ شائع کیا ہے، (۱) لا الٰہ الا اللہ۔

(۲) الاسلام (۳) اسلامی خلافت (۴) خلق عظیم (۵) افصح العرب (۶) عورت مذاہب عالم میں، پہلے مضمون میں اس پر زور دیا گیا ہے، کہ اسلام ہی اصل میں خدا کا دین ہے، اسی کی دعوت دینے کے لیے ہر قوم میں نبی بھیجے گئے، مگر بد قسمتی سے ان قوموں نے اپنے انبیاء کو معبود کا درجہ دے دیا، اسلام کے کلمۂ طیبہ میں اسی گمراہی کا سدِ باب کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں کلمہ میں رسول کے نام کی شمولیت کو شرک اور عقیدۂ توحید کے منافی بتانے والوں کی تردید کی گئی ہے، دوسرے مضمون میں بتایا ہے کہ دین کے بنیادی تصورات و معتقدات ہمیشہ ایک رہے، تغیر و ارتقا کا عمل شریعت و قانون میں ہوا، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر دین مکمل ہو گیا، گذشتہ تمام امتوں کا دین اسلام تھا، اور اس کے ماننے والے مسلم تھے، ان کے خیال میں ہر قوم اہل کتاب تھی کیونکہ ہر ایک کی اصلاح کے لیے نبی آئے، چاہے اس کے نبی کو کتاب دی گئی ہو یا وہ اپنے پیشرو نبی کی کتاب و شریعت ہی کی دعوت دینے کے لئے آیا ہو، اور جس طرح ہزاروں رسول کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ملتا اسی طرح ان اہل کتاب قوموں اور ان کی کتابوں کے نام بھی مذکور نہیں، اسی سلسلہ میں سورۂ فاتحہ کی روشنی میں دین کے بنیادی اصول و کلیات بیان کر کے بتایا ہے کہ اس میں وہ سب کچھ آگیا ہے جو دین ہے، اور بقیہ قرآن سورۂ فاتحہ کی تفسیر و تعبیر ہے، تیسرے مضمون میں خلافت کا مفہوم، چاروں خلفاء کے طریقۂ انتخاب، شوریٰ کی اہمیت، خلیفہ کے صفات و فرائض اور خلیفہ کے اصول کی وضاحت کی ہے، اس مضمون کی اہم اور خاص باتیں دو ہیں، ایک یہ کہ اسلام میں خلیفہ کے انتخاب کا کوئی اصول نہیں ہے، اسی لئے چاروں خلفاء کا انتخاب جدا جدا طریقے سے ہوا، اور دوسری یہ کہ اسلام میں معاملات حکومت میں اصحاب رائے اور اہل علم و فکر سے مشورہ کرنے کے حکم کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا گیا ہے کہ کسی معاملہ میں حتمی فیصلہ پر پہنچ جانے کے بعد مشورہ دینے والوں کی رائے کے خلاف عزم و ارادہ کریں تو توکل علی اللہ اس پر کاربند ہو جائیں، مصنف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

اور خلفائے راشدینؓ کے دور سے اکثریت کے فیصلے کے خلاف عمل کرنے کی متعدد مثالیں بھی دی ہیں، چوتھے مضمون میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق عظیم کو نہایت موثر اور دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے پہلے آپ کے مخالفین کی تین قسمیں بتائی ہیں، مشرکین، یہود اور منافقین، اور ہر ایک کی مخالفت، ایذا رسانی اور عناد کے مختلف واقعات و اسباب بیان کرکے دکھایا ہے کہ آپ کس طرح ضبط و تحمل کا پہاڑ بنے رہے، اور جب دشمن آپ کی مٹھی میں آگئے تو آپ نے ان کے ساتھ عفو و درگذر اور حسن سلوک کا برتاؤ کیا، جو آپ کے خلق عظیم اور لطف عمیم کا بڑا ثبوت ہے، پانچواں مضمون افصح العرب ہے، اس میں ہر نبی کے ابتدا میں اکیلا اور تنہا ہونے اور طرف سے اس کی مخالفت کئے جانے اور آخر میں اس کی کامیابی اور اس کے دشمنوں کی ناکامی کا ذکر ہے، اس کا سبب جہاں نبی کے پیغام کی صداقت ہے، وہاں اس کو پیش کرنے کا انداز بھی ہے، اس مضمون میں اسی پہلو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں، اس سلسلہ میں پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان تبلیغی خطوط کا ذکر ہے، جو آپ نے بعض سلاطین اور قبائل کے رئیسوں کو لکھے تھے، اور ان کی فصاحت، بلاغت، سلاست، ایجاز اور اقتضائے حال سے مطابقت دکھائی ہے، پھر آپ کے چند خطبوں پر بحث کرکے ان میں طریقۂ ادا کا حسن اور اظہار و ابلاغ کا موثر انداز دکھایا ہے، آخر میں آپ کی چند حدیثیں درج کی ہیں، جو ضرب المثل کا درجہ اختیار کر چکی ہیں، آخری مضمون میں اسلام کے خدا کا آخری اور مکمل ترین پیغام ہونے کی صداقت کو ثابت کرنے کے لئے عورتوں کے بارہ میں اس کی جامع تعلیم و ہدایت پیش کی گئی ہے، اس سلسلہ میں عورت کے درجہ و مرتبہ، تعلیم نسواں، نکاح، اس کی رسموں، اس کی غرض، اس کی بعض شرطوں اور طریقوں مہر، تعدد ازدواج، اہلی زندگی، بیوی کے حقوق و فرائض، زنا سے بچنے کے طریقے، زنا کی تہمت، لعان، طلاق، خلع، نکاح بیوگاں اور وراثت کے بارہ میں اسلام کے احکام کی خوبی و برتری کو نمایاں کرنے کیلئے

ہندو، یہودی، عیسائی اور بعض دوسرے مذاہب کی بھی اس سلسلہ کی تعلیم بیان کی ہے، یہ سب مضامین غور و فکر اور تحقیق و جستجو کا نتیجہ ہیں، زبان و بیان کی خوبی کے لیے مصنف کا نام ہی پوری ضمانت ہے، مگر اول الذکر دو مضامین میں ان کے بعض قیاسات و نتائج درست نہیں معلوم ہوتے یا کہیں کہیں ان کی تعبیر کھٹک معلوم ہوتی ہے، مثلاً ان کی تعبیر سے خیال ہوتا ہے کہ قرآن مجید وحدت ادیان کا قائل ہے، اور اس کی رو سے ہر دین اسلام ہے اور وہ خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے، جب کہ قرآن مجید میں صرف وحدت دین کا ذکر ہے اور اس نے یہ بتایا ہے کہ خدا کے نزدیک اصل دین اسلام ہے جس کو اس نے اتارا ہے اور اسی کی تعلیم تمام انبیاءؑ نے دی تھی، جن لوگوں نے اسکو قبول کیا وہ مسلم تھے، مگر جن لوگوں نے اسے چھوڑ کر اپنے الگ راستہ تجویز کیا، اور کفر و شرک میں مبتلا ہو گئے اور اسی کو اپنا دین سمجھنے لگے، وہ نہ مسلم تھے، اور نہ ان کا مذہب اسلام تھا، اگر ہر قوم کا خود ساختہ دین اسلام ہوتا تو انبیائے کرامؑ اس کا ابطال کیوں کرتے، اور کیوں قرآن یہودیت و نصرانیت کی مذمت کر کے ان کے ماننے والوں کو حضرت ابراہیمؑ کی ملت حنیف کو اختیار کرنے کی دعوت دیتا، بنیادی تصورات و معتقدات کی وحدت سے بھی صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ ان کی حد تک ہر نبی کی دعوت یکساں رہی ہے، یہ نہیں ثابت ہوتا ہے کہ جن قوموں کی اصلاح کے لیے نبی آئے تھے، وہ ان کو مانتی تھیں، اگر مانتیں تو انبیاءؑ اپنی دعوت کے آغاز میں ان بنیادی باتوں پر اس قدر زور کیوں دیتے، انبیاءؑ کے اس طریقۂ دعوت سے صاف ظاہر ہے کہ ہر نبی کی قوم اصل دین اسلام کو چھوڑ کر کسی اور دین کو اختیار کیے ہوئے تھی، اور وہ انہی بنیادی تصورات کی دعوت دینے کی وجہ سے انبیاءؑ کی شدید مخالفت کرتی تھی، اس بنا پر یہ کہنا کہ گذشتہ تمام امتوں کا دین اسلام تھا، اور وہ مسلم تھیں، اور وہ تمام مذاہب جو وقتاً فوقتاً خدا کی طرف سے نازل ہوئے اسلام تھے، یا خدا کی طرف سے نازل ہونے والا ہر دین اسلام تھا صحیح تعبیر نہیں ہے، صحیح تعبیر یہ ہے کہ گذشتہ تمام پیغمبروں کا دین اسلام تھا اور تمام ادیان و مذاہب نہیں بلکہ خدا کی طرف سے ایک ہی دین نازل ہوا تھا، جو اسلام ہے،

دراصل ہر مذہب میں بعض ایسی مشترک اصولی اور بنیادی باتیں ملتی ہیں جن کی وجہ سے وحدت
ادیان کا تصور پیدا ہوتا ہے لیکن ہر مذہب کی شریعت اور منہاج کے مختلف ہونے کی وجہ سے وحدت
ادیان کا یہ تصور ختم ہو جاتا ہے جس سے غالباً ہمارے فاضل مصنف کو بھی اتفاق ہے، مصنف اسلام کے
بنیادی تصورات میں توحید آخرت اور یتامی و مساکین کی امداد کا ذکر کرتے ہیں، اور یہ لکھتے ہیں
کہ بنیادی چیز خدا کی ہستی پر ایمان کامل اور اس کی عبادت ہے لیکن یہ محض کلمہ کا ایک جز لا الٰہ الا اللہ ہے، مگر وہ
دوسرے جز محمد رسول اللہ اور اسلام کے تصور رسالت کا ذکر نہیں کرتے جب کہ انھیں یہ تسلیم ہے کہ محمدؐ آخر
اور مکمل دین لائے، گذشتہ جن قوموں نے انبیاءؑ کی تکذیب کی یا موجودہ دور کی جن قوموں کے بارہ میں قرآن میں
کی کوئی صراحت موجود نہیں ہے، انھیں قطعیت کے ساتھ اہل کتاب قرار دینا بھی صحیح نہیں ہے۔

مطالعات:- جلد اول، مرتبہ ڈاکٹر ہرالدین بٹ تقطیع متوسط، کاغذ بہتر کتابت و طباعت معمولی،
صفحات ۲۴۴، قیمت ۳۰ روپیہ پتے (۱) ڈاکٹر ہرالدین بٹ لکچرار، پلوامہ، کشمیر (۲) مکتبہ علم و ادب، پیڈر راس روڈ، سری نگر۔

یہ کتاب چھ مضامین کا مجموعہ ہے، پہلے مضمون میں عربی میں لفظ ادب کے تصور و مفہوم کی وضاحت کی گئی ہے
اس میں عہد بعہد کے تغیر کا ذکر کرنے کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ اب ادب کا کیا مطلب سمجھا جاتا ہے، دوسرے میں
اندلس کی عربی شاعری میں منظر نگاری کی خصوصیات دکھائی گئی ہیں، اور ضمناً عام عربی شاعری میں منظر نگاری
کا مختصر جائزہ بھی لیا ہے، آخر کے چار مضامین میں عربی زبان کے چار مشہور ادیبوں اور انشا پردازوں ابو حیان توحیدی
بدیع الزماں ہمدانی، صاحب ابن عباد اور قاضی محسن تنوخی کے حالات و کمالات بیان کئے گئے ہیں، مصنف نے
ان چاروں مصنفین کی کتابوں کا تعارف کرا کے ان کے طرز نگارش اور اسلوب کی خصوصیات بھی دکھائی
ہیں اور ان کے ادبی درجہ و مرتبہ پر بھی بحث کی ہے، انھوں نے اردو میں عربی زبان و ادب اور اس کے مشاہیر
ادیبوں پر مضامین کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اس کی پہلی کڑی ہے، امید ہے، عربی زبان و ادب کے طلبہ و
شائقین میں یہ سلسلہ مقبول ہوگا، لیکن ابھی یہ مرتب کی پہلی پیش کش ہے، اس لئے زبان و بیان کی فروگذاشتوں کے
علاوہ دوسری حیثیتوں سے بھی اس میں کچھ کسر ہے، جو آئندہ مشق و ممارست کے بعد دور ہو جائے گی۔

"ض"

سلسلۂ مذہبی رواداری

[illegible] سلسلہ [illegible] شائع ہو کر [illegible] پہنچ چکا ہے، اسی ضمن میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری بھی ایک سلسلہ ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہے،

جلد اول اس میں مغلوں سے پہلے کے مختلف خاندانوں کے مسلمان حکمرانوں مثلاً محمد بن قاسم، محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، علاء الدین خلجی، محمد بن تغلق وغیرہ کی مذہبی رواداری و ملن ساری کے واقعات پیش کئے گئے ہیں، قیمت [illegible]

جلد دوم - اس میں مغل فرماں روا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے حکمراں شیر شاہ، اسلام شاہ، پھر مغل شہنشاہ اکبر، جہانگیر، شاہجہاں کی مذہبی رواداری وغیرہ کے دلچسپ واقعات قلمبند کئے گئے ہیں، قیمت [illegible]

جلد سوم ہندوستان کے مغل عہد کے مشہور مورخ سر جدوناتھ سرکار کی کتاب کا جواب خود ان کی کتابوں کے حوالوں سے اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اورنگزیب عالمگیر اور اس کے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری وغیرہ کی تفصیلات آگئی ہیں، مولانا شبلی کی مضامین عالمگیر اور مولانا سید نجیب اشرف صاحب ندوی مرحوم کی مقدمۂ رقعات عالمگیر کے بعد اورنگ زیب عالمگیر پر دوسری اہم اور پر از معلومات کتاب جس میں اس کے پورے پچاس سالہ عہد حکومت و فرمانروائی کی پوری تاریخ آگئی ہے، قیمت: [illegible] روپے،

اسلام کی مذہبی رواداری - اس میں مستند حوالوں سے مذہبی رواداری، غیر مسلم رعایا کے ساتھ سلوک اور ذمیوں کے حقوق کے متعلق مذہب اسلام کی تعلیمات اور ان پر مسلمانوں کے عمل کا نمونہ پیش کیا گیا ہے، (زیر طبع)

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

رجسٹرڈ نمبر اے۔ زیڈ۔ ایم۔ این پی ۴۳ دسمبر ۱۹۸۶ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

قیمت تیس ۳۰ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

پن :- ۲۷۶۰۰۱

سلسلۂ اسلام اور مستشرقین

فروری سنہ ۱۹۸۲ء میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر دارالمصنفین کے اہتمام میں جو بین الاقوامی سمینار ہوا تھا، اس کے سلسلہ میں اسی عنوان پر دارالمصنفین نے ایک اہم اور نیا سلسلۂ تالیفات شروع کیا ہے جس کی اب تک پانچ جلدیں مرتب ہو چکی ہیں۔

جلد ۱ اس میں جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب کے قلم سے اس سمینار کی بہت ہی مفصل اور دلچسپ روداد قلم بند ہوئی ہے۔ قیمت ۱۶ روپے۔

جلد ۲ اس میں وہ تمام مقالات جمع کر دیے گئے ہیں جو اس سمینار میں پڑھے گئے تھے اور جو معارف سنہ ۸۲ء سے لے کر سنہ ۸۳ء تک سلسلہ وار شایع بھی ہو چکے ہیں۔ قیمت ۳۰ روپے

جلد ۳ اس میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر سمینار کے علاوہ جو مقالات لکھے گئے ہیں، اور معارف میں شایع بھی ہو چکے ہیں، جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۲۰ روپے۔

جلد ۴ تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر مستشرقین کے اعتراضات کے جواب میں علامہ شبلی نعمانیؒ کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۳۰ روپے۔

جلد ۵ اسلامی علوم و فنون سے متعلق مستشرقین کی قابل قدر خدمات کے اعتراف کے بعد ان کے اسلام اور تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اعتراضات کے جواب میں مولانا سید سلیمان ندویؒ کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۱۷ روپے۔

"منیجر"

جلد ۱۳۸ ماہ ربیع الثانی ۱۴۰۷ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۸۶ء عدد ۶

مضامین

مقالات

شذرات

دار المصنفین شبلی اکاڈمی کی تاسیس نومبر ۱۹۱۴ء میں ہوئی، اس طرح یہ ادارہ اب بہترویں سال گزار کر بہتر ویں عمر میں داخل ہو رہا ہے۔

اتنی مدت میں اس کی علمی شہرت چار دانگ عالم میں پہنچ چکی ہے، اس میں شک نہیں کہ اس کی ناموری میں اس کے ایثار پسند، خدمت گزار اور بلند پایہ مصنفوں کا نمایاں ترین حصہ ہے، لیکن اس کے حصول میں اس کی مجلس انتظامیہ اور مجلس عاملہ کی ملک گیر تشکیل کو بھی بڑا دخل رہا، اس کی مجلس انتظامیہ کی صدارت کو نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی وزیر اعظم سابق ریاست حیدر آباد، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی وزیر امور مذہبی سابق ریاست حیدر آباد، اور ڈاکٹر سید محمود وزیر حکومت ہند کی باوقار شخصیتوں کی وجہ سے بڑی جلا پیدا ہوتی رہی۔

موجودہ دور میں اس کے صدر حیدر آباد کے شہزادہ مکرم جاہ ہیں، اس کی مجلس عاملہ کی صدارت کو مولانا حمید الدین فراہی، مولانا عبد الماجد دریابادی، اور مولانا ابو الحسن علی ندوی نے غیر معمولی رونق بخشی، مجلس انتظامیہ کے ارکین میں جسٹس کرامت حسین لکھنؤ، نواب علی حسن خان بھوپال، نواب ناظر یار جنگ حیدر آباد، ڈاکٹر ذاکر حسین سابق صدر جمہوریہ ہند، جناب فخر الدین علی احمد سابق صدر جمہوریہ ہند نواب عبید الرحمٰن خان شیروانی پرو چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، کرنل بشیر حسین زیدی سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جناب حکیم عبد الحمید ہمدرد نگر نئی دہلی، اور دوسرے مشاہیر دار المصنفین کے علمی افق پر مہر و ماہ بن کر درخشاں اور تابندہ رہے، انھوں نے اس ادارہ کو ہر قسم کی علمی، مالی اور اخلاقی امداد پہونچائی۔

موجودہ ارکین میں ایک بہت ہی محبوب اور معزز نام جناب سیٹھ عبد العزیز انصاری کا ہے، جن کے ذکر خیر میں اسوقت قلم سے بے ساختہ یہ تحریر نکل رہی ہے، وہ اعظم گڈھ ضلع ہی کے رہنے والے ہیں، اہل قلم تو نہیں،

لیکن ذوق شعری بہت اچھا اور صاف ستھرا رکھتے ہیں، بمبئی میں ٹرانسپورٹ کا کاروبار کرتے ہیں، وہاں دوسرے کاروباریوں نے ان سے زیادہ دولت حاصل کی لیکن انھوں نے جو عزت، وقعت اور منزلت حاصل کی وہ کسی کو کم نصیب ہوئی، وہ اپنے حلقہ کے حاتم طائی بنے رہے، ان کو اپنے عزیزوں، دوستوں، حاجتمندوں اور جاننے والوں کی مدد کرنے میں وہی لذت ملتی رہی، جو نوابوں اور رئیسوں کو اپنی محفل رقص و سرود میں ملتی رہی، انھوں نے اپنی ساری کمائی اپنے مہمانوں کی خاطر داری میں گنوائی، ان کے نیچے جو فیاضانہ دسترخوان سجاتے تو ان کو چمچوں اور پلیٹوں کی کھنکھناہٹ میں ان کو وہی نشاط حاصل ہوتا جو کسی میخانہ کے بلند رندانہ شیشہ و ساغر میں ارغوانی اور گلابی شراب کو اچھلتے دیکھنے میں ہوتا ہے، ان کی سادگی میں رئیسانہ کروفر دکھائی دیتا، ان کے دروازہ پر ان کے بچوں کی آمد و رفت کے لیے کئی کئی موٹریں کھڑی رہتی ہیں لیکن وہ چند آنے پیسے دیکر بس ہی سے سفر کرنا پسند کرتے ہیں اگر کسی ماہر سنگتراش کو مہر و محبت، دلجوئی، دلداری، اور دلنوازی کا پیکر بنانے کو کہا جاتا تو سیٹھ عبدالعزیز انصاری ہی کی شبیہ نظر آتی۔

ان کو دارالمصنفین سے بڑی محبت ہے، وہ اس کی مجلس انتظامیہ کے جلسوں میں برابر شریک ہوتے رہے، یہاں آکر کہتے کہ اس کے مرغزاروں، سبزہ زاروں اور درختوں میں وہ بزرگ چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں، جنھوں نے اس زمین کے ایک ٹکڑے کو علم و فن کا لالہ زار بنا دیا ہے، دارالمصنفین کے جلسوں میں ہی اس ادارے کو ہر طرح سے محفوظ رکھنے کی جو نصیحتیں کرتے رہے، وہ چاندی کے سکوں کی سیمیں آواز کی طرح اسکے ارکین کے کانوں میں برابر سامعہ نواز رہیں گی، ایک موقع پر جب دارالمصنفین کو مالی اعانت کی ضرورت تھی تو اس کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ بمبئی میں طلب کیا، اور اس کے اراکین کی جو خاطر تواضع کی تو ان کے واقعی حاتم طائی ہونے کا اندازہ ہوا، اپنی محبت میں دارالمصنفین کے اراکین کو کسی سے مالی اعانت کی لب کشائی پر پابندی عائد کر رکھی تھی، وہ خود اپنے یہاں بڑی بڑی دعوتوں میں بمبئی کے اصحاب ثروت کو مدعو کرتے اور ان کو دارالمصنفین کو نذرانے پیش کرنے پر آمادہ کرتے۔

وہ گذشتہ نومبر میں دارالمصنفین تشریف لائے، ان کو بڑی خوشی ہوئی کہ وہ پھر وہ دیکھ رہے ہیں جو اس کی شخصیت کے گلکدے پر ان کی خوبیوں کے جو جوہر ہیں کے چاندنی جاندنی کی نظر نہیں آتی، دارالمصنفین کی عمارت کے سامنے کھڑے ہو کر بولے، اس نے ہم کو تمہارے آبا و اجداد کو، ہمارے شہر کو اور ہمارے ملک کو بڑی عزت بخشی، یہ خاکسار کچھ دور کھڑا تھا، اپنے پاس بلا کر کہا کہ تمہارے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں کہ تم نے اس کی عزت کو برقرار رکھا، پھر اپنے ارد گرد کے لوگوں سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ جس نے ان کو اذیت پہونچائی، اس نے مجھ کو اذیت دی۔

اسی روز دارالمصنفین میں ان کے اعزاز میں بہت سے لوگوں کے ساتھ ڈنر کھانا تھا، کھانا کھا کر اپنے فرزند ارجمند عزیزی ابو صالح کے سہارے اٹھے تو یہ راقم بھی ان کے پاس کھڑا تھا، اس وقت عزیزی ابو صالح کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ میری وصیت ہے کہ ان کو کسی قسم کی اذیت نہ پہونچنے پائے، اسی روز شام کو شبلی پوسٹ گریجویٹ کالج میں ان کے لیے عصرانہ تھا، وہاں سے رخصت ہوئے تو کچھ لوگوں سے میری طرف ہاتھ اٹھا کر کہا کہ ان کو کوئی اذیت نہ پہونچے، وہ اعظم گڑھ سے رخصت ہو کر اپنے گاؤں چلے گئے، تو ایک روز اعظم گڈھ کی ایک معزز شخصیت نے آکر اس خاکسار سے کہا کہ وہ منشی جی کو رخصت کرنے کے لیے انکے گاؤں گئے تھے، تو انھوں نے مجھ سے یہ کہا کہ صباح الدین پر کوئی آنچ نہ آنے پائے، میری حقیر ذات ہی کیا، یہ گویا اُن کی خواہش تھی کہ دارالمصنفین پر کوئی آنچ نہ آئے، ان کی ان محبت بھری باتوں کو یاد کر کے اپنی تمام تصنیفی زندگی کو ہیچ سمجھتا ہوں، اور ان کی محبت، شفقت، اور اخلاص کے بارے اپنے کو دبا پاتا ہوں، دارالمصنفین کی فضا میں ان کی یہ آواز سنائی دیتی ہے۔

ع ڈھونڈوگے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

مقالات

شاخت اور حدیث نبویؐ

از ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی، استاذ حدیث، ملک سعود یونیورسٹی ریاض مملکت سعودیہ

ترجمہ:- از حافظ محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی رفیق دار المصنفین

(۲)

پہلی اور دوسری صدی ہجری میں فقہاء کی سرگرمیاں، شاخت کی نظر میں

شاخت لکھتے ہیں کہ نبی کریمؐ مدینہ میں ایک قانون ساز نبی کی حیثیت سے نمایاں ہوئے، اور گو آپ نے کسی قانون کو مکمل طور پر نافذ نہیں کیا لیکن مسلمانوں کے لیے دینی لحاظ سے اور منافقین کیلئے سیاسی طور پر ایسے احکام ضرور نافذ کیے جو ایک حد تک تشریع کی تعریف میں آتے ہیں[۱]، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ:-

خلفاء راشدینؓ (۶۳۲ - ۶۶۱ھ) امت اسلامیہ کے سیاسی راہنما تھے، اور یہ کہیں سے ظاہر نہیں ہوتا کہ انھوں نے اپنے احکام اور فیصلوں میں مصدر اعلیٰ (ذات نبویؐ یا قرآن مجید) سے رہنمائی حاصل کی بلکہ بڑی حد تک ان خلفاء کے عمل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ امت کے لیے خود ہی قانون ساز تھے[۲]، ان خلفاء راشدینؓ نے قضاۃ کو مقرر نہیں کیا[۳] انکے بعد اموی خلفاء نے یہ اہم قدم اٹھایا کہ انھوں نے اسلامی قضاۃ کو مقرر کیا[۴]۔ پہلی صدی ہجری کے آخر تک مخصوص لوگوں کو ہی عہدۂ قضاء پر مامور کیا جاتا تھا، جن کی خصوصیت یہ ہوتی تھی کہ وہ متقی و پرہیزگار ہوتے، اور ان کی یہ ذاتی خواہش

---

[۱] انٹروڈکشن ٹو اسلامک لا شاخت ص ۱۱ [۲] ایضاً۔ [۳] ایضاً ص ۱۲ [۴] ایضاً ص ۲۳۔

ہوتی تھی کہ وہ لوگوں کے لیے اسلامی نظام زندگی کی راہوں کو ہموار کریں[1]

دوسری صدی ہجری تک بتدریج ان مخصوص متقیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، ان کا آپس میں ربط بھی بڑھا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فقہ کے چند باقاعدہ مکاتب فکر وجود میں آگئے[2]

فقہ کے یہ مکاتب گو فکری اعتبار سے مختلف النوع تھے، اور ان میں سے ہر مکتب اپنے بعض اسلاف کی رایوں کی نمایندگی کرتا تھا، مگر وہ قانون کے ... بنیادی نظریہ میں متفق الخیال تھے، اور یہ بنیادی نظریہ "عمل" یا "امر متفق علیہ" کے اصطلاحی نام سے معروف تھا، اور اصلاً یہ نظریہ دو دائروں تک محدود تھا،

ایک تو یہ کہ ماضی کے واقعات کو دیکھنا اور ان میں غور وفکر کرنا، دوسرے عصری اور وقتی ماحول و مسائل کو مدنظر رکھنا شاخت کے نظریہ کے مطابق پہلی صورت میں اس قانون کو سنت یا حدیث اور "عمل" کے لبادہ میں ظاہر کیا گیا[3]

سنت یا حدیث یا اسوۂ قابل تقلید پر عمل اور اس کے ساتھ بعض عصری تقاضوں کے تحت کچھ اور نظریات کا وجود کا یہ سلسلہ دوسری صدی ہجری کی ابتدائی دہائیوں سے شروع ہوا تو پھر یہ فقہا کا خاص نظریہ بن گیا، امر متفق علیہ سے یہی حقیقت حال مراد ہے، جس میں کسی بھی رائے کو ماضی کی کسی بڑی شخصیت کے ساتھ منسوب کر دیا گیا ہو۔[4]

مثلاً کوفہ والوں نے سب سے پہلے اپنی رایوں اور نظریات کو ابراہیم نخعی سے منسوب کیا، بعد میں مدینہ والے بھی اس راہ پر گامزن ہوئے[5]

فقہ اسلامی کی نظری اساس کو وجود میں لانے کے لیے ماضی کے اوراق میں پسندیدہ رایوں کو تلاش کرنے کا یہ عمل صرف اسی حد تک محدود نہیں رہا کہ ان کو ماضی قریب کی چند شخصیتوں سے منسوب

---

[1] اٹروڈکشن ٹو اسلامک لا شاخت ص ۲۶ [2] ایضاً ص ۲۰ [3] ایضاً ص ۳۰-۲۹ [4] ایضاً ص ۳۱۔

کر دیا جائے، بلکہ علماء نے یہ کوشش کی کہ اپنی رایوں کی تائید میں زیادہ سے زیادہ قدیم شخصیتوں بلکہ بعد صحابہ کرامؓ کی جانب نسبت کا اظہار کیا جائے، چنانچہ کوفہ والوں نے اپنے اس عمل میں حضرت عبداللہ ابن مسعود کو شریک کر لیا۔[۱]

شاخت نے اپنے ان نظریات وخیالات کے اظہار کے بعد یہ انکشاف کیا ہے کہ دوسری صدی ہجری میں محدثین کے طبقہ کا وجود ... در حقیقت فقہ کے ان مذکورہ مختلف طبقات کے خلاف ایک ردعمل تھا، محدثین پر دین واخلاق کا زیادہ اثر تھا،[۲] اور ان کی نظر وفکر کا بنیادی مرکز یہ تھا کہ نبی کریمؐ سے ماخوذ حدیثوں کا حق یہ ہے کہ وہ فقہی حدیثوں پر غالب رہیں، اس مقصد کے تحت محدثین نے تفصیلی روایتوں یا حدیثوں کو وضع کیا، اور یہ دعوی کیا کہ یہ روایتیں رسول اللہؐ کے اقوال وافعال ہیں یا پھر یہ تقریر رسول کی قسم سے ہیں، اور یہ ساری روایتیں ان تک غیر منقطع اسانید اور معتبر راویوں کی زبانی پہنچی ہیں، شاخت کہتے ہیں کہ اسی وجہ سے ہمارے لیے یہ سخت دشوار ہے کہ فقہی حدیثوں میں سے کسی بھی حدیث کے متعلق یہ فیصلہ کریں کہ وہ صحیح اور معتبر ہے۔[۳]

اس کے بعد شاخت لکھتے ہیں۔ کہ محدثین کے اس سخت موقف کا نتیجہ یہ ہوا کہ فقہ کے سارے طبقات ومکاتب فکر ان کے سخت مخالف ہو گئے۔[۴]

فقہاء ومحدثین کی اس کشمکش کے تجزیہ میں ان کی رائے یہ ہے کہ چونکہ محدثین نے رسول اللہؐ کی جامع شخصیت کو اپنا حلیف بنا لیا، اور انھوں نے اپنی روایات ونظریات کو زیادہ مہارت کے ساتھ پیش کیا اس لیے اس تصادم میں ان کی فتح یقینی تھی، فقہی مکاتب فکر کے سامنے حدیث نبوی کے اس حملہ کے مقابلہ کے لیے کوئی دفاعی لائن نہیں تھی، اس صورت میں ان فقہاء کے لیے ایک ہی بہتر شکل تھی،

---

[۱] انٹروڈکشن ٹو اسلامک لا شاخت ص ۳۳ [۲] ایضاً ص ۳۴ [۳] ایضاً ص ۳۴ [۴] ایضاً

علاوہ یہ کہ اپنی مختلف فیہ تفسیر و تشریح کے لیے حدیثوں سے کم سے کم وہ بعض استدلال کرتے، اور اس میں رسول اللہ سے منسوب ایسی حدیثوں کا انتخاب کرتے جن سے ان کی ذاتی فقہی رایوں کی تائید ہوتی نظر آتی۔

شاخت اس موقف پر یہ رائے بھی پیش کرتے ہیں کہ اگر وضع احادیث کے عمل میں یہ فقہاء، محدثین کے ساتھ اس طور پر شریک ہوتے کہ اپنے اقوال کو رسول اللہؐ سے منسوب کرتے تو وہ آغاز میں ہی محدثین کے مقابلہ میں کامیاب ہو جاتے۔[1]

کتب احادیث میں جو متصل السند اسناد موجود ہیں، ان کے متعلق شاخت کی تحقیق یہ ہے کہ یہ محض دروغ اور بے حیثیت ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ مکمل احادیث نبوی کا ذخیرہ دوسری یا تیسری صدی ہجری میں پایا جاتا ہے، تو یہ تصور کیونکر ممکن ہے کہ اسناد کا وجود متن کے وجود سے پہلے ہو۔

شاخت کہتے ہیں کہ احادیث کی اسانید کا ایک بڑا حصہ ناقص ہے، اور یہ سب کو معلوم ہے کہ اسانید تیسری صدی ہجری کے نصف ثانی میں مکمل شکل میں مرتب ہوئیں، ان اسانید سے زیادہ اعتنا نہیں کیا گیا، بلکہ جو طبقہ اپنی رایوں کو متقدمین سے منسوب کرنا چاہتا وہ ان میں سے چند شخصیتوں کا انتخاب کر لیتا اور پھر ان کو اسانید میں شامل کر دیتا۔[2]

شاخت کی مذکورۂ بالا رایوں کو ہم تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں، اور بعد میں ان تینوں حصوں پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

۱۔ اول یہ کہ احادیث نبوی کے خلاف اصحاب فقہ کی جانب سے سخت مزاحمت ہوئی۔

۲۔ فقہی حدیثیں وضع ہوئیں، اور یہ اس طور پر کہ ذاتی یا مسلکی رایوں کو متقدمین بلکہ خود رسول اللہ سے منسوب کر دیا گیا۔

---

[1] انٹروڈکشن ٹو اسلامک لا ص ۳۴-۳۵ ۵۲

۳۔ احادیث کا سلسلۂ اسانید وضع کردہ اور ناقص ہے۔

شاخت کے ان تینوں بنیادی اعتراضات کے جواب دینے سے پہلے ہم پھر اس حقیقت کی جانب نشاندہی کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کی ایک اصولی غلطی، ان کی ساری بحث کو غلط بناتی جاتی ہے، مذکورۂ بالا باتوں کا ربط ایک دوسرے سے ہے، اس لیے جب وہ ایک جگہ غلط نظریہ کو راہ دیتے ہیں تو پھر وہ غلطی پر غلطی کا ارتکاب کرتے جاتے ہیں اور جب وہ اپنے مطلوبہ نتائج تک نہیں پہونچتے تو پھر وہ اپنی ہی دلیلوں سے صرف نظر کرکے اپنی مرضی و منشا کے مطابق نتائج اخذ کرتے ہیں، ان کو یہ بھی پرواہ نہیں رہتی کہ نقل روایت میں خود ان کی تکذیب ہو سکتی ہے، اس کے علاوہ متضاد اور متناقض مثالوں کو ایک ہی جگہ پیش کرکے وہ عجیب و غریب نتائج کو مستنبط کرتے ہیں، ہم اپنی اس رائے کے اثبات میں تفصیل سے آئندہ سطور میں بحث کریں گے، لیکن سب سے پہلے ہم تاریخی پس منظر میں شاخت کے نظریات پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں۔

قدیم فقہی مکاتب فکر اور ان کے مخالفین کے نشو و نما کا دور اور شاخت کی رائے، شاخت کا دعویٰ ہے کہ امام شعبی متوفی سنہ ۱۱۰ھ کی زندگی میں فقہ اسلامی کا وجود نہیں تھا۔[1]

حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ سنہ ۱۲۰ھ میں فقہاء کے مرتب و مدون کیے ہوئے لٹریچر میں فقہ کی جزئیات کے علاوہ حدیث نبوی کے اعتراف اور اس کی بالادستی اور اس کی قدر و منزلت کی مثالیں موجود ہیں۔[2] فقہ اسلامی کے سب سے بڑے امام ابو حنیفہؒ اور ان کے مسلک کا جو عملی اور نظری تعلق حدیث نبوی سے ہے وہ معروف اور مشہور ہے، ۸۰ھ اور ان . . کا انتقال سنہ ۱۵۰ھ میں ہوا، تو ان تاریخی حقیقتوں کی

---

[1] اوریجنس آف محمڈن جورس پروڈنس ص ۲۳۰-۲۳۲، امام ذہبی لکھتے ہیں کہ ۱۴۳ھ تک امام ابو حنیفہ اور دوسرے فقہاء کی فقہی تالیفات سامنے آگئی تھیں [2] امام ابو حنیفہ کے نزدیک عمل بالحدیث اور دوسری رایوں اور فتووں پر اس کی ترجیح کے لیے دیکھیے، انتقاء ابن عبد البر ص ۲۲-۲۳، موطا شیبانی اور آثار شیبانی کا تو ہر صفحہ اس کا شاہد ہے، ان کے علاوہ تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۲۰، سیرۃ النعمان، علامہ شبلی نعمانی ص ۲۲-۲۵، اور ابو حنیفہ مرتبہ ابو زہرہ ص ۲۲-۲۵ دیکھیے۔

روشنی میں جب ہم شاخت کے مذکورہ دعووں پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ ظاہر ہوتا ہے، کہ مندرجہ ذیل واقعات صرف تیس سال کے عرصہ میں ظہور میں آئے،

۱۔ قدیم فقہی مکاتب فکر کا ظہور ہوا، اور

۲۔ ان تمام طبقات میں فکری طور سے ترقی اور تبدیلی آئی اور اجماع کے خیال کا نشو ونما ہوا

۳۔ ہر طبقۂ فکر نے اپنی رایوں اور اقوال کو ماضی کی بڑی شخصیتوں سے منسوب کرنا شروع کیا، جیسا کہ اہل عراق نے ابراہیم نخعی سے اپنی رایوں کو نسبت دی۔

۴۔ اس سے بھی بڑھ کر، اپنی ذاتی رایوں کو اور زیادہ قدیم لوگوں سے منسوب کیا گیا جیسے کہ امام مسروق کی جانب اقوال کی نسبت کی گئی۔

۵۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر صحابہ کرامؓ مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے ان کا انتساب شروع ہوا۔

۶۔ اور آخری اور انتہائی کوشش اس پر ختم ہوئی کہ اپنے ذاتی اقوال کو رسول اللہ کے اقوال سے تعبیر کیا گیا۔

۷۔ ان کوششوں کے رد عمل میں محدثین کا ظہور ہوا۔

۸۔ ان محدثین نے فقہاء کی ضد میں رسول اللہؐ اور صحابہ کرامؓ کی سیرت اور اقوال و افعال سے متعلق احادیث وضع کیں۔

۹۔ اس رد عمل کے نتیجہ میں دونوں طبقات یعنی طبقۂ فقہاء اور طبقہ محدثین میں آویزش اور رنجش قائم ہوگئی۔

۱۰۔ بالآخر فقہاء نے شکست کھائی اور محدثین کا اقتدار قائم ہوا۔

گویا تیس سال کے مختصر عرصہ میں ان سارے عوامل کا ظہور ہوا، اور وہ پایہ تکمیل کو بھی پہنچ گئے، کیا کوئی بھی عقل یہ باور کر سکتی ہے، کہ اس قدر وسیع علمی و نظری انقلاب کے لیے محض تیس سال کا

عرصہ کافی ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ دعوی قطعی خلاف عقل ہے، شاخت کا یہ نتیجہ، مطالعہ، ایک خیال خام سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتا، تحریک اور مخالف تحریک کا یہ افسانہ دراصل مغربی ذہن اور ماحول کی اپج ہے، اور تاریخی حقیقتوں کو مسخ کرنے کے علاوہ یہ اسلامی معاشرہ کی روح کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔

محدثین اور فقہاء کے درمیان آویزش: محدثین اور احادیث نبوی کے خلاف، فقہاء کے مختلف طبقات کی جانب سے حملہ اور مقابلہ کی داستان میں پروفیسر شاخت نے مدینہ، عراق، اور شام کے فقہاء کی چند مثالوں کو پیش کیا ہے، جو بقول خود ان کے دعوی کو مدلل اور مضبوط کرتی ہیں، یہاں ایک ذاتی رائے کو پہلے اجمالاً بیان کرنے کے بعد ان کی بعض مثالوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے گی۔

یہ بات ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ شاخت کی بحثوں میں جو بات سب سے نمایاں ہے، وہ ان کا متناقض الرائے ہونا ہے، ان کی تحریر پر نظر رکھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ پہلے سے اپنی طے شدہ منزل تک پہونچنے کے لیے ایک نظریہ قائم کرتے ہیں، اس صورت میں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ان کا یہ نظریہ گہری تحقیق اور سنجیدہ بحث کے نتیجہ میں قائم ہوا ہو، اسی لیے بحث کے دوران وہ متناقض باتیں پیش کرتے جاتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ باہم متناقض اور متضاد دلیلوں میں وہ ربط اور توافق کیسے پیدا کریں گے، مثلاً ان کی تحقیق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل کلام کے ساتھ ساتھ فقہاء کے تمام طبقات نے حدیث کی سختی سے مخالفت کی اور اسکا مقصد یہ تھا کہ حدیث ان کی فقہ میں زیادہ موثر اور دخیل عنصر نہ بن سکے[1]، اس کے بعد وہ ایک دوسری جگہ جب فقہی احادیث کے وضع ہونے پر گفتگو کرتے ہیں، تو یہ کہتے ہیں کہ کسی زمانہ میں وضع حدیث کو ثابت کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اس زمانہ میں فقہاء نے اس حدیث کا اپنی

---

[1] اوریجنس ص ۵۰۔

بحث میں ذکر کیا ہے یا نہیں، اگر فقہا کی بحثوں میں اس حدیث کا ذکر نہیں ہے، تو یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ اس حدیث کو بعد کے زمانہ میں وضع کیا گیا ہے۔[1]

سردست ہم اس بحث میں نہیں پڑتے ہیں کہ یہ یقینی طور پر کیسے کہا جاسکتا ہے، کہ فلاں حدیث سے فقہا نے اپنی علمی بحثوں میں استفادہ نہیں کیا، اور کیا یہ کسی بھی شخص کے لیے ضروری اور ممکن ہے کہ وہ اپنی بحث کے دوران سارے دلائل پیش کرے؟ البتہ یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ ہم شاخت کی اس متناقض اور متضاد رائے کو کیونکر تسلیم کریں، جب شاخت کے دعویٰ کے مطابق فقہا رفی الحقیقت احادیث نبوی کے مخالف تھے، تو پھر ان سے یہ امید کیونکر کی جائے کہ وہ باوجود مخالفت کے احادیث کو اپنی بحث و گفتگو میں شامل کریں گے، اور اگر حدیثوں کا ذکر واقعی ان کی بحثوں میں ناگزیر تھا، تو پھر حدیث سے ان کی دشمنی کا دعویٰ کیا محض افسانہ ثابت نہیں ہوتا ہے؟ یہ شاخت کے مجموعہ اضداد ہونے کی ایک مثال ہے،

ایک اور مثال | محدثین اور فقہا کے درمیان آویزش کو ثابت کرنے کے لیے شاخت نے ایک اور مثال دی ہے، وہ کہتے ہیں کہ فقہا نے احادیث کے مقابلہ میں آثار پر زیادہ اعتماد کیا ہے، اور اس سلسلہ میں انھوں نے درج ذیل اعداد پیش کیے ہیں۔[2]

	موطا امام مالک	موطا امام محمد شیبانی	آثار ابی یوسف	آثار امام محمد شیبانی
احادیث نبویہ	۸۲۲	۴۲۹	۱۸۹	۱۳۱
احادیث موقوفہ	۶۱۳	۶۲۸	۳۷۲	۲۸۴
آثار تابعین	۲۸۵	۱۱۲	۵۴۹	۵۵۰
آثار متاخرین	-	۱۰	-	۶

---

[1] اوریجنس ص ۱۴۰ [2] ایضاً ۲۲۔

اس خاکہ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ موطا امام مالک (م ۱۷۹ھ) میں احادیث نبوی کی تعداد، کمیت کے اعتبار سے آثار صحابہؓ و تابعینؒ کے برابر ہے،

موطا امام محمد شیبانی (م ۱۸۹ھ) میں کمیت کے لحاظ سے آثار صحابہؓ و تابعینؒ کے مقابلہ میں احادیث کی تعداد تقریباً نصف ہے۔

آثار شیبانی میں اس کمیت کی نسبت ۱ : ۵ کی ہے، اور آثار ابی یوسف میں یہ نسبت تقریباً ۱ : ۲ کی ہے۔ اب اگر صحابہؓ و تابعینؒ سے مروی آثار کی بڑی تعداد سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جائے کہ احادیث نبوی کی اہمیت کم ہوگئی تھی، تو کوئی بھی شخص یہ نتیجہ اخذ کرسکتا ہے کہ امام شیبانی کے زمانہ میں تو احادیث کی اہمیت بالکل ہی ختم ہوکر رہ گئی ہوگی، کیونکہ امام شیبانی نے امام مالک کے انتقال کے دس سال کے بعد وفات پائی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان حضرات کی موطا میں احادیث و آثار تقریباً مساوی تعداد میں موجود ہیں، ہاں آثار شیبانی میں آثار کی نسبت احادیث سے کچھ گنا زیادہ ہے، لیکن اس بات سے شاخت کے اس دعوی کا ابطال ہوتا ہے کہ محدثین کا دباؤ فقہاء پر بڑھتا گیا یہاں تک کہ ان فقہاء نے محدثین کے سامنے سر تسلیم خم کردیا، اس دعوی کی دلیل میں وہ لکھتے ہیں کہ

چونکہ امام ابو یوسف کا زمانہ امام ابو حنیفہ کے بعد کا ہے، اس لیے احادیث نبوی کو قبول کرنے میں وہ امام ابو حنیفہ سے زیادہ محتاط تھے، امام شیبانی کا معاملہ ابو یوسف سے اس لیے مختلف ہے کہ انھوں نے موطا کو نقل کیا، تاہم ہر حدیث کے بعد وہ اپنے قول کی بھی تکرار کرتے ہیں۔

اب شاخت کے اس دعوی کو اگر ہم تسلیم کرلیں تو یہ گویا دو متضاد رایوں کو ایک ہی وقت میں تسلیم کرنے کے مترادف ہوگا، یعنی جب ان کتابوں میں آثار صحابہؓ و تابعینؒ کی موجودگی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ احادیث نبوی سے اعتنا کم ہوگیا تھا، تو پھر امام شیبانی کے متعلق یہ کہنا ہوگا کہ

انھوں نے اپنے اسلاف یعنی امام مالک و ابو یوسف کی بہ نسبت احادیث سے اور بھی کم اعتنا کیا اور ان کے دور تک حدیث کی اہمیت تقریباً ختم ہو گئی، تو اس صورت میں شاخت کا یہ دعویٰ مہمل ہو جاتا ہے کہ محدثین کا غلبہ فقہاء پر بڑھتا گیا، اور بالآخر فقہار نے محدثین کے سامنے سپر ڈالدی ان دونوں متضاد دعووں میں باہم توافق کی کیا کوئی اور شکل بھی ہے۔؟

البتہ ہم شاخت کے مذکورہ دعوی کے بارہ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے فقہاء کے اس اعتماد اور اقرار کو یکسر رد کر دیا کہ تشریع کے میدان میں اولیت اور اہمیت احادیث نبویؐ کو ہی حاصل ہے، اسی طرح شاخت نے فقہار کی کتابوں کی ان صدہا مثالوں سے صرف نظر کیا جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان فقہار نے حدیث پر عمل کو ترجیح دی، اسی طرح انھوں نے امام شافعی کے اس قول کو بھی تسلیم نہیں کیا، جس میں امام صاحب نے اپنے مسلک کے مخالف فقہار کے بارے میں یہ کہا کہ یہ لوگ حدیث نبویؐ پر تعامل اور اس سے استدلال کرنے میں بہرحال ان کے ہم مسلک ہیں، اور اس معاملہ پر دو سب متفق ہیں، اور دلچسپ بات یہ ہے کہ شاخت، امام شافعی کا یہ قول بخوشی تسلیم کرتے ہیں کہ ان کے مسلک کے مخالف فقہار نے چند حدیثوں پر عمل کو ترک کر دیا ہے، حالانکہ ان فقہار نے جن احادیث کو قبول کیا ہے، ان کے مقابلہ میں ایسی حدیثوں کی تعداد نہایت کم ہے، جن کو انھوں نے بعض اصولوں کے تحت ترک کیا ہے، یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ شاخت امام شافعی پر علمی غیر امانت داری اور سوء فہم کا الزام عائد کرتے ہیں، مگر جب امام شافعی کے ایک قول سے ان کے نتیجہ فکر کا کوئی شگوفہ شاداب ہوتا نظر آتا ہے تو پھر وہ اسوقت اپنے لگائے ہوئے الزام اغماض برتنے میں ذرا تکلف نہیں کرتے ہیں، بایں ہمہ امام شافعی کے اعتراضات کو قبول کرنے میں اگر وہ کسی اصول پر کاربند ہوتے تو حیرت نہ ہوتی، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ شاخت نے جسارت کے ساتھ ایک فیصد کو سو فیصد بنا کر پیش کیا ہے، اس علمی تحقیق کو اگر کوئی صاحب نظر

ن شعبدہ بازی سے تعبیر کرے تو کیا یہ غلط بات ہوگی۔

اخت کی تحقیق کی بنیادی غلطیاں: شاخت کی مذکورہ بالا تحقیق کے مطالعہ کے دوران بار بار یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ قدم قدم پر اصولی اور منہجی غلطیاں کرتے جاتے ہیں۔

یہ ایک عام اصول ہے کہ کسی قضیہ میں کسی شخص کی رائے معلوم کرنا ہو یا کسی سے اس کے مذہب اور مسلک کے بارے میں کچھ جاننا ہو تو صاحب معاملہ سے براہ راست معلومات حاصل کرنا ہی زیادہ انصاف کی بات ہے، اس طرح اس شخص کا قول زیادہ صحیح اور مستند ہوگا، اور جب کسی کے قول کی صداقت اور صحت معلوم کرنے کی ضرورت ہوگی تو اس کے قول کو اس کے فعل و عمل کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا، لیکن شاخت کے کارخانہ تحقیق میں اس کسوٹی کا وجود نہیں ہے، وہ احادیث رسول اللہؐ کے بارے میں خود فقہاء کے اس قول کو تسلیم نہیں کرتے ہیں، کہ وہ یعنی فقہاء احادیث نبوی کے پابند ہیں، اور انہی پر ان کا عمل ہے، وہ مختلف مسلکوں کے نمائندہ فقہاء کی اس بات سے بھی متفق نہیں ہیں کہ احادیث نبویؐ کی عظمت و جلالت کے متعلق وہ سب ایک دوسرے سے اتفاق کرتے ہیں، شاخت وہ فیصلے قضایا و معاملات سے بھی صرف نظر کرتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ فقہاء نے احادیث نبویؐ سے استدلال کیا، اس کے برعکس وہ کسی فریق مخالف کا یہ اعتراض فوراً تسلیم کرتے ہیں، کہ فلاں فقیہ نے کسی مسئلہ میں حدیث رسولؐ کو قبول نہیں کیا، خواہ ایسے مسائل تعداد میں ایک ہی فیصد کیوں نہ ہوں۔

اسی طرح وہ امام مالک کی روایوں سے چند مثالیں منتخب کرتے ہیں، اور ان سے جو نتائج نکالتے ہیں اس کی ذمہ داری میں سارے مدینہ والوں کو شامل کرتے ہیں، گویا مدینہ میں امام مالک کے علاوہ دوسرے صاحب الرائے فقہاء کا نہ تو وجود تھا، اور نہ علمائے مدینہ میں کسی مسئلہ میں کوئی اختلاف رائے ہوا تھا،

عراق کے مکتب فکر کے سلسلہ میں ان کے نتائج اور زیادہ عجیب وغریب ہیں، احناف کے مکتب فکر سے وہ کوئی ایک مثال لیتے ہیں، پھر وہ اس کو نہ صرف کوفہ بلکہ پورے عراق والوں پر منطبق کر دیتے ہیں، ان کا یہی معاملہ امام اوزاعی کے ساتھ بھی ہے، اس اجمال کی تفصیل میں ہم بعض اور مثالیں پیش کرتے ہیں،

معتزلہ اور حدیث | ایک جگہ شاخت نے حدیث کے مخالف فقہاء کو دو طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک طبقہ کو وہ سخت اور متشدد قرار دیتے ہیں، اور دوسرے کو نسبتاً نرم اور معتدل سمجھتے ہیں، ان کے خیال میں معتزلہ کا شمار متشدد طبقہ میں ہے، مگر خود معتزلہ کی رایوں کا جائزہ لیا جائے، تو شاخت کی یہ تقسیم یک طرفہ اور حقیقت کے بخلاف ثابت ہوتی ہے، مثلاً مشہور معتزلی، خیاط جنھوں نے اپنی کتاب الانتصار کو سنہ ۳۰۰ھ سے پہلے مدون کیا تھا، اس میں انھوں نے دوسری اور تیسری صدی ہجری کے بعض کبار معتزلہ کے اقوال نقل کئے ہیں، (دیکھئے مذکورہ کتاب ص ۶۸، ۵، ۱۰۸، ۱۱) اور ان سب کا ماحصل یہ ہے کہ وہ سنت اور حدیث نبوی پر کاربند اور اس کے پابند ہیں، اسی طرح ابن المرتضیٰ نے اپنی کتاب طبقات معتزلہ کی ایک طویل فہرست میں نامور معتزلی محدثین کے ناموں کا ذکر کیا ہے، (دیکھئے ص ۱۳۳، ۱۴۰) اس فہرست میں بعض ناموں کی شمولیت گو محل نظر ہے۔ تاہم محدثین کی ایک خاصی بڑی تعداد سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے، لیکن شاخت ان ساری سچائیوں پر یہ کہہ کر پردہ ڈالتے ہیں کہ یہ لوگ قدیم معتزلہ کے نمائندہ نہیں ہیں[۱] حقیقت یہ ہے کہ شاخت نے خود قدیم معتزلہ کا براہ راست مطالعہ نہیں کیا، بلکہ ان کے اس موقف کی بنیاد ابن قتیبہ متوفی ۲۷۶ھ کی چند باتوں پر ہے، ابن قتیبہ کی معتزلہ دشمنی معروف ہے، ان کی بعض باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ اہل کلام معتزلہ ایسے تھے، جو حدیث کی اہمیت کے چنداں قائل نہیں تھے، ابن قتیبہ کی یہ رائے

---

[۱] اوریجنلس۔ ص ۲۵۵۔

اگر درست تسلیم کرلی جائے، تو بھی شاخت کے رویہ کے بارہ میں یہ سوال اٹھتا ہے، کہ یہ کون سی منطق ہے، اور یہ کیسا طریقۂ استدلال ہے؟ لیکن مستشرقین کی نفسیات سے واقف لوگوں کیلئے یہ بہرحال حیرت کی بات نہیں ہے، کیونکہ ایک مستشرق نے صریحاً اس حقیقت سے انکار کیا کہ قرآن مجید، قرن اول میں تحریری شکل میں موجود تھا، اور اس کے لیے انھوں نے یہ دلیل کافی سمجھی کہ یوحنا دمشقی مسیحی نے کہیں یہ ذکر نہیں کیا ہے کہ اس زمانہ میں مسلمانوں میں کوئی کاتب بھی تھا، (یہ یوحنا دمشقی مسیحی، پہلی صدی ہجری کے اواخر میں شام میں تھا، اور اسلام سے دشمنی اور نفرت کے لیے مشہور تھا)، شاخت نے حدیث کے مخالفین کے دوسرے معتدل طبقہ میں تقریباً تمام فقہاء کو شامل کیا ہے، خصوصاً مدینہ شام اور عراق کے مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والوں کو انھوں نے اسی طبقہ میں جگہ دی ہے، اس تقسیم کے لیے وہ امام شافعی کی بعض تحریروں سے سند حاصل کرتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان تحریروں سے حدیث کے مخالف فقہاء کا تعین ہوتا ہے، یہاں شاخت کے اصول و دلائل پر نظر ڈالنے سے پہلے یہ واضح کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شاخت کی نظر میں امام شافعی کا کیا مرتبہ و مقام ہے، وہ امام شافعی کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "امام شافعی نے عراقیوں (حنفیوں) کے اصول و مبادی میں کثرت سے تحریف کی ہے" دوسری جگہ وہ بجائے عراقیوں کے شامی مکتب فقہ کے متعلق امام شافعی کی اسی بات کو دہراتے ہیں، اور تائید میں تینتیس چالیس مثالیں پیش کرتے ہیں[۱]، امام شافعی کے متعلق ان کی یہ رائے بھی ہے کہ وہ فریق مخالف کی باتوں میں اپنی جانب سے بھی اضافہ کردیا کرتے تھے[۲]۔ انھوں نے چند ایسی مثالیں پیش کی ہیں، جن سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے، کہ علمی مسائل میں امام شافعی موضوع کے پابند نہیں رہتے تھے، اس کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر شاخت کی نظروں میں امام شافعی کا

---

[۱] اوریجنس۔ ص ۳۲۱ [۲] ایضاً۔ ص ۳۲۱ - ۳۲۲

یہی مرتبہ و مقام ہے، تو پھر مخالفین پر امام شافعی کے اعتراضات کو قطعی طور پر دلیل بنا لینا کیسے جائز ہے؟ لیکن شاخت کو اس سے بحث نہیں، وہ صرف اپنی مرضی کے مطابق، بغیر کسی منطقی جواز کے، امام شافعی کے ایک قول کو کبھی نظر استحسان سے دیکھتے ہیں اور کبھی دوسرے قول سے صرف نظر کرتے ہیں،

فقہائے حنفیہ اور حدیث | اوپر کی سطروں میں ہم شاخت کی اس رائے کو نقل کر چکے ہیں کہ آثار صحابہ کو حدیث پر ترجیح دی گئی، جس سے حدیث کی مخالفت اور عداوت کا اظہار ہوتا ہے۔ چنانچہ جب انھوں نے حدیث کے متعلق فقہائے حنفیہ کا ذکر کیا تو لکھا کہ عراقیوں (حنفیوں) کا مسلک یہ ہے کہ حدیث کو اس کے مقام سے گرا کر دوسرے درجہ پر رکھا جائے، اور اس کے مقابلہ میں صحابہ کے آثار و اقوال کو ترجیح اور فضیلت دی جائے، اپنی اس رائے کی تائید میں انھوں نے امام شافعی کا یہ قول نقل کیا کہ "وہ (احناف) یہ سمجھتے ہیں کہ وہ کسی صحابی کی مخالفت نہیں کرتے حالانکہ انھوں نے حضرت عمرؓ کے حکم کی مخالفت کی، وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ کسی ایسے شخص کی رائے کو قبول نہیں کرتے جو قیاس کو ترک کرتا ہو، حالانکہ وہ خود قیاس کو ترک کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں متناقض باتیں پیش کرتے ہیں"۔[۲]

شاخت کے اس اعتراض و دلیل کے متعلق سب سے پہلے تو ہم یہ کہتے ہیں کہ ابو حنیفہ کے رد میں امام شافعی کے قول پر وہ کیسے اعتماد کرتے ہیں، جب کہ وہ امام شافعی پر علمی عدم امانت کا الزام بھی عائد کرتے ہیں، آخر یہ کون سا اصول ہے؟ وہ احناف کی اس بات پر اعتماد کیوں نہیں کرتے کہ

لا حجۃ فی احد مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم — نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں کوئی قابل حجت نہیں۔[۳]

---

[۱] اوریجنس۔ ص ۲۹ [۲] دیکھیے الحجۃ علی اہل المدینۃ۔ امام شیبانی ج ا ص ۲۰۲-۲۰۵ کتاب الام امام شافعی ج ۷، ص ۲۹۲، کتاب الخراج، امام ابو یوسف ۵۸، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۸۹۔

پھر امام شافعی کے مذکورہ بالا قول سے یہ کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ احناف، حدیث کے مقابلہ میں آثار صحابہؓ کو ترجیح اور فضیلت دیتے ہیں، کیونکہ امام شافعی تو احناف کے اس قول پر اظہار رائے کرتے ہیں، کہ وہ اصحاب نبیؐ میں کسی کی مخالفت نہیں کرتے ہیں، حدیث و سنت رسولؐ سے اس قول کا تعلق ہی نہیں ہے، اپنے قول کی تائید میں شاخت کے لیے بہتر یہ ہوتا کہ وہ صراحت اور شمار کے ساتھ ثابت کرتے کہ اکثر و بیشتر فقہی معاملات میں ایک حدیث کے پائے جانے کے باوجود، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب نے سنت و حدیث کی مخالفت کی اور اس کے مقابلہ میں آثار صحابہ کو ترجیح دی۔

فقہائے مدینہ اور حدیث فقہاء مدینہ کے بارے میں شاخت کی تحقیق یہ ہے کہ متعدد قضایا و معاملات میں انھوں نے حدیث سے استفادہ کیا ہے لیکن بہت سے مقامات پر حدیث سے صرف نظر بھی کیا ہے لیکن جب ہم موطا امام مالک پر ایک نظر ڈالتے ہیں، تو یہ دیکھتے ہیں، کہ وہ ۸۲۲ حدیثوں پر مشتمل ہے، احادیث کی اتنی بڑی تعداد میں صرف تین حدیثیں ایسی ملتی ہیں جن سے امام مالک نے استدلال نہیں کیا ہے [۵۲] اسی طرح امام مالک نے ۶۱۳ آثار صحابہ کی روایت کی ہے اور ان میں سے صرف دس روایتیں ایسی ہیں جن پر ان کا عمل نہیں ہے [۵۳] اس حقیقت حال سے باخبر ہونے کے بعد شاخت یا کسی بھی شخص کے لیے یہ کہنا کیسے زیب دیتا ہے کہ فقہائے مدینہ، اکثر صورتوں میں احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تغافل اور تجاہل کا معاملہ کرتے ہیں۔

امام مالک نے موطا میں یہ مشہور حدیث بھی روایت کی ہے کہ

ترکت فیکم امرین لن تضلوا	میں تمھارے لیے دو باتیں چھوڑے جاتا ہوں
ما تمسکتم بھما کتاب اللہ	جب تک تم ان کو مضبوطی سے پکڑے رہوگے

---

۵۲ دیکھیے موطا امام مالک۔ ص ۳۰۹، ۔ ۴۸۲ ۔ ۶۱۷ ۔ ۵۳ ایضاً ص ۱۲۵،۸۲، ۲۰۶، ۲۰۶، ۲۳۹، ۲۴۹
۳۶۲، ۴۰۸، ۴۸۸، ۸۲۷، ۸۵۱۔

... سنتہ رسولہ ... فعلی گروہ ہوگئے ایک کتاب اللہ اور دوسرے

اس کے رسول کا اسوہ ...

لیکن شاخت موطا میں اس بنیادی حدیث کی موجودگی سے متاثر نہیں ہوتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ بہرحال فقہی مباحث میں فقہائے مدینہ حدیث پر اعتماد نہیں کرتے ہیں، اور جن فقہائے مدینہ کا حدیث پر عمل ثابت ہے وہ امام شافعی سے ایک پشت پہلے کے لوگ تھے[۱]، اب شاخت کی ان تحقیقات بلکہ خیالات کا جو علمی پایہ متعین ہوتا ہے، وہ کس صاحب نظر سے پوشیدہ ہے۔

شاخت کی ایک اور خصوصیت | ہم اوپر یہ بتا چکے ہیں کہ شاخت نے فقہا کو متشدد اور معتدل دو حصوں میں تقسیم کیا معتدل فقہا میں انھوں نے مدینہ، کوفہ یا عراق والوں اور امام اوزاعی کے مکتب فکر کو شامل کیا ہے[۲] حدیث کی ... میں ان کا خیال یہ ہے کہ یہ تمام فقہا آثار صحابہ کو زیادہ ترجیح اور فضیلت دیتے ہیں، شاخت اپنے اس نظریہ کی تائید میں صالح بن کیسان کا یہ قول نقل کرتے ہیں[۳] میں اور زہری ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتے تھے ہم نے کہا کہ حدیثوں کو لکھیں گے اس پر زہری نے کہا کہ ہم رسول اللہؐ سے مروی حدیثوں کو لکھیں گے اور صحابہؓ سے منقول آثار کو بھی ضبط تحریر میں لائیں گے اس لیے کہ وہ بھی سنت (حدیث) کے درجہ میں ہیں، تو میں نے کہا کہ نہیں آثار صحابہ کو میں حدیث نہیں مانتا، اس لیے ان کو نہیں لکھوں گا، صالح بن کیسان اس کے بعد کہتے ہیں کہ زہری نے آثار صحابہ کو لکھا اور میں نے نہیں لکھا تو وہ کامیاب ہوگئے، اور میں ضایع ہوگیا[۴]۔

اس روایت سے کہیں یہ اشارہ نہیں ملتا کہ فقہائے مدینہ احادیث پر آثار کو ترجیح دیتے تھے، ہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ صالح اور زہری دونوں احادیث کے لکھنے پر متفق تھے، البتہ آثار صحابہ کو اہمیت دینے میں صالح زہری کی رائے سے متفق نہیں تھے دوسرے یہ کہ علم میں زہری، صالح سے زیادہ کامیاب تھے، مذکورہ روایت کے سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ تاریخی اعتبار سے یہ واقعہ پہلی صدی کے نصف حصہ کے بعد کا ہے تو اگر اس دور میں صالح اور زہری دونوں نے حدیثوں کو مرتب کیا تھا تو پھر شاخت کے اس قول میں کتنی صداقت رہ جاتی ہے کہ ساری حدیثیں دوسری اور تیسری صدی میں وضع کی گئیں۔ (باقی)

۱ موطا ص ۱۵۸
۲ ایضاً ص ۱۲
۳ ایضاً ص ۲۱-۵۲
۴ ص ۴۹،۷۹ طبقات ابن سعد ص ۱۳۵

یادِ رفتگاں

از

سید صباح الدین عبدالرحمن

(۲)

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا معین الدین اجمیری کو مزید خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

فرائض کے ساتھ نوافل اور مستحبات کے بھی آخر وقت تک پابند رہے، علمی مشاغل بھی جاری رکھے، ترمذی شریف کا ایک ناتمام حاشیہ لکھا، وجود علم و معلوم کلی طبیعی اور مسئلہ دہر پر ان کی تقریروں کا ایک مجموعہ ہے، حضرت خواجہ غریب نواز کی ایک محققانہ سوانح عمری بھی لکھی تھی، جو شاید چھپ نہ سکی، مگر سید صاحب ان کے ان اوصاف کے ساتھ ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو جو عشق رہا اس سے زیادہ متاثر رہے۔ لکھتے ہیں :۔

ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت و شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ بخاری وغیرہ میں جب یہ حدیث آتی کہ حضورؐ کے مرض وفات کی تکلیف دیکھ کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بے اختیار پکار اٹھیں یا ابتاہ (اے میرے باپ) سرکار دو عالمؐ نے فرمایا۔ لاکرب علی ابیک بعد الیوم (آج کے دن کے بعد تمہارے باپ پر مصیبت نہیں ہے) اس جملہ پر مولانا بے تاب ہو جاتے، آنسو نکل آتے، چیخ نکل پڑتی، بسا اوقات غشی طاری ہو جاتی، مدرسہ میں درس دیتے وقت ہر مرتبہ یہ واقعہ پیش آتا۔ (یادِ رفتگاں، صفحہ ۲۰۱)

آخر میں سید صاحبؒ لکھتے ہیں، کہ زندگی میں گورِ غریباں کو اپنا مسکن بنا لیا تھا، وہاں کے

ایک چھوٹے مکان میں وفات پائی۔ ان کا جنازہ اٹھا تو چارپائی میں لمبی لمبی بلیاں باندھ دی گئی تھیں کہ بیک وقت پچاسوں مسلمان کندھا دیتے تھے، پھر بھی ہجوم اور لوگوں کے اشتیاق کی کوئی حد نہ تھی، خواجہ اجمیری کی درگاہ میں مسجد شاہجہانی کے زیر سایہ تدفین ہوئی، قبر میں اتارتے وقت دیواروں اور درختوں پر انسانوں کا ہجوم تھا" (یاد رفتگاں صفحہ ۲۰۲)

مدراس کے علماء سید صاحبؒ کی نظر جنوبی ہند کے علماء کی طرف بھی برابر اٹھی رہی، نجی صحبت میں وہ فرمایا کرتے کہ مدراس سے ان کو عشق ہے، اس لیے کہ اسی طرف سے ہندوستان میں اسلام کا پہلا قافلہ داخل ہوا، اسی عشق میں مدراس میں سیرۃ النبیؐ پر جو خطبات دیے، ان کا نام بھی خطبات مدراس رکھا، پھر ان کو مدراسی علماء سے کیوں نہ دلچسپی ہوتی۔ مدراس میں روشن کمپنی کے حاجی عمر ایک کامیاب تاجر تھے، ان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "کہ وہ توحید و سنت کے بڑے متبع تھے، انھوں نے شمالی ارکاٹ میں عمر آباد ایک آبادی قائم کی، اور وہاں ایک بڑے مدرسہ دار السلام کی بنیاد رکھی، ان کی وفات کے بعد ان کے منجھلے بیٹے سیٹھ ابراہیم نے اسکی دیکھ بھال اور اس کے قیام و ترقی کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا، مدرسہ کے کتب خانہ کی ایک عمارت بنوائی، اس کے لیے کتابیں خریدوائیں، طنطاوی کی تفسیر کا اردو ترجمہ مطبع معارف میں چھپوایا، ان کی جوان مرگی پر سید صاحبؒ نے لکھا کہ افسوس کہ یہ پھول کھلنے سے پہلے مرجھا گیا، ۲۰ رجب ۱۳۵۶ھ کو اس دنیائے ناپائدار کو الوداع کہا، رحمۃ اللہ تعالیٰ۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۰۶)

مدراس کے علاقے میں جب کرنول میں مسلمانوں کی حکومت تھی، تو اسی کے ایک خاندان سے مولانا حاجی محمد عمر المتوفی ۱۹۴۶ء تعلیم پاکر ایک معمولی مدرسہ کی خدمت میں لگ گئے، تو اس کو بڑی ترقی دی، اور وہاں کے سند یافتہ اچھے اچھے عہدوں پر

مامور ہوئے، ان کے شاگردوں میں ڈاکٹر عبدالحق بھی تھے، جو مدراس کے مشہور ماہر تعلیم گذرے ہیں وہ مولانا اشرف علی تھانوی سے بیعت بھی تھے، مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی سے بھی فیض حاصل کیا، حکومت سے شمس العلماء کا خطاب بھی ملا، ان کی وفات پر سید صاحبؒ نے بہت دلگیر ہو کر لکھا کہ ان کے علم و فضل، نیکی و تقویٰ کے سبب سے حاکم و محکوم دونوں طبقوں میں انکی ہر دلعزیزی تھی، ان کی وفات سے علوم قدیمہ کا خاتمہ ہو گیا، وہ اسلاف کی زندگی کا نمونہ تھے، ہر طرح کے آرام کے باوجود ہمیشہ خود اختیارانہ فقر کی زندگی پسند کی، اور دنیاوی املاک میں سے نہ زمین چھوڑی، نہ مکان، اور نہ نقد، ہمیشہ یہی آرزو رہی، کہ دنیا سے ایسے روانہ ہوں کہ ترکہ کا حساب نہ دینا پڑے، وہی بعینہٖ پیش آیا، رحمۃ اللہ تعالیٰ۔ (یادِ رفتگاں صفحہ ۳۳۹)

یہ لکھتے وقت سید صاحبؒ کو خوشی ہو رہی ہوگی، کہ ان کے طبقہ کے لوگ اپنے کردار اور سیرت کی کیسی کیسی اعلیٰ مثالیں چھوڑ گئے ہیں۔

سندھ کے عالم | سید صاحب کی نظر سندھ کے دور دراز علاقہ کے علماء پر بھی رہی جھنڈا گوٹھ ضلع حیدرآباد سندھ کے مشہور عالم پیر احسان اللہ شاہ صاحب (متوفی ۱۹۳۰ء) کی وفات ہوئی تو ان پر یہ ماتمی تحریر لکھی :-

> "مرحوم حدیث و رجال کے بڑے عالم تھے، ان کے کتب خانہ میں حدیث و تفسیر و رجال کی نایاب قلمی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا، ان کے شوق کا یہ عالم تھا کہ مشرق و مغرب، مصر و شام، عرب و قسطنطنیہ کے کتب خانوں میں ان کے کاتب و ناسخ قلمی کتابوں کی نقل پر مامور رہتے تھے، مرحوم ایک خانقاہ کے سجادہ نشین اور طریق سلف کے متبع اور علم و عمل دونوں میں ممتاز تھے۔ (ایضاً ص ۱۸۶)

اس تحریر کو پڑھتے وقت ناظرین کو خیال ہوگا کہ سید صاحبؒ اپنے علماء کے طبقہ ہی سے

ہر ممتاز فرد کی خوبیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتے اور ان کو پیش کرنے میں خود خوشی محسوس کرتے سید صاحب نے اپنے دور کے علما کی وفات پر جو کچھ لکھا ہے، اس کو ایک علحٰدہ کتاب میں شائع کر دیا جائے، تو یہ تذکرہ علمائے ہند کی ایک مستقل جلد ہو جائے، ان کے اوصاف بیان کرنے میں اس کی تفریق نہ کرتے کہ وہ کس مسلک، کس عقیدہ اور کس مکتب فکر اور کس مدرسہ کے سند یافتہ ہیں، اس سے بے نیاز ہو کر ان کے محاسن، مناقب اور اوصاف پر ان کی نظر ہوتی،

اوپر کی تفصیلات سے معلوم ہوگا کہ ان کے تعلقات اہل حدیث علما سے ویسے ہی رہے جیسے حنفی علما سے تھے، اور اہل حدیث علما کی تعریف و تحسین میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی بلکہ ان میں جو اوصاف تھے، ان کو دل کھول بیان کیا ہے، ان کی اس فراخ دلی اور رواداری کی وجہ سے بعض حلقہ میں ان کو اہل حدیث اور سلفی سمجھا گیا، حالانکہ جو لوگ ان کی خانگی اور خاندانی زندگی میں ان سے قریب تر رہے ہیں، وہ پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں، کہ وہ ہر لمحہ اور ہر ساعت اپنی زندگی میں حنفی عقائد اور مسلک کے پابند رہے، یہ اور بات ہے کہ ان میں اعتدال پسندی تھی، جیسا کہ خود انھوں نے مولانا ابوبکر شیث کے ذکر میں لکھا ہے، کہ ایک مرتبہ میں نے ان سے کہا اور انھوں نے مانا بھی کہ ایک مذہب ہے جس کے دو ہی پیرو ہیں، ایک وہ اور ایک میں مقصود تقلید و عدم تقلید کے مسائل میں اعتدال سے تھا، سید صاحبؒ کی یہی اعتدال پسندی ان کی سیرت اور ان کے مذہبی مسلک کی نمایاں خوبی تھی۔

ارباب علم و دانش پر ماتم | ان کے زمانہ میں جن ارباب علم و دانش نے وفات پائی ان کے مختصر حالات لکھ کر ان پر بھی ماتم کیا، اور ان کی خوبیوں کی طرف خاص توجہ دلائی، مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی (المتوفی ۱۹۱۷ء) سے ان کے ذاتی تعلقات تھے، ان کے علمی کارناموں میں قرآن

اسد بن کی تقریظ و تحشیہ اور قواعد اردو اور اردو لغات کی تکمیل کی کوشش کو سراہنے کے بعد ان کے مدرسہ نبات المسلمین کی تاسیس کا بھی ذکر کرتے ہیں، ان کی جس چیز سے خاص طور پر وہ متاثر ہوئے، اس کی طرف یہ لکھ کر توجہ دلائی ہے کہ

بقول علامہ شبلیؒ مرحوم مولانا حالی کے بعد کسی نے سننے کے لائق کچھ کہا ہے، تو وہ مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی ہیں، افسوس کہ دوسرا حالی بھی ہماری دنیا سے رخصت ہوگیا، مرحوم کا سہل اور رواں کلام ہمارے بچوں کا ابتدائی سبق تھا، وہ اپنی پیرانہ سالی کی مرتعش زبان سے چھوٹے چھوٹے بچوں کو اس پیار سے سمجھاتے تھے، کہ وہ نصیحت کی گراں باری کو کھلونے سمجھ کر اٹھا لیتے تھے، افسوس کہ یہ کھلونا بنانے والا بھی اب نہ رہا" (یادِ رفتگاں صفحہ ۳۰)

ایم مہدی حسن افادی الاقتصادی (المتوفی ۱۹۲۱ء) سے ان کے بڑے قلبی تعلقات رہے۔ جیسا کہ مکتوبات مہدی کے دیباچہ کی ان کی تحریر سے معلوم ہوگا، ان کی وفات پر معارف میں بہت پھیلا کر تو وہ تو نہ لکھ سکے، لیکن اس کے دو تین جملے کسی کے پورے مضمون پر بھاری ہیں، وہ لکھتے ہیں، کہ وہ ایک سحر نگار ادیب اور ایک خاص طرز کے موجد تھے، ادب و انشا کا ایسا ذوقِ سلیم رکھنے والے افراد مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں، افسوس ہے کہ یہ ماہتاب کمال پیوند خاک ہوگیا۔ (ایضاً ص ۴۴)

وہ مولانا عبد الحلیم شرر (المتوفی ۱۹۲۶ء) سے اپنے بچپن کے زمانہ سے متاثر تھے، جب ان کا ناول منصور موہنا پڑھا تھا، تو پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے، وہ ندوہ تعلیم کے لیے آئے، تو اس زمانہ میں بھی ان سے ملتے جلتے رہے، ان کے رسالہ دلگداز، پردۂ عصمت اور اتحاد پھر ان کے ناولوں میں منصور موہنا، ورجینا، فتح اسپین، مقدس نازنین، ملک العزیز ورجنا، فردوس بریں

اور فلورا فلورنڈا کے علاوہ ان کی تصانیف میں تاریخ سندھ، تاریخ رسل، خاتم المرسلین، ابوبکر شبلی، اور جنید بغدادی کے قدرداں رہے، پھر ان کی عربی دانی کے بھی معترف تھے، ان کی وفات پر ان کے کچھ حالات لکھ کر ان کا ماتم اس طرح کیا کہ

"چھیالیس برس کا عہد خدمت ان کے کسی معاصر کو میسر نہیں آیا۔ ان کی ادبی اور علمی خدمات کی گوناگونی اور کثرت بھی ان کا خاص امتیاز ہے، ان کی تصنیفات نے اردو میں سیکڑوں انشا پرداز پیدا کئے، اور ملک میں تاریخ کا مذاق پیدا ہوا، اور سنجیدہ تصانیف کے لیے حسن قبول کا راستہ صاف کیا، وہ ہماری زبان کے نامور مصنف، ہندوستان کا فخر اور لکھنؤ کی آبرو تھے، ان کے فانی جسم نے مفارقت کی، مگر انکی ابدی زندگی ہمیشہ قائم اور باقی رہے گی"

(یادِ رفتگاں۔ صفحہ ۷۴، ۷۶)

سید صاحبؒ ایک عالم تھے، مولانا شررؔ کی شہرت زیادہ تر ایک فاضل ناول نگار کی حیثیت سے رہی، ایک عالم کی ایک ناول نگار کی شان میں یہ مدح سرائی عالمانہ فراخدلی مزید ثبوت ہے۔

سرسید کے معاصرانِ ادب کے مولانا بشیر احمد المتوفی ۱۹۲۷ء، کو باغنیمت اس لئے سمجھتے تھے، کہ اپنی تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ تاریخ بیجاپور، فرامین شاہی، اور عصاے پیری جیسی کتابیں مرتب کیں۔ (ایضاً۔ ص ۸۰)

سید جالب دہلوی (المتوفی ۱۹۳۰ء) سے بھی ان کے مراسم رہے، اور وہ ان کی اخبار نویسی کے فن کی مہارت، اور انکی گوناگوں قلمی خوبیوں کے بیحد قائل تھے اس لیے ان کی وفات پر بہت ہی افسردگی اور رنج کے ساتھ لکھا، کہ وہ علم کے ایک سچے طالب اور عاشق تھے، ان کی کہنہ مشقی، اور اخباری وسعتِ اطلاع، عام معلومات کی آگاہی، تاریخی ذوق

کتب نادرہ سے سچا عشق، ان کی زندگی کی خصوصیات تھیں، کہنہ مشق اخبار نویس اور اخبار نویسی کے ایک ایک فن کا واقف کار شاید ہی مسلمانوں میں کوئی دوسرا ہوا ہو، بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے، کہ اگر سید جالب کا وجود نہ ہوتا، تو اخباری حیثیت سے لکھنؤ کا کوئی وزن اور وقار نہ ہوتا۔

(یادِ رفتگاں۔ صفحہ ۱۰۸ و ۱۰۹)

مولانا حیدر یار جنگ حیدر علی نظم طباطبائی لکھنوی (المتوفی ۱۹۳۳ء) سے سید صاحبؒ کی ملاقات تو نہیں ہوئی۔ مگر وہ ان کے ذوق شعری کے معترف تھے، وہ حیدرآباد میں ملازم تھے، ان کی وفات پر لکھا، کہ وہ چمنستان روزگار کی بیاسی بہاریں دیکھ کر ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئے۔ آخر شاہ اودھ کے دربار کی خزاں دیکھی تھی، مٹیا برج کلکتہ کی شاعرانہ مجلسوں کی یادگار تھے، علوم عربیہ کے علاوہ شعر و سخن کے فنون پر کامل عبور رکھتے تھے، اس عمر کے باوجود آخر تک علمی کاموں میں مصروف و منہمک رہے، شرح غالب اور بعض رسائل و مقالات یادگار ہیں، اللہ تعالیٰ کرم فرمائے۔۔۔ (ایضاً۔ ص ۱۴۴)

مولوی محبوب عالم اڈیٹر پیسہ اخبار (المتوفی ۱۹۳۳ء) سے براہ راست ملاقات نہیں ہوئی، مگر ان کی قدر اس لیے کی، کہ وہ اردو کے سب سے پہلے روزانہ اخبار کے اڈیٹر تھے، اور ان کی وجہ سے ملک میں تاریخ اور سیاحت ناموں کے پڑھنے کا ذوق پیدا ہوا، انھوں نے یورپ اور اسلامی ممالک کے دو سفر بھی کئے، اور ان کے سیاحت نامے بھی لکھے، ان کی وفات پر سید صاحبؒ نے لکھا کہ اب ان کا وہ سفر پیش آیا، جس کا سفر نامہ انسانوں کے ہاتھ نہیں فرشتوں کے ہاتھ لکھتے ہیں، اس اندھیری منزل کے بوڑھے مسافر پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو۔ (ایضاً۔ ص ۱۴۵)

میر ناصر علی مدیر صلائے عام دہلی نے عمر کی ۸۶ بہاریں دیکھ کر ۱۲ر جون ۱۹۳۳ء کو وفات پائی، تو سید صاحبؒ نے لکھا، کہ ان کے علم میں جو نزاکت اور ان کی انشا میں جو لطافت تھی وہ

اب بھی ہماری زبان کا سرمایہ ہے۔ (یادرفتگان صفحہ ۱۲۰)

مارماڈیوک پکتھال (المتوفی ۱۹۳۶ء) انگریز تھے، مگر اسلام قبول کر لیا تھا، سید صاحب ان سے لندن اور حیدرآباد میں برابر ملتے رہے، آخر میں وہ حیدرآباد کی سول سروس کے اتالیق اور رسالہ اسلامک کلچر کے اڈیٹر بھی ہو گئے تھے، اس زمانہ میں ان کی خواہش ہوئی کہ وہ قرآن مجید کا ایک ایسا انگریزی ترجمہ کریں جو دلوں کو گرمائے، اس ترجمہ کے ابتدائی مراحل میں سید صاحبؒ سے بھی کچھ مشورے لیے ان کی وفات پر انھوں نے لکھا کہ وہ نومسلم انگریز تھے، مگر ایمان کے ساتھ نماز اور روزہ کے پابند تھے۔ (ایضاً ص ۱۶۷)

مولوی نورالحسن نیر خلف حضرت محسن کاکوروی (المتوفی ۱۹۳۶ء) سے سید صاحب کو اس لیے لگاؤ تھا، کہ وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد بھی رہے، اس کے علاوہ ان کی عزت ان کی نظر میں اس لیے بھی تھی، کہ وہ سخن ور، سخن سنج، سخن شناس اور سخن داں سب کچھ تھے، سید صاحب کے خیال میں ان کی زندگی کا سب سے اہم کارنامہ نوراللغات کی تالیف ہے۔

(ایضاً صفحہ ۱۷۳)

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی (المتوفی ۱۹۴۰ء) لکھنؤ میں دروازہ حیدر بخش کی مسجد کے نیچے کتابوں کی ایک چھوٹی سی دکان کے مالک تھے، مگر یہی دوکان بقول سید صاحبؒ نصف صدی تک لکھنؤ کے اہل علم و ادب کا مرکز بنی رہی، سید صاحبؒ کی نظر میں ان کی قدر اس لیے تھی کہ لکھنؤ کی راجدھانی اور لکھنؤ کے جان عالم کی کہانی ان کا خاص موضوع تھا، لکھنؤ کی بول چال، محاوروں اور روزمروں کو بخوبی برتتے تھے۔ (ایضاً ص ۲۰۵)

پٹنہ کے مسٹر نصیر بیرسٹر (المتوفی ۱۹۴۲ء) سے سید صاحب کے کافی مراسم اپنے چچا کی وجہ سے رہے، اس کے علاوہ وہ ندوہ کے دلدادہ تھے، سید صاحب کو ان سے دلچسپی

بھی پیدا ہوئی کہ وہ کوٹ پتلون پہننے والے صاحب بہادر کے رہنے کے بعد ریش سپید
اتھ اچکن اور کرتہ میں تسبیح و سجادہ کی طرف مائل ہو گئے تھے، پیری میں اردو میں ایک
لکھی، تو اپنی بزرگانہ شفقت کی وجہ سے سید صاحبؒ سے اس پر ایک دیباچہ لکھوایا۔
(یادِ رفتگاں۔ صفحہ ۲۳۶)

سید سجاد حیدر یلدرم علی گڑھ میں مولانا شبلیؒ کے شاگرد اور مولانا محمد علی جوہر کے ساتھی تھے، اپنی
ت کے سلسلہ میں ترکی میں رہے، اس سے ترکی ادب سے ان کو دلچسپی ہو گئی۔ یلدرم تخلص
یا، جس کے معنی ترکی میں تجلی کے ہیں، سید صاحبؒ پہلی بار ان سے ملے تو یہ ملاقات فوراً
بھائی کی حد تک بڑھ گئی، ان کو دار المصنفین سے بھی دلچسپی ہوئی، ۱۹۴۳ء میں ان کا انتقال
تو سید صاحبؒ نے ان کی یاد میں لکھا کہ وہ ہماری زبان میں ایک نئی صنف ادب کے
بانی تھے، جس کو ادب لطیف کہتے ہیں، اس لیے ہماری ادبی تاریخ میں ان کا ایک
ہے، وہ کئی ادبی افسانوں کے مصنف اور ترکی ناولوں کے مترجم ہیں، سید صاحبؒ نے
کے ذاتی اوصاف کا ذکر اس طرح کیا کہ وہ بڑے متواضع، مرنجاں مرنج، ہنس مکھ، ملنسار، شگفتہ دل،
سنج، شریف اور نرم طبع تھے، ان کے دوستوں کو ان کی یاد بہت آئے گی۔ (ایضاً ص ۲۴۸)

سید محفوظ علی بدایونی المتوفی ۱۹۴۳ء سے سید صاحبؒ کی بے تکلفانہ ملاقاتیں رہتیں، علی گڑھ کے ممتاز طالب علم
، مولانا محمد علی جوہر کے زمانہ میں تھے، علی گڑھ منتھلی، اودھ پنچ، ادب، دکن ریویو، نقیب اور ہمدرد اخبار کے
اول کے ممتاز لکھنے والوں میں تھے، مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ ہمدرد میں رہے، تو تجاہل عارفانہ کے عنوان
لی گڑھ کے معاملات کے بارے میں مزاحیہ مضامین لکھا کرتے تھے، سرکاری عہدہ کے سلسلہ میں افریقہ
گئے، ان کی وفات پر سید صاحبؒ نے لکھا، کہ اپنے دور کے نامور ادیب ہوئے، سنجیدہ و ظریفانہ دونوں
کے شگفتہ نگار ادیب تھے، ان میں بڑی دینداری بھی رہی) (ایضاً ص ۲۶۹-۲۷۰)

مولانا عبد الرزاق کانپوری اپنی تصانیف البرامکہ اور نظام الملک طوسی کی وجہ سے اپنے زمانہ میں بہت مشہور ہوئے، علامہ شبلیؒ نے ہیروز آف اسلام سیریز میں المامون، الفاروق لکھی، تو انھوں نے وزرائے اسلام سیریز کی ابتدا کی، اور اسی سلسلہ میں مولانا شبلیؒ کے یہاں ان کا آنا جانا ہوا، اسی زمانہ میں سید صاحبؒ سے بھی تعلقات پیدا ہوئے، تو دونوں بزرگوں نے ۳۴ برس تک بڑی خوبی سے نباہا، سید صاحبؒ بھوپال میں قاضی القضاۃ تھے، تو وہیں مولوی عبد الرزاق کانپوری نے وفات پائی، سید صاحبؒ نے ان کا ماتم "ماتم گسار برامکہ" کے عنوان سے لکھ کر کیا، جس میں لکھا کہ مرحوم بلند بالا خوش اخلاق اور متواضع تھے، ہر حال میں علمی کاموں میں منہمک رہے، زمانہ کے حالات میں جو انقلاب ہو رہا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے ایسے شائق و خدمت گذار علم و ادب ہونے کی توقع بہت کم کیجاتی ہے۔

مولوی عنایت اللہ بی۔ اے دہلوی منشی ذکاء اللہ کے بیٹے تھے، سرسید کی نگرانی میں علی گڑھ میں تعلیم پائی، سرسید کے بہت سے علمی کاموں میں اس زمانہ میں ان کی مدد کرتے رہے، آرنلڈ کی پریچنگ آف اسلام کا ترجمہ اردو میں دعوت اسلام کے نام سے کیا، تو بہت مشہور ہوئے، جونپور اور گوالیار میں سرکاری ملازمت کرنے کے بعد دار الترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی کے ناظم مقرر ہو کر وہاں چودہ سال رہے، آخر میں دہرہ دون میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، سید صاحبؒ سے ان کا ملنا جلنا برابر رہا، اس لیے جب ان کی وفات ۱۹۴۳ء میں ہوئی، تو انھوں نے معارف میں لکھا کہ وہ غیر زبان کی کتابوں کو اس طرح اردو کے قالب میں ڈھال دیتے، کہ تصنیف کا گمان ہوتا تھا، ان کے چھوٹے بڑے تراجم اور علمی کتابوں کی تعداد پچاس ساٹھ رہی ہوگی، ان کی سب سے اہم علمی خدمت اندلس کا تاریخی جغرافیہ ہے جو ان کی سالہا سال کی محنت کا نتیجہ ہے، یہ درحقیقت جغرافیہ نہیں ہے، بلکہ ایک حد تک اندلس کی اسلامی فتوحات اور اس کے ابتدائی دور کی تاریخ ہے۔ (ایضاً۔ ص ۲۷۲)

انگریزی دانوں کے حلقہ میں سید صاحبؒ لاہور کے شیخ عبد القادر (المتوفی سنہ ۱۹۵۰ء) ت

بہت متاثر تھے، انکی وفات ان کی وہ حقیقت نصف صدی تک رہی، وہ حکومت کے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے، مگر سید صاحبؒ کی نگاہ میں ان کی قدر اس لیے تھی، کہ ان کو ندوہ کی تحریک سے غیر معمولی دلچسپی تھی، اس کی حمایت میں بقول سید صاحبؒ انوکھے انداز میں تقریر کرتے، آخر آخر وقت تک اس کے رکن رہے، اسی کے ساتھ سید صاحبؒ ان کو اردو کا سب سے بڑا محسن اس لیے تصور کیا، کہ جب انھوں نے سنہ ۱۹۰۱ء میں ماہنامہ رسالہ مخزن نکالا تو اس کے ذریعہ سے انھوں نے بیسیوں کو ادیب، انشا پرداز، اہل قلم اور شاعر بنا دیا، سید صاحبؒ کا پہلا مضمون اسی رسالہ میں نکلا، ان کی وفات پر اپنی تعزیتی تحریر میں لکھا کہ حق یہ ہے کہ انھی نے ہندوستان کو اقبال بخشا، اور ان ہی کے فیض نے شاہنامۂ اسلام کے مصنف حفیظ جالندھری کو روشناس کیا، سید صاحبؒ ان کی نجی زندگی سے بھی واقف تھے، اس لیے ان کی تعریف یہ لکھ کر بھی کی ہے کہ ان کی شخصیت گوناگوں اوصاف کی حامل تھی، ہر مجلس اور ہر محفل میں ان کی یکساں قدر و منزلت تھی، وہ نیک طبیعت، نرم مزاج، متواضع اور ملنسار تھے، سر شیخ عبد القادر سے ملنے والوں میں اب بھی کچھ لوگ زندہ ہوں گے، سید صاحبؒ نے ان پر جو کچھ لکھا ہے، اس کی وہ تصدیق کریں گے۔ (ایضاً ص ۲۰۷-۲۰۸)

مہاراشٹر کے پروفیسر شیخ عبد القادر سرفراز سے سید صاحبؒ کے دوستانہ تعلقات چالیس سال تک رہے، اور جب ان کی وفات سنہ ۱۹۵۲ء میں ہوئی تو ان کو ایک شریف النفس دوست کہہ کر ان کا ماتم کیا، ان کا آبائی وطن تو یوپی میں تھا، مگر ان کے والد بزرگوار نے مہاراشٹر کے شہر ناسک کو اپنا وطن بنایا، تو بھی صوبہ بمبئی یا مہاراشٹر کے ہوگئے، بمبئی اور پھر پونہ کے کالجوں میں مشرقی زبانوں کے استاذ رہے، فارسی زبان میں اپنی قابلیت کے لیے مشہور تھے، ان کو مولانا شبلیؒ سے بڑی محبت تھی، اس تعلق کی بنا پر انھوں نے سید صاحبؒ کو دکن کالج پونہ میں استاد مقرر کرایا، اسی زمانہ میں دونوں کی گہری دوستی شروع ہوئی، سید صاحبؒ کو اعتراف رہا، کہ ارض القرآن لکھنے میں

ان سے بڑی مدد ملی، وہ جب کراچی منتقل ہوگئے، تو شیخ عبدالقادر نے ان کی شعر گوئی کہا۔

وفا آموختی از ما بکار دیگراں کردی   ربودی گوہرے از ما نثار دیگراں کردی

سید صاحبؒ نے اس کی کسک محسوس کی، وہ ان سے سن میں پانچ سال بڑے تھے، مگر ان کی وفات پر ان کو دوست ہی کی طرح یاد کرکے اپنے دکھ کا اظہار کیا، کہ افسوس علم فضیلت اور اخلاق و اخلاص کا یہ مجسمہ ہماری نگاہوں سے ہمیشہ کے لیے پوشیدہ ہوگیا، (یادِ رفتگاں صفحہ ۲۴۷)

ہم عصر شعرا کا ماتم | سید صاحبؒ سخن ور ضرور تھے، لیکن اپنی سخن وری کی طرف بہت کم توجہ دی، البتہ سخن شناس، سخن دان اور سخن فہم شروع سے آخر تک رہے، اسی لیے اپنے دور کے باکمال شعرا کی قدردانی میں کسی طرح کمی نہیں کی، بلکہ ان سے ذاتی تعلقات بھی رکھے، اکبر الٰہ آبادی اور مولانا شبلیؒ میں گہرے مراسم رہے، اسی بنا پر سید صاحبؒ ان کو اپنا بزرگ تسلیم کرتے تھے، دونوں میں برابر بزرگانہ اور عزیزانہ خط و کتابت ہوتی رہی، ۱۹۲۱ء میں ان کی وفات ہوئی، تو سید صاحبؒ نے بہت مغموم ہوکر "غم اکبر" کے عنوان سے معارف میں لکھا کہ ہماری زبان کا زندہ دل شاعر اس دنیا سے چل بسا، اس گلستاں نا خزاں آباد کی بہتر بہاریں اس کی آنکھوں نے دیکھیں، اس کی زندگی میں شاید ہی کوئی ایسا اہم واقعہ گذرا ہو جس کو اپنے کاشانۂ خیال میں اس نے جگہ نہ دی ہو، زبانِ خلق نے اس کو "لسان العصر" کا خطاب دیا، اس سے بہتر لقب اس کے لیے دوسرا نہیں ہو سکتا تھا، اس میں تین صفتیں ایک ساتھ جمع تھیں، وہ فطری فلسفی، پاک مشرب صوفی، اور زندہ دل شاعر تھا، اس کا نمک ظرافت ہمارے عیوب کے زخموں پر کسی قدر تیز سا لگتا تھا، تاہم ہمیں کوئی شک نہیں کہ وہ درحقیقت نمک نہیں مرہم تھا، (ایضاً ۴۸) ان چند سطروں میں اکبر الٰہ آبادی کے تمام شاعرانہ کمالات سامنے آگئے ہیں،

جناب میر علی محمد شاد عظیم آبادی نے بیاسی سال کی عمر میں ۱۹۲۷ء میں وفات پائی، سید صاحبؒ کو ان سے اپنی ہم وطنی کے باوجود ملاقات کرنے کا موقع نہیں ملا، مگر مراسلت برابر جاری رہی،

ان کی وفات پر سید صاحب نے ان کے شاعرانہ کمالات کا اعتراف اس طرح کیا، کہ ساٹھ برس سے زیادہ مشق سخن تھی، لاکھوں اشعار ان کے نتائج فکر ہیں، میر اور انیس کے مقلد اور متبع تھے، اس دور میں وہ پورب میں زبان اردو کے تنہا استاد رہ گئے تھے۔ (یاد رفتگاں صفحہ ۷۰)

حضرت گرامی رہنے والے تو ضلع جالندھر کے تھے، مگر فارسی کے مسلم الثبوت شاعر ہونے کی وجہ سے نظام حیدر آباد کے دربار کے فارسی شاعر ہو گئے تھے، حفیظ جالندھری اور جناب سالک ان کے شاگردوں میں تھے، علامہ محمد اقبال بھی ان کو اپنا فارسی کلام دکھاتے تھے، حیدر آباد کے قیام میں مولانا شبلیؒ کا بھی ساتھ رہا، اسی تعلق سے سید صاحبؒ ان سے ملتے رہے اور انھوں نے بھی ان سے بزرگانہ برتاؤ رکھا، دونوں میں برابر خط و کتابت بھی رہی، ۱۹۲۷ء میں ان کی وفات پر سید صاحبؒ نے معارف میں لکھا کہ افسوس اب کشور ہند ایسے یگانہ نامور وجود سے خالی ہو گیا، (ایضاً ص ۹۰)

حافظ فضل حق آزاد اصلاً گیا ضلع کے رہنے والے تھے، مگر مستقل سکونت عظیم آباد پٹنہ میں اختیار کر لی تھی، ان کو ندوہ کی تحریک سے دلچسپی تھی، اس لیے سید صاحبؒ مولانا شبلیؒ کی معیت میں ان سے برابر ملتے رہے، جب ان کی وفات ۱۹۳۲ء میں ہوئی تو سید صاحبؒ اپنی مبصرانہ تحریر میں ان کے متعلق لکھا، کہ مرحوم فطری شاعر تھے، کسی استاذ سے کبھی اصلاح نہیں لی، مشکل قافیوں اور ردیفوں کا شوق تھا، زبان، محاورات اور روزمروں کے بجائے دقیق مضامین و معانی کا شوق زیادہ تھا، اس لیے مشکل الفاظ استعمال کرنے سے پرہیز نہ تھا، طبیعت میں ذکاوت اور ذہانت تھی، اس لیے آپ اپنا راستہ پیدا کرنے کی دھن تھی، تقلید عام سے نفور تھا، جوانی میں شاد عظیم آبادی سے بھی بھڑ گئے تھے، (ایضاً ص ۲۳۸)

وحشی دلگرامی سے سید صاحبؒ سے پہلی ملاقات ۱۹۰۶ء میں ہوئی، جس کی گرم جوشی

ان سے بڑی مدد لی، وہ جب کراچی منتقل ہو گئے، تو شیخ عبدالقادر نے ان کی شعر کہہ کر دیا۔

وفا آموختی از ما بکار دیگراں کردی ربودی گوہرے از ما نثار دیگراں کردی

سید صاحبؒ نے اس کی کسک محسوس کی، وہ ان سے سن میں پانچ سال بڑے تھے، مگر ان کی

وفات پر ان کو دوست ہی کی طرح یاد کر کے اپنے دکھ کا اظہار کیا، کہ افسوس علم فضیلت اور اخلاق

و اخلاص کا یہ مجسمہ ہماری نگاہوں سے ہمیشہ کے لیے پوشیدہ ہو گیا، (یادرفتگاں۔ صفحہ ۴۷۶)

ہم عصر شعراء کا ماتم | سید صاحبؒ سخن ور ضرور تھے، لیکن اپنی سخن وری کی طرف بہت کم توجہ دی،

البتہ سخن شناس، سخن دان اور سخن فہم شروع سے آخر تک رہے، اسی لیے اپنے دور کے باکمال

شعراء کی قدر دانی میں کسی طرح کی نہیں کی، بلکہ ان سے ذاتی تعلقات بھی رکھے، اکبر الہ آبادی اور

مولانا شبلیؒ میں گہرے مراسم رہے، اسی بنا پر سید صاحبؒ ان کو اپنا بزرگ تسلیم کرتے تھے دونوں

میں برابر بزرگانہ اور عزیزانہ خط و کتابت ہوتی رہی، ۱۹۲۱ء میں ان کی وفات ہوئی، تو سید صاحبؒ

نے بہت مغموم ہو کر "غم اکبر" کے عنوان سے معارف میں لکھا کہ ہماری زبان کا زندہ دل شاعر

اس دنیا سے چل بسا، اس گلستاں نا خزاں آباد کی بہتر بہاریں اس کی آنکھوں نے دیکھیں، اس کی

زندگی میں شاید ہی کوئی ایسا اہم واقعہ گذرا ہو جس کو اپنے کاشانۂ خیال میں اس نے جگہ نہ دی ہو،

زبان خلق نے اس کو "لسان العصر" کا خطاب دیا، اس سے بہتر لقب اس کے لیے دوسرا نہیں ہو سکتا

تھا، اس میں تین صفتیں ایک ساتھ جمع تھیں، وہ فطری فلسفی، پاک مشرب صوفی، اور زندہ دل

شاعر تھا، اس کا نمک ظرافت ہمارے عیوب کے زخموں پر کسی قدر تیز گرتا تھا، تاہم ہمیں کوئی شک نہیں کہ وہ درحقیقت نمک

نہیں مرہم تھا، (ایضاً ۳۰) ان چند سطروں میں اکبر الہ آبادی کے تمام شاعرانہ کمالات سامنے آ گئے ہیں،

جناب میر علی محمد شاد عظیم آبادی نے بیاسی سال کی عمر میں ۱۹۲۷ء میں وفات پائی، سید صاحبؒ

کو ان سے اپنی ہم وطنی کے باوجود ملاقات کرنے کا موقع نہیں ملا، مگر مراسلت برابر جاری رہی،

ان کی وفات پر سید صاحبؒ نے ان کے شاعرانہ کمالات کا اعتراف اس طرح کیا، کہ ساٹھ برس سے زیادہ مشقِ سخن تھی، لاکھوں اشعار ان کے نتائجِ فکر ہیں، میرؔ اور انیسؔ کے مقلد اور متبع تھے، اس دور میں وہ پورب میں زبانِ اردو کے تنہا استاد رہ گئے تھے۔ (یادِ رفتگاں صفحہ ۷۷)

حضرت گرامی رہنے والے تو ضلع جالندھر کے تھے، مگر فارسی کے مسلم الثبوت شاعر ہونے کی وجہ سے نظام حیدر آباد کے دربار کے فارسی شاعر ہو گئے تھے، حفیظ جالندھری اور جناب سالک ان کے شاگردوں میں تھے، علامہ محمد اقبال بھی ان کو اپنا فارسی کلام دکھاتے تھے، حیدر آباد کے قیام میں مولانا شبلیؒ کا بھی ساتھ رہا، اسی تعلق سے سید صاحبؒ ان سے ملتے رہے اور انھوں نے بھی ان سے بزرگانہ برتاؤ رکھا، دونوں میں برابر خط و کتابت بھی رہی ۱۹۲۷ء میں ان کی وفات پر سید صاحبؒ نے معارف میں لکھا کہ افسوس اب کشورِ ہند ایسے یگانہ نامور وجود سے خالی ہو گیا۔ (ایضاً ص ۹۷)

حافظ فضل حق آزاد اصلاً گیا ضلع کے رہنے والے تھے، مگر مستقل سکونت عظیم آباد پٹنہ میں اختیار کر لی تھی، ان کو ندوہ کی تحریک سے دلچسپی تھی، اس لیے سید صاحبؒ مولانا شبلیؒ کی معیت میں ان سے برابر ملتے رہے، جب ان کی وفات ۱۹۳۲ء میں ہوئی تو سید صاحبؒ اپنی مبصرانہ تحریر میں ان کے متعلق لکھا، کہ مرحوم فطری شاعر تھے، کسی استاذ سے کبھی اصلاح نہیں لی، مشکل قافیوں اور ردیفوں کا شوق تھا، زبان، محاورات اور روز مروں کے بجائے دقیق مضامین و معانی کا شوق زیادہ تھا، اس لیے مشکل الفاظ استعمال کرنے سے پرہیز نہ تھا طبیعت میں ذکاوت اور ذہانت تھی، اس لیے آپ اپنا راستہ پیدا کرنے کی دھن تھی، تقلیدِ عام سے نفور تھا، جوانی میں شادؔ عظیم آبادی سے بھی بھڑ گئے تھے۔ (ایضاً ص ۲۳۸)

وصل بلگرامی سے سید صاحبؒ سے پہلی ملاقات ۱۹۰۸ء میں ہوئی، جس کی گرم جوشی

ان کی وفات [illegible] تک رہی، وہ اچھے شاعر و ادیب تھے، مگر سید صاحبؒ کے
شعری و ادبی کارناموں سے زیادہ ان کی ذاتی خوبیوں کے زیادہ مداح رہے، انھوں نے ان کے
متعلق ان کی وفات کے بعد لکھا کہ وہ بڑے ملنسار، متواضع، پر محبت، دوستوں کے فداکار اور
وقت پر ہر ایک کے کام آنے والے تھے، ہمیشہ سے دیندار اور پابند وضع رہے، مولانا اشرف علی
تھانویؒ سے بیعت بھی ہو گئے تھے، اور ان ہی کی خانقاہ میں وفات پائی۔ (یادرفتگان صفحہ ۲۲۹)

خواجہ عزیز الحسن غوری مجذوب (المتوفی سنہ ۱۹۴۴ء) سید صاحبؒ کے خواجہ تاش تھے،
وہ سید صاحبؒ کے محبوب طریقت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے محبوب بنے رہے۔
اسی لیے سید صاحبؒ نے ان کی وفات پر جو کچھ لکھا، اس میں ان کی انشراحی کیفیت چھائی ہوئی،
ہے، ان کی بہت سی خوبیاں بیان کر کے ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے، رقم طراز ہیں،
کہ وہ فطری شاعر تھے، کسی کے تلمذ نہ تھا، تلمیذ الرحمٰن تھے، اول تو شاعری کا سنجیدہ اور فطری
مذاق اس پر تصوف کی چاشنی اور اس میں جگ بیتی نہیں بلکہ اپنی کہانی سب مل ملا کر ان کی
شاعری اپنے زمانے کی شاعری کا بے مثال نمونہ تھی، جب وہ اپنا شعر سنانے پر آتے، تو ایک غزل دو غزل
بلکہ بیسیوں غزل سنا ڈالتے تھے، اس کی ان کو کچھ پرواہ نہیں ہوتی تھی کہ کون اس کو سن رہا ہے، اور کون
داد دے رہا ہے، وہ اپنے اشعار سے آپ لطف اندوز ہوتے اور جھومتے تھے، اہل ادب نے لکھا ہے کہ خطابت
اور شاعری میں فرق یہ ہے کہ خطیب کی نظر اپنے اوپر نہیں سامعین پر ہوتی ہے، اور شاعر کو سامع سے نہیں،
بلکہ اپنے آپ سے بحث ہوتی ہے، وہ آپ ہی کہتا اور آپ ہی سنتا ہے، وہ اپنی شراب سے آپ مست اور اپنی
بانسری پر آپ جھومتا ہے، شاعری کی یہ تعریف پوری طرح خواجہ پر صادق آتی تھی، (ایضاً ص ۳۱۰) یہ تبصرہ
مختصر ہے، لیکن کیسا پاکیزہ اور جاندار ہے، دل کی گہرائیوں سے لکھا گیا ہے، اس لیے پڑھنے والوں کے
دلوں سے بھی ٹکرائے گا، اس پوری ماتمی تحریر میں دل کی یہی ساری کیفیت چھائی ہوئی ہیں۔

چودھری خوشی محمد ناظر (المتوفی ۱۹۴۴ء) دہلی پور ضلع کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے، علی گڑھ میں تعلیم پائی، مولانا شبلیؒ سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا، مگر ان کی شاعری کو مناسبت مولانا حالی سے ہوئی اور ان ہی سے اصلاح لی، کشمیر میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے، وہاں کی فرح بخش آب و ہوا، اور قدرتی مناظر نے ان کی شاعری کے لیے بہترین مواقع فراہم کیے، سید صاحبؒ سے ان سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں، وہ مولانا شبلیؒ کے تعلق سے ان سے محبت اور شفقت سے پیش آتے رہے، سید صاحبؒ نے بھی اس کی قدر کی، اور جب ان کی وفات ہوئی، تو انھوں نے ان کو اپنے دور کا نرالا شاعر کہہ کر ان نوجوانوں کو ان کی شاعری سے سبق لینے کی تلقین کی جو اپنی نوجوانی میں یہ سمجھتے ہیں کہ وہی ادب کو زندگی سے پہلی دفعہ وابستہ کر رہے ہیں، چودھری خوشی محمد ناظر کے شعری کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کشمیر میں اسی مجلس مفرح القلوب کے ذریعہ شعر و سخن کے ترانے بلند کیے، مناظر قدرت کی تصویر کشی میں ان کے قلم میں بے مثال جولانی تھی، پھر عشق الٰہی اور عشق نبویؐ پر ان کی نظمیں ان کے مومن دل کی پوری شہادت دیتی ہیں، (ایضاً۔ ص ۳۱۹-۲۰)

جلیل القدر نواب فصاحت جنگ (المتوفی ۱۹۴۶ء) کی شاعری کا سکہ سید صاحبؒ کے دل پر ان کے فرزند صدیق حسن کی وجہ سے بیٹھا، جو دار العلوم ندوۃ العلماء میں ان کے ساتھ تھے، ان کی وفات پر جو تحریر لکھی اس میں اپنے ابتدائی دور کے ذوق شعری کا بھی ذکر کر گئے ہیں، اس زمانہ میں وہ امیر مینائیؒ کے بڑے دلدادہ تھے، جلیل ان کے شاگرد تھے، اس لحاظ سے بھی ان کی طرف مائل ہوئے، امیر مینائیؒ کے ساتھ وہ بھی حیدرآباد گئے، اپنے استاد کی وفات کے بعد وہ حیدرآباد ہی میں رہے، اور میر عثمان علی خان نظام حیدرآباد کے استاذ کی حیثیت سے وہیں وفات پائی، سید صاحبؒ جب جب حیدرآباد گئے، ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوئے، وہ لکھتے ہیں، کہ ان کی وضعداری کا یہ حال تھا کہ پہلی ملاقات جس مکان، جس سائبان، جس کرسی اور جس ہیئت کذائی سے کی، ہر ملاقات میں اسی وضعداری

سے ملے، سید صاحبؒ ان کے گرویدہ اس لیے بھی تھے کہ نہایت دیندار، تہجد گزار، نعت خواں اور ذکر الٰہی میں تر زبان تھے، ان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے آخر میں لکھا کہ "آج شاعر بہت ہیں مگر ایسے کم ہیں، جو فن کے مسائل پر کامل عبور رکھتے ہوں، جو لفظوں کے ہاتھوں میں نہ ہوں، بلکہ لفظ ان کے ہاتھ میں ہوں، جن کے کلام سے زبان کے الفاظ، محاورات اور امثال کی تصدیق ہو، جن کا دیوان زبان کے سکوں کی ٹکسال ہو، حضرت جلیل اس دور کے جو میر و مرزا سے شروع ہوا تھا، بظاہر خاتم معلوم ہوتے ہیں، اب نیا زمانہ ہے، نئی شاعری ہے، نیا ذوق ہے، نئے خیالات ہیں، پرانے قاعدے توڑے جارہے ہیں، پرانے اصول مٹ رہے ہیں، تشبیہوں اور استعاروں تک میں بے اصولی آرہی ہے، انتشار میں کمی بیشی ہو رہی ہے، اور بحور کے دریا میں بھی تلاطم برپا ہے، ہر دور شاعر اور ہر دور بادشاہ میں جو تلازم عہد عباسیہ میں شروع ہوا تھا، اس کو حضرت جلیل اور میر عثمان علی خاں نظام حیدرآباد پر اب تمام سمجھئے" (ایضاً ص ۳۳۰) یہ کیسا جاندار اور باوقار تبصرہ ہے، جو آج کل شاعروں کے غور و فکر کے لائق ہے،

عبدالرحمن شاطر مدراسی: [illegible] عبدالرحمن شاطر سے اس لیے قریب تر اور متاثر رہے، کہ وہ حیدرآباد میں مولانا شبلیؒ کے ساتھ وہاں کی علمی و ادبی مجلسوں میں شریک رہتے تھے، اس کے علاوہ مولانا شبلیؒ نے ان کے ایک طویل رائیہ قصیدہ کی بڑی تعریف کی تھی، جس میں فلسفیانہ خیالات بڑی برجستگی سے ادا کیے گئے ہیں، اور بقول مولانا شبلیؒ ایسی مثالیں اردو میں کم ملتی ہیں۔

حضرت سید صاحب مدراس میں ان سے برابر ملتے رہے، اور گویا ان سے گھریلو تعلقات ہو گئے تھے، ان کی نظمیں معارف میں بھی شائع کیں، جب ان کی وفات اپریل ۱۹۴۳ء میں ہوئی تو ان کو یاد کر کے تحریر فرمایا کہ "ارکاٹ، احاطۂ مدراس میں اسلامی علم و تمدن کی فراموش شدہ تاریخ کا ایک ورق ہے، نواب ارکاٹ کا محل ارکاٹ کے جنگی معرکے کے بعد خود شہر مدراس میں ہے،

شمس العلماء، عبدالرحمٰن شاطر اسی برج فلک کے آفتاب تھے، اور پھر آخر میں لکھتے ہیں:" دکن میں مولانا شاطر جیسے اردو کے حکیم شاعر کا وجود اس زبان کی عالمگیری کی دلیل قاطع تھی۔ جس نے چالیس برس تک اہل دکن کو اپنی خوش نوائیوں سے مسرور و محظوظ رکھا، افسوس کہ اس سرزمین دکن کا یہ بلبل شیریں نوا اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔" (یادرفتگان۔ صفحہ ۲۵۰۔ ۲۴۹)

مشاہیر کا ماتم | سید صاحبؒ کے زمانہ میں ہندوستان کے ہر شعبۂ زندگی میں ایسے ایسے باکمال افراد گذرے کہ جس طرف نظر اٹھتی، ان کے کارناموں سے ذہن متاثر ہوجاتا، اور اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا، سید صاحبؒ اور ان کے ہم عصروں کو ایک زریں دور میں زندگی بسر کرنے کا موقع ملا، سید صاحبؒ ان تمام باکمال صحاب کے ساتھ کسی نہ کسی طرح وابستہ رہے، اور ان کی وفات پر دکھ بھری تحریریں لکھ کر ان سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔

نواب وقار الملک سے وہ اپنی کم عمری اور طالب علمی کے زمانہ سے مولانا شبلی کی وساطت سے ملتے رہے، اور جب جب ملے ان کی خاکساری، فروتنی، سادگی، تواضع، طالب علموں سے مہر و محبت اور کردار کی پختگی سے پہلے زیادہ متاثر ہوئے، ان کے کیرکٹر کی پختگی کا ذکر یہ لکھ کر کیا ہے کہ وہ شروع میں سرسید کی ماتحتی میں ملازم ہوئے، اس لیے ان کو سرکار کہا کرتے تھے، اور جب حیدرآباد جاکر وہاں وقار الملک ہوگئے، تب بھی ان کو سرکار ہی کہہ کر ان سے مودبانہ ملتے تھے، مگر سرسید نے اپنے لڑکے سید محمود کو ایم۔ اے۔ او کالج میں اپنا جانشین بنایا تو انھوں نے سرسید کو نہایت صفائی سے لکھا کہ اسلام میں دو ہی شخص گذرے ہیں، ایک معاویہ کہ انھوں نے یزید کو اپنا جانشین بنایا، اور ایک آپ جو محمود کو جانشین بنا رہے ہیں، ۱۹۱۷ء میں ان کی وفات ہوئی، تو ان کا ماتم کرتے ہوئے لکھا۔

نواب محسن الملک کی وفات پر ہم نے تدبر و سیاست کا ماتم کیا۔ مولانا نذیر احمد کے مرنے پر سحر نگاری اور بزم آرائی کا مرثیہ پڑھا، مولانا شبلی کی موت پر ہم نے علم کا فقدان پر نوحہ کیا،

لیکن نواب وقار الملک کی رحلت پر ہم قوم کا ماتم کرتے ہیں، وہ جامع الحیثیات اور معدوم الامثال بزرگ تھا، اس کی موت ایک شخص کی موت نہیں، بلکہ پوری قوم کی موت ہے، خدا ان کی گمشدگی پر فریاد ہے" (یادرفتگاں۔ صفحہ ۳۱)

ان چند سطروں میں ماتم گساری کا نہ صرف ایک عمدہ نمونہ ملتا ہے، بلکہ وقار الملک کی زندگی کی مرقع آرائی ہوجاتی ہے۔

جسٹس سید کرامت حسین لکھنؤ کے رہنے والے تھے، اپنی ملازمت کے مختلف مدارج طے کرکے آخر میں الٰہ آباد کے ہائی کورٹ کے جج ہوکر ریٹائر ہوئے، ۱۹۱۷ء میں ان کا انتقال ہوا، وہ دارالمصنفین کے نائب صدر بھی رہے، اس تعلق کی بنا پر سید صاحب کا برابر ملنا جلنا رہا، ان کی وفات پر اپنی تعزیتی تحریر میں لکھا، کہ ان کو فلسفہ کا خاص ذوق تھا، انھوں نے جدید فلسفہ کو اردو میں لکھنے کی ابتدا کی، آخر میں ایک ضخیم کتاب المرآۃ کے نام سے عورتوں کے حقوق اور خصائص پر لکھ رہے تھے۔ (ایضاً ص ۳۶)

نواب عماد الملک (المتوفی ۱۹۲۶ء) اپنی زندگی کے مختلف مدارج طے کرکے حیدرآباد کی ریاست کے وزیر اعظم ہوگئے تھے، اس عہدہ کے زمانہ میں انھوں نے پورے ہندوستان میں بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل کی، مولانا شبلیؒ سے ان کے گہرے تعلقات تھے، اس بنا پر سید صاحب ان سے اپنی کم عمری کے زمانہ سے ملتے رہے، ان کی ایک نصیحت سے سید صاحب کی علمی زندگی کا رنگ بدل گیا، جب مولانا شبلیؒ کی وفات ہوئی، تو سید صاحب نے ان پر ایک نوحہ لکھا، اور اس کو نواب عماد الملک کی خدمت میں ارسال کیا، اس کو پڑھ کر انھوں نے سید صاحب کو لکھا کہ عرض ہنر اس وقت تک نہیں کرنا چاہئے، جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ اب اس ہنر میں میرا کوئی حریف نہیں، سید صاحب لکھتے ہیں۔ کہ یہ نکتہ میرے لیے رہنما ثابت ہوا، دارالمصنفین کی تاسیس میں انھوں نے ہر طرح کی مالی امداد کی، اور اس کے صدر بھی ہوئے، اس لیے سید صاحب کو ان سے گہرا لگاؤ رہا، ان کی وفات پر یہ لکھ کر ماتم کیا کہ وہ انگریزی زبان کے بڑے عالم اور دوسری طرف مشرقی علوم و فنون میں مہارت

رکھتے تھے، ان کے نصاب، قیام اور اشاعت میں نہایت دلچسپی اور ہمدردی کے ساتھ ہر ممکن اعانت کے لیے آمادہ رہتے، دائرۃ المعارف، دارالمصنفین، ندوہ، مسلم یونیورسٹی، غرض اس وقت قدیم و جدید علوم و فنون کے جس قدر مرکز ہندوستان میں قائم ہیں، سب کے سب ان کی علمی اعانت اور سرپرستی کے ممنون تھے، ان کے در و دیوار سے ایک مدت تک ان کے ماتم کی صدائے بازگشت آتی رہے گی، (یاد رفتگاں۔ صفحہ ۷۶)

سید صاحب ایک دینی مدرسہ کے عالم ہونے کے باوجود انگریزی تعلیم یافتہ اہل قلم اور اہل علم سے ملنے ملانے میں پرہیز نہ کرتے، بلکہ ان سے شوق سے ملتے، اس لیے مولانا شبیر احمد عثمانی نے ان کے متعلق کہا تھا، کہ علماء اور انگریزی تعلیم یافتوں کے درمیان سفیر اور متوسط کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جسٹس سید امیر علی (المتوفی ۱۹۲۸ء) اپنی دو تصانیف اسپرٹ آف اسلام ہسٹری آف سارسنیس کی وجہ سے اب تک مشہور رہیں، وہ شیعہ تھے، اس لیے بعض اوقات کچھ ایسی باتیں لکھ جاتے جن سے سنیوں کو اتفاق نہ ہوتا، سید صاحبؒ بھی ان کے بعض خیالات سے اختلاف رکھتے تھے، مگر وہ ۱۹۲۰ء میں لندن گئے تو ان سے برابر ملتے رہے، ان کی وفات پر جو تحریر لکھی، اس سے اندازہ ہوگا کہ انھوں نے ان کی خوبیوں کے اعتراف میں بخل سے کام نہیں لیا ہے، بلکہ اس کا اعتراف کیا ہے، کہ انھوں نے یورپ میں اسلام کی بڑی خدمت کی، اور ان کے قلم کی ضوفشانی سے اسلام کے متعلق یورپ کے بہت سے خیالات باطلہ کے بادل چھٹ گئے" (ایضاً ص ۸۲)

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (المتوفی ۱۹۳۰ء) سرسید کی تعلیمی تحریک کے بہت بڑے موید تھے، بیرسٹری کی تعلیم پائی تھی، اس سے رغبت نہیں ہوئی، برطانوی حکومت کی طرف سے انڈیا کونسل کے ممبر مقرر ہوئے، جو اس زمانہ میں بڑا سیاسی اعزاز سمجھا جاتا تھا، وہاں سے آئے، تو مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے انھوں نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کو بڑی ترقی دی سید صاحبؒ انکے بڑے مداح تھے انکا خیال تھا کہ

قصد وہی ہے، کہ ان کا اصل پسندیدہ فلسفہ یہ تھا کہ مسلمان جمہوریت اور بادشاہت دونوں کے درمیان [illegible] یعنی ایک طرف تو وہ پہلے اللہ کا تابع بندہ بنیں، دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی خلافت و نیابت سے سرفراز ہو کر پورے عالم اسلام اور کل قوائے عالم پر اپنے علم کے زور سے حکمرانی کریں۔ (یادرفتگان صفحہ ۹۵)

صلاح الدین خدابخش (المتوفی ۱۹۳۱ء) پٹنہ کی مشہور اورینٹل لائبریری کے بانی خدابخش خان کے بیٹے تھے، بیرسٹری کرتے، انگریزی کے بڑے اچھے اہل قلم تھے، جرمن مستشرقین کی بعض کتابوں کے ترجمے انگریزی میں کیے، مگر ان کتابوں میں اسلام سے متعلق جو کچھ غلط یا زہریلی باتیں ہوتیں ان کو اپنے ترجمہ میں اسی طرح رہنے دیتے، اس لیے ایک موقع پر ان کی سخت مخالفت ہوئی جس کے لیے ان کو مسلم آؤٹ لک لاہور میں معذرت نامہ شائع کرنا پڑا، اسی کے بعد ان کی وفات ہوگئی، سید صاحبؒ نے اپنی تعزیتی تحریر میں ان کے لیے کیسی عذوبات سے لکھ دی ہے۔ کہ کس کو خبر تھی کہ ان کا یہ معذرت نامہ حقیقت میں ان کی پوری عمر کا آخری توبہ نامہ ہوگا۔ (ایضاً ص ۱۳۸)

خواجہ کمال الدین (المتوفی ۱۹۳۳ء) احمدی تھے، اس کے باوجود علامہ شبلیؒ ان کے قدردان رہے، سید صاحبؒ کے بھی ان کے تعلقات ۱۹۱۲ء سے شروع ہوئے، مذہبی تحریکات کے سلسلہ میں ان سے خط و کتابت کی، ان کی وفات پر انھوں نے لکھا کہ خواجہ صاحب کے بہت سے خیالات سے اتفاق نہیں، تاہم یہ کتنا اظہار واقعہ ہے کہ انھوں نے ۱۹۱۲ء سے لے کر ۱۹۳۳ء تک کی پوری زندگی یورپ میں اسلام کی تبلیغ اور اس کے محاسن کی اشاعت میں صرف کی نیز یہ کہ ان کی تصانیف کے بڑے حصہ کا موضوع احمدیت نہیں، محمدیت ہے، سید صاحبؒ کے اس خیال سے ان کی رواداری کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ (ایضاً ص ۱۵۰)

پٹنہ کے سرعلی امام (المتوفی ۱۹۳۲ء) اپنے زمانہ میں بہت ہی کامیاب بیرسٹر تھے ہندوستان

کی سیاست میں بھی بڑی ناموری حاصل کی، وائسرائے کی اگزیکیٹو کونسل کے ممبر بھی ہوئے، شروع میں
مسلم لیگ اور آخر میں کانگریس کی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیا، بڑے اچھے مقرر تھے، سید صاحب سے
ان کے ذاتی تعلقات تو نہ تھے، مگر وہ ان کی عظمت اور رتبہ سے اچھی طرح واقف تھے، اس لیے انکی
وفات پر لکھا کہ انگریزی تعلیم کے ایک بہترین نمونہ تھے، اس رائے کی تائید ان کے جاننے والے
بھی کریں گے۔ (یادِ رفتگان۔ ص ۱۲۲)

پٹنہ ہی کے سر فخر الدین (المتوفی ۱۹۳۳ء) انگریزوں کے زمانہ میں بہار کے وزیر تعلیم رہے،
اپنی فیاضی، مشرقیت پسندی، اور دینداری کی وجہ سے عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، سید صاحب
سے براہ راست راہ و رسم قائم نہ تھی، لیکن وہ ان کے رتبہ شناس تھے، اس لیے ان کی وفات پر
بڑے دکھ اور درد کے ساتھ لکھا کہ سر علی امام کی وفات پر تدبر و سیاست کا ماتم ہوا، ان کے بھائی
حسن امام کے مرنے پر قانون دانی کا نوحہ پڑھا گیا، لیکن سر فخر الدین کی رحلت پر انسانیت اور
اس کی شرافت کا ماتم ہے، ان دو تین سطروں میں کیسی دل سوزی ہے، (ایضاً ص ۱۴۹)

ضلع کرنال (پنجاب) کے سر حاجی رحیم بخش (المتوفی ۱۹۳۵ء) عربی و فارسی کے ایک
معمولی مدرس کی حیثیت سے ترقی کرکے بھاولپور کی مجلس
نیابت کے صدر مقرر ہوئے، حکومت برطانیہ کی طرف سے سرکا
خطاب پایا، وہ ندوۃ العلماء کے سرپرست بھی رہے، تبلیغی کاموں میں اپنی دولت صرف کی، سید صاحب
نے ان پر جو تعزیتی تحریر لکھی ہے، اس سے اندازہ ہوگا، کہ وہ ان کی اس بات سے متاثر تھے، کہ
وہ اپنے اعلیٰ مرتبہ تک پہنچنے پر اپنی پرانی زندگی کو نہیں بھولے، اور اپنی حاصل کی ہوئی نعمت کے
شکرانہ میں دینی اور قومی خدمت میں لگے رہے، ایسی مثالیں کم ملیں گی، (ایضاً ص ۱۵۷)

سر فضل حسین (المتوفی ۱۹۳۶ء) پنجاب کے مشہور لیڈر تھے، وائسرائے کی اگزیکیٹو کونسل کے

ملک کی بین [illegible]، نیز وہ نائب؟ مرحوم جس تدبر اور دانائی سے ہوم ممبری کی کونسل پر چھا گئے تھے، سید صاحب
ان سے کبھی نہیں ملے، مگر ان کے جوہر شناس تھے، جیسا کہ ان کی وفات پر ان کی تعزیتی تحریر سے ظاہر
ہے، جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں، کہ مرحوم کے سیاسی مسلک سے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو، مگر ان کی
قابلیت، تدبر، بے خوفی، دلیری، ہر دلعزیزی، اور قومی بہی خواہی سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو، وہ
ان حکومت پسندوں میں نہ تھے، جو اپنی شخصی ترقی کو صرف اپنی خاندانی ترقی کا زینہ بناتے ہیں، بلکہ
ان میں تھے، جو حکومت کا ساتھ دے کر اپنی سمجھ کے مطابق قوم و ملک کی بھلائی کرتے رہے، انکی زندگی
کا کتنا جاندار تجزیہ ہے۔ (یاد رفتگاں، صفحہ ۱۰۰)

سر راس مسعود (المتوفی ۱۹۳۷ء) اپنے نامور دادا سرسید کے پوتے اور نامور باپ جسٹس محمود
کے بیٹے تھے، انگلستان میں تعلیم پا کر ہندوستان واپس ہوئے تو بہار اور اڑیسہ کے محکمۂ تعلیم میں استاد
رہنے کے بعد حیدرآباد میں ناظم تعلیمات ہوئے، پھر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں وائس چانسلر کی حیثیت
بلائے گئے، آخر میں بھوپال کے وزیر تعلیم تھے، ۱۹۳۳ء میں افغانستان کے شاہ نادر خان نے چند
ماہرین تعلیمات کو اپنے یہاں مدعو کیا، تو سید صاحب اور علامہ محمد اقبال کے ساتھ وہ بھی تھے، سید صاحب نے
اس سفر میں ان کو بہت قریب سے دیکھا، اور ان کی مجلسی خوبیوں کو کبھی نہیں بھولے، اسی لیے
ان کی وفات پر بڑے درد و غم کے ساتھ لکھا کہ مسلمانوں کو عموماً اور ان کے دوستوں کیلئے خصوصاً
یہ سانحہ بہت ہی المناک ہے، وہ جامہ وجیہ، کشیدہ قامت، سرخ و سفید، ہنس مکھ اور ملنسار تھے،
جس مجلس میں ہوتے سب پر چھا جاتے، باتوں کے دھنی اور زبان کے میٹھے تھے، ہر شخص کے ساتھ جھک کر
ملتے تھے، جاپان کا تعلیمی نظم و نسق، انتخاب زریں (اردو اشعار کا انتخاب) بعض رسائل اور مضامین
ان کی علمی و ادبی یادگاریں ہیں۔ (ایضاً ص ۱۰۸)

شیخ مشیر حسین قدوائی (المتوفی ۱۹۳۱ء) ضلع بارہ بنکی (یو۔پی) کے ایک گاؤں گدیہ کے

تعلق دار تھے، بیرسٹری کی تعلیم پائی، سید صاحب ان کی قدر اس لیے کرتے رہے، کہ وہ اسلام کے پُرجوش سپاہی اور اتحادِ اسلامی کی تحریک کے بانیوں میں تھے، سید صاحبؒ وفدِ خلافت کے ساتھ لندن میں تھے، تو وہ اراکین وفد سے برابر ملتے رہے، سید صاحبؒ پر اس حیثیت سے بھی ان کا اثر پڑا، کہ وہاں نمازوں کی پابندی کیا کرتے، اور وضو و طہارت کا بڑا اہتمام رکھتے، وہ ندوہ کے بھی رکن تھے، ان کی کتاب "اسلام اور سوشلزم" بہت مقبول ہوئی، سید صاحبؒ نے ان کی وفات پر جو یہ لکھا کہ عمر بھر فرنگستان کی وادیوں میں اپنے قلم سے مصروف جہاد رہے، اس سے ان کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوگا۔ (یادِ رفتگاں، صفحہ ۱۸۰)

علی گڈھ کے نواب سر مزمل اللہ خاں (المتوفی ۱۹۳۸ء) کی وفات پر سید صاحبؒ نے ان کو یوپی کا حاتم طائی کہا ہے، اور انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ، ایجوکیشنل کانفرنس، اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ، الہ آباد یونیورسٹی، ہندو یونیورسٹی بنارس، دارالعلوم دیوبند، جمعیۃ العلماء اور کانگریس کو جس طرح اپنے چشمۂ فیض سے سیراب کیا، اس کی تفصیل لکھ کر ان کی سادگی یہ دکھائی ہے، کہ ٹین آنے گز کے کپڑے کا کرتہ پہننے میں جھجک محسوس نہ کرتے، اور ہر لمحہ اپنے نیک عمل کے قبول ہونے کے خواہاں رہے، سید صاحبؒ نے یہ سب کچھ لکھ کر متمول لوگوں کو توجہ دلائی ہے، کہ امارت اور دولت کا مصرف کس طرح لینا چاہئے۔ (ایضاً ص ۱۸۵)

حیدرآباد کے نواب اختر یار جنگ (المتوفی ۱۹۴۰ء) نے معتمد امورِ مذہبی کی کارکردگی کی وجہ سے نظامِ حیدرآباد سے خطاب پایا، سید صاحبؒ نے ان کے سیکڑوں مفید خدمات کا ذکر اس لیے کیا ہے، کہ یہ سبق حاصل ہو، کہ نیک کام کی امداد میں سبقت کیسے کی جا سکتی ہے (ایضاً ص ۲)

سرشاہ سلیمان (المتوفی ۱۹۴۱ء) اعظم گڈھ ضلع ہی کے رہنے والے تھے، انکے مورث اعلیٰ شمس بازغہ کے مصنف ملا محمود جونپوری تھے، ان کو ایک طرف تو قصائد ذوق سے دلچسپی رہی،

وہ ہندوستان کے تعلیمی مسائل کا بھی مطالعہ کرتے رہے، جو پہلے ہائی کورٹ الہ آباد کے چیف جسٹس اور مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی ہوئے، ان کی وفات پر ماتم کرتے ہوئے ان کے کمالات سید صاحب نے اس لیے دکھائے ہیں، کہ مسلمانوں میں جو لوگ نئی تعلیم پاکر کچھ کمالات حاصل کرتے ہیں، ان کا اعلیٰ ظرف کیا ہونا چاہئے۔ اس لیے ان کی سیرت کی خوبیاں اس طرح بیان کی ہیں، کہ نئی تعلیم کے جو بہتر سے بہتر نمونے ہماری قوم نے پیش کیے، ان میں سے ایک سر شاہ سلیمان تھے، وہ ایماناً اور عملاً مسلمان تھے، ان تنگ ظرفوں میں نہ تھے، جو رومن حروف کے چند الفاظ پڑھ لینے کے بعد اپنے کو حقائق و معارف کا سب سے بڑا عارف مان کر دین و مذہب سے بے نیاز ہو جاتے ہیں اور بندگی کی حد سے آگے بڑھ کر خدائی کے عرش کا اپنے کو مستحق سمجھتے ہیں، وہ منکسر المزاج، متواضع، حلیم اور سادہ مزاج تھے، اپنی رائے کے معاملے میں وہ اور کام کے دھنی تھے، وہ عالم تھے، مگر عمر بھر طالب علم بنے رہے، وہ ہندوستان کا وقار اور مسلمانوں کا فخر تھے، (یادِ رفتگاں، صفحہ ۲۲۲ - ۲۲۳)

حیدرآباد کے صدر اعظم سر اکبر حیدری (المتوفی ۱۹۴۳ء) کی وفات پر سید صاحب نے جو تحریر لکھی، اس میں ان سے اپنی قدردانی کا اور ان کی وفات پر اپنے غم و الم کا اظہار اس لیے کیا کہ وہ صدر اعظم کی حیثیت سے تمام اسلامی اداروں سے ایک خاص مربیانہ تعلق رکھتے تھے، یہ گویا اس کا پیام ہے کہ جو اعلیٰ عہدہ دار علمی و تعلیمی اداروں کی سرپرستی کریں گے، وہ قدردانی کے مستحق ہوں گے (ایضاً ص ۲۲۵)

حیدرآباد کے نواب محمد یار جنگ بہادر (المتوفی ۱۹۴۲ء) وہاں کے ایک صوبہ دار تھے دار المصنفین سے ان کو بڑی دلچسپی تھی، اس لیے سید صاحب ان سے برابر ملتے رہے، ان کی وفات پر ان کا ملول ہونا بالکل فطری تھا، ان کا ماتم یہ لکھ کر کیا کہ وہ ایک مرنجان مرنج بزرگ، نہایت مخلص، بے ریا، باخدا، اور نیک طبع تھے، نیز علمی اور تعلیمی تحریک میں شریک رہے، ان کی ان خوبیوں کا ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے، کہ ایسے ہی لوگوں سے مسلمانوں کی معاشرت بن سکتی ہے، (ایضاً ص ۲۳۴)

مراد آباد کے سرمحمد یعقوب (المتوفی سنہ ۱۹۴۲ء) اپنے زمانہ کے بہت ہی خوش قسمت
ں میں تھے، دہلی کے لجسلیٹو اسمبلی کے صدر بھی ہوئے، سر کا خطاب بھی پایا، حکومت نظام
بر اصلاحات بھی ہوئے، سید صاحبؒ شاید ان سے کبھی نہیں ملے، لیکن ان کو دوسرے لگاؤ
یے رکھا کہ ان کے والد ماجد مولوی محمد اسماعیل وکیل شاہجہانپور ندوہ کے رکن اور تبلیغی
س میں مولانا شبلیؒ کے ساتھ تھے، اسی وضعداری میں ان کی وفات پر لکھا کہ انھوں نے
یں ترقی اپنی خوش قسمتی سے کی، دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ اس عالم میں بھی ان کو خوش قسمت
ے، سید صاحبؒ کی نظر میں ان کی دنیاوی کامیابی کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بہت خوش خلق
ضع، متحمل اور حاجت مندوں کی امداد میں کشادہ دست تھے، ان محاسن کا ذکر سید صاحبؒ
ید اس لیے کیا، کہ ان خوبیوں کے ساتھ ایک آدمی خوش قسمت اور کامیاب بھی ہو جائے
ب کی بات نہیں، اس لیے ان کا ذکر شرافت اخلاق کے ساتھ کرتے ہیں: (ایضاً ص ۲۴۳)
سید صاحبؒ جن سے گہرا لگاؤ رکھتے، اس کی وفات پر اپنی تعزیتی تحریر لمبی لکھتے، اپنے معاصر سید حسین
ت پر بھی ایک طویل تحریر لکھی ہے، سید حسین بنگال کے مشہور ظریف انشاپرداز سید محمد آزاد کے
ے بیٹے تھے، انگلستان میں تعلیم پائی، تو انگریزی زبان لکھنے میں بڑی مہارت حاصل کی، خاندانی
ایات کی وجہ سے اردو لکھنے کا اچھا ذوق پایا، سیاست میں حصہ لینے لگے تو پنڈت موتی لال نہرو کے
بار انڈپنڈنٹ الہ آباد کے اڈیٹر ہوئے، جب سنہ ۱۹۲۰ء میں ہندوستان کا وفد خلافت لندن گیا
مولانا محمد علی اور سید صاحبؒ کے ساتھ وہ بھی تھے، وہاں جا کر خلافت کے سلسلہ میں مولانا محمد علی نے
لمانوں، سید صاحبؒ نے دین اسلام اور سید حسین نے ہندوستانیوں کا نقطۂ نظر پیش کیا، لندن کے
ام میں مولانا محمد علی اور سید حسین میں جو نوک جھونک ہوتی، اس کو سید صاحبؒ جس طرح رفع کرتے
ان کی شرافت طبع کی ایک مثال ہے، سید صاحبؒ نے لکھا ہے کہ

محمد علی اور سید حسین دونوں ہی لائق اور قابل تھے، یہ دونوں اپنی اپنی جگہ الگ اصول اور عمل رکھتے تھے، اس لیے ان دونوں شیروں کو ٹھیک ٹھیک کر رکھنا بڑا مشکل کام تھا، یہ کام اس کو کرنا پڑتا تھا، جو دونوں کے بیچ میں واو عطف کی طرح تھا، تاہم کام کی اہمیت کا خیال کر کے دونوں نے جس طرح بنا آٹھ مہینے کی مدت کو خیر و خوبی کے ساتھ نباہا۔

اس مدت کو خیر و خوبی سے نباہنے میں، سید صاحبؒ کی شرافت طبع بہت معاون ثابت ہوئی، مگر انھوں نے اپنے عجز و انکسار میں اس کی تفصیل لکھ کر اپنی بڑائی کا اظہار پسند نہیں کیا بلکہ ایک عاجزانہ تحریر لکھ کر اپنے کو دبانے کی کوشش کی مگر اس طرح وہ چھپ کر اور ظاہر ہو جاتے ہیں، وفد خلافت کے واپس آنے کے بعد سید حسین امریکہ چلے گیے، اور وہیں اپنی زبان اور قلم سے ہندوستان کی خدمت میں مصروف رہے، آخر میں ہندوستان آئے، اور ہندوستان کے سفیر بنا کر مصر بھیجے گئے، وہیں ۲۵ فروری ۱۹۴۹ء میں وفات پائی، سید صاحب کو دکھ تھا، کہ ان کی قابلیت سے ہندوستان کو براہ راست فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملا، (یادرفتگاں، صفحہ ۸۳ - ۳۰۹)

منشی احتشام علی کاکوری کے رئیس تھے، لکھنؤ میں خیالی گنج میں ایک بہت بڑی کوٹھی بنائی تھی، جو اس زمانہ میں ہر قسم کے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی، سید صاحبؒ ان کا احترام اس لیے کرتے، کہ ۱۸۹۵ء سے ۱۹۴۳ء یعنی وفات کے آخری لمحہ تک ندوہ کے ساتھ بڑے اخلاص کے ساتھ اپنی دلچسپی برقرار رکھی، پھر سید صاحب کے دل میں ان کی قدر و منزلت اس لیے بھی تھی، کہ ان کی بڑی اور وسیع کوٹھی عزیزوں کا مسکن، نو واردوں کا ماویٰ، غریبوں کا ملجا، بڑے بڑے قومی خادموں کی فرودگاہ، علماء و فضلاء اور صلحا کا مہبط اور مسلمانوں کے بڑے بڑے قومی جھگڑوں اور فیصلوں کی عدالت گاہ بنی ہوئی تھی، سید صاحبؒ کو ان کی وفات پر یہ دکھ ہوا، کہ یہ حادثہ پچھلے دور خدمت کے جواہر فضائل کو بھی اپنے ساتھ لے گیا، اور پھر ان کو یاد کر کے اس طرح اپنی تحریروں کو آنسوؤں میں اس طرح تبدیل کر دیا ہے۔

"اردو میں قدیم شریفانہ جوہر، وضعداری، دینداری، مروت، بیرحشمی، اقربانوازی، اور مسکین پروری کا یہ اخیر نمونہ تھا، ان کی پوری زندگی میں جس میں وسعت کا زمانہ بھی تھا، اور تنگی کا بھی، ان کے ہاتھ یکساں کھلے رہے، اور اس اخفا کے ساتھ کہ بائیں ہاتھ کو داہنے ہاتھ کی خبر نہ تھی، وہ مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی سے بیعت تھے، اس تعلق کو اخیر اخیر وقت تک جس طرح نباہا وہ ان کی سعادت مندی کا نشان ہے، پابندی یہ کہ مرتے وقت تک سجدۂ عبودیت ادا کیا ہے، اور صبر و شکر کے کلمے زبان سے نکلتے رہے، (یادرفتگاں ص ۱۲۵)

معاصر سیاسی رہنماؤں کا ذکر سید صاحبؒ اپنی زندگی میں سیاسیات میں بھی حصہ لیتے رہے، اپنی سیاسی سرگرمیوں میں ان کو ہندوستان کے ہر قسم کے سیاسی رہنماؤں کے ساتھ کام کرنے اور ملنے جلنے کا موقع ملا، اپنی شرافت اخلاق اور مرنجاں مرنج طبیعت کی بدولت سیاسی مسلک کے رہنماؤں سے برابر کے خوشگوار تعلقات رکھے خواہ وہ کانگرسی یا خلافتی یا جمعیۃ العلمائی یا مسلم لیگی یا اتحاد المسلمین کے کیوں نہ ہوں، ان کی نظر ان رہنماؤں کی حقیقی اور اندرونی خوبیوں پر جاتی جن کی وہ دل سے قدر کرکے ان کی وفات پر ان کا اعتراف کرتے۔

مسیح الملک حکیم اجمل خان (المتوفی ۱۹۲۷ء) کی سیاست کے ساتھ ان کے اس لیے مداح رہے، کہ علی گڑھ، دیوبند، جمعیۃ العلماء، مسلم لیگ، کانگریس، خلافت کانفرنس، ہندوستانی دواخانہ، جامعہ ملیہ، اور طبیہ کالج دہلی سب ان کے خوان نعمت کے برابر ریزہ چیں رہے، جب ان کی وفات ہوئی، تو اپنے پورے زور بیان کے ساتھ لکھا، کہ

"حکیم صاحب کی وفات کسی خاندان کا ماتم نہیں، دلی کا ماتم نہیں، قوم کا ماتم ہے فضل و کمال کا ماتم ہے، اخلاق و شرافت کا ماتم ہے، سنجیدگی و متانت کا ماتم ہے عقل و رزانت کا ماتم ہے، فکر و اصابت کا ماتم ہے آزادی و حریت کا ماتم ہے، ہندوستان اور مسلمانان ہند کے طالع و بخت کا ماتم ہے"

مرثیہ ہے ایک کا اور نوحہ ساری قوم کا (ص ۸۱)

یہ کوئی رسمی ماتم نہیں، سید ہی لکھ سکتا ہے، جو اپنے دل کی اندرونی آواز کو موثر طریقہ پر قلمبند کرنے کی بھی قدرت رکھتا ہو، چند سطروں میں درد وغم کو تاثیر میں ڈھال دیا ہے۔

بہار کے مظہر الحق بیرسٹر (المتوفی سنہ ۱۹۳۰ء) کی قومی و سیاسی سرگرمیوں کے معترف تھے، وہ بہت بڑے کانگرسی کی حیثیت سے اب تک یاد کیے جاتے ہیں، سید صاحبؒ ان کی سیاسی دلچسپیوں سے زیادہ ان کی اخلاقی قوت و جرأت کے ثناخواں رہے، وہ جس طرح اپنی یورپین طرزِ معاشرت کو الوداع کہہ کر خالص مشرقی بن گئے، اس کو سید صاحبؒ نے ان کی بے مثال اخلاقی جرأت کہا ہے، آخر میں وہ سیاست سے علٰحدہ ہو کر روح اور روحانیت کی تحقیق میں لگ گئے، اور جب ان کی وفات ہوئی تو سید صاحبؒ نے لکھا کہ ان کی روح اب خود وہاں پہنچ گئی ہے، جہاں کے کشف راز کے لیے بیقرار تھی (ایضاً ص ۹۲)

مولانا محمد علی جوہر سید صاحب سے عمر میں چھ سال بڑے تھے، مگر دونوں میں بڑی دوستانہ بے تکلفی رہی، اور اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہوگا، کہ سیاسی رہنماؤں میں سید صاحبؒ کو ان سے جتنی محبت تھی کسی اور سے نہ ہو سکی، اور رہنماؤں سے بھی ان کو عقیدت تھی، وہ ان کی عزت کرتے، ان سے احترام سے پیش آتے، ان کی خوبیوں کی قدر کرتے، اگر وہ سیاست میں ان کے ہم مسلک ہوتے، تو ان سے قریب تر ہوتے، مگر ان کو مولانا محمد علی سے اللہ واسطے کی محبت تھی، اس لئے ۴ جنوری سنہ ۱۹۳۱ء کو ترپن سال کی عمر میں ان کی وفات کی خبر پائی، تو ان کا رواں رواں روتا دکھائی دیا، اور جب ان پر اپنی ماتمی تحریر لکھنے بیٹھے تو ان کے قلم کی شاید بہترین تحریر قرار دی جا سکتی ہے، اس کا ہر لفظ ان کے آنسو کا ایک قطرہ ہے، اس کی ہر سطر ان سوز سینہ کی چنگاری ہے، اس کا ہر پیرا ان کی غم ناکیوں کا آتش دان ہے، جب وہ ماتم لکھنے بیٹھے ہوں گے، تو زبان حال سے کہہ رہے ہوں گے۔

ہویدا آج اپنے زخم پنہاں کر کے چھوڑوں گا لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑونگا

اور سچ تو یہ ہے، کہ ابھی اس تحریر کے سوزِ پنہاں سے ہر شمعِ دل کو جلایا ہے، اور اس کے لیے یہ لکھی گئی ہے، اس کی موت کی یادوں کی تاریک راتوں کو چراغاں کر کے چھوڑا ہے، دونوں کے تعلقات کی بڑی لمبی داستان ہے، اس ماتمی تحریر کے ٹکڑوں ہی سے دونوں کی مہر و محبت کی کیفیت کا اندازہ ہوگا، اور پھر ان ہی سے مولانا محمد علی کی سیرت کی پوری تصویر بھی نظروں کے سامنے سنیما کے پردہ کی طرح چلتی پھرتی نظر آئے گی

دو چار سطروں کے بعد اس مرثیہ کی ابتدا، اس طرح کرتے ہیں۔

افسوس وہ پُر درد آواز جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۰ء تک ہندوستان اور دنیائے اسلام پر قیامت آفریں سانحہ میں صدائے صور بن کر بلند ہوتی رہی، ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی، وہ بے قرار دل جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت بے تاب ہو جاتا تھا، اور اوروں کو بے تاب کر دیتا تھا، دریغا کہ قیامت تک کے لیے ساکن ہوگیا، (یادِ رفتگان ص ۱۲۳)

سید صاحب اتنا ہی لکھ کر رک جاتے تو غمناک کیفیت کی تاثیر پورا کام کر دیتی، مگر ان کا قلم رکا نہیں، ان کے غم ناک جذبات حروف و الفاظ میں ڈھل کر ان کی نوکِ قلم کے ذریعہ سے کاغذ پر منتقل ہوتے نظر آتے ہیں، جن میں آورد کے بجائے آمد اور تصنع کے بجائے بے ساختہ پن دکھائی دیتا ہے، رقم طراز ہیں،

وہ اشک آلود آنکھیں جو دین و ملت کے ہر ماتم میں آنسوؤں کا دریا بن جاتی تھیں حسرت کہ ان کی روانی ہمیشہ کے لیے بند ہوگئی، وہ مترنم لب جو ہر بزم میں خوش نوا بلبل بن کر چہکتے تھے، ان کے ترانے اب ہمارے کان نہ سنیں گے، وہ آتشیں زبان جو ہر رزم میں تیغِ براں بن کر چمکتی تھی، اس کی تابش اب کسی معرکہ میں ہماری آنکھوں کو نظر نہ آئے گی، وہ پُرجوش سینہ ہمارے مصائب کے پہاڑوں کو سیلاب بن کر بہالیجاتا تھا، اس کا تلاطم ہمیشہ کے لیے تھم گیا، وہ پُر زور دست بازو جو شب و روز کی خدمت گذاری اور نبرد آزمائی میں مصروف تھے، وہ اب ایسے تھکے کہ

پھر نہیں گے، اور افسوس کہ شکست خوردہ فوج کا وہ آخری سپاہی جو اور اکیلا تنہا لڑ رہا تھا، آخر زخموں سے چور ہو کر ایسا گرا، کہ پھر کھڑا نہ ہوگا، الوداع محمد علی الوداع والسلام، الی یوم القیام۔"

شاید کچھ ایسے لوگ بھی زندہ ہوں، جنھوں نے مولانا محمد علی کو دیکھا ہو، اور ان کی سیاسی سرگرمیوں سے واقف رہے ہوں، وہی اس تحریر کی غم ناک کیفیت کا اندازہ کرسکیں گے، اس کو لکھے ہوئے نصف صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے، مگر آج بھی محمد علی کے قدرداں اس کو پڑھ کر ضرور اشکبار ہوں گے، مولانا محمد علی کی سیاست میں ان کی اشک آلود آنکھوں نے ساتھ دیا، ان کے آنسوؤں نے ان کی غم گساری کی، ان کے مترنم لب کے ترانوں نے ان کی ہم نوائی کی، ان کی سیاست کو ان کی آتشیں زبان سے سہارا ملا، ان کا پرجوش سینہ ان کا ہم رکاب رہا، وہ اپنی سیاسی نبرد آزمائی میں ایک شکست خوردہ فوج لے کر لڑے، اور یہ صحیح ہے کہ وہ زخموں سے چور ہو کر گرے، مگر ان کی شکست میں ان کی عظمت ہے، انھوں نے پوری سیاسی زندگی عزاداری، سوگواری، گریہ وزاری، ماتم داری اور مرثیہ خوانی میں ضرور گذاری، وہ اپنی سیاست میں فتح و کامرانی سے ہم کنار نہیں ہوئے، مگر وہ جس روح، عزم اور استقلال سے سینہ سپر ہو کر ملت اسلامی کے لیے لڑے۔ وہی ان کا کارنامہ ہے جس سے ان کے ہم مذہبوں کی روح میں تڑپ اور ان کے قلب میں گرمی پیدا ہوتی رہے گی، یہی ان کی سیاسی زندگی کا کارنامہ ہے، سید صاحبؒ نے ان کے ان کارناموں کو اپنی ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ اس طرح قلم بند کیا ہے،

"تو ملت کا عزادار تھا، حق ہے کہ ساری ملت تیری عزادار ہو، تو امت محمدی کا سوگوار تھا، فرض ہے کہ پوری امت تیرا سوگ کرے، تو نے دنیائے اسلام کا ماتم کیا تھا سزاوار ہے، کہ دنیائے اسلام تیرا ماتم کرے، ہندوستان کا ماتم دار، طرابلس کا سوگوار، عراق کے لیے

غم زدہ، بلقان کے لیے اشکبار، شام پر گریاں، انگورہ پر مرثیہ خواں، حجاز کا سوختۂ غم، اور بیت المقدس کے لیے وقف الم۔ اے ہند کے آوارہ گرد مسافر تیرا حق سرزمین اسلام کے چپہ چپہ پر تھا، مناسب یہی تھا، کہ تیرے لیے اولیں قبلۂ اسلام کا سینہ پھٹ جائے اور تو اس میں سما جائے۔

یہ تحریر وہی لکھ سکتا ہے، جو ملت اسلامی کی سیاست کا خود بھی اداشناس اور اس کیلئے سوختۂ غم اور اشکبار ہو، سید صاحبؒ جس وقت یہ تحریر لکھ رہے ہوں گے ان کی آنکھوں سے ان کے آنسوؤں کے قطروں سے ان کے قلم کے نیچے کا کاغذ تر ہو گیا ہو گا، اگر وہ کاغذ بھی محفوظ کر لیا گیا ہوتا، تو ان کی اور تحریروں کی طرح یہ بھی ایک یادگار ہو جاتا، محمد علی کی جدائی پر ان کا قلم اس طرح سوختۂ غم ہوا جس طرح فراق یار میں کسی مضطرب اور رہجور عاشق کا ہو، جراحت دل کے ساتھ لکھتے ہیں :۔

وہ مشرق کی زمین میں پیدا ہوا لیکن مغرب کی آب و ہوا میں نشو و نما پائی، مشرق کی مٹی سے اس کا جسم تھا لیکن مغرب کے ہتھیاروں سے اس نے اپنا جسم سجایا، اس کا دماغ مغربی مگر دل مشرقی تھا، مشرق کی حمایت میں بارہا مغرب سے مغرب کے ہتھیاروں سے لڑا، اور اس نے اس کا لوہا مانا، وہ مشرق کا آفتاب تھا، یہ آفتاب بھی اگر مشرق میں طلوع ہو کر مغرب میں ڈوبا، تو دنیا کا کوئی نیا واقعہ نہ ہوا، اور اسی لیے حق تھا کہ مشرق و مغرب کا متحدہ مرکز بیت المقدس اس کا مدفن ہے، اے مشرق و مغرب کے مالک تو اپنی رضامندی کے پھول سے اس کا دامن بھر دے۔

اس ایک پیراگراف سے مولانا محمد علی کے کردار کی پوری عکاسی ہوتی ہی، یہ وہی لکھ سکتا ہے، جو ان کی جگر کاویوں اور عملی ہنگامہ آرائیوں کا اداشناس اور عارف رہا ہو، ان کی سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ سید صاحب کو ان کی غزل گوئی یاد آئی، تو اس میں یہ لکھ کر آب و رنگ پیدا کرتے ہیں۔

محمد علی کے کارناموں میں اس کی غزل گوئی کا گو کوئی بڑا درجہ نہیں لیکن جس طرح اس کی آخری

پیشین گوئی کی صداقت کو دنیا نے دیکھا اور تسلیم کیا، کہ وہ اُٹھ اور غلام ہندوستان کو واپس نہیں آیا، اس کے مرنے پر معلوم ہوا کہ اس نے زندان خانہ میں بیٹھ کر اپنی جن واردات کو نظم کیا تھا، وہ سراسر صداقت تھی، اور پیشین گوئیوں کی عجیب و غریب مثالیں، اس نے کہا۔

اللہ ہی کے رستہ میں جو موت آئے تو اچھا۔ ۔

اکسیر یہی ایک دعا میرے لیے ہے،

محمد علی مبارک کہ یہ تیری پُر تاثیر دعا، اکسیر بنی، اور تیرے حق میں قبول ہوئی۔

اور پھر محمد علی کے ایک مصرع کو سامنے رکھ کر اپنی ماتمی تحریر کو یہ لکھ کر دل گداز بنا دیا ہے، کہ

مولانا محمد علی کا ماتم جس طرح دنیا میں ہوا، مشرق و مغرب میں ہوا، یورپ اور ہندوستان
جو امصر و شام میں ہوا، فلسطین اور اس کے بیت المقدس میں ہوا، وہ شاید ہی کسی کے لیے ہوا ہو،
صاحب دل شاعر کی اس پیشین گوئی کی صداقت سے کس کو انکار ہے۔

ماتم یہ زمانہ میں بپا میرے لیے ہے۔

اس کے بعد سید صاحبؒ نے مولانا محمد علی سے اپنے پُرکیف تعلقات کی یادوں کو سمو کر اپنے دل و جگر کو تشنۂ فریاد دکھایا ہے، مولانا محمد علی کی موت پر اس سے بہتر نثری نوحہ نہیں لکھا گیا ہے، اس میں درد و الم کے ساتھ شادی و غم بھی اس لیے ہے کہ لکھنے والے کے شیشۂ دل میں مولانا محمد علی ایک جام جم کے مانند نظر آئے، اس کو اپنے خامۂ معجز رقم سے لوگوں کے سامنے اس طرح آشکارا کر دیا ہے، کہ یہ انشا پردازی کا شاہکار اور دردِ عشق کا گہر آبدار نظر آتا ہے، جس کو ہمیشہ دیدۂ حیران اور چشم گریاں کے ساتھ پڑھا جائے گا، اس میں خون کے آنسو تحریر کے نافۂ آہو میں بند ہو کر مشک اذفر بن گئے ہیں۔ (یادِ رفتگان۔ صفحہ ۳۰، ۱۳۳) (باقی)

بزمِ رفتگان حصہ اول دوم:- یہ عزیزوں، دوستوں اور معاصروں کی وفات پر دردانگیز تاثرات

از جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ قیمت ۔ ۲۰ روپیہ

کیا مغصوبہ زمین پر مسجد تعمیر کی جا سکتی ہے؟

از

مولانا محمد برہان الدین سنبھلی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

اسلامی قوانین سے تھوڑی بہت واقفیت رکھنے والے کو بھی یہ حقیقت ماننے میں تامل نہ ہوگا
ت اسلامیہ میں غیر مسلم رعایا کو پوری مذہبی آزادی حاصل ہوتی ہے، یعنی انھیں اپنے دین کے
بق زندگی گزارنے کا مکمل قانونی حق دیا گیا ہے، چنانچہ اسلامی اصول قانون میں "نترکھم
اید ینون" (ہمیں اللہ کے رسول کی طرف سے غیر مسلم رعایا کو ان کے مذہب پر پوری طرح
کی آزادی دینے کا حکم ہے) ایک ایسی اصل و بنیاد ہے، جس سے قانون شریعت کا معمولی
ب علم بھی بے خبر نہ ہوگا، (اور یہ اصل حضرت عمرؓ کے قول سے ماخوذ ہے[2]۔ ظاہر ہے کہ اس آزادی
عبادات اور معاملات دونوں قسم کے احکام شامل ہیں کہ غیر مسلم اپنے مذہب کے مطابق
طرح چاہیں لین دین کریں، اور جس طریقہ پر چاہیں عبادت کریں، اسلامی قانون اور

---

[1] فقہ حنفی کی مشہور و معتبر ترین کتاب ہدایہ اخیرین میں ہے: "نحن امرنا بأن نترکھم وما یدینون۔"
یہ ص ۲۰۳، ج ۲، برہان الدین المرغینانی (متوفی ۵۹۳ھ) (مطبوعہ کتب خانہ رشیدیہ دہلی) اس کتاب میں
صول متعدد جگہ بیان ہوا ہے، یہاں صرف ایک موقع کی نشاندہی پر اکتفا کیا گیا ہے۔ [2] ہدایہ کے مشہور شارحین
لامہ بدر الدین عینی نے بنایہ شرح ہدایہ جلد ۳ ص ۲۰۹ میں اور اکمل الدین محمود البابرتی نے عنایہ
حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے، کہ انھوں نے اپنے عمال سے فرمایا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم لوگ جزیہ میں میتہ خنزیر
ور شراب وصول کرتے ہو، حضرت بلالؓ نے فرمایا کہ ہاں ایسا ہوتا ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو بلکہ ان سے کہو کہ
نھیں بیچ دیں، اور تم لوگ اس کی قیمت لے لیا کرو (عنایہ للبابرتی ج ۳ ص ۲۴۲ مطبوعہ کلکتہ ۱۲۴۵ھ)

مسلمانوں کے مزاج سے جو شخص ذرا بھی باخبر ہے وہ جانتا ہے کہ خنزیر ان کے یہاں کس درجہ ناپاک اور قابل نفرت چیز ہے کہ اس کا نام لینا بھی طبیعت پر گراں ہوتا ہے، اس کی خرید فروخت بھی ان کے لئے قطعاً ممنوع ہے، مگر اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کو، اگر ان کا مذہب اجازت دیتا ہے تو خنزیر کی خرید و فروخت اور اس کے استعمال کی پوری قانونی اجازت ہے جس کا ذکر فقہ (اسلامی قانون) کی ہر چھوٹی بڑی کتاب میں موجود ہے، اس کی مزید تفصیل آگے بیان کی جائے گی۔

غیر مسلموں کو معاملات ہی کی طرح عبادات میں بھی مکمل آزادی اسلامی حکومت کے تحت حاصل ہوتی ہے، دنیا جانتی ہے کہ اسلام میں بت پرستی کی سخت ممانعت ہے، مگر اس کے باوجود اسلامی حکومت کے تحت رہنے والے غیر مسلموں کو اپنے عبادت خانوں میں اس سے روکا نہ جائے گا مزید یہ کہ انھیں ایسے علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی غالب تعداد نہ ہو، بت خانے بنانے سے بھی نہیں منع کیا جائے گا، جیسا کہ فقہ کی معروف و معتبر کتاب بدائع الصنائع میں ہے۔[1]

لو فعلوا ذالک اظہار شعائر الکفر فی کنائسھم لا یتعرض لھم وکذا الضرب بالناقوس فی جوف کنائسھم ...... ولا یمنعو ...من بیع الخمر والخنزیر والصلیب وضرب الناقوس	اگر غیر مسلم اپنے کفریہ مراسم اپنے عبادت خانوں میں انجام دیتے ہیں تو انھیں اس سے منع نہیں کیا جائیگا، ...... اور انھیں شراب و خنزیر نیز صلیب کی خرید و فروخت سے بھی نہیں روکا جائیگا، اور ایسے مقامات پر کہ جہاں مسلمانوں کی بہت زیادہ آبادی نہو

[1] بدائع الصنائع۔ ص ۱۱۳ - ۱۱۴ - ج ۷، لملک العلماء الکاسانی۔ (المتوفی ۵۸۷ھ) طبع مطبعۃ الجمالیۃ مصر الطبعۃ الاولی (۱۳۲۸ھ۔ ۱۹۱۰ء)

فی القریٰ أو فی موضع لیس من	نئے عبادت خانے بنانے سے بھی منع
أمصار المسلمین فلا یمنعون	نہیں کیا جائیگا، جس طرح شراب و
من احداث الکنائس والبیع	خنزیر کی کھلی خرید و فروخت سے
کما لا یمنعون عن اظهار	نہیں روکا جائے گا۔

بیع الخمور والخنازیر۔

حکومت اسلامی میں جب نئے بت خانے بنانے تک کی اجازت ہے تو ان کے قدیم اور اسلامی حکومت کے قیام سے پہلے کے بت خانوں، مندروں، گرجاگھروں وغیرہ کا توڑنا کیونکر قانون شرعی کی رو سے درست ہو سکتا ہے، چنانچہ اس کی صراحت بھی معتبر کتب فقہ میں ملتی ہے۔ مثلاً مشہور مصری محقق ابن ہمام (متوفی ۸۶۱ھ) اپنی شہرۂ آفاق معتبر فقہی کتاب فتح القدیر میں یہ حکم شرعی بیان کرتے ہیں:۔

ما فتحہ المسلمون عنوۃ...	اسلامی مفتوحہ ملکوں میں غیر مسلموں
عندنا۔ لا تھدم البیعۃ و	کے عبادت خانے توڑے نہ جائیں گے
الکنیسۃ........	.... کیونکہ صحابہؓ نے بہت سے ملکوں
.... لأن الصحابۃ	کو بزور شمشیر فتح کیا، مگر انھوں نے
فتحوا کثیرا من البلاد عنوۃ	کہیں بھی غیر مسلموں کا کوئی عبادت خانہ
ولم یھدموا کنیسۃ ولا	نہیں توڑا.........
دیرا ولم ینقل ذالک قط	....

....

....

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:۔

ولا يتعرض للقديمة ..... واعلم ان البيع والكنائس القديمة في السواد لا تهدم على الروايات كلها واما في الامصار ... ذكر الامام محمد، انها لا تهدم، وعمل الناس على هذا فانا رأينا كثيرا منها توالت عليها ائمة وازمان وهي باقية لم يأمر بهدمها امام فكان متوارثا من عهد الصحابة رضي الله عنهم ..... فالكنائس الموجودة الآن في دار الاسلام غير جزيرة العرب كلها ينبغي ان لا تهدم[1]

غیر مسلموں کے پرانے عبادت خانوں کو چھیڑا نہ جائیگا اور دیہاتوں کے قدیم عبادت خانے ہرگز نہیں توڑے جائیں گے، اس میں فقہائے احناف کا کوئی اختلاف نہیں، اور شہروں کے عبادت خانوں کے بارے میں بھی امام محمدؒ کا یہی فتوےٰ ہے کہ نہیں توڑے جائیں گے، یہی وجہ ہے کہ لوگ اسی پر عمل کرتے ہیں، اسی لیے پرانے عبادت خانے ہم یہاں (مصر میں) موجود دیکھتے ہیں، حالانکہ کتنے حکمران بدل چکے ہیں، اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ صحابہؓ کے زمانہ سے یہ چلے آرہے ہیں، اسلیے آج کل دارالاسلام میں جتنے بھی قدیم عبادت خانے ہیں، جزیرۃ العرب کے علاوہ کسی بھی جگہ نہیں توڑا نہ جائے،

مذکورۂ بالا عبارت سے غیر مسلموں کے عبادت خانوں کے بارے میں حکم شرعی معلوم ہونے کے ساتھ متعدد دیگر اہم باتوں کا پتہ بھی چلتا ہے، مثلاً یہ کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین جو پوری امت کے لیے نمونۂ عمل ہیں، انھوں نے اپنے زمانہ میں بے شمار غیر مسلم علاقے فتح کرکے اسلامی حکومت

---

[1] فتح القدیر لابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ۔ ج ۴ ص ۸، ۳، الطبعۃ الاولیٰ بالمطبعۃ الکبریٰ الامیریہ بولاق مصر ۱۳۱۶ھ

اندر داخل کئے، مگر کہیں بھی انھوں نے پہلے سے بنے ہوئے بت خانے یا غیر مذاہب کے عبادت خانے نہیں توڑے۔ بعد کے مسلم فاتحین نے بھی یہی رویہ اپنایا، چنانچہ مصنفؒ کے بیان کے مطابق ان کے زمانہ نویں صدی ہجری کے آخر تک مصر جیسے ملک میں جہاں ۹۵ فیصد آبادی مسلمانوں کی ہے۔ غیر مسلموں کے قدیم عبادت خانے باقی تھے، (بلکہ ابتک ہوں گے) حالانکہ مصر، اسلام کے دور اول ہی میں، خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ (متوفی ۲۳ھ) کی خلافت میں فتح ہو چکا تھا، اور اس کے بعد درجنوں خلفاء اور حکمران ہوئے، مگر کسی نے ان غیر مسلموں کے عبادت خانوں کے توڑنے کا حکم نہیں دیا۔

اس سلسلہ میں علامہ شامیؒ (متوفی ۱۲۵۲ھ) نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ردالمحتار میں یہ عجیب و غریب واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ فتنۂ تاتار کے زمانہ میں شام کے یہودیوں نے تاتاریوں کی حمایت کر کے مسلمانوں کے ساتھ غداری کی تھی، جس کے نتیجہ میں انھیں قانوناً حقوق شہریت سے محروم کر دینا چاہئے تھا، مگر اس کے باوجود ان کے عبادت خانے آج تک باقی ہیں[1]۔ . . .

اس کی بنیادی وجہ وہی ہے، جس کا اوپر ذکر آیا، یعنی صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا طرز عمل، مزید براں یہ کہ محقق ابن ہمامؒ نے جو خود بڑے درجہ کے فقیہہ ہیں، اور جن کی تحقیقات و آراء کو قانون شرعی کی حیثیت دی جاتی ہے، انھوں نے یہ رائے بھی دی ہے کہ . . . . غیر مسلموں کے عبادت خانے (خواہ وہ کہیں بھی ہوں) توڑے نہ جائیں، اور یہ رائے آج نہیں بلکہ تقریباً سات سو سال پہلے دی گئی ہے، جب کہ چار دانگ عالم میں مسلمانوں کا طوطی بول رہا تھا، اور ساری دنیا گویا ان کی عظمت و بالادستی کے سامنے سرنگوں تھی، اور پھر ہندوستان جیسے غیر مسلم اکثریت کے ملک میں یہ بات نہیں کہی گئی، بلکہ مصر جیسے ملک میں جہاں، جیسا کہ اوپر گذرا۔ غیر مسلموں کی تعداد برائے نام ہے، ان دلائل و شواہد کی موجودگی میں بھلا یہ کیسے باور کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان

---

[1] ردالمحتار، ج ۳ ص ۲۷۰ لابن عابدین شامی (مطبوعہ مکتبہ نعمانیہ دیوبند)

ے ملک میں، جہاں ہمیشہ غیر مسلم اکثریت میں رہے، مسلم حکمرانوں نے جبراً غیر مسلموں کے عبادت خانے
ند، توڑ ڈالے ہوں گے، اور یہ بات دوگنا زیادہ بعید از قیاس اور خلاف شرع ہے کہ ان منہدم
جگہ پر مسجدیں بنائی ہوں گی، کیونکہ مسجد بہرحال خدا کی عبادت اور اس کی خوشنودی کے لیے
ائی جاتی ہے لہٰذا وہ شرعاً کسی ایسی جگہ پر نہیں بن سکتی جو کسی سے زبردستی بغیر خوشدلی اور رضامندی
ے لی گئی ہو، اگر بنالی گئی تو بنانے والے بجائے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے سخت گنہگار
ر اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہوں گے۔ فقہ اور قانون شریعت کی تمام معتبر کتابیں اس شرعی
م کے بیان سے بھری پڑی ہیں، بلکہ ان کتابوں میں بعض علماء کی یہ رائے بھی ملتی ہے کہ ایسی
گہ پر اگر نماز پڑھی جائے گی تو نماز ہی نہ ہوگی،[۱] اور اس بات پر تو تمام فقہاء اور قانون شریعت
ے ماہرین متفق نظر آتے ہیں کہ نماز پڑھنے والا گنہگار ہوگا، اور نماز کے اجر و ثواب سے محروم
ہے گا۔ مثلاً فقہ و قانون شریعت کی ایک معتبر و مستند کتاب درمختار میں ہے۔

ں... لا (الصلاۃ) فی... بارض مغصوبۃ — مغصوبہ یا غیر کی زمین میں نماز ناجائز ہے۔
للغیر[۲]

اس عبارت کی شرح کے دوران علامہ ابن عابدینؒ جو خود بہت بڑے فقیہ اور ماہر قانون
شریعت ہیں، اور جن کی رائے پر فتویٰ دیا جاتا اور فیصلہ کیا جاتا ہے، ایک عجیب بات فرماتے
ہیں کہ اگر کسی مجبوری کی، مثلاً جگہ نہ ملنے کی وجہ سے ایک آدھ وقت کی نماز اگر مالک زمین کی

---

[۱] یہ حکم امام شافعیؒ وغیرہ کے نزدیک ہے، جو ایک خاص اصل پر مبنی ہے، جس کی تفصیل اصول فقہ
کی کتابوں میں مذکور ہے، مختصر طور پر ابن رشد اندلسی (متوفی ۵۹۵ھ) کی کتاب بدایۃ المجتہد ج ا
ں ۱۱۲۔ میں بھی یہ مسئلہ بیان ہوا ہے، (مطبوعہ مطبعۃ الاستقامۃ۔ قاہرہ) [۲] درمختار مع الرد ج ا
ں ۲۵۵ للفقیہ علاء الدین الحصکفی۔ (متوفی ۱۰۸۸ھ)

بلا اجازت پڑھنا ضروری ہو جائے تو غیر مسلم کی زمین پر بلا اجازت ہرگز نہ پڑھے، بلکہ کسی مسلمان کی زمین پر بلا اجازت پڑھ لے، کیونکہ عادۃً کسی مسلمان سے یہ بات بعید ہے کہ وہ ایک وقت کی نماز پڑھنے کی اجازت نہ دے گا۔ برخلاف غیر مسلم کے، غالباً اسی لیے حکم میں فرق ہو گیا ہے، موصوف کے الفاظ یہ ہیں:۔

فلو اضطر بین ارض مسلم و کافر یصلی فی ارض مسلم[۱]

اگر کسی مسلمان یا کافر کی زمین میں نماز پڑھنے کے لئے مجبور ہو جائے تو مسلمان کی زمین میں نماز پڑھے گا۔

اسی کتاب میں یہ مسئلہ بھی ملتا ہے۔

یوخذ من التعلیل... کراھۃ الصلاۃ فی معابد الکفار ویکرہ للمسلم الدخول فی البیعۃ والکنیسۃ[۲]....

والظاہر انہا تحریمیۃ[۳]

مصنف کی دلیل سے کفار کے عبادت خانوں میں نماز پڑھنا اور اس کے اندر مسلمانوں کا داخل ہونا مکروہ تحریمی (ناجائز) ثابت ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں تیرہویں صدی کے مشہور یمنی عالم و محقق علامہ قاضی محمد بن علی الشوکانی (متوفی ۱۲۵۰ھ) نے اپنی مشہور ترین کتاب نیل الاوطار میں ممتاز ترین علمائے امت سے مغصوبہ زمین پر نماز پڑھنے کا یہ حکم نقل کیا ہے۔

---

[۱] در المختار، ص ۲۵۵ ج ۲ (مطبوعہ مکتبہ نعمانیہ، دیوبند) [۲] غیر مسلموں کے عبادت خانوں میں چاہے تصاویر نہ ہوں، نماز پڑھنے کی کراہت مشہور صحابی حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا مذہب ہے؛ جو انھوں نے حضرت عمرؓ کی روایت سے اخذ کیا ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے بدایۃ المجتہد ج ۱ ص ۱۱۴ لابن رشد) [۳] ایضاً ج ۱ ص ۲۵۵

"قال القاضي ابوبكر بن العربي ولا يصلي فيها ثلاثة عشر مكانا ... وزاد العراقي في الارض المغصوبة":

تیرہ جگہوں پر نماز نہیں پڑھی جاتی .... ان میں ایک جگہ دوسرے کی زمین بھی ہے۔

اور اس ممانعت کی وجہ قاضی شوکانی یہ بیان کرتے ہیں۔

واما الصلاة في الأرض المغصوبة فلما فيه من استعمال الغير بغير اذنه[1]

کیونکہ مغصوبہ زمین پر نماز پڑھنے کو دوسرے کی چیز کا مالک کی اجازت کے بغیر استعمال لازم آتا ہے جو شرعاً ممنوع ہے۔

یہاں یہ ذکر کر دینا بھی شاید بے محل نہ ہوگا کہ یہ حکم یعنی مغصوبہ زمین میں نماز پڑھنے کی ممانعت دراصل اس صورت کا بیان ہوا ہے، جب بغیر اجازت کسی کی زمین پر ایک آدھ نماز پڑھ لی جائے، اور اگر کسی کی زمین پر مستقل مسجد بلا اجازت بنا کر نمازیں پڑھی جائیں تو ممانعت کتنی شدید ہوگی، ؟ اسکا اندازہ لگانا مشکل نہیں،

بغیر اجازت کسی کی چیز پر قبضہ کر لینا شرعی اصطلاح میں غصب، کہلاتا ہے، اس کی مذمت اور بالخصوص کسی کی زمین غصب کرنے پر، آخرت میں بھیانک سزا کا ذکر جس انداز سے احادیث میں آیا ہے، اس کے پیش نظر، آخرت پر یقین رکھنے والے کسی بھی شخص کو غصب کی جرأت نہیں ہوگی، چہ جائے کہ وہ اس پر مسجد بنا کر خداوند تعالےٰ کا مزید غضب مول لے، متن حدیث یہ ہے،

من أخذ شبرا من الأرض ظلما فانه يطوقه يوم القيامة[2]

جو شخص ایک بالشت زمین بھی کسی دوسرے کی ناحق لے گا قیامت کے دن

---

[1] نیل الاوطار للشوکانی ج ۲ ص ۱۴۳ - ۱۴۲ (مطبوعہ دار الجیل، بیروت)

من سبع ارضین [۱]

اسے نہایت سخت عذاب ہوگا جس کا تصور بھی دنیا میں مشکل ہے۔

مشہور شارح حدیث محی الدین نووی (متوفی ۶۷۶ھ) نے اس باب کی احادیث کی شرح کرتے ہوئے، جن میں حدیث بالا بھی ہے، ان سے ماخوذ مسائل کا ذکر بایں الفاظ کیا ہے:۔

وفی هذه الاحادیث تحریم الظلم وتحریم الغصب فیه امکان غصب الارض وتغلیظ عقوبته [۲]	ان احادیث سے ظلم اور غصب کے حرام ہونے کا حکم ثابت ہوتا ہے اور اس پر سخت سزا ملنے کا پتہ بھی چلتا ہے۔

ان احکام وروایات کی وجہ سے علمائے اسلام اور ماہرین قانون شریعت نے اپنے فتاوی میں یہاں تک احتیاط برتنے کا فتوی دیا ہے کہ اگر کسی جگہ پر بظاہر زمین کے مالک یا مالکین کی اجازت سے مسجد بنی ہو، لیکن بعد میں چاہے جتنی مدت بعد، یہ پتہ چلے کہ اس زمین کے کسی جزو کا ایک ایسا شخص بھی مالک ہے جس سے اجازت نہیں لی گئی ہے تو وہ عمارت شرعاً مسجد نہیں رہے گی، بلکہ اس کا وہ حصہ اصل مالک کو لوٹانا ضروری ہوگا، برصغیر میں فقہ وفتاوی کے سب سے بڑے مرکز دارالعلوم دیوبند کے مطبوعہ مجموعہ فتاوی میں وہاں کے سابق مفتی مولانا محمد شفیع صاحب کے جو بعد میں پاکستان کے مفتی اعظم کی حیثیت سے معروف ہوئے، ان کے فتوی کا یہاں اقتباس مع سوال کے دیا جارہا ہے، جس سے اس بارے میں کافی روشنی ملتی ہے، سائل نے سوال کیا: "...... نے اپنی خرید کردہ زمین مسجد کے لیے وقف کردی اور اس میں مسجد تیار کرکے چودہ پندرہ سال تک نمازیں پڑھیں، اب ایک شخص کا حق اس مسجد کی زمین میں تخمیناً ڈیڑھ دو ہاتھ تقریباً ڈھائی

---

[۱] صحیح الامام مسلم ص ۳۲ ج ۲ - بن الحجاج متوفی ۲۶۱ھ مع الشرح (مطبوعہ کتب خانہ رشیدیہ دہلی)
[۲] ایضاً ص ۳۳

بلکہ اس سے بھی کم، نکلا اور وہ دعوے دار ہے، لہٰذا وقف کالعدم ہوا یا نہیں"؟

اس سوال کا جواب مفتی صاحب نے حسب ذیل دیا۔

" اس مسئلہ کا جواب یہ ہے کہ ۔ ۔ ۔ ۔ نے جس زمین کو مسجد کے لیے وقف کیا اور مسجد بنایا تھا، اگر فی الواقع اس میں کسی شخص کا حق مشترک نکل آیا تو یہ مسجد نہ رہی بلکہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (واقف) کی ملک کی طرف لوٹ گئی، اور اس کے (مرنے کے بعد اس کے) ورثہ کا حق ہو گیا اور جس قدر زمین اس شخص (مدعی) کے حصہ میں آئی وہ اس کی ہے"۔

اس کے بعد مفتی صاحب موصوف نے اپنے اس فتویٰ کی تائید میں فتاویٰ عالمگیری[1] کی ایک عبارت نقل کی ہے جس میں صورت مسؤلہ کا بعینہٖ یہی حکم شرعی بتایا گیا ہے، جو مفتی صاحب نے لکھا ہے۔

واضح رہے کہ فتاویٰ عالمگیری وہی ہے، جسے اورنگ زیبؒ عالمگیر نے زرِ کثیر صرف کرکے اپنے وقت کے ممتاز ترین علماء و فقہاء سے اپنی نگرانی میں مجموعہ قوانین شریعت مرتب کرایا تھا، تاکہ وہ ہندوستان کا مذہبی آئین اور دستور رہے، چنانچہ بعد میں ایسا ہی ہوا بھی، ظاہر ہے کہ اگر اس زمانہ میں یا اس کے بعد اورنگ زیبؒ یا کسی اور ذمہ دار کو یہ معلوم ہوتا کہ فلاں مسجد کی تعمیر ایسی جگہ ہوئی ہے جس کی اس کے مالک سے اجازت نہیں لی گئی تھی، اور بیع یا دوسرے کسی شرعی طریقہ سے بھی حاصل نہیں کی گئی تھی تو یقیناً اس جگہ اول تو مسجد تعمیر ہی نہ کرنے دی جاتی، اور اگر تعمیر ہو جانے کے بعد پتہ چلتا تو چونکہ اسے شرعاً مسجد کی حیثیت حاصل ہی نہیں ہوئی، اس لئے وہ مسجد برقرار نہیں رکھی

---

[1] فتاویٰ دار العلوم ص ۵۲۳ جلد پنجم و ششم (مطبوعہ کتب خانہ امدادیہ دیوبند) میں عالمگیری بحوالہ بالا عبارت یہ ہے:- ۔ ۔ ۔ ۔ فقد جعل المسجد جزأ شائعًا فیبطل کما لو جعل ارضہ مسجدًا ثم استحق شقص شائعًا یعود الباقی الی ملکہ۔ (عالمگیری۔ مصری مطبوعہ ج ۲ ص ۳۵۶) منقول از فتاویٰ دار العلوم لیکن ہمارے سامنے عالمگیری کا جو نسخہ ہے، (الطبعۃ الثانیۃ بالمطبعۃ الکبری الامیریہ بولاق) اس میں یہ عبارت ج ۲ ص ۳۵۶ پر ہے۔

جا سکتی تھی، بلکہ مالک کو زمین لوٹا دی جاتی لیکن ان میں سے کچھ نہیں ہوا، یا کم سے کم اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، تو یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ عالمگیر یا اس سے پہلے کسی بادشاہ یا کسی عام فرد یا رئیس نے کسی ایسی جگہ پر کوئی مسجد نہیں بنوائی، جو دوسرے کی ملکیت میں ہو، اور مالک سے بخوشی نہ لی گئی ہو، خواہ بالعوض یا بلاعوض، اگر بالفرض حکام و رؤسا ایسی کسی غلط حرکت کا ارتکاب کر بیٹھتے تو وہ علماء بھی خاموش نہ رہتے، جنھوں نے اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈال کر اور قید و سلاسل کا خطرہ مول لیکر بھی کلمۂ حق سربراہانِ حکومت کے سامنے برملا کہا، مثلاً حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ، جنھوں نے اکبر کی بدعتی، اور جہانگیر کی بے راہ روی سجدۂ تعظیمی پر کھلم کھلا تنقید کی اور اس کی پاداش میں انھیں سال بھر گوالیار کے قلعہ میں مقید رہنا پڑا[1] تو ان سے نیز ان جیسے دیگر ربانی علماء سے یہ بعید ہے کہ وہ مغصوبہ زمینوں پر مسجدیں تعمیر ہوتے دیکھتے رہے ہوں اور کچھ نہ کہا ہو۔ اور یہ بات اس سے بھی زیادہ بعید از قیاس ہے کہ علماء نے کسی مسجد کے مسجد نہ ہونے کا فتویٰ دیا ہو اور یہ بتا دیا ہو کہ مغصوبہ زمین پر بنی مسجد میں نماز پڑھنا گنہگار بناتا ہے، مگر پھر بھی عوام نے ان کی بات نہ مانی ہو؟ جب کہ تاریخ شاہد ہے کہ مسلم عوام پر بالخصوص غیر منقسم ہندوستان میں ہمیشہ علماء کی گرفت رہی ہے، خصوصاً مذہبی معاملات میں عوام نے ہمیشہ بادشاہوں اور حکمرانوں کے مقابلہ میں بھی علماء کی بات مانی ہے، اس صورت حال کے باوجود ان مسجدوں کا مسجد کی حیثیت سے باقی رہنا، جن کے بارے میں آج انگریزوں کی پھیلائی ہوئی منصوبہ بند غلط خبروں کی بنا پر یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ مندر کی جگہ بنائی گئی ہیں، یہ ثابت کرنے کے لیے بالکل کافی ہے کہ یہ قطعاً غلط ہے کہ فلاں فلاں مسجدیں مندروں کی جگہ یا مغصوبہ زمین پر بنائی گئی ہیں، اس بے بنیاد دعوے

---

[1] تفصیل کیلئے دیکھئے "تاریخ دعوت و عزیمت" جلد چہارم ص [illegible] از مولانا ابو الحسن علی ندوی مدظلہ، مطبوعہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ۔ (پہلا ایڈیشن)

خلاف تو بہت سے دلائل و قرائن ہیں، مگر اس کے حق میں ایک بھی مضبوط دلیل یا قرینہ نہیں، یہاں اس کی وضاحت ضروری تو نہیں معلوم ہوتی کہ کسی چیز یا جگہ پر کسی کا حق اسی وقت ثابت ہوتا یا ہو سکتا ہے، جب مدعی کے پاس مضبوط دلیل ہو، اس کے بغیر محض دعوے سے نہ کوئی حق ثابت ہوتا ہے، اور نہ اس کی بنیاد پر کوئی ثابت شدہ حقیقت بدلتی ہے، اور یہ ایسا تسلیم شدہ اصول ہے، جسے سب ہی مانتے اور برتتے ہیں، آج کل کی عدالتیں بھی اور شریعت اسلامی کے ماہرین بھی۔

یہاں یہ بتانا بھی شاید بے محل نہ ہوگا کہ مسجد بنانے اور وقف کرنے وغیرہ کے معاملات میں قانون شریعت کا تقاضا بہت زیادہ احتیاط برتنے کا ہے، جس کا کچھ اندازہ ذیل کے فتوے سے ہوگا، جو ماضی قریب کے سب سے ممتاز صاحب ارشاد و افتاء، عالم حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، یہ فتویٰ موصوف کے مطبوعہ مجموعہ فتاویٰ میں شامل ہے، تفصیل ملاحظہ ہو :-

سوال :- اس ملک میں مالک زمین ہندو ہیں، اور قابض مسلمان ہے، مگر مسلمان ایسا قابض ہے کہ ہندو اسے بے دخل نہیں کر سکتا، قانون انگریزی کے ذریعہ سے مسلمان کو اختیار تام ہے، وہ اس زمین میں مکان، قبرستان، مسجد سب بنا سکتا ہے، . . . .
. . . . اب (سوال یہ ہے کہ) مسلمان اس مذکورہ زمین کو قبرستان وغیرہ کے واسطے وقف کر سکتا ہے، یا نہیں، شریعت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی" ؟

اس کا جواب حکیم الامتؒ نے دیا :-

"صحت وقف کی شرائط میں سے واقف کا مالک ہونا بھی ہے، اور یہاں معدوم ہے، لہذا یہ وقف جائز نہیں، اور بلکہ کوئی تصرف و استعمال بھی بدون مالک کی خوشی کے

درست نہیں۔" انتہیٰ[1]

مقام غور ہے کہ قانون ملکی کی رو سے ایک شخص کو پوری اجازت ہے، کہ وہ کسی زمین میں مکان، مسجد اور ہر چیز بنا سکتا ہے، لیکن قانون شریعت میں اس کی اجازت نہیں تو کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ ملکی قانون کا سہارا لے کر مسجد بنائے۔ اگر ایسا کرے گا تو وہ گناہگار ہوگا، اور وہ عمارت شرعاً مسجد نہ ہوگی۔

ان حقائق کی روشنی میں پھر یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے، کہ کسی مسلمان بادشاہ یا کسی امیر و حکمراں نے کسی ایسی زمین پر مسجد بنائی ہوگی، جو شرعاً اس کی ملکیت میں نہ ہو۔ !؟ اس بنا پر بلا تأمل کہا جا سکتا ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہوا، آج جو یہ کہا جا رہا ہے، کہ فلاں مسجد، مندر کی جگہ بنی ہے، محض غلط پروپگنڈا بلکہ الزام تراشی ہے، جس پر کوئی سنجیدہ، اور منصف شخص یقین نہیں کر سکتا۔

---

[1] امداد الفتاویٰ۔ ج ۲ ص ۶۱۳ - ۶۱۴ از حضرت تھانویؒ۔ (شائع کردہ مکتبہ اشرف العلوم۔ کراچی سن ۱۳۷۸ھ)

سیرت عائشہؓ اور مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ

از محمد عارف اعظمی، عمری دارالمصنفین

مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم برصغیر کے ممتاز اور معروف عالم تھے، رسالہ (برہان) اور مولانا دراصل ایک ہی اسم کے دو مسمّٰی خیال کئے جاتے ہیں، ان کو مولانا سید سلیمان ندویؒ سے خاص عقیدت تھی، اور وہ ان کے علم و فضل کے بڑے مداح و معترف بھی تھے، سید صاحبؒ کے انتقال کے بعد معارف کا "سلیمان نمبر" شائع ہوا تو اس میں مولانا سعید احمد صاحب کا بھی ایک مبسوط مقالہ شامل تھا، جس سے سید صاحبؒ سے ان کے غیر معمولی تعلق اور عقیدت و محبت کا پتہ چلتا ہے۔

سنہ ۱۹۸۴ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی طرف سے سید صاحبؒ پر ایک سیمینار ہوا تھا جس میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے بھی شرکت کی تھی، اور "سید سلیمان ندویؒ اور فن سوانح نگاری" کے عنوان سے ایک مقالہ بھی پڑھا تھا جس میں سید صاحبؒ کی گراں قدر سوانحی تصنیفات کا تعارف کرایا ہے، اس سلسلہ میں انھوں نے سید صاحبؒ کی مشہور تصنیف "سیرت عائشہؓ" پر بھی بحث و گفتگو کی ہے، اور اس کو "علامہ کی معرکۃ الآرا تصنیف" (مجموعۂ مقالات سیمینار ص ۹۵) قرار دیا ہے، ان کے نزدیک اس میں "بعض بڑی اہم بحثیں آگئی ہیں، جو حضرت عائشہؓ کی غیر معمولی شخصیت کی حیات کے بعض نازک اور اہم ادوار سے تعلق رکھتی ہیں" (ص ۹۵) انھوں نے اس کتاب کے بارہ میں علامہ اقبال کی اس رائے کی تائید بھی کی ہے، کہ "سیرت عائشہؓ ہدیۂ سلیمانی نہیں، بلکہ سرمۂ سلیمانی ہے، جو اہل بصیرت و بصارت کی نگاہوں کو مدتوں روشنی دیتا رہیگا" (ص ۹۶)

اس غیر معمولی تحسین کے ساتھ ہی انھوں نے سیرت عائشہؓ کی بعض باتوں کی طرف توجہ بھی دلائی ہے، مولانا سعید احمد اکبرآبادی ایک بہت ممتاز اور وسیع النظر عالم تھے، ان کے خیالات پر بحث و گفتگو کرنا اسی درجہ کے بلند پایہ عالم اور ممتاز اہل قلم کا کام تھا، لیکن دارالمصنفین سے وابستہ ہونے کی وجہ سے یہ حقیر راقم اس سلسلہ میں کچھ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہے۔

خلیفۂ ثالث حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد امت مسلمہ زبردست بحران کا شکار ہو گئی تھی، حضرت علیؓ انتشار سے بچنے کے لیے قاتلین عثمانؓ کو چھیڑنا نہیں چاہتے تھے، جبکہ بنو امیہ اس کے لئے شدت سے مصر تھے کہ سب سے پہلے ان ہی سے نپٹا جائے، عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ حضرت عائشہؓ بھی بنو امیہ کی ہمنوا تھیں اور وہ قاتلین عثمانؓ سے قصاص لینے ہی کے لیے آگے بڑھی تھیں لیکن سید صاحبؒ کو اس عام خیال سے اتفاق نہیں ہے، بلکہ وہ حضرت عائشہؓ کے جرأت مندانہ اقدام کا مقصد "اصلاح بین الناس" بتلاتے ہیں، یہ توجیہ بالکل درست اور واقعہ کے عین مطابق ہے، کیونکہ اگر حضرت عائشہؓ کا مقصد بھی بنو امیہ کی طرح حضرت عثمانؓ کے قاتلین سے قصاص لینا ہوتا تو وہ بصرہ نہ جاتیں بلکہ شام کا رخ کرتیں جو بنو امیہ کا مرکز تھا، اور وہاں ان کے ہمنواؤں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، حقیقت یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ نے کسی بھی موقع پر بنو امیہ کا ساتھ نہیں دیا، اس موقع پر بھی مکہ معظمہ سے چھ ہزار آدمیوں کی فوج، کئی لاکھ درہم اور سواری کے لیے بڑی تعداد میں اونٹ فراہم کرنے کے بعد انھوں نے روانگی کی سمت متعین کرنے کے لئے اپنی قیام گاہ پر اپنے اصحاب سے جو مشورہ کیا اور اس میں خود جو رائے دی اس سے ان کے اصل مقصد کی وضاحت ہوتی ہے، ان کی رائے یہ تھی کہ :۔

"چونکہ سبائی اور عام باغی مدینہ ہی میں ہیں اس لیے ادھر کا رخ کیا جائے۔" (سیرت عائشہؓ صفحہ ۱۱۱)

مگر مشورہ کے بعد بصرہ کی جانب پیش قدمی مناسب سمجھی گئی، اس لیے وہ وہاں تشریف

ہے گئیں، اور جنگ جمل کا واقعہ پیش آیا، اس موقع پر حضرت عائشہؓ کی رائے پر اگر عمل ہوا ہوتا، یعنی اگر وہ بصرہ کے بجائے مدینہ منورہ کا رخ کرتیں تو، واقعہ کی نوعیت اس سے مختلف ہوتی جیسا کہ سید صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

"غالباً اگر ایسا ہوتا تو عجب نہیں کہ واقعہ کی صورت دوسری ہوتی، (سیرت عائشہؓ ص ۱۱۵)

بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ معظمہ سے صحیح سمت متعین نہ ہونے کی وجہ سے یہ نوبت پیش آئی، اور حضرت عائشہؓ کو اپنے اقدام پر افسوس ہوا، ظاہر ہے یہ افسوس "دعوت اصلاح" پر نہ تھا، بلکہ اس کے لئے اختیار کئے گئے طریقہ پر تھا، جس کو وہ اپنی اجتہادی غلطی سمجھتی تھیں اور اس پر عمر بھر افسوس کرتی رہیں،

سید صاحبؒ کی اس تحقیق پر کہ :۔

"حضرت عائشہؓ کو اپنی اس اجتہادی غلطی پر کہ اصلاح کا جو طریقہ انھوں نے اختیار کیا تھا وہ کہاں تک مناسب تھا، ان کو عمر بھر افسوس رہا" (سیرت عائشہؓ ص ۱۴۳)

تبصرہ کرتے ہوئے مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم لکھتے ہیں :۔

"حضرت ندوی حضرت عائشہؓ کے اس عمل کو اجتہادی غلطی تسلیم کرتے ہیں اور ان کے افسوس و تاسف کا حوالہ بھی دیتے ہیں، لیکن اس اجتہادی غلطی اور اس پر تاسف کی تائیدی شہادت ماخذ کی روایات سے نہیں پیش کرتے اور جو روایات پیش بھی کی گئی ہیں، ان سے جنگ میں خونریزی، اصحاب وفا کی شہادت اور قرآن کریم کی آیات کی تلاوت پر رونے کا اظہار ہوتا ہے" (سید سلیمان ندوی اور فن سوانح نگاری، مجموعہ مقالات سید سلیمان ندوی سمینار ص ۹۵)

مولانا اکبرآبادیؒ کا خیال ہے کہ سید صاحبؒ نے حضرت عائشہؓ کی اس اجتہادی غلطی اور اس پر تاسف کی کوئی تائیدی شہادت روایات سے نہیں پیش کی ہے، حالانکہ سید صاحبؒ نے بخاری شریف کی

من سبع ارضین ؎ اسے نہایت سخت عذاب ہوگا جس کا تصور بھی دنیا میں مشکل ہے،

مشہور شارح حدیث محی الدین نووی (متوفی ۶۷۶ھ) نے اس باب کی احادیث کی شرح کرتے ہوئے، جن میں حدیث بالا بھی ہے، ان سے ماخوذ مسائل کا ذکر بایں الفاظ کیا ہے:

وفی هذه الاحادیث تحریم الظلم وتحریم الغصب ویه امکان غصب الارض وتغلیظ عقوبته ؎

ان احادیث سے ظلم اور غصب کے حرام ہونے کا حکم ثابت ہوتا ہے اور اس پر سخت سزا ملنے کا پتہ بھی چلتا ہے۔

ان احکام وہدایات کی وجہ سے علماء اسلام اور ماہرین قانون شریعت نے اپنے فتاوی میں یہاں تک احتیاط برتنے کا فتویٰ دیا ہے کہ اگر کسی جگہ پر بظاہر زمین کے مالک یا مالکین کی اجازت سے مسجد بنی ہو، لیکن بعد میں چاہے جتنی مدت بعد، یہ پتہ چلے کہ اس زمین کے کسی جزو کا ایک ایسا شخص بھی مالک ہے جس سے اجازت نہیں لی گئی ہے تو وہ عمارت شرعاً مسجد نہیں رہے گی، بلکہ اس کا وہ حصہ اس مالک کو لوٹانا ضروری ہوگا، برصغیر میں فقہ و فتاویٰ کے سب سے بڑے مرکز دارالعلوم دیوبند کے مطبوعہ مجموعہ فتاویٰ میں وہاں کے سابق مفتی مولانا محمد شفیع صاحب جو بعد میں پاکستان کے مفتی اعظم کی حیثیت سے معروف ہوئے، ان کے فتویٰ کا یہاں اقتباس مع سوال کے دیا جارہا ہے، جس سے اس بارے میں کافی روشنی ملتی ہے، سائل نے سوال کیا:

"۔۔۔ نے اپنی خرید کردہ زمین مسجد کے لیے وقف کردی اور اس میں مسجد تیار کرکے چودہ پندرہ سال تک نمازیں پڑھیں، اب ایک شخص کا حق اس مسجد کی زمین میں تخمیناً ۹ فٹ درد ہاتھ تقریباً ڈھائی

؎ صحیح الامام مسلم ص ۳۳ ج ۲۔ ابن الحجاج متوفی ۲۶۱ھ مع الشرح (مطبوعہ کتب خانہ رشیدیہ دہلی)

؎ ایضاً ص ۳۲۵۔

بلکہ اس سے بھی کم، نکلا اور وہ دعوے دار ہے، لہذا واقف کا وقف باطل ہوا یا نہیں" ؟

اس سوال کا جواب مفتی تصفیع صاحب نے حسب ذیل دیا ہے۔

"اس مسئلہ کا جواب یہ ہے کہ . . . . . نے جس زمین کو مسجد کے لیے وقف کیا اور مسجد بنایا تھا، اگر فی الواقع اس میں کسی شخص کا حق مشترک نکل آیا تو یہ مسجد نہ رہی بلکہ . . . . . (واقف) کی ملک کی طرف لوٹ گئی، اور اس کے (مرنے کے بعد اس کے) ورثہ کا حق ہو گیا اور جس قدر زمین اس شخص (مدعی) کے حصہ میں آئی وہ اس کی ہے"

اس کے بعد مفتی صاحب موصوف نے اپنے اس فتوی کی تائید میں فتاوی عالمگیری کی[1] ایک عبارت نقل کی ہے جس میں صورت مسئولہ کا بعینہ یہی حکم شرعی بتایا گیا ہے، جو مفتی صاحب نے لکھا ہے

واضح رہے کہ فتاوی عالمگیری وہی ہے، جسے اورنگ زیبؒ عالمگیر نے زر کثیر صرف کر کے اپنے وقت کے ممتاز ترین علماء و فقہاء سے اپنی نگرانی میں مجموعہ قوانین شریعت مرتب کرایا تھا، تاکہ وہ ہندوستان کا مذہبی آئین اور دستور بنے، چنانچہ بعد میں ایسا ہی ہوا بھی، ظاہر ہے کہ اگر اس زمانہ میں یا اس کے بعد اورنگ زیبؒ یا کسی اور ذمہ دار کو یہ معلوم ہوتا کہ فلاں مسجد کی تعمیر ایسی جگہ ہوئی ہے جس کی اس کے مالک سے اجازت نہیں لی گئی تھی، اور بیع یا دوسرے کسی شرعی طریقہ سے بھی حاصل نہیں کی گئی تھی تو یقیناً اس جگہ اول تو مسجد تعمیر ہی نہ کرنے دی جاتی، اور اگر تعمیر ہو جانے کے بعد پتہ چلتا تو چونکہ اسے شرعاً مسجد کی حیثیت حاصل ہی نہیں ہوئی، اس لئے وہ مسجد برقرار نہیں رکھی

ملے فتاوی دار العلوم ص ۳۲۵ جلد پنجم و ششم (مطبوعہ کتب خانہ امدادیہ دیوبند) میں عالمگیری بحوالہ بالا عبارت یہ ہے :- .... فقد جعل المسجد جزأً شائعاً فیبطل کما لو جعل ارضہ مسجداً ثم استحق شقص شائعاً یعود الباقی الی ملکہ۔ (عالمگیری۔ مصری مطبوعہ، ج ۲ ص ۳۵۶) منقول از فتاوی دار العلوم

لیکن ہمارے سامنے عالمگیری کا جو نسخہ ہے، (الطبعۃ الثانیہ بالمطبعۃ الکبری الامیریہ بولاق) اس میں یہ عبارت ج ۲ ص ۴۵۶ پر ہے۔

سکتی تھی، بلکہ مالک کو زمین لوٹا دی جاتی لیکن ان میں سے کچھ نہیں ہوا، یا کم سے کم اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا، تو یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ عالمگیر یا اس سے پہلے کے کسی بادشاہ یا کسی عام فرد نے کسی ایسی جگہ پر کوئی مسجد نہیں بنوائی، جو دوسرے کی ملکیت میں ہو، اور مالک سے دشمنی نہ لی گئی ہو، خواہ بالعوض یا بلا عوض، اگر بالفرض حکام و رؤسا ایسی کسی غلط حرکت کا ارتکاب کر بیٹھتے تو وہ علماء کبھی خاموش نہ رہتے، جنھوں نے اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈال کر اور قید و سلاسل کا خطرہ مول لیکر بھی کلمۂ حق سربراہانِ حکومت کے سامنے برملا کہا، مثلاً حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ، جنھوں نے اکبر کی بیدینی، اور جہانگیر کی بے راہ روی، سجدۂ تعظیمی پر کھلم کھلا تنقید کی، اور اس کی پاداش میں انھیں سال بھر گوالیار کے قلعہ میں مقید رہنا پڑا[1] تو ان سے نیز ان جیسے دیگر ربانی علماء سے یہ بعید ہے کہ وہ مغصوبہ زمینوں پر مسجدیں تعمیر ہوتے دیکھتے رہے ہوں اور کچھ نہ کہا ہو۔ اور یہ بات اس سے بھی زیادہ بعید از قیاس ہے کہ علماء نے کسی مسجد کے مسجد نہ ہونے کا فتویٰ دیا ہو اور یہ بتا دیا ہو کہ مغصوبہ زمین پر بنی مسجد میں نماز پڑھنا گناہ ہے مگر پھر بھی عوام نے ان کی بات نہ مانی ہو؟ جب کہ تاریخ شاہد ہے کہ مسلم عوام پر بالخصوص غیر منقسم ہندوستان میں ہمیشہ علماء کی گرفت رہی ہے، خصوصاً مذہبی معاملات میں عوام نے ہمیشہ بادشاہوں اور حکمرانوں کے مقابلہ میں بھی علماء کی بات مانی ہے، اس صورت حال کے باوجود ان مسجدوں کا مسجد کی حیثیت سے باقی رہنا، جن کے بارے میں آج انگریزوں کی پھیلائی ہوئی منصوبہ بند غلط خبروں کی بنا پر یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ مندر کی جگہ بنائی گئی ہیں، یہ ثابت کرنے کے لیے بالکل کافی ہے کہ یہ قطعاً غلط ہو کہ فلاں فلاں مسجدیں مندروں کی جگہ یا مغصوبہ زمین پر بنائی گئی ہیں، اس بے بنیاد دعوے

---

[1] تفصیل کیلئے دیکھیے "تاریخ دعوت و عزیمت" جلد ۴ ص ۱۶۸ تا ۱۹۲ از مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ۔ مطبوعہ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ۔ (پہلا ایڈیشن)

خلاف تو بہت سے دلائل و قرائن ہیں، مگر اس کے حق میں ایک بھی مضبوط دلیل یا قرینہ نہیں یہاں اس کی وضاحت ضروری تو نہیں معلوم ہوتی کہ کسی چیز یا جگہ پر کسی کا حق اسی وقت ثابت ہوتا یا ہو سکتا ہے، جب مدعی کے پاس مضبوط دلیل ہو، اس کے بغیر محض دعوے سے نہ کوئی حق ثابت ہوتا ہے، اور نہ اس کی بنیاد پر کوئی ثابت شدہ حقیقت بدلتی ہے، اور یہ ایسا تسلیم شدہ اصول ہے، جسے سب ہی مانتے اور برتتے ہیں، آج کل کی عدالتیں بھی اور شریعت اسلامی کے ماہرین بھی۔

یہاں یہ بتانا بھی شاید بے محل نہ ہوگا کہ مسجد بنانے اور وقف کرنے وغیرہ کے معاملات میں قانون شریعت کا تقاضا بہت زیادہ احتیاط برتنے کا ہے، جس کا کچھ اندازہ ذیل کے فتوے سے ہوگا، جو ماضی قریب کے سب سے ممتاز صاحب ارشاد و افتاء عالم حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، یہ فتویٰ موصوف کے مطبوعہ مجموعہ فتاویٰ میں شامل ہے، تفصیل ملاحظہ ہو :-

سوال :- اس ملک میں مالک زمین ہندو ہیں، اور قابض مسلمان ہے، مگر مسلمان ایسا قابض ہے کہ ہندو اسے بے دخل نہیں کر سکتا، قانون انگریزی کے ذریعہ سے مسلمان کو اختیار تام ہے، وہ اس زمین میں مکان، قبرستان، مسجد سب بنا سکتا ہے، . . . .

. . . . اب (سوال یہ ہے کہ) مسلمان اس مذکورہ زمین کو قبرستان وغیرہ کے واسطے وقف کر سکتا ہے، یا نہیں، شریعت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی" ؟

اس کا جواب حکیم الامتؒ نے لکھا :-

"صحت وقف کی شرائط میں سے واقف کا مالک ہونا بھی ہے، اور یہاں معدوم ہے، لہٰذا یہ وقف جائز نہیں، اور بلکہ کوئی تصرف و استعمال بھی بدون مالک کی خوشی کے

درست نہیں۔[1] اھ

مقام غور ہے کہ قانون ملکی کی رو سے ایک شخص کو پوری اجازت ہے، کہ وہ کسی زمین میں مکان، مسجد اور ہر چیز بنا سکتا ہے، لیکن قانون شریعت میں اس کی اجازت نہیں تو کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ ملکی قانون کا سہارا لے کر مسجد بنائے، اگر ایسا کرے گا تو وہ گناہگار ہوگا، اور وہ عمارت شرعاً مسجد نہ ہوگی۔

ان حقائق کی روشنی میں پھر یہ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے، کہ کسی مسلمان بادشاہ یا کسی امیر و حکمراں نے کسی ایسی زمین پر مسجد بنائی ہوگی، جو شرعاً اس کی ملکیت میں نہ ہو۔ یا وہ اس بنا پر بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہوا، آج جو یہ کہا جا رہا ہے، کہ فلاں مسجد، مندر کی جگہ بنی ہے، محض غلط پروپیگنڈا بلکہ الزام تراشی ہے، جس پر کوئی سنجیدہ، اور منصف شخص یقین نہیں کر سکتا۔

---

[1] امداد الفتاوی۔ ج ۲ ص ۶۱۳ - ۶۱۴ از حضرت تھانویؒ۔ (شائع کردہ مکتبہ اشرف العلوم۔ کراچی سنہ ۱۳۷۰ھ)

سیرت عائشہؓ
اور
مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ

از محمد عارف اعظمی عمری دارالمصنفین

مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم برصغیر کے ممتاز اور معروف عالم تھے، رسالہ (برہان) اور مولانا دراصل ایک ہی اسم کے دو مسمّی خیال کئے جاتے ہیں، ان کو مولانا سید سلیمان ندویؒ سے خاص عقیدت تھی، اور وہ ان کے علم و فضل کے بڑے مداح و معترف بھی تھے، سید صاحبؒ کے انتقال کے بعد معارف کا "سلیمان نمبر" شائع ہوا تو اس میں مولانا سعید احمد صاحب کا بھی ایک مبسوط مقالہ شامل تھا جس سے سید صاحبؒ سے ان کے غیر معمولی تعلق اور عقیدت و محبت کا پتہ چلتا ہے

سنہ ۱۹۸۳ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی طرف سے سید صاحبؒ پر ایک سیمینار ہوا تھا جس میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے بھی شرکت کی تھی، اور "سید سلیمان ندویؒ اور فن سوانح نگاری" کے عنوان سے ایک مقالہ بھی پڑھا تھا جس میں سید صاحبؒ کی گراں قدر سوانحی تصنیفات کا تعارف کرایا ہے، اس سلسلہ میں انھوں نے سید صاحبؒ کی مشہور تصنیف "سیرت عائشہؓ" پر بھی بحث و گفتگو کی ہے، اور اس کو "علامہ کی معرکۃ الآرا تصنیف" (مجموعۂ مقالات سیمینار ص ۹۵) قرار دیا ہے، ان کے نزدیک اس میں "بعض بڑی اہم بحثیں آگئی ہیں، جو حضرت عائشہؓ کی غیر معمولی شخصیت کی حیات کے بعض نازک اور اہم ادوار سے تعلق رکھتی ہیں" (ص ۹۵)، انھوں نے اس کتاب کے بارہ میں علامہ اقبال کی اس رائے کی تائید بھی کی ہے، کہ "سیرت عائشہؓ ہدیۂ سلیمانی نہیں، بلکہ سرمۂ سلیمانی ہے جو اہل بصیرت و بصارت کی نگاہوں کو مدتوں روشنی دیتا رہیگا (ص ۹۶)

اس غیر معمولی تحسین کے ساتھ ہی انھوں نے سیرت عائشہؓ کی بعض باتوں کی طرف توجہ بھی دلائی ہے، مولانا سعید احمد اکبرآبادی ایک بہت ممتاز اور وسیع النظر عالم تھے، ان کے خیالات پر بحث و گفتگو کرنا اسی درجہ کے بلند پایہ عالم اور ممتاز اہل قلم کا کام تھا، لیکن دارالمصنفین سے وابستہ ہونے کی وجہ سے یہ حقیر راقم اس سلسلہ میں کچھ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہے۔

خلیفۂ ثالث حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد امت مسلمہ زبردست بحران کا شکار ہو گئی تھی، حضرت علیؓ انتشار سے بچنے کے لیے قاتلین عثمانؓ کو چھیڑنا نہیں چاہتے تھے، جبکہ بنوامیہ اس کے لیے شدت سے مصر تھے کہ سب سے پہلے ان ہی سے نپٹا جائے، عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے، کہ حضرت عائشہؓ بھی بنوامیہ کی ہمنوا تھیں اور وہ قاتلین عثمانؓ سے قصاص لینے ہی کے لیے آگے بڑھی تھیں لیکن سید صاحبؒ کو اس عام خیال سے اتفاق نہیں ہے، بلکہ وہ حضرت عائشہؓ کے جرأت مندانہ اقدام کا مقصد "اصلاح بین الناس" بتلاتے ہیں، یہ توجیہ بالکل درست اور واقعہ کے عین مطابق ہے، کیونکہ اگر حضرت عائشہؓ کا مقصد بھی بنوامیہ کی طرح صرف حضرت عثمانؓ کے قاتلین سے قصاص لینا ہوتا تو وہ بصرہ نہ جاتیں بلکہ شام کا رخ کرتیں جو بنوامیہ کا مرکز تھا، اور وہاں ان کے ہمنواؤں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، حقیقت یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ نے کسی بھی موقع پر بنوامیہ کا ساتھ نہیں دیا، اس موقع پر بھی مکہ معظمہ سے چھ ہزار آدمیوں کی فوج، کئی لاکھ درہم اور سواری کے لیے بڑی تعداد میں اونٹ فراہم کرنے کے بعد انھوں نے روانگی کی سمت متعین کرنے کے لئے اپنی قیام گاہ پر اپنے اصحاب سے جو مشورہ کیا اور اس میں خود جو رائے دی اس سے ان کے اصل مقصد کی وضاحت ہوتی ہے، ان کی رائے یہ تھی کہ :-

"چونکہ سبائی اور عام باغی مدینہ ہی میں ہیں اس لیے ادھر ہی کا رخ کیا جائے۔" (سیرت عائشہؓ صفحہ ۱۱۵)

مگر مشورہ کے بعد بصرہ کی جانب پیش قدمی مناسب سمجھی گئی، اس لیے وہ وہاں تشریف

لے گئیں، اور جنگ جمل کا واقعہ پیش آیا، اس موقع پر حضرت عائشہؓ کی رائے پر اگر عمل ہوا ہوتا، یعنی اگر وہ بصرہ کے بجائے مدینہ منورہ کا رخ کرتیں تو واقعہ کی نوعیت اس سے مختلف ہوتی جیسا کہ سید صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

"غالباً اگر ایسا ہوتا تو عجب نہیں کہ واقعہ کی صورت دوسری ہوتی، (سیرت عائشہؓ ص ۱۱۵) بعد کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ مکہ معظمہ سے صحیح سمت متعین نہ ہونے کی وجہ سے یہ نوبت پیش آئی، اور حضرت عائشہؓ کو اپنے اقدام پر افسوس ہوا، ظاہر ہے یہ افسوس "دعوت اصلاح" پر نہ تھا، بلکہ اس کے لئے اختیار کئے گئے طریقہ پر تھا، جس کو وہ اپنی اجتہادی غلطی سمجھتی تھیں اور اس پر عمر بھر افسوس کرتی رہیں،

سید صاحبؒ کی اس تحقیق پر کہ :۔

"حضرت عائشہؓ کو اپنی اس اجتہادی غلطی پر کہ اصلاح کا جو طریقہ انھوں نے اختیار کیا تھا وہ کہاں تک مناسب تھا، ان کو عمر بھر افسوس رہا" (سیرت عائشہؓ ص ۱۳۴)

تبصرہ کرتے ہوئے مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم لکھتے ہیں :۔

"حضرت ندوی حضرت عائشہؓ کے اس عمل کو اجتہادی غلطی تسلیم کرتے ہیں اور ان کے افسوس و تاسف کا حوالہ بھی دیتے ہیں، لیکن اس اجتہادی غلطی اور اس پر تاسف کی تائیدی شہادت ماخذ کی روایات سے نہیں پیش کرتے اور جو روایات پیش بھی کی گئی ہیں، ان سے جنگ میں خونریزی، اصحاب وفا کی شہادت اور قرآن کریم کی آیات کی تلاوت پر رونے کا اظہار ہوتا ہے" (سید سلیمان ندوی اور فن سوانح نگاری، مجموعہ مقالات سید سلیمان ندوی سمینار ص ۹۵)

مولانا اکبرآبادیؒ کا خیال ہے کہ سید صاحبؒ نے حضرت عائشہؓ کی اس اجتہادی غلطی اور اس پر تاسف کی کوئی تائیدی شہادت روایات سے نہیں پیش کی ہے، حالانکہ سید صاحبؒ نے بخاری شریف کی

اس روایت کا حوالہ دیا ہے، جس میں مذکور ہے کہ "وفات کے وقت انھوں نے وصیت کی کہ مجھے روضۂ نبویؐ میں آپؐ کے ساتھ دفن نہ کرنا بقیع میں اور ازواج کے ساتھ دفن کرنا۔" (سیرت عائشہؓ ص ۱۳۲ بحوالہ بخاری، کتاب الجنائز) اس کی وجہ سید صاحبؒ کے بیان کے مطابق حاکم نے مستدرک میں خود حضرت عائشہؓ کی زبانی یہ بیان کی ہے کہ "میں نے آپؐ کے بعد ایک جرم کیا ہے۔" (سیرت عائشہ ص ۱۳۲ بحوالہ مستدرک حاکم جلد ۴ ص ۶)

آخر وہ کونسا جرم تھا جس کی وجہ سے حضرت عائشہؓ اس قدر پشیماں تھیں کہ انھوں نے یہ وصیت کی کہ وہ حضورؐ کے پہلوئے مبارک میں دفن نہ کی جائیں، جب کہ یہی ان کی عزیز ترین خواہش ہونی چاہیے تھی، غور وتأمل کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کے انتقال کے بعد حضرت عائشہؓ کی زندگی کا یہی سب سے سنگین حادثہ تھا یعنی جنگ جمل میں ان کی شرکت جس میں مسلمان باہم دست گریباں ہوئے، اس لئے وہ اسی کو اپنا ایسا جرم تصور کرتی رہی ہونگی جس کی وجہ سے انھوں نے اپنے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلوئے مبارک کے بجائے مسلمانوں کے عام قبرستان میں دفن کئے جانے کی وصیت فرمائی تھی، اس کے علاوہ سید صاحبؒ نے جو روایات پیش کی ہیں، ان کے بارہ میں مولانا اکبرآبادی مرحوم ارشاد فرماتے ہیں :-

"اور جو روایات پیش بھی کی گئی ہیں، ان سے جنگ میں خونریزی، اصحاب وفا کی شہادت اور قرآن کریم کی آیات کی تلاوت پر رونے کا اظہار ہوتا ہے۔" (ص ۵۵)

یہاں سید صاحبؒ کی پیش کردہ روایات کا جائزہ لینا مناسب ہوگا تاکہ حقیقت حال پوری طرح واضح ہو جائے۔

۱- حضرت سید صاحبؒ نے پہلی روایت یہ نقل کی ہے کہ

"تاریخ طبری میں ہے کہ ایک دفعہ ایک بصری حضرت عائشہؓ کی ملاقات کو آیا،

آپ نے پوچھا کہ تم ہماری لڑائی میں شریک تھے، اس نے کہا، ہاں، پوچھا کہ تم اس کو جانتے ہو جو رجزیہ شعر پڑھتا تھا، یا امنا خیر ام تعلم۔ اس نے کہا وہ میرا بھائی تھا، راوی کہتا ہے، وہ اس کے بعد اس قدر روئیں کہ میں سمجھا کہ پھر کبھی چپ نہ ہوں گی، (سیرت عائشہؓ صفحہ ۱۳۴)

یہ روایت طبری کی ہے، جس کو سید صاحبؒ نے اپنے اس قول کی تائید میں نقل کی ہے، کہ حضرت عائشہؓ کو عمر بھر اس بات پر افسوس رہا کہ انھوں نے اصلاح کا جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ درست نہ تھا لیکن مولانا اکبر آبادی مرحوم اس کو "صرف خونریزی اور اصحاب وفا کی شہادت پر رونے" پر محمول کرتے ہیں، یعنی ان کا خیال یہ ہے کہ جنگ جمل کے شرکا کی شہادت پر حضرت عائشہؓ روتی تھیں، نہ کہ اپنی اجتہادی غلطی پر لیکن شہادت پر رونے کا تو کوئی محل نہیں ہے، بلکہ یہ تو فخر و خوشی کا مقام تھا، کہ کچھ لوگوں نے حق کی حمایت میں اپنی جان دیدی، البتہ اس احساس کے تحت ان کا رونا اور افسوس کرنا بجا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا طریقۂ اصلاح درست نہ تھا جس کی وجہ کر یہ المیہ پیش آیا۔

۲۔ حضرت سید صاحبؒ نے اپنے موقف کی تائید میں دوسری روایت یہ پیش کی ہے۔

" ابن سعد میں ہے کہ جب وہ آیت پڑھتی تھیں۔ وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ (اے پیغمبر کی بیویو، اپنے گھروں میں ٹھہری رہو) تو اس قدر روتی تھیں کہ روتے روتے آنچل تر ہو جاتا تھا۔

(سیرت عائشہؓ صفحہ ۱۳۴ - ۱۳۵)

مولانا اکبر آبادیؒ اس روایت کو صرف "قرآن کریم کی آیات کی تلاوت پر رونے" پر محمول فرماتے ہیں، جب کہ یہ آیت عذاب و عقاب کے ذکر میں وارد نہیں ہے، بلکہ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کو یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ وہ اپنے گھروں میں ٹھہری رہیں، اس آیت کو پڑھ کر حضرت عائشہؓ کا اس قدر رونا اور تاسف کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان سے اس حکم کی خلاف ورزی ہو گئی تھی کہ وہ اپنے گھر سے نکلیں، بصرہ کا رخ کیا، لوگوں کو اصلاح کی دعوت دی اور پھر جنگ ہوئی جس میں وہ

نع تھا، جب کہ ان سے اس حکم کی خلاف ورزی ہو گئی تھی۔

مولانا نے یہ بھی فرمایا ہے، کہ "سید صاحبؒ اس اجتہادی غلطی اور اس پر تأسف کی تائیدی شہادت خود کی روایات سے نہیں پیش کرتے۔" (ص ۹۵)

بخاری شریف کی یہ روایت ہے۔

عن ھشام عن ابیہ عن عائشۃ	ہشام بواسطہ اپنے والد حضرت عائشہؓ
انھا اوصت عبد اللہ بن	سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے عبداللہ
الزبیر لا تدفنی معھم	ابن زبیرؓ کو یہ وصیت کی کہ مجھے ان لوگوں
ادفنی مع صواحبی بالبقیع	(حضورؐ و ابوبکرؓ و عمرؓ) کے ساتھ دفن نہ
لا ازکی بہ ابدا۔	کرنا، میری سوکنوں کے ساتھ دفن کرنا،
(بخاری۔ کتاب الجنائز)	میں اس کے سبب سے پاک نہیں کی جاؤں گی۔

اس روایت کو سامنے رکھ کر سید صاحبؒ نے اس کا یہ ٹکڑا نقل کیا ہے،

"بخاری میں ہے کہ وفات کے وقت انھوں نے وصیت کی کہ مجھے روضۂ نبویؐ میں آپؐ کے ساتھ دفن نہ کرنا، بقیع میں اور ازواج کے ساتھ دفن کرنا۔" (سیرت عائشہؓ۔ ص ۱۴۳ بحوالہ بخاری کتاب الجنائز)

اس کے علاوہ سید صاحبؒ نے مستدرک کے حوالہ سے اس کا ایک ٹکڑا یہ نقل کیا ہے، کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ "میں نے آپؐ کے بعد ایک جرم کیا ہے۔" (سیرت عائشہؓ ص ۱۴۳ بحوالہ مستدرک حاکم)

مستدرک میں پوری روایت یوں ہے۔

عن قیس بن ابی الحازم	قیس بن ابی حازم سے مروی ہے، کہ
قال قالت عائشۃ وکانت تحدث	حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میرا جی
نفسھا ان تدفن فی بیتھا	چاہتا تھا کہ میں رسول اللہؐ اور ابوبکرؓ

مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	کے ساتھ اپنے ہی گھر میں دفن کی جاؤں
وانی بکت فقالت انی احدثت	مگر انھوں نے (وفات کے وقت) یہ
بعد رسول اللہ احداثا ادفنونی مع ازواجہ	وصیت کی کہ مجھ سے حضور کے بعد ایک جرم سرزد
فدفنت بالبقیع (مستدرک حاکم ج ۴ ص ۶)	ہو گیا ہے اسلئے مجھکو حضور کی دیگر ازواج کے ساتھ دفن

(ترجمہ: ... مستدرک حاکم ج ۴)

حاکم نے اس روایت کے متعلق لکھا ہے کہ یہ حدیث امام بخاری و امام مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح ہے، لیکن ان دونوں حضرات نے اسکو صحیحین میں درج نہیں فرمایا ہے۔

سید صاحبؒ نے ان کے علاوہ طبقات ابن سعد سے بھی بعض روایتیں نقل کی ہیں، ان میں سے ایک کا ذکر پہلے آچکا ہے اور دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ فرمایا کرتی تھیں کہ "اے کاش میں درخت ہوتی، اے کاش میں پتھر ہوتی، اے کاش میں روڑا ہوتی، اے کاش میں نیست و نابود ہوتی"۔ (سیرت عائشہؓ صفحہ ۱۳۲ بحوالہ طبقات ابن سعد جزو نساء)

ان روایتوں سے ظاہر ہے کہ سید صاحبؒ نے جو کچھ لکھا ہے، وہ مستند حوالوں سے لکھا ہے۔ مولانا اکبر آبادی مرحوم کا ایک خیال یہ بھی ہے کہ:

"مزید برآں علامہ ندوی کا یہ نظریہ کہ وہ اصلاح بین الناس اور اختلاف امت کو دور کرنے کے لیے نکلی تھیں شکست ہو جاتا ہے، اگر سید ندوی کا یہ مزعومہ قبول کر لیا جائے کہ اس عوامی زندگی کے اہتمام بالشان معاملہ پر انھیں قطعی کوئی تأسف نہ تھا۔" (مجموعۂ مقالات ص ۵۵)

اس سے پہلے یہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ حضرت عائشہؓ کو دعوت اصلاح پر قطعی کوئی تأسف نہ تھا، بلکہ وہ صرف اس طریقۂ اصلاح کو اپنی اجتہادی غلطی سمجھتی تھیں جو انھوں نے اس دعوت کیلئے اختیار کیا تھا، اسی وجہ کر سید صاحبؒ لکھتے ہیں "حضرت عائشہ کو اپنی اس اجتہادی غلطی پر... عمر بھر افسوس رہا۔" (سیرت عائشہ ص ۱۳۲)

مگر مولانا اکبر آبادی مرحوم نے اصلاح اور طریقۂ اصلاح کے اس فرق کو نظر انداز کر دیا جو سید صاحبؒ نے تحریر فرمایا تھا، اس لیے انھیں یہ اشتباہ ہو گیا۔

مطبوعات جدیدہ

مشکلات الاحادیث النبویہ:۔ مرتبہ عبد اللہ بن علی النجدی القصیمی، تقطیع متوسط، کاغذ و طباعت عمدہ، صفحات ۲۱۲، قیمت درج نہیں، پتہ المجلس العلمی السلفی شیش محل روڈ لاہور پاکستان۔

اس عربی کتاب میں ان مشکل احادیث کی شرح و توضیح کی گئی ہے، جن کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ قرآن مجید اور دین کے اصول و مقاصد کے مطابق نہیں ہیں، اور عقل نیز موجودہ علمی، طبی، جغرافیائی اور فلکیاتی تحقیقات کے خلاف ہیں، فاضل مصنف نے پہلے اصل ماخذ سے حدیثیں نقل کرکے ان کی صحت و قوت بتائی ہے، پھر ان کے بارہ میں معترضین اور منکرین حدیث کے شکوک و شبہات نمبروار تحریر کرکے ان کا جواب دیا ہے، مصنف نے بعض ایسی حدیثوں کا صحیح مفہوم و مطلب بھی بیان کیا ہے، جن کو بعض گمراہ فرقے اور اہل بدعت اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں، اور ان کے غلط معنی بیان کرتے ہیں، اس کتاب میں مختلف احادیث پر بحث و گفتگو کی گئی ہے، جن میں عذاب قبر، معجزۂ شق القمر، یہودی کے آپ کو سحر کرنے، دجال، حضرت آدمؑ و موسٰیؑ کا محاجہ، ملک الموت کو حضرت موسٰیؑ کے طمانچہ مارنے، حضرت ابراہیمؑ کے تین دفعہ جھوٹ کہنے، قرآن مجید کی منسوخ التلاوت آیتوں کے احکام کے باقی ہونے، معراج اور مُردوں سے آپؐ کے خطاب کرنے وغیرہ کی حدیثیں زیادہ اہم اور نازک ہیں، یہ کتاب نیک جذبہ اور منکرین حدیث کے اشکالات کو رفع کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، اس لحاظ سے قابل قدر ہے، لیکن مصنف کے بعض جوابات تشفی بخش نہیں ہیں، خصوصاً منسوخ التلاوت آیتوں کے حکم کے باقی رہنے، اور حضرت ابراہیمؑ کے تین بار جھوٹ بولنے وغیرہ کی روایات کی جو توجیہ

کی گئی ہے، اس سے بعض اصحاب علم و نظر اور محققین نے بھی اتفاق نہیں کیا ہے۔

اسلام اور بدلتی دنیا: از جناب ضیاء الحسن فاروقی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۰۰، مجلد، قیمت ۱۲۰ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

ملک کے مشہور مصنف و دانشور ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم نے ۱۹۶۲ء میں "اسلام اینڈ دی موڈرن ایج سوسائٹی" قائم کر کے اس کی طرف سے انگریزی اور اردو میں "اسلام اور عصر جدید" کے نام سے سہ ماہی علمی رسالے نکالے تھے، ان میں بلند پایہ علمی مضامین کے ساتھ ہی مسلمانوں اور دنیائے اسلام کے موجودہ حالات و مسائل پر بھی اظہار خیال کیا جاتا ہے، ڈاکٹر صاحب کی وفات کے بعد جامعہ ملیہ کے مشہور صاحبِ قلم جناب ضیاء الحسن فاروقی کو دونوں رسالوں کی ادارت سپرد کی گئی اور وہ ابتک اسے خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں، گذشتہ چند برسوں میں اردو رسالہ میں ان کے قلم سے جو اداریے شائع ہوئے تھے، زیر نظر کتاب ان کا مجموعہ ہے، ان میں عالم اسلام کے واقعات اور مسلمانوں کو درپیش دینی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور اخلاقی مسائل کے نتائج و عواقب کا جائزہ لیا گیا ہے، اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں عقل و تدبر سے کام لیکر ان کو حل کرنے کی دعوت دی گئی ہے، مجموعہ کی ابتدا جامعہ ملیہ کے معمار اور اسلام اینڈ دی موڈرن ایج سوسائٹی کے بانی ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم کے ذکر خیر سے ہوئی ہے، اس میں جامعہ، اردو زبان اور ملک و ملت کی تعمیر و ترقی کے لئے ان کی مساعی جمیلہ کا تذکرہ کیا ہے، اور اسی ضمن میں ان کی ان کوششوں کا جائزہ بھی لیا ہے جو ۱۹۴۷ء کے بعد مسلمانوں کے ذہنی جمود و افسردگی اور ملک کے بحران کو دور کرنے کیلئے انھوں نے کی تھیں، اسلام اینڈ دی موڈرن ایج سوسائٹی کا قیام بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اس کے اور اس کے سہ ماہی رسالوں کے مقاصد و خدمات تفصیل سے قلمبند کئے ہیں، اسی نوعیت کے ایک مضمون میں جماعت اسلامی کے بانی مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کے علمی، فکری اور دعوتی

کارناموں کا جائزہ لے کر ان کے مفید پہلوؤں اور دوررس اثرات کا ذکر کیا ہے، مگر آخر میں ان کے بعض فکری و دینی خیالات کی کوتاہیوں کی نشاندہی بھی کی ہے، ایک مضمون میں دکھایا ہے کہ اسوقت دنیائے اسلام کے بعض ملکوں میں اسلامی بیداری کے آثار اور اسلام کو مضبوط و مستحکم کرنے کی خواہش تو نمایاں ہے، مگر ان میں معاشرتی و معاشی اصلاح اور سچی اسلامی زندگی کے قیام کے بنیادی کام کو نظرانداز کر کے سیاسی طاقت اور حکومتی اقتدار حاصل کر کے اسلامی قوانین کو نافذ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، اسی غفلت و کوتاہی کا ذکر "اصلاح و تجدد کے حامی اور ان کی الجھنیں" میں بھی کیا ہے، اس میں جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ، سرسید اور اقبال کی اصلاحی و مذہبی کوششوں کی خوبیاں اور خامیاں بھی زیر بحث آگئی ہیں، مصنف کے خیال میں اس وقت مسلم معاشرہ قدیم و جدید کی کشمکش کی وجہ سے ذہنی و فکری انتشار میں مبتلا ہے، اس لئے موثر و معقول تجدد پسندی معدوم ہو گئی ہے، اور کتاب و سنت کا نام لینے کے باوجود مغربیت چھائی جا رہی ہے۔ ایک مضمون پندرہویں صدی ہجری کی مناسبت سے لکھا گیا ہے، اس میں چودہویں صدی کا جائزہ لیکر اسلام اور مسلمانوں کی شکست و ریخت کے یہ افسوسناک واقعات زیر بحث آئے ہیں، مغرب کی سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی بالادستی اور اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کے بوسیدہ اور محدود مادی وسائل، مسلمانوں اور ان کے ملکوں کی مغرب کی محکومی، اسلامی تعلیمات کو مشنریوں اور مستشرقین کا مسخ کرنا، مغربی تہذیب کے تضاد اور پسپائی کے باوجود سائنس اور ٹکنالوجی میں اس کی برتری، اسرائیل کا قیام، اسلامی ملکوں میں پٹرول کے ذخیرہ کا انکشاف مگر دولت کی فراوانی کا عذاب بن جانا، افغانستان میں روسی فوجوں کا داخلہ وغیرہ، مضمون کا خاتمہ اس عزم و حوصلہ کی دعوت پر کیا ہے کہ چودہویں صدی ہجری کے رہنماؤں کی شاندار فکری و عملی کوششوں کی وجہ سے اسلامی بیداری کی جو لہر وجود میں آئی ہے، اس کو ضائع کرنے کے بجائے اس کی بنیاد پر اپنی اور نوع انسانی کی اصلاح کے اولوالعزمانہ

دھوم سے پندرہویں صدی ہجری کا استقبال کیا جائے، مولانا نقوی کے اسلام اور مستشرقین پر ہونے والے
سیمینار اور جمہوریہ ترکی میں بین الاقوامی قرآن کانگریس پر بھی مفید مضامین ہیں، اسلام اور مغرب اور اسلامی
فنڈامنٹلزم، مسلمانوں کی اخلاقی حالت پر [illegible] اور سوڈان کا موجودہ منظرنامہ بھی مفید
اور معلومات سے پُر مضامین ہیں، ایک اداریہ میں سیکولرازم کے بارے میں مسلم معاشرہ کے رد عمل،
اسلامی دنیا میں اس کے نفوذ، مسلمانوں پر اس کے اثرات اور اس سے پیدا ہونے والی کشمکش اور
بے چینی دکھائی ہے، آخری مضمون میں یتیم پوتے کے حق وراثت کے بارے میں موجودہ علما کے
دو مختلف نظریوں کا ذکر کرکے بعض مفید باتوں کی جانب توجہ دلائی ہے اور علماء و مفکرین کو اس کی
دعوت دی ہے کہ اس کا کوئی متفقہ اور معقول حل تلاش کریں، لائق مصنف کی نظر حالات
کی نزاکتوں اور دین کے تقاضوں پر یکساں ہے، ان کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کا درد
اور یہ نیک جذبہ بھی ہے کہ موجودہ مسابقت میں مسلمان کسی سے پیچھے نہ رہیں، اس لیے انھوں نے
جام شریعت اور سندان عشق دونوں کا حق ادا کیا ہے، ان مضامین میں فکری گہرائی، اور
اصلاحی و عملی دعوت کے علاوہ مصنف کا سوز و ساز اور درد و داغ و جستجو و آرزو بھی شامل
ہے، ان کے یہ سنجیدہ و متوازن خیالات غور و فکر کے مستحق ہیں،

جامعہ مجیب نمبر :- مرتبہ جناب ضیاء الحسن فاروقی، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت
عمدہ، صفحات ۴۴۴، قیمت ۳۵ روپیے، سالانہ چندہ ۱۰ روپیے، پتہ جامعہ ملیہ اسلامیہ
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے تین معماروں میں ایک پروفیسر محمد مجیب مرحوم بھی تھے، جو
تقریباً نصف صدی تک اس سے وابستہ رہے، اور ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے علی گڑھ منتقل
ہونے کے بعد وہ شیخ الجامعہ مقرر کیے گئے، انہی کے دور میں جامعہ کو یونیورسٹی کا درجہ ملا،

مجیب صاحب شرفائے اودھ کے ایک ممتاز خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اور خود بھی بڑے لائق و فاضل تھے، اس لئے انھوں نے علم و ادب کی بھی مفید خدمت انجام دی ہے، اور جامعہ کی تعمیر و ترقی اور توسیع میں بھی ان کا بہت نمایاں اور شاندار حصہ رہا ہے، اب ماہنامہ جامعہ نے ان کی یادگار میں یہ خاص نمبر شائع کیا ہے، جو ان کے گوناگوں کمالات و کارناموں کا مرقع اور متنوع مضامین کا اچھا مجموعہ ہے، شروع کا حصہ مختلف موقعوں کی مجیب صاحب کی تصویروں سے مزین ہے، اس کے بعد ان کی شخصیت، سیرت اور کمالات کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل مضامین درج ہیں، یہ سب مضامین ان لوگوں کے قلم سے ہیں، جن کو برسوں مجیب صاحب کے ساتھ رہنے سہنے اور کام کرنے کا موقع ملا یا جن کو ان سے فخر تلمذ حاصل تھا، یہ مضامین مختلف نوعیت کے ہیں، پہلا مضمون مجیب صاحب کے خود نوشت حالات پر مشتمل ہے، دوسرے مضامین میں ان کے حالات زندگی، اخلاق و سیرت کے جلوے، شخصیت و مزاج کے خط و خال اور دوسری خوبیاں اور خصوصیات نمایاں کی گئی ہیں، بعض مضامین میں ان کی تصنیفات و نگارشات پر بحث و تبصرہ کیا گیا ہے، ان میں ان کے فنی کمالات، افکار و خیالات اور اسلوب و طرز نگارش کی خصوصیات دکھائی گئی ہیں، دوسرا حصہ خود مجیب صاحب کی تحریروں اور مضامین پر مشتمل ہے، اہم ہے، ان سے بھی مجیب صاحب کی زندگی، اور طریقہ غور و فکر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے، یہ نمبر اہتمام اور سلیقہ سے مرتب کیا گیا ہے جو اچھے اور معیاری مضامین پر مشتمل ہونے اور مجیب صاحب کی زندگی اور انکے علمی، علمی و تعلیمی خدمات اور کارناموں کا مرقع ہونے کی وجہ سے مطالعہ کے قابل ہے،

انجمن اسلام کے سو سال :- مرتبہ جناب سید شہاب الدین دسنوی صاحب تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۳۲، قیمت ۲۵ روپیہ۔ پتہ۔ انجمن اسلام، بدرالدین طیب جی مارگ، دادا بھائی نوروجی روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۱ -

انجمن اسلام ہائی اسکول ... مجبور اور تعلیم ... [illegible]

استقلال سے مسلمانوں کی ترقی و بہبودی کی نمایاں خدمات انجام [illegible]

کو سو برس ہو گئے، اس مناسبت سے اس کے صد سالہ جشن [illegible] اور اس کی

پُرعظمت تاریخ مرتب کئے جانے کی ضرورت محسوس کی گئی [illegible] صدی کمیٹی کی نظر

انتخاب جناب سید شہاب الدین پر پڑی، جو ہر اعتبار سے اس کے اہل تھے، وہ تقریباً نصف

صدی تک مختلف حیثیتوں سے انجمن سے وابستہ رہے اور انھیں اس طرح کے کاموں کو ا

دینے کا خاص تجربہ اور بڑی مہارت ہے، اس بنا پر انھوں نے یہ تاریخ بڑی محنت اور سلیقہ

دو حصوں میں مرتب کی ہے، پہلے حصہ میں انجمن کے گذشتہ پانچ دور کی سرگرمیوں اور کارگذا

کی مکمل تفصیل قلمبند کی گئی ہے، اور دوسرے حصہ میں اس کے وسیع اور اہم کاموں کا جائزہ لیا

ان پر حسب ضرورت مناسب انداز میں اظہار خیال کیا ہے، پہلے حصہ میں انجمن اسلام کا پس م

اس کی تشکیل، مقاصد، انجمن اسلام ہائی اسکول کے قیام اور ثقافتی و سماجی سرگرمیوں کی

تحریک ہے، اس کے بعد ہر دور میں اس کے کاموں میں جو وسعت و ترقی ہوئی، اور مختلف شعبے

اور اسکول قائم ہوئے، جو سماجی اصلاحی اور تعمیری کام انجام پائے، دستور و مقاصد میں جو ترم

ہوا، اور جو لوگ انجمن کے کاموں میں پیش پیش رہے، ان سب کا تذکرہ ہے، دوسرے حصہ

اور اس کی گوناگوں تعلیمی، ادبی، لسانی، دینی، ملی اور فلاحی اسکیموں کا جائزہ لیا ہے، جن میں تعلی

نسواں اور دینی تعلیم کے فروغ، ابتدائی و ثانوی سطح پر جدید تعلیم کے رواج، اردو زبان کی

ترقی اور اوقاف کی اصلاح وغیرہ کا ذکر ہے، اس کے بعد انجمن کی اہم تقریبات کی داستان

اور اس کے ممتاز معماروں کا حال بیان کیا ہے، آخر میں کئی ضمیمے ہیں، جن میں انجمن کے قواعد و ضوابط

خطوط، سپاس نامے، طلبہ و طالبات کے اسکولوں کے نام، ان کے اساتذہ و طلبہ کی تعداد اور تعلیم

...ہندستان، مسلم ... [illegible] ... کلکتہ ... [illegible]

...ہیں، بعض مرتب ... [illegible] ... کہ انجمن ... کے تمام کے

...انے ہی میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ ... نیشنل کانگریس کی ... سر سید ...

...انوں کی شمولیت کے مخالف تھے، اور انھوں نے اس سلسلہ میں مسلمانوں کی تمام

...کو مراسلہ بھی لکھا جو ایک ضمیمہ میں درج ہے، جب کہ بدر الدین طیب جی اور ان کے رفقاء

...گریس کے حامی تھے اور مسلمانوں کے عام فلاح و بہبود اور سیاسی حقوق کے حصول کے لیے

...س میں ان کی شرکت کو موزوں خیال کرتے تھے، مرتب نے سیاست سے انجمن کا تعلق بھی دکھایا

...مگر یہ لکھا ہے کہ بتدریج اس نے سیاست کے سوا دوسرے مقاصد کو مرکز توجہ بنا لیا، انجمن

اسلام کی یہ تاریخ دوسری انجمنوں اور اداروں کے لیے سبق آموز ہے، ایجاز، سلاست و شگفتگی

مرتب کی تحریر کی خاص خوبی ہے، جس کا نمونہ یہ کتاب بھی ہے،

کلکتہ کے قدیم اردو مطابع اور ان کی مطبوعات۔ } مرتبہ جناب سید معتیت الحسن صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۴۴، مجلد مع گرد پوش،

قیمت ۵ روپیہ، پتہ عثمانیہ بک ڈپو ۱۲۴ لور چیت پور روڈ (راجندر سرانی) کلکتہ ۱۲

جناب سید معتیت الحسن صاحب عرصہ سے نیشنل لائبریری کلکتہ سے وابستہ ہیں، اور اب وہ اس کے ڈپٹی لائبریرین ہیں، اس لیے کتابیں اور کتب خانے ان کی دلچسپی و توجہ کا خاص مرکز ہیں اور وہ کتابوں کی طبع و اشاعت کے مسائل اور پریس کے امور سے بھی واقف ہیں، ان صفحات میں ان کی کتاب لائبریرین شپ کا پہلے ذکر آچکا ہے، زیر نظر کتاب میں انھوں نے کلکتہ کے قدیم اور اولین دور کے مطبعوں، ان سے شائع ہونے والی کتابوں اور ان کے مالکوں کے بارہ میں مفید معلومات فراہم کیے ہیں، ایک زمانہ میں علمی و سیاسی حیثیت سے کلکتہ ہندوستان کا زیادہ اہم اور ممتاز شہر رہا ہے،

انجمن اسلام بمبئی کے مسلمانوں کا مشہور اور عظیم الشان تعلیمی و ثقافتی ادارہ ہے، جو بڑی خوش اسلوبی سے مسلمانوں کی ترقی و بہبودی کی قابل فخر خدمات انجام دے رہا ہے، ۱۹۷۶ء میں اس کے قیام کو سو برس ہوگئے، اس مناسبت سے اس کے صد سالہ جشن منانے کا مسئلہ زیر غور آیا تو اس کی گذشتہ پُرعظمت تاریخ مرتب کئے جانے کی ضرورت بھی محسوس کی گئی، اس کے لیے جشن صدی کمیٹی کی نظرِ انتخاب جناب سید شہاب الدین پر پڑی، جو ہر اعتبار سے اس کے بڑے اہل تھے، وہ تقریباً نصف صدی تک مختلف حیثیتوں سے انجمن سے وابستہ رہے اور انھیں اس طرح کے کاموں کو انجام دینے کا خاص تجربہ اور بڑی مہارت ہے، اس بنا پر انھوں نے یہ تاریخ بڑی محنت اور سلیقہ سے دو حصوں میں مرتب کی ہے، پہلے حصہ میں انجمن کے گذشتہ پانچ دور کی سرگرمیوں اور کارگذاریوں کی مکمل تفصیل قلمبند کی گئی ہے، اور دوسرے حصہ میں اس کے وسیع اور اہم کاموں کا جائزہ لیکر ان پر حسب ضرورت مناسب انداز میں اظہار خیال کیا ہے، پہلے حصہ میں انجمن اسلام کا پس منظر، اس کی تشکیل، مقاصد، انجمن اسلام ہائی اسکول کے قیام اور ثقافتی و سماجی سرگرمیوں کی روداد تحریر کی ہے، اس کے بعد ہر دور میں اس کے کاموں میں جو وسعت و ترقی ہوئی، اور مختلف شعبے اور اسکول قائم ہوئے، جو سماجی اصلاحی اور تعمیری کام انجام پائے، دستور و مقاصد میں جو رد و بدل ہوا، اور جو لوگ انجمن کے کاموں میں پیش پیش رہے، ان سب کا تذکرہ ہے، دوسرے حصہ میں ادارہ کی گوناگوں تعلیمی، ادبی، لسانی، دینی، ملی اور فلاحی اسکیموں کا جائزہ لیا ہے، جن میں تعلیمِ نسواں اور دینی تعلیم کے فروغ، ابتدائی و ثانوی سطح پر جدید تعلیم کے رواج، اردو زبان کی ترقی اور معاشرت کی اصلاح وغیرہ کا ذکر ہے، اس کے بعد انجمن کی اہم تقریبات کی داستان اور اس کے ممتاز معماروں کا حال بیان کیا ہے، آخر میں کئی ضمیمے ہیں جن میں انجمن کے قواعد و ضوابط، خطوط، سپاس نامے، طلبہ و طالبات کے اسکولوں کے نام، ان کے اساتذہ و طلبہ کی تعداد اور مہتمم خانوں

فنڈ، چیئرمین و شاف، صدر، سکریٹری، اور مختلف اسکولوں کو بڑے بڑے چندے دینے والوں کے نام دیے ہیں، فاضل مرتب نے اس کو دلچسپ اتفاق قرار دیا ہے کہ انجمن اسلام کے قیام کے قریب زمانے ہی میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ اور انڈین نیشنل کانگریس بھی وجود میں آئی مگر سر سید کانگریس میں مسلمانوں کی شمولیت کے مخالف رہے، اور انھوں نے اس سلسلہ میں مسلمانوں کی تمام انجمنوں کو مراسلہ بھی لکھا جو ایک ضمیمہ میں درج ہے، جب کہ بدر الدین طیب جی اور ان کے رفقار کانگریس کے حامی تھے اور مسلمانوں کے عام فلاح وبہبود اور سیاسی حقوق کے حصول کے لیے اس میں ان کی شرکت کو موزوں خیال کرتے تھے، مرتب نے سیاست سے انجمن کا تعلق بھی دکھایا ہے مگر یہ لکھا ہے کہ بتدریج اس نے سیاست کے سوا دوسرے مقاصد کو مرکز توجہ بنا لیا، انجمن اسلام کی یہ تاریخ دوسری انجمنوں اور اداروں کے لیے سبق آموز ہے، ایجاز سلاست و شگفتگی مرتب کی تحریر کی خاص خوبی ہے، جس کا نمونہ یہ کتاب بھی ہے،

کلکتہ کے قدیم اردو مطابع اور ان کی مطبوعات۔ مرتبہ جناب سید عقیت الحسن صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۲۲۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۵۰ روپیے، پتہ عثمانیہ بک ڈپو ۱۷۱ لور چیت پور روڈ (دابند سرانی) کلکتہ ۱۳

جناب سید عقیت الحسن صاحب عرصہ سے نیشنل لائبریری کلکتہ سے وابستہ ہیں، اور اب وہ اس کے ڈپٹی لائبریرین ہیں، اس لیے کتابیں اور کتبخانے ان کی دلچسپی و توجہ کا خاص مرکز ہیں اور وہ کتابوں کی طبع و اشاعت کے مسائل اور پریس کے امور سے بھی واقف ہیں، ان صفحات میں ان کی کتاب لائبریرین شپ کا پہلے ذکر آچکا ہے، زیر نظر کتاب میں انھوں نے کلکتہ کے قدیم اور اولین دور کے مطبعوں، ان سے شائع ہونے والی کتابوں اور ان کے مالکوں کے بارہ میں مفید معلومات فراہم کئے ہیں، ایک زمانہ میں علمی و سیاسی حیثیت سے کلکتہ ہندوستان کا زیادہ اہم اور ممتاز شہر رہا ہے،

اس لئے صنعتی اور سائنسی ترقی کے لحاظ سے بھی یہ بہت نمایاں تھا چنانچہ عربی و فارسی رسم الخط میں چھاپ کی
ایجاد میں اولیت کا سہرا اسی کو حاصل ہے، جس کے نتیجہ میں متعدد معیاری پریس بھی یہاں قائم ہوئے اور
سیکڑوں کتابیں شائع ہوئیں، مگر اب امتداد زمانہ کی وجہ سے نہ لوگ ان مطابع سے واقف ہیں
اور نہ انکی اشاعتی خدمات سے، اس لئے لائق مصنف نے ابتدا سے انیسویں صدی تک کے کلکتہ کے
ممتاز اور اہم مطابع کا یہ تذکرہ مرتب کیا ہے، جو تین حصوں پر مشتمل ہے، پہلا حصہ مطابع کے ذکر کے لئے
خاص ہے، اس میں ہر پریس کے آغاز و قیام، ان کے مالکوں، ان کی مطبوعات اور مولفین کا نام درج
ہے اور معیار طباعت اور کتابوں کی بعض خصوصیات بھی تحریر کی ہیں، دوسرے حصہ میں ان اشخاص
اور اداروں کا حال قلمبند کیا ہے، جن کا ذکر پہلے حصہ میں آیا ہے، اور وہ پریس سے وابستہ یا کتابوں کی
طبع و اشاعت میں شریک رہے ہیں، تیسرے حصہ میں کلکتہ سے ۱۷۸۱ء سے ۱۹۰۰ء تک شائع
ہونے والی کتابوں کی فہرست دی ہے، اس میں مطبع، مصنفین اور کتابوں کے نام، انکے سنہ اشاعت،
صفحات کی تعداد، طباعت کی نوعیت اور بعض کے موضوع کی بھی صراحت کی ہے، آخر میں مفصل
انڈیکس بھی ہے یہ کتاب بڑی محنت سے لکھی گئی ہے، اور اردو میں اپنی نوعیت کی انوکھی ہے، لیکن غالباً
مصنف پر انگریزی زبان کا ذوق و اثر غالب ہے، اس لئے کہیں کہیں بلاضرورت انگریزی الفاظ
استعمال کرتے ہیں،

آدابِ زواج :- مرتبہ مولانا ابو احمد محمد الاعظمی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر،
صفحات ۱۶۸، قیمت ۵ روپیہ ۵۰ پیسے پتہ ادارہ تحقیقات و نشریات اسلامی سرائے عالیہ ۷۸ بیہ، مئوناتھ بھنجن، یوپی
اس کتاب میں اسلام میں شادی بیاہ کے شرعی آداب و طریقے بیان کئے گئے ہیں، اور ازدواج کی دینی اہمیت،
نکاح، مہر، زفاف، ولیمہ، زوجین میں حسن معاشرت اور ان کے حقوق و فرائض، نسل وغیرہ کے متعلق اسلامی تعلیمات
پیش کی گئی ہے، مصنف نے غلط رسم رواج کی سخت مذمت بھی بیان کی ہے یہ کتاب مفید ہے۔
"ض"

مصنفات مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

سیرۃ النبی جلد سوم۔ معجزہ کے امکان و وقوع پر علم کلام اور قرآن مجید کی روشنی میں مفصل بحث۔ قیمت 55/-

سیرۃ النبی جلد چہارم۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغمبرانہ فرائض۔ 55/-

سیرۃ النبی جلد پنجم۔ فرائض خمسہ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور جہاد پر سیر حاصل بحث۔ 25/-

سیرۃ النبی جلد ششم۔ اسلامی تعلیمات، فضائل و رذائل اور اسلامی آداب کی تفصیل۔ 55/-

سیرۃ النبی جلد ہفتم۔ معاملات پر مشتمل متفرق مضامین و مباحث کا مجموعہ۔ 20/-

رحمت عالم۔ مدرسوں اور اسکولوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کیلئے سیرت پر ایک مختصر اور جامع رسالہ۔ 6/-

خطبات مدراس۔ سیرت پر آٹھ خطبات کا مجموعہ جو مسلمانان مدراس کے سامنے دیے گئے تھے۔ 13/-

سیرت عائشہؓ۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حالات و مناقب و فضائل۔ 22/-

حیات شبلیؒ۔ مولانا شبلیؒ کی بہت مفصل اور جامع سوانح عمری۔ 55/-

ارض القرآن ج ۱۔ قرآن میں جن عرب اقوام و قبائل کا ذکر ہے ان کی عصری اور تاریخی تحقیق۔ 21/-

ارض القرآن ج ۲۔ بنو ابراہیم کی تاریخ قبل از اسلام، عربوں کی تجارت اور مذاہب کا بیان۔ 15/-

خیام۔ خیام کے سوانح و حالات اور اس کے فلسفیانہ رسائل کا تعارف۔ 40/-

عربوں کی جہاز رانی۔ بمبئی کے خطبات کا مجموعہ۔ 14/-

عرب و ہند کے تعلقات۔ ہندوستانی اکیڈمی کے تاریخی خطبات (طبع دوم عکسی) 46/-

نقوش سلیمانی۔ سید صاحب کے منتخب مضامین کا مجموعہ جن کا انتخاب خود موصوف نے کیا تھا (طبع دوم عکسی) 39/-

یاد رفتگان۔ ہر شعبۂ زندگی کے مشاہیر کے انتقال پر سید صاحبؒ کے تاثرات 30/-

مقالات سلیمان (۱) ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر مضامین کا مجموعہ۔ 30/-

مقالات سلیمان (۲) تحقیقی اور علمی مضامین کا مجموعہ۔ 26/-

مقالات سلیمان (۳) مذہبی و قرآنی مضامین کا مجموعہ (بقیہ جلدیں زیر ترتیب ہیں) 26/-

برید فرنگ۔ سید صاحبؒ کے یورپ کے خطوط کا مجموعہ۔ 14/-

دروس الادب حصہ اول و دوم۔ جو عربی کے ابتدائی طالب علموں کے لیے مرتب کیے گئے ۲/ 5/-

"منیجر"

سلسلۂ مذہبی رواداری

تاریخ ہند کا سلسلہ اب تک تیس کتابوں تک پہنچ چکا ہے، جس میں ہندوستان

کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ ہے، جو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔

جلد اول اس میں مغل دور سے پہلے کے مختلف خاندانوں کے مسلمان حکمرانوں مثلاً

محمد بن قاسم، محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، علاء الدین خلجی، محمد بن تغلق وغیرہ کی مذہبی رواداری ا

وطن دوستی کے واقعات پیش کیے گئے ہیں۔ قیمت ۱۴ روپیے۔

جلد دوم اس میں مغل فرماں روا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے

اسلام شاہ، پھر مغل شہنشاہ اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کی مذہبی رواداری وغیرہ کے دلچسپ واقعات

قلمبند کیے گئے ہیں۔ قیمت ۲۶ روپیے۔

جلد سوم ہندوستان کے مغل عہد کے مشہور مورخ سر جدو ناتھ سرکار کی کتاب کا

جواب خود ان کی کتاب کے حوالوں سے اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ اور

اس کے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری وغیرہ کی تفصیلات آگئی ہیں، مولانا شبلیؒ کی

مضامین عالمگیر اور مولانا سید نجیب اشرف صاحب ندوی مرحوم کی مقدمۂ رقعات عالمگیرؒ کے

بعد اورنگ زیب عالمگیرؒ پر دوسری اہم اور پُر از معلومات کتاب جس میں اس کے پورے پچاس سا

عہد حکومت و فرماں روائی کی پوری تاریخ آگئی ہے۔ قیمت ۴۵ روپیے۔

اسلام کی مذہبی رواداری اس میں مستند حوالوں سے مذہبی رواداری، غیر مسلم رعایا

کے ساتھ سلوک اور ذمیوں کے حقوق کے متعلق مذہب اسلام کی تعلیمات اور ان پر مسلمانوں کے

عمل کا اسوہ پیش کیا گیا ہے۔ مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمن۔ منیجر